سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں
ماہنامہ
سرگزشت
کراچی
نومبر 2017
نگران اعلیٰ
معراج رسول
PDF
NOVEMBER 2017
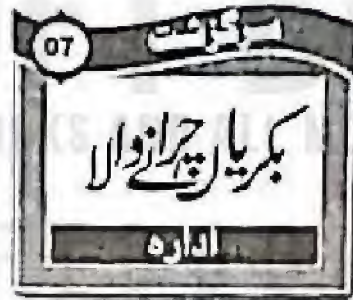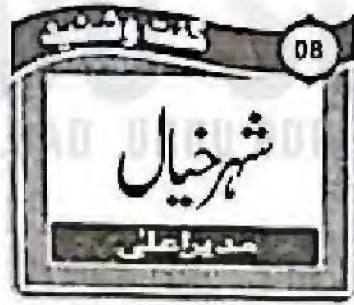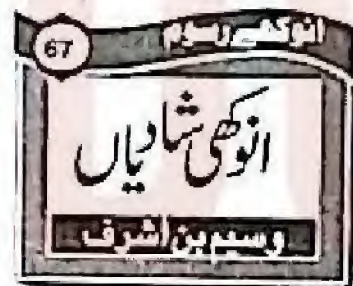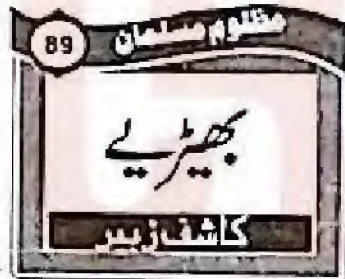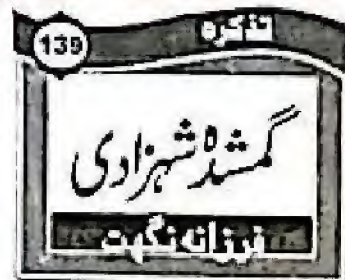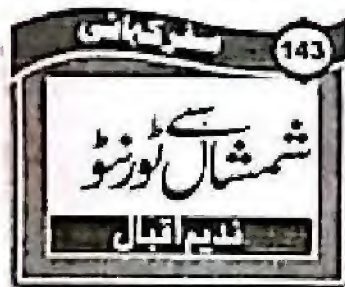
قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

معزز قارئین آپ سے التماس ہے www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے لیے مسلسل اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کُچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کے اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox کی Adblocker Extension کو Pause کر دیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے Pause کر دیں۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کے Adblocker کے Pause ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات **Green Box** والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔
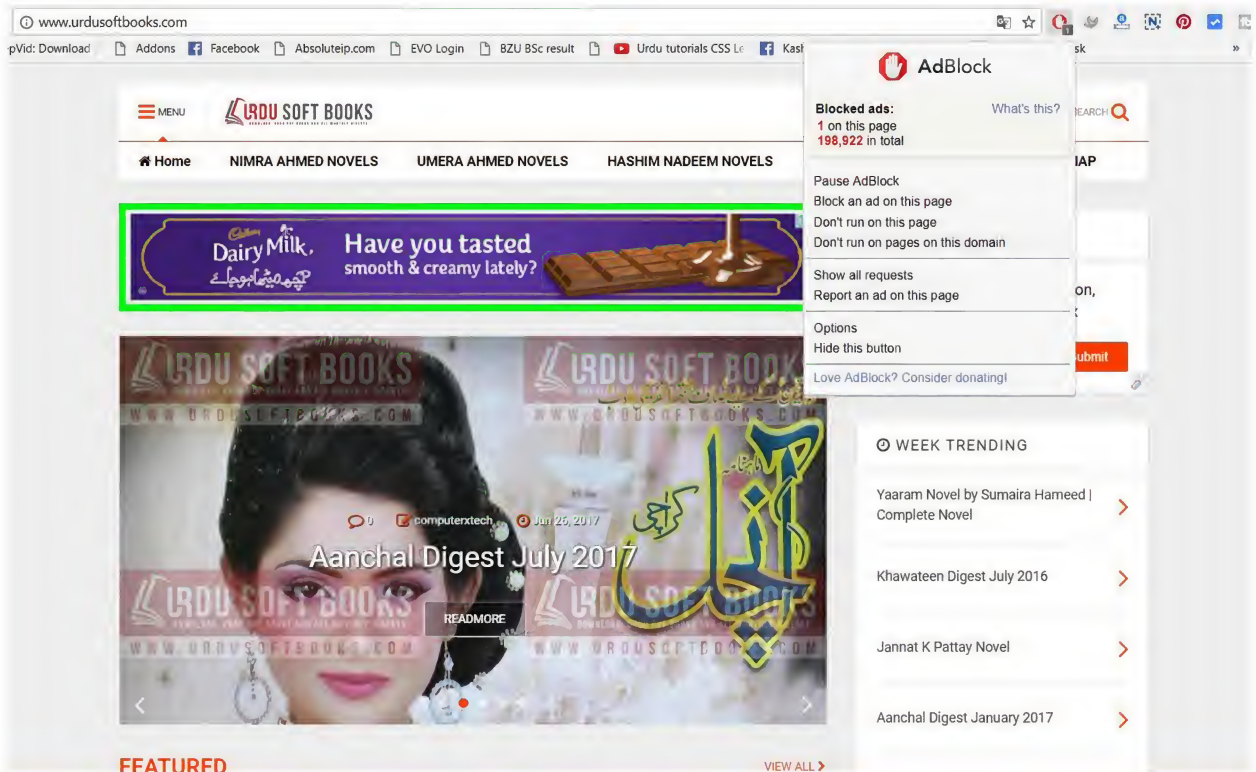
Click Here to Visit UrduSoftBooks.com

جلد 27 ❖ شمارہ 10 ❖ نومبر 2017ء

ماہنامہ
کراچی
سرگزشت

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول
مدیر : پرویز بلگرامی
نائب مدیرہ : نبیلہ اظہر

◆◆◆

منیجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

◆◆◆

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرسالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقام اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط وکتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200
Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

''اس گھر میں آئے ہوئے انہیں ایک ماہ ہو چکا تھا۔ گھر اب تک چمک رہا تھا۔ ننھا کاشان ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوم ورک کر رہا تھا کہ اسے کچھ یاد آیا اور اس نے ہاتھ میں پکڑی پینسل سے دیوار پر پھول پتی بنانا شروع کر دیا۔ ماں کی نظر پڑی تو وہ غصے میں بھری اس کے پاس آئی ہاتھ سے پینسل چھینی اور اسے دور پھینک دیا۔ کاشان حیرت بھری نظروں سے ماں کو دیکھنے لگا پھر بولا ''امی میں پرانے والے گھر میں بھی تو دیوار پر نقشے بنایا کرتا تھا مگر آپ تب تو منع نہیں کرتی تھیں۔''

''بیٹا وہ گھر کرائے کا تھا یہ ہمارا اپنا گھر ہے۔'' ماں نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔'' یہ مِنی کہانی ہماری آپ کی ہم سب کی کہانی ہے۔ ہماری سوچ اسی قسم کی سطحی ہو چکی ہے۔ ہم وطن کی محبت بھول کر صرف اپنا مفاد دیکھ رہے ہیں۔ ہر روز ٹی وی پر ٹاک شوز میں جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے۔ اداروں کے درمیان دوریاں پیدا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ یہ سب دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ یہ وطن ہمارا گھر ہے اور کرایہ کا بھی نہیں ہے۔ اس کی تعمیر و ترقی کے لیے ہم سب کو سوچنا ہے۔ اس کی ترقی تبھی ممکن ہے جب ہم مفاد سے بالاتر ہو کر سوچیں گے۔

معراج رسول

بکریاں چرانے والا

سیالکوٹ کی تحصیل نارووال کے گاؤں کالا قادر۔ میں صاحبزادہ خان رہا کرتا تھا۔ دو وقت کی روٹی بھی اسے میسر نہ تھی۔ ہر صبح وہ گاؤں والوں کی بکریاں چرایا کرتا۔ اس کڑی مشقت کے بعد اسے صرف اتنا سا اناج ملتا جو اس کے گھر والوں کی بھوک کو کم کردیتا۔ اس آدھے پیٹ کھانے میں سلطان محمد خان بھی شریک تھا وہ کچھ اور بڑا ہوا تو صاحبزادہ خان نے اسے بھی بکریاں ہانکنے پر مامور کردیا۔ جب وہ مدرسے کے برابر سے گزرتا تو اس کا دل تڑپ اٹھتا اور وہ ایک بار اندر جھانک کر ضرور دیکھتا۔ قطار در قطار بیٹھے بچے اسے بہت اچھے لگتے۔ ایک دن اس نے اپنے باپ سے کہا کہ میں بھی مدرسے میں پڑھوں گا۔ باپ نے پڑھنے کی اجازت دے دی۔ پرائمری پاس کرنے کے بعد سلطان محمد خان نے بدو کے اسکول میں داخلہ لے لیا۔ وہ خوب محنت کرتا دن رات کی محنت رنگ لائی اور اس نے مڈل کا امتحان بھی امتیازی نمبروں سے پاس کرلیا پھر آگے کی پڑھائی کے لیے وہ لاہور آگیا۔ رات گزارنے کے لیے اس نے ایک مسجد کو چن لیا اسی مسجد میں افغانستان کے سفیر بھی نماز پڑھنے آتے تھے سلطان محمد کے بارے میں امام صاحب نے انہیں بتایا کہ یہ لڑکا بہت اچھی انگلش جانتا ہے تو انھوں نے فرمائش کردی کہ سلطان ہر روز ان کے بنگلے پر آکر انھیں انگریزی کی تعلیم دے اور اس طرح وہ ایک معمر شخص کا نوجوان معلم بن گیا۔ اسی دوران 1906ء کا خوش نصیب سال آگیا۔ شہنشاہ افغانستان نے سفیر سردار امیر محمد خان کو واپس کابل بلالیا جب وہ جانے لگے تو انھوں نے سلطان محمد خان کو بھی ساتھ لے لیا۔ کابل کے بادشاہ امیر عبدالرحمن نے اسے بحیثیت مترجم اپنے یہاں مقرر کرلیا۔ اسی دوران اس کی ملاقات حکومت برطانیہ کی سفیر ڈاکٹر ٹیلر ہملٹن سے ہوئی لیڈی ٹیلر ہملٹن نے بھی اس کی فہم و دانش کا لوہا مان لیا۔ دونوں میں خوب نبھنے لگی۔ ٹیلر ہملٹن نے ایک دن سلطان کو مشورہ دیا کہ وہ ہوشیار ہوجائے۔ کچھ لوگ بادشاہ کو اس سے بدظن کرنے کی سازش میں لگے ہوئے ہیں۔ اس نے فوراً ہی بوریا بستر باندھ لیا اور رات کی تاریکی میں کابل سے فرار ہوگیا۔ وہ لاہور پہنچا ہی تھا کہ حکومت برطانیہ نے اسے لندن طلب کرلیا لندن پہنچنے پر اس کے استقبال کو لیڈی ٹیلر ہملٹن خود بندرگاہ پر آئی۔ وہ اس کے گھر میں ٹھہرا لیکن جلد اسے احساس ہوگیا کہ یہاں اس کے لائق کوئی کام نہ تھا اس لیے وہ دوبارہ حصول علم میں کوشاں ہوگیا۔ اس نے کیمبرج میں داخلہ لے لیا تھا۔ طلب علم کی لگن نے اسے جلد ہی فیلو آف رائل جیوگرافیکل سوسائٹی کی سند دلادی۔ سلطان محمد نے کیمبرج میں دو سال تک تعلیم حاصل کی، پھر اس نے لاء کالج میں داخلہ لے لیا۔ بیرسٹری پاس کرنے کے بعد وہ واپس برصغیر آگیا۔ پہلے اس نے جہلم میں پریکٹس کی لیکن وہاں جم نہ سکا اور واپس اپنے آبائی شہر سیالکوٹ آگیا۔ وہاں آکر اس نے ایک بہت بڑی حویلی خرید لی تھی اس نے یکے بعد دیگرے پانچ شادیاں کی تھیں سب سے چھوٹی بیوی کے نو بچے ہوئے۔ طفیل احمد، عنایت اللہ، بشیر احمد، بیگم بی بی گل، بیگم نجیب اللہ خان، بیگم اعظم علی، بیگم حمید، رشیدہ سلطانہ اور فیض احمد خان۔ بکریا چرانے والے سلطان محمد خان نے اپنے عزم و حوصلے سے تعلیم کا سہارا لے کر ثابت کردیا کہ تعلیم ہی انسان کو ادج پر پہنچاتی ہے۔ شہرت دلاتی ہے۔ یہ وہی سلطان محمد خان تھے جن کے بیٹے فیض احمد فیض نے اردو ادب میں ایک بڑا مقام پایا۔

☆☆☆

☆ نزہت افتخار نے ساہیوال سے پہلی بار تبصرہ ارسال کیا ہے لیکن اتنا بھرپور ہے کہ ایک لفظ بھی اضافی نہیں ہے۔ انہوں نے لکھا ہے۔ ''پہلی بار محفل میں آئی ہوں۔ کون کون ویل کم کرے گا۔ اس بار کا شمارہ بروقت آیا تو سوچا میں بھی تبصرہ کرنے کی کوشش کرلوں۔ گو کہ یہ میرے لیے ایک مشکل امر ہے۔ کبھی تبصرہ کیا نہیں، دوسروں کا پڑھتی رہی ہوں اس لیے صرف کوشش کی ہے۔ اگر انداز بیاں پسند نہ آئے تو خدارا مذاق مت اڑایئے گا۔ نئی آمد سمجھ کر درگزر کر دیجیے گا تو جناب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ زویا اعجاز کی رہائی نے مجھ پر جادو سا اثر دکھایا۔ قیام پاکستان کے وقت کی سیکڑوں کہانیاں پڑھی ہیں، امرت سر جل رہا ہے، کھول دو، خونی سے سنی ریل، اور انسان مر گیا۔ نہ جانے کتنے ناول، کتنی کہانیاں پڑھی ہیں۔ پڑھ پڑھ کر روئی ہوں کہ کس طرح مسلمانوں کا خون ارزاں ہو گیا تھا۔ کتنی قربانیوں کے بعد یہ وطن حاصل ہوا جسے یہ آج کے سیاست داں کتر کتر کر کھا رہے ہیں۔ لیکن اس سچ بیانی نے تو دہلا دیا۔ ایسی کہانیاں کبھی کبھی ہی جنم لیتی ہیں۔ (ویلڈن زویا اعجاز) ''رہائی'' کے بعد جو سچ بیانی پسند آئی وہ ''کی جاناں'' ہے۔ زبردست، قلم کا شاہکار کہلا سکتی ہے۔ ''حماقت'' کو حماقت کہہ کر میں نے پڑھنے کے بعد نظر انداز کر دیا۔ ''تریاق'' بس گزارے لائق تھی۔ ''شیر کی خالہ اور زہر کا پیالہ'' بکواس کہی جائے گی۔ فرشتہ اور تیزاب افسانوی انداز کی ہے ''دل مشکل'' کچھ پڑھی پڑھی سی لگی تو ذہن پر زور دیا پھر اپنا سر پیٹا کہ اتنی جلدی بھول گئی۔ یہ ابھی ایک ماہ قبل ہی تو ایک ڈائجسٹ میں پڑھی ہے۔ مدیران سے التماس ہے کہ ایسی کہانیوں سے اجتناب کریں۔ (حبیب اشرف نے یہ ایک غلط حرکت کی ہے۔ ہم جرمانے کہانی لکھنے والوں پر پابندی لگا دیتے ہیں۔ مصنف کی اس حرکت پر ہم معذرت خواہ ہیں کہ قارئین کو سہواً ایسی کہانی پڑھنے کو ملی)۔ اب کچھ باتیں باذوق قارئین کے لیے لگائی جانے والی تحریر پر بھی ہو جائے۔ علامہ ابن جوزی پر ضیا تسنیم بلگرامی نے خوب لکھا، اب تک مختلف تحریروں میں بطور حوالہ ان کا نام پڑھتی رہی ہوں پہلی بار ان کی حالات زندگی پڑھی۔ راشدی برادران سندھ کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ انہوں نے وسائل نہ رہتے ہوئے بھی جو تخلیقات پیش کیں ان کا جواب نہیں۔ تنقید نگار بھی خاصے کی چیز ہے۔ محترم شکیل صدیقی اور شکیل ادریس دونوں کی تخلیق قابل تحسین ہے۔ سلمیٰ اعوان کا کیا کہنا، وہ جو کچھ لکھتی ہیں دل کی آنکھوں سے میں پڑھتی ہوں، شاعر انقلاب خوب لکھا ہے۔ پر کی بہت مختصر تھی۔ شاید لطیف کو اسے مزید طویل کرنا چاہیے تھا۔ آواز کا جادوگر، واہ جناب میرے پسندیدہ اناؤنسر پر تحریر، وہ صرف اناؤنسر نہیں ایک بڑے محقق بھی ہیں اور ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ''مرد بحران'' بھی پسند آئی لیکن دھرتی کا بوجھ مرحوم کاشف زبیر کی یہ تحریر بہت عمدہ، بہت اعلیٰ، زبردست تحریر ہے۔ اب آتی ہوں اپنی پسندیدہ تحریر کی طرف یعنی جس کا انتظار بڑی بے صبری سے کرتی ہوں۔ کہنے کو ''شمشال سے تورتتو'' ایک سفرنامہ ہے لیکن حقیقت میں وہ ایک طویل تحریر ہے۔ اگر نسرین کے کردار کو اور آگے بڑھایا جائے تو مزہ آ جائے گا۔ تنقین شاہ بھی پسند آئی۔ اب ذرا ناسور کی بات... بھی کی جائے۔ یہ نویں قسط ہے اور کہانی ایک انچ بھی نہیں بڑھی۔ کرداروں کا جمعہ بازار ہے۔ اگر برا نہ مانیں تو کہہ دوں کہ مجھے یہ کہانی بالکل پسند نہیں آ رہی ہے۔''

☆ امجد علی سید لاہور سے رقمطراز ہیں۔ ''میں کہانی لکھنا چاہتا ہوں طریقہ کار بتا دیں'' یہ میرا پہلا سوال ہے۔ اب تبصرہ حاضر ہے پہلے ہی بتا دوں کہ میں بہت سارے رسالوں میں تبصرہ لکھتا رہتا ہوں۔ علامہ ابن جوزی پر ضیا تسنیم بلگرامی نے اچھا لکھا ہے۔ ایک تحقیقی مضمون ہے راشدی برادران پر شکیل صدیقی نے انصاف نہیں کیا یہ تحریر مزید تحقیق مانگتی ہے۔ تنقید نگار بھی اسی زمرے میں آتی ہے،

شاعر انقلاب سلمٰی اعوان کی بھی ادھوری ادھوری لگی۔ یہ جرکی تو بالکل سمجھ نہیں آئی۔ ''آواز کا جادوگر'' اتنی طویل تحریر، سعید احمد سلطان نے صفحات ضائع کیے۔ مرد بحران بھی بس ایویں سی تحریر ہے۔ اب کہانیوں پر بھی باتیں ہو جائیں۔ تیزاب اور فرشتہ جیسی کہانیاں بالکل پسند نہیں آئیں۔ ''کی جاناں'' سے اچھی کہانی تو ''رہائی'' تھی لیکن یہ کہانی بھی افسانوی سی لگی۔ زہر کا پیالہ بہت پسند آئی۔ (خدا کا شکر ہے کہ آپ کو کوئی کہانی پسند آئی۔ کہانی لکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ سفید کاغذ اور قلم لیں ایک ایک لائن چھوڑ کر صاف صاف لکھیں، کہانی میں پلاٹ کا ہونا ضروری ہے۔ جملے دلچسپ ہوں، کہانی میں روانی ہو اور کہانی سچی ہو ہم افسانے شائع نہیں کرتے)۔''

☆ سحرش سحر کا ای میل ''میں رائٹر ہوں، ایک مکمل ناول لکھ چکی ہوں جو کتابی شکل میں آنے والا ہے، ایک اور ناول بھی آن لائن شائع ہو رہا ہے۔ میں سرگزشت میں سلسلہ وار ناول لکھنا چاہتی ہوں۔ (آپ اس ناول کا مکمل مرکزی خیال اور ایک قسط پہلے بھیج دیں۔ اگر انداز تحریر اچھا ہوا تو کہانی ضرور چھپ جائے گی۔)''

☆ نادیہ عنبر لودھی، ایڈیٹر خبریں مانچسٹر یو کے لکھتی ہیں۔ ''میں عرصہ دراز سے آپ کے رسالوں کی قاری ہوں، اور لکھاری بھی ہوں نیز اخبارات میں بھی لکھتی ہوں۔ اس رسالے سرگزشت کے لیے مرزا اسداللہ خاں غالب کی سرگزشت لکھنا چاہتی ہوں۔ (غالب پر طویل تحریر شائع ہو چکی ہے)''

☆ خالد محمود کی آمد ملتان سے، اس دفعہ سرگزشت 25 تاریخ کو مل گیا۔'' بے حد خوشی ہوئی۔ محرم کی چھٹیوں کی بدولت کافی وقت مل گیا تھا۔ محترمہ زویا اعجاز کی کہانی ''رہائی'' پڑھ کر کلیجہ پھٹ گیا۔ کہاں وہ وقت تھا کہ محمد بن قاسم کو چند خواتین کی رہائی کے لیے فوج کشی کے لیے آنا پڑا اور اب ہم جیسے کمزور اور بزدل مسلمانوں کو ایسے برے دن دیکھنا پڑ رہے ہیں۔ بعض لوگوں کو شاید یہ کہانی سمجھ نہ آسکے مگر میرے جیسے لوگوں کے لیے مقام عبرت ہے کیونکہ میں نے پاکستان بنتے دیکھا ہے۔ جن لوگوں کو پکی پکائی مل گئی ہے ان کو پاکستان کی کوئی قدر نہیں ہے۔ ان کو صرف دولت سے پیار ہے۔ بعض اوقات میں سوچتا ہوں کہ اگر اللہ نے ہمیں کشمیر دے دیا اور جب وہاں کوئی دولت مند بے وقوف سیاست داں حاکم بن کر عیاشی کرنے لگے گا تو وہ لوگ سوچیں گے کہ آیا انہوں نے ایسے پاگلوں کے لیے اتنی قربانیاں دی تھیں۔ یہی حال موجودہ پاکستان کے حاکموں کا ہے۔ اشعر جمال صاحب کی کہانی ''کی جاناں میں'' ایک اچھوتی کہانی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسی مخلوق کو معاشرہ میں جائز مقام ملنا ضروری ہے۔ میرے علم میں بات نہیں ہے کہ ایسی مخلوق کو چین، روس، یورپ اور امریکا میں کیا مقام دیا جاتا ہے۔ آخر وہاں بھی ایسے لوگ پیدا ہوتے ہوں گے۔ اگر کوئی صاحب علم روشنی ڈالیں تو ممنون رہوں گا۔ حماقت بالکل حماقت ہی ثابت ہوئی۔ ''تریاق'' بھی سبق آموز کہانی ہے۔ ''شیر کی خالہ'' واجبی سی کہانی لگی۔ فرشتہ ایک لاجواب حقیقت ہے۔ عبداللہ صاحب نے ہمارے سیاست دانوں کی چمڑی ادھیڑ دی ہے۔ مبارک ہو۔ ہم سوچتے تھے کہ آفاقی صاحب کے جانے کے بعد قلم نگری کا کیا ہوگا لیکن انور فرہاد صاحب نے کمال کر دیا۔ ان کے مضامین بے حد علمیت رکھتے ہیں اور خاص طور جو حقیقتیں وہ نکال کر لاتے ہیں لاجواب ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے قلم میں اور طاقت دے۔ ندیم، وحید مراد، جاوید شیخ پر ان کی کہانیاں پڑھ کر پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ ''ناسور'' کی سلسلہ وار قسط میں کریکٹر بڑھتے جا رہے ہیں جو مجھ جیسے بوڑھے کی یادداشت سے مطابقت نہیں رکھتے۔ شمشال سے نور نواب یکسانیت کا شکار ہے مگر دلچسپ ہے۔ باقی مضامین ابھی زیر مطالعہ ہیں۔''

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کراچی سے لکھتے ہیں۔'' چیف صاحب اجتماعیت کا اسلامی پیغام ہرگز ہرگز انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے طوفان بدتمیزی کی نذر نہیں ہوگا۔ ہر نئی چیز اور ایجاد کا وقتی ابال ضرور ہوتا ہے۔ آج کی ماں ضرور اس سے متاثر ہے لیکن اگلی نسل کی ماں اس کی عادی ہوگی کہ وہ اس کی مہارت اپنے ساتھ لے کر اپنے بیٹے اور بیٹیوں کے درمیان بیٹھی ہوگی۔ لاؤڈ اسپیکرز اور ٹیلی ویژن سے بھی ابتدائی طور پر یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ یہ سب ہماری اسلامی اقدار کو متاثر کریں گے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ آج ہماری نوجوان نسل میں اپنے مذہب سے رغبت پہلے کے مقابلے میں زیادہ ہے اور رہ گئی اجتماعیت کی بات تو آج بھی آپ جیسے مشعل راہ لوگ ہمیں بھٹکنے نہیں دیں گے۔ عثمان جامعی کی خوبصورت نظم پر ان کا شکریہ۔ ہاجرہ مسرور نے ہمیں واقعی مسرور کر دیا۔ تنقید نگر سے زیادہ ہم ڈاکٹر جمیل جالبی کو ایک مشفق استاد کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ان کے ادبی احسانات اپنی جگہ لیکن کراچی یونیورسٹی کی خدمت ان کا عظیم اثاثہ ہے۔ راشدی برادران بھی قوم کا روشن چہرہ تھے۔ اپنے اپنے نفس کو مرغوبات سے جس نے بھی روکا وہ اللہ کا دوست بن گیا، علامہ ابن جوزی بھی ان میں سے ایک تھے۔ سلمٰی اعوان صاحبہ کی تحریریں ہماری نظر سے گزرتی رہتی ہیں۔ شاعر انقلاب بھی اچھی تھی۔ شاہد لطیف کی جر کی مناسب سی تھی۔ آواز کا جادوگر ریڈیو کے لیے صرف رضا علی عابدی نہیں تھے بلکہ ان جیسے جادوگروں کی ایک فوج تھی جس

نے ریڈیو کو طلسماتی بنا دیا تھا۔ رضا علی عابدی کو صف اوّل کے لکھاری میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ عراق کے پس منظر میں دھرتی کا بوجھ انجانی شاندار تھی۔ حارث جیسے غدار ہر جگہ موجود ہیں اور ایمن جیسی حب الوطن عورتیں بھی، کاش صدام حسین عراق کی اس حالت کے ذمہ دار نہ بنتے۔ ندیم اقبال صاحب ''شمشال سے ٹورنٹو'' تک میں اپنے وطن سے دور پہلی عید کی روداد سنا رہے تھے۔ انداز تو ہے ہی دل لبھانے والا، اس مرتبہ کچھ افسانوی رنگ غالب تھا خاص کر پری جمال والا واقعہ۔ تلقین شاہ کی شخصیت کو بلاتبصرہ بھی رہنے دیا جائے تو اس کی شان میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ نو ماہ بعد اپنے تخلیقی عمل سے گزر کر اپنے معاشرتی ناسوروں کو عملی شکل دینے میں جناب عبدالرب بھٹی کامیاب ہو گئے لیکن کہانی جہاں کی تہاں کھڑی ہے اب اسے آگے بھی بڑھنا چاہیے۔ ہر ماہ کی طرح انور فرہاد اس مرتبہ بھی چھا گئے۔ مرد بحران جاوید شیخ کی ایسی سرگزشت ہے جو نہ صرف پڑھنے کے لائق ہے بلکہ اس میں بہت سی غلطیوں سے بچنے کا سبق بھی ہے۔ جناب ابن صفی کا عمران بلاشبہ جاوید شیخ ہی ہوسکتا تھا۔ کاش دھاکا کی بے قدری نہ ہوتی تو آج ہم جیمز بانڈ کی طرح عمران سیریز پر بھی کئی فلمیں دیکھ چکے ہوتے۔ خدا کرے زینت منگھی جاوید شیخ کو اپنی تکلیفیں معاف کردیں یہ سوچ کر کہ اگر وہ دکھ نہ اٹھاتیں تو ہمیں جاوید شیخ بھی نہ ملتا۔ شہر خیال میں حاصل تبصرہ رضا احمد اعوان کا تھا انہوں نے تو آئینہ دکھا کر افسردہ ہی کر دیا۔ اعجاز حسین ستار، رانا محمد شاہد، سدرہ بانو ناگوری، قیصر خان، کلیم اللہ ایڈووکیٹ، نزاہت افشاں، عبدالجبار رومی، سیف اللہ اور ندیم اقبال صاحب کا شکریہ کہ انہیں ہمارا تبصرہ پسند آیا۔

☆ آرٹسٹ محمد عامر ساحل کی تشریف آوری۔ ''سب سے پہلے شہر خیال میں حاضری دی۔ جناب رضا احمد اعوان کا طویل خط بہت زبردست تھا۔ اس کے علاوہ دوستوں میں قیصر خان بھکر اور ندیم بھائی ڈیرے وال کا خلوص نامہ بہت پسند آیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے مرد بحران پڑھی اس میں جاوید شیخ کے بارے میں تفصیل سے واقعات بیان ہوئے ہیں، بہت اچھا لگا۔ جاوید شیخ نے زینت منگھی کے ساتھ جو سلوک کیا بہت ہی دکھ کی بات ہے۔ ایک تجربے کی بات ہے کہ جو شخص کسی اچھے انسان کی قدر نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس بے قدرے شخص کو زندگی میں برے انسانوں سے بھی ٹکراتا ہے تاکہ وہ اچھے اور برے میں تمیز کرسکے۔ شمشال سے ٹورنٹو میں ندیم بھائی نے نسرین کے بیٹے کی سالگرہ میں شرکت کرکے ان دونوں کو دلی خوشی عنایت فرمائی۔ نہ جانے اب نسرین بے چاری مستقبل میں کیا فیصلہ کرنے والی ہے۔ ایران جائے گی کہ وہیں رہ جائے گی۔ ندیم بھائی زبردست۔ ناسور میں تجسس برقرار رہ گیا کہ نہ جانے زنیرہ ایڈووکیٹ کی گولی کی زد میں کون آگیا۔ سچی آپ بیتیوں میں ''رہائی'' ایک مکمل دکھ بھری داستان تھی۔ بلدیو سنگھ اور گلاب کور اپنے کیے کی سزا بھگت چکے مگر اگلے جہاں یعنی جہنم میں اس سے کئی لاکھ گنا زیادہ تڑپیں گے۔ اس آپ بیتی سے یہ بھی سبق حاصل ہوتا ہے کہ والدین کو اپنی اولاد برادران کے دوستوں پر یوں اندھا اعتماد بالکل نہیں کرنا چاہیے۔ تریاق بہت ہی انوکھی محبت کی داستان تھی۔ وسیم نے واقعی اپنی محبت کی سچائی کا ثبوت دیا۔ یہ سچ ہے کہ جو انسان کسی سے سچی محبت کرتا ہے تو وہ ہر حالت میں صرف اپنے محبوب کو خوش دیکھنا چاہتا ہے اور یہاں اس کے محبوب کی خوشی اس کے اپنے شوہر کے ساتھ ہی تھی۔ جب محبوب خوش ہو تو ایک عاشق کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہوسکتی ہے۔ ویلڈن وسیم بھائی۔ زہر کا پیالہ اپنے آپ میں منفرد تحریر تھی۔ ملک نور کا یہ اقدام سراسر غلط تھا اور رملا بھی خودکشی کر کے گناہ کبیرہ کی مرتکب ہوئی۔ فرشتہ میں بے خود سیاسی نے ہماری بیوقوف عوام کو بالکل ہی انوکھے اور نرالے انداز میں بیوقوف بنایا۔ اللہ تعالیٰ کی پاک ذات تمام مسلمانوں کو ایسے بہروپیا سے بچائے (آمین ثم آمین)۔ تیزاب میں رافعہ کے ساتھ واقعی بہت ظلم ہوا۔ یہ ٹھیک ہے کہ قانون نے اپنا کردار ٹھیک طور پر نہیں نبھایا مگر پھر بھی کوئی بھی شہری ہو اسے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ اس دکھ اور آزمائش پر صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتی۔ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر کون سا فائدہ حاصل ہوا؟

☆ سدرہ بانو ناگوری نے ملیر کراچی سے لکھا ہے۔ اداریہ میں عثمان جامعی کی نظم پڑھ کر لبوں سے ایک آہ سی نکلی، ہم عجیب تذبذب کا شکار ہیں۔ ایک طرف ہماری موجودہ نسل کی انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا میں حد سے زیادہ بڑھتی ہوئی دلچسپی تو دوسری طرف روہنگیا مسلمانوں پر توڑے جانے والے ظلم و ستم۔ ابھی تو کشمیر کے مسلمانوں کو سکھ نصیب نہیں ہوا تھا کہ پھر سے امت مسلمہ پر ایک اور وار، ایک نیا دکھ، ایک نئی اذیت۔ خدا پاک ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ ''شہر خیال'' کے سبھی ساتھیوں کا تبصرے کی پسندیدگی پر شکریہ۔ کلیم ایڈووکیٹ صاحب آپ کا یہ مختصر خط پڑھ کر مجھے دل سے اعتراف ہے کہ آپ جیسے اچھے اور سچے لوگ ابھی بھی ہیں جو واقعی وطن عزیز کے دکھ کو سمجھتے ہیں۔ آپ اپنا کام اسی طرح جاری رکھیے۔ شہر خیال کے سبھی ساتھی آپ کا حوصلہ بڑھانے کے لیے آپ کے ساتھ ہیں۔ ندیم اقبال اچھی تحریر اپنی جگہ ضرور بناتی ہے لیکن اس تحریر نے تو مسحور کر دیا ہے۔ میں امریکا سمیت بہت سے ملکوں کے حلف نامے پڑھ چکی ہوں۔ آپ نے ٹھیک فرمایا کہ آپ جس ملک میں بھی رہیں وہاں کے قانون کا احترام کرنا ضروری ہے۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ آپ

نے ایسا کیوں کہا۔ آپ کا بھی شکریہ کہ آپ شہر خیال کے لیے بھی وقت نکالتے ہیں۔ لکھتے رہا کریں۔ اچھا لگتا ہے۔ ”ثقلین شاہ“ جناب اشفاق احمد صاحب کا مختصر تذکرہ اچھا لگا۔ ”ناسور“ میں نعمان بڑی مشکلوں سے اپنی بہن کو بچا پایا تھا اب نیم کی گمشدگی سوالیہ نشان کی مانند آکھڑی ہوئی ہے۔ ”مرد بحران“ موجودہ دور کا ایک بڑا اداکار مگر جب میں نے اس کے گزرے شب و روز کا احوال پڑھا تو میں حیران رہ گئی کہ اس نے موجودہ مقام پانے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ اس نے سب کچھ پالیا مگر زینت منگلی کو چھوڑنا اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ کاش کہ وہ یہ غلطی نہ کرتا تو کوئی خلش کوئی کمی اس کے دل میں نہ رہتی۔ ”شمشال سے ٹورنٹو“ ہمیشہ کی طرح دلوں میں اتر گئی۔ ندیم بھائی مفتی کی بہن کی بدولت آپ کی عید تو خوب گزری مگر موٹے تازے بلے نے سرجی کی عید کا سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ سلمٰی اعوان ہمیشہ کی طرح اپنے منفرد انداز میں آئیں اور اپنی خوبصورت تحریر کے ذریعے ایک بار پھر اپنا گرویدہ کر گئیں۔ بہت اچھے سلمٰی جی۔ ذریا اعجاز جی اس دفعہ تو رلا دیا آپ نے۔ پاکستان کی بیٹی کا درد اور کرب پڑھ کر دل دہل گیا۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ انہی ظالموں کو ہم سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ ہمارے گھروں میں خوشیاں اس وقت تک ادھوری رہتی ہیں جب تک ہم ان کے گائے ہوئے گانوں کو نہ بجالیں۔ کتنے بے حس ہیں ہم، وطن کی ہزاروں بیٹیاں اسی طرح ظلم و ستم کا نشانہ بنتی ہیں۔ ”تریاق“ میں وسیم کے اقدام کو سراہنا چاہیے کہ اس نے محبوبہ کی خوشی کے لیے محبوبہ سے دستبردار ہونا ہی بہتر سمجھا۔ اس نے جو کیا بہت اچھا کیا۔ محبت کا یہ انداز ہمیں بہت بھایا۔ ”فرشتہ“ اچھی تحریر ہے مگر بے خود صاحب کی خودی کے کیا کہنے، سیاست کا حصہ بننے کے لیے نیکی اور اچھائی کی آڑ لینا انتہائی غلط عمل ہے۔

☆ نذیر احمد راجپوت نے شہداد پور سے انور فرہاد کی تعریف کی ہے۔ لکھتے ہیں ”میں ماہنامہ سرگزشت کا مستقل خریدار ہوں۔ آپ نے اداکار سدھیر، اداکار محمد علی، اداکار ندیم، اداکار وحید مراد اور اس مہینے جاوید شیخ پر مفصل مضمون لکھا۔ یہ مضامین بہت دلچسپ اور معلوماتی ہیں، پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ غالباً دسمبر 2015ء کے شمارے میں بابا عالم سیاہ پوش پر معلوماتی اور مفصل مضمون آپ نے تحریر کیا تھا۔ ایسا مضمون تو آج تک ہفت روزہ نگار میں بھی شائع نہیں ہوا جیسا آپ نے لکھا ہے۔ میری آپ سے التجا ہے کہ براہ کرم اب آپ پنجابی فلموں کے فنکاروں پر دلچسپ معلوماتی اور مفصل مضمون تحریر کریں۔ مثلاً اداکار اکمل مرحوم، اداکارہ شیریں، ہدایت کار حیدر چوہدری، گلوکارہ بیگم نذیر، موسیقار، ہدایت کار ایم جے رانا، ہدایت کار اسلم ایرانی، نغمہ نگار وارث لدھیانوی وغیرہ پر ان فنکاروں پر معلوماتی دلچسپ اور مفصل مضمون پڑھنے کا بے حد شوق ہے۔ امید ہے کہ آپ میری خواہش پوری کردیں گے۔

☆ رانا محمد شاہد کا خلوص نامہ بورے والا سے۔ معراج رسول کے اداریے میں دو باتیں پڑھ کر اپنی ماں کی بہت یاد آئی۔ جب تک وہ زندہ تھیں ہم سب شادی شدہ بھائیوں اور بہنوں کے اکٹھے ہونے کی وجہ وہی تھیں۔ جب عید یا کسی بھی خاص موقع پر دوسرے شہروں سے بھائی آتے تو سب کو اکٹھے دیکھ کر ماں کی خوشی سنبھالے نہ سنبھلتی۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ماں ایک ایسا مرکز ہے جو اولاد کو جوڑے رکھتا ہے۔ تصویر کا دوسرا پہلو بھی دردناک ہے کہ آج کی دنیا میں انٹرنیٹ نے ہر شخص کی الگ دنیا بسادی ہے۔ گویا کہ ایک ہی گھر میں رہنے والے اجنبی ہیں اور ان کی آپس میں ایک دوسرے سے کم ہی گفتگو ہوتی ہے جو یقیناً بقول معراج رسول، اسلامی اور ہماری تہذیبی اقدار کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ یک مکی سرگزشت میں معروف افسانہ نگار ہاجرہ مسرور کی بچپن میں ادبی دنیا میں داخل ہونے کی کہانی بہت دلچسپ لگی۔ ایک کند ذہن بچی نے کس طرح ادبی دنیا میں نام پیدا کیا۔ میرے خیال میں یقیناً مطالعہ اور خوب مطالعہ ہی اس کی وجہ بنی۔ اس دفعہ کرسی صدارت پر موجود رضا احمد اعوان کا طویل خط تبصرے سے زیادہ مختلف مسائل کا احاطہ کرتا کالم لگ رہا تھا۔ تبصرہ تو آخر میں چند لائنوں پر مشتمل تھا۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی بھی اچھا لکھ رہے ہیں۔ سلیم رشید کی بات سے اتفاق ہے کہ اتحاد و اتفاق ایک ایسی قوت ہے جس سے بڑے سے بڑے مسائل سے نمٹا جا سکتا ہے۔ سدرہ بانو ناگوری! یہ مقام افسوس ہی ہے کہ ہم دنیاوی کاموں کے لیے تو ایک دوسرے کو لوٹتے اور دھوکا بھی دیتے تھے۔ اب حج جیسے مقدس فریضے میں بھی یہی کام کرنے لگے ہیں۔ لمحہ فکریہ تو یہ بھی ہے کہ جب دھوکے اور فراڈ کو ہم زندگی کا معمول بنالیں گے تو پھر بچنے کی صورت کیسے اور کیوں کر بنے گی۔ کلیم اللہ ایڈووکیٹ آپ نے صحیح لکھا، ہم تاریخ کو جتنا مرضی مسخ کرنے کی کوشش کریں وہ کسی نہ کسی صورت حقیقت سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ آپ قومی معاملات پر لکھیں اور قارئین تک سچ ضرور پہنچائیں۔ نزاہت انشال، علامہ اقبال کے حوالے سے آپ نے جو لکھا اس حوالے سے تو بس یہی کہیں گے کہ جو قومیں اپنے محسنوں کو فراموش کردیں، زوال ان سے زیادہ دور نہیں رہتا۔ اس زوال کا سامنا ان کی کئی نسلوں کو کرنا پڑتا ہے۔ عبدالجبار رومی گزشتہ ستمبر کے آخری ہفتے میں لاہور میں تھا۔ آپ سے ملنے کا سوچا، پھر یاد آیا کہ آپ تو قصور میں ہوتے ہیں۔ ندیم اقبال اردو سے محبت کرنے والے جہاں بھی ہوں وہ اردو کی ترقی و ترویج کے لیے ہمہ وقت کام کرتے ہیں کہ زندہ قوموں کا یہی شیوہ ہے۔ اسلامی تاریخ کی ایک عظیم ہستی مفسر اور مورخ علامہ ابن جوزی کی شخصیت پر ضیاء تسنیم بلگرامی نے بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ حقیقت تو

یہ ہے کہ ان ہستیوں کی زندگیاں تمام انسانوں کے لیے روشنی ہی روشنی ہیں۔ سندھ کے قابلِ فخر سپوتوں پر شکیل صدیقی کی تحقیق قابلِ ستائش تھی۔ راشدی برادران کی ادب کے لیے خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی زندگی کی کہانی پڑھی۔ ڈاکٹر صاحب نے بچوں کے لیے بہت لکھا۔ بچوں کے لیے لکھی ان کی کہانیاں اپنے بچپن میں خوب پڑھی تھیں۔ رضا علی عابدی اردو زبان کا ایک معتبر نام۔ جرنیلی سڑک پشاور سے کلکتہ کا بس پر سفر کیا گیا، سفر جہاں بیش قیمت معلومات فراہم کرتا ہے وہیں رضا علی عابدی نے اس خطے کی تہذیب وثقافت کو بھی بخوبی اجاگر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پرانے وقتوں کی سادگی، رواداری اور وضع داری کا آج کی نفسانفسی اور تیز رفتار زندگی سے بھی خوب موازنہ کیا ہے۔ جاوید شیخ کا شمار بھی پاکستان فلم انڈسٹری کے بڑے اور نامور اداکاروں میں ہوتا ہے۔ انور فرہاد نے ان کی زندگی کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کیا۔ خصوصاً والدہ کے انتقال کے دو دن بعد سیٹ پر آنا یقیناً ایک کرب ناک اور آزمائشی مرحلہ تھا۔ ''دھرتی کا بوجھ'' کے ساتھ مریم اے کاشف کی آمد اچھی ہے۔ دلچسپ باتوں سے مزین ندیم اقبال کا سفرنامہ بھی اچھا جا رہا ہے۔ انتظار مجاز کی تلقین شاہ یعنی اشفاق احمد پر مختصر تحریر اچھی لگی۔ اشفاق احمد جیسے میٹھی لوری جیسی باتیں کرنے والے صوفی اور درویش بھی معاشروں کو صدیوں بعد ملتے ہیں۔''

☆ منشی محمد عزیز میمن کا تبصرہ لندن وہاڑی سے ''اداریہ تازہ ترین حالات کا بہترین عکاس ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ موبائل اور انٹرنیٹ نے فاصلے ختم کر دیے ہیں لیکن اس سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ اس ایجاد نے اپنوں کے درمیان بہت فاصلے پیدا کر دیے ہیں۔ یک صفحی داستان ہاجرہ مسرور کا مختصر تعارف تھا۔ شہرِ خیال کی صدارت رضا احمد خان اعوان کے نام تھی۔ آپ نے تبصرہ کم کیا لیکن جن حالات کی طرف اشارہ کیا ہے شاید ہم سب مجموعی طور پر اس سے کبوتر کی طرح آنکھیں چراتے ہیں۔ آفتاب نصیر اشرفی، اعجاز ستار، رانا محمد شاہد، سدرہ بانو ناگوری اور سیف اللہ نے بھی بھرپور تبصرے کیے۔ نزاہت انشال، ٹرائی اکین۔ شہرِ خیال میں ندیم اقبال سری کی آمد بھلی لگی۔ احمد خان توحیدی، بشریٰ افضل کے علاوہ وحید ریاست بھٹی بھی کافی عرصہ سے غیر حاضر ہیں اور وحید صاحب کی معروفیات کے پیشِ نظر میں سرگزشت کا ''سالانہ تجزیہ'' مرتب کر رہا ہوں۔ انشا اللہ اپنے وقت مقررہ پر بشرط زندگی بھیج دوں گا۔ علامہ ابن جوزی پر محترمہ ضیا تسنیم بلگرامی نے خوب مضمون لکھا ہے۔ راشدی برادران کا ذکر بھی خوب تھا لیکن سب سے زیادہ مزہ تنقید نگار نے دیا۔ جمیل جالبی حیرت انگیز شخصیت کا نام ہے۔ شاعرِ انقلاب پڑھ کر مرحوم حبیب جالب یاد آگئے۔ آواز کا جادوگر، رضا علی عابدی پر سعید احمد خان نے بھرپور لکھا۔ انور فرہاد نے میرے پسندیدہ اداکار جاوید شیخ کے حالاتِ زندگی کا بڑی باریک بینی سے احاطہ کیا۔ دھرتی کا بوجھ اس ماہ کی بہترین کہانی تھی۔ ایمن کی بے بسی کا پڑھتے ہوئے آنکھیں بار بار بھیگ جاتی تھیں۔ خس کم جہاں پاک، ایمن اپنے ساتھ کئی درندوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا سبب بنی۔ اس کی عظمت کو سلام۔ شمشال سے ٹورنٹو کی یہ قسط تو گویا رومانٹک سی قسط تھی۔ نسرین اور اس کے بچے سے ملاقات اور پھر ان کے گھر قیام۔ واہ جی واہ! کیا بات ہے۔ تلقین شاہ میں بابا اشفاق احمد کی رحم دل فطرت کا ایک اور پہلو اجاگر کیا گیا تھا۔ ناسور کی اس قسط کا انجام سوالیہ نشان چھوڑ گیا ہے۔ سرورق کی کہانی ''رہائی'' پڑھ کر دل غموں کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گیا۔ اف خدایا! کتنی لاچار، مجبور اور بے بس تھی زیبا اور اس جیسی نہ جانے کتنی پاکستانی بیٹیوں کو قیمت چکانی پڑی ہے پاکستان بننے کی۔ اس بات کا اندازہ آج کی نسل کو شاید بلکہ یقیناً نہیں ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ آج کی نسل کو اس قیمت سے آگاہ کیا جائے تاکہ دوست اور دشمنوں میں تمیز پیدا ہو۔ آخری سچ بیانی میں ماں کی عظمت کو بیان کیا گیا ہے۔ ماں تیری عظمت کو سلام۔ کتنا خوش نصیب ہے محب جسے اتنی محبت کرنے والی ماں ملی ہے۔ سچ بیانیاں تو ساری پڑھ چکا ہوں لیکن جگہ کی کمی ہے، سو اللہ حافظ۔''

☆ خواجہ حنیف ادیب کا خط لاہور سے۔ ''اکتوبر کا شمارہ پیشِ نظر ہے۔ ابھی ابھی رسالہ پڑھ کر اٹھا ہوں۔ سرگزشت کے مطالعہ کے سلسلے میں میں سب سے پہلے ''شخصیات'' کے صفحات کو ترجیح دیتا ہوں۔ یک صفحی سرگزشت میں ممتاز افسانہ نگار ہاجرہ مسرور کا ذکر تھا۔ ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور دو بہنوں نے اپنے وقت میں دنیائے ادب بالخصوص افسانے کی صنف میں بڑا نام پیدا کیا۔ انہیں ادبی دنیا میں ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ ان سے متعلق ایک اچھی تحریر پڑھ کر پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ قلم و قرطاس کے ایسے دھنی لوگوں کا ذکر جب بھی آجائے وہ نیا ہی ہوتا ہے، پرانا نہیں ہوتا۔ حرف و لفظ کے کھلاڑی امر ہوئے وہ بھلا کسی کو کب بھولتے ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ تاریخ کا ایک حصہ ہوتے ہیں تو غلط نہیں۔ دیگر شخصیات کے ذکر میں اشفاق احمد جیسے عظیم دانشور، قلم کار، ڈراما نویس اور مصنف سے متعلق بھی پڑھنے کو ملا۔ اشفاق احمد میرے پسندیدہ دانشور، مصنفین اور ادیبوں میں سے وہ منتخب شخصیت ہیں جن کا میں مداح ہوں۔ یوں تو ان کی کئی کتابیں ہیں البتہ اس وقت میرے گھر کی الماری میں ''زاویہ (نمبر 3)'' پڑی ہے جسے میں کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ اس عظیم مصنف کی یہ تحریریں ہی کچھ ایسی ہیں کہ متعدد بار پڑھنے کے باوجود ہر دفعہ نئی معلوم ہوتی ہیں اور تالیفِ قلب کا باعث بنتی ہیں۔

پھر جمیل جالبی اور اقبال نزار کے متعلق پڑھا۔ یہ سب مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ محترمہ سلمیٰ اعوان نے ایک ایسے عظیم شاعر سے تعارف کرایا جس کے متعلق پہلے کبھی پڑھا نہ سنا تھا۔ محترمہ سلمیٰ اعوان کے قلم کا یہ اعجاز ہے کہ وہ ہر دفعہ ایک نئی طرز کی تحریر یا مضمون لے کر سامنے آتی ہیں جو اپنے اندر ایک نیا انداز رکھتا ہے۔ اب کچھ اپنے متعلق۔ محترم رضا اشرف اعوان صاحب نے میرے ستمبر کے شمارے میں شامل خط پر پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ ایک اور مراسلہ نگار نے بھی اپنے مراسلے میں میرے خط کا توصیفی انداز سے حوالہ دیا ہے۔ جس سے خط کی پسندیدگی کا اظہار ہوتا ہے۔ ان دونوں کا شکریہ۔ کسی بھی لکھنے والے کی تحریر کی پسندیدگی کا اظہار اس کے قلم کو مہمیز دیتا ہے اور اس کی قلمی کاوش کو مزید اجاگر کرتا اور صلاحیت بخشتا ہے۔ دونوں کی ذرہ نوازی ہے جس کے لیے مشکور ہوں۔ گزشتہ ماہ ایک تحریر ''غالبیات'' کے عنوان سے بھیجی تھی جس میں کچھ شگفتہ باتیں تھیں مگر مایوسی ہوئی کہ شائع نہیں ہوئی شاید آپ اسے آیندہ شمارے میں شائع کرنا چاہتے ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ آیندہ ماہ اسے جگہ دیں گے، بصورت دیگر شہرِ خیال کے صفحے پر جواب دیں۔ (غالبیات میں آپ نے مشہور واقعات کو یکجا کیا ہے لیکن وہ یکجا ہو نہیں پائی۔ تسلسل ٹوٹتا رہا ہے۔ اس لیے ان واقعات کو اقتباس بنا کر وقتاً فوقتاً شائع کیا جائے گا) اب ذکر ہے اس شمارہ کی ایک کہانی ''حماقت'' کا۔ یہ کہانی ہمارے معاشرے کے ایسے شخص کی عکاسی کرتی ہے جسے دولت کے بے جا ہوس کا نام دیا جاسکتا ہے۔ پیسے کی طلب اپنی جگہ جو زندگی کی سہولتوں اور آسائشوں اور ایک خود کفیل زندگی بسر کرنے کی سہولت مہیا کرتی ہے۔ وہاں دولت کی بے جا طلب کی تباہ کاریوں سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ہاں بیشتر لوگ خدا جانے پیسے کی طرف کیوں بے تحاشا دوڑتے پھرتے ہیں۔ باقی سب کچھ بھول کر ان لوگوں نے محض دولت کو ہی ''حلّ المشکلات'' سمجھ رکھا ہے۔ ایک بے وفا شے کی اتنی لگن نہ کیجیے کہ سب کچھ پیچھے رہ جائے۔ روشن پہلو کو مدِنظر رکھا جائے۔ اس شمارہ کی مزید کہانیاں ابھی پڑھی نہیں۔ جو کچھ اب تک پڑھ سکا اس کے متعلق ہی لکھ رہا ہوں گر قبول افتد زہے عزّ و شرف۔''

☆ راحت وفا راجپوت نے لاہور سے لکھا ہے۔ ''خیریت بہ عافیت نیک مطلوب۔ ایک نئی کہانی ''شریف آدمی'' ارسال کر رہی ہوں، اُمید ہے کہ آپ کو پسند آئے گی۔ زندہ کرداروں کی کہانی ہے۔ آپ کے لیے بہت دعا گو۔ (کہانی مل گئی ہے۔ اس پرچے سے فارغ ہو کر دیکھ لوں گا)''

☆ سیف اللہ کی آمد ملک وال سے۔ ''معراج رسول صاحب کی نثری کہانیوں کی طرح نظم کہانی بھی اپنے اندر بہت کچھ سمیٹے ہوئے ہے۔ نئی نسل کی مصروفیات، اندازِ زندگی، تبدیل شدہ معاشرتی اخلاقی قدریں وہیں پرانی نسل کی فکرمندی، بے بسی، حسرت اور نہ جانے کیا کیا ہے اس نظم کہانی میں۔ اللہ وارث ہے آنے والے وقت کا۔ یک صفحی کہانی مصنفہ ہاجرہ مسرور کے بارے میں اچھی ہے۔ علامہ ابن جوزی اچھی کوشش ہے۔ تاریخی معروف ہستی کی سوانح عمری پڑھنے کو مل رہی ہے۔ سلمیٰ اعوان صاحبہ کی تحریر شاعرِ انقلاب نزار قبانی پڑھی۔ اچھی لگی لیکن ایسے محسوس ہوتا ہے کہ سلمیٰ اعوان صاحبہ کا قلم غیر ملکی شخصیات پر زیادہ لکھتا ہے۔ صفحہ 58 پر لکھا ہے کہ ''جو ایسا کہتے ہیں وہ دغا باز ہیں جو سوچتے ہیں کہ انہوں نے عورت تخلیق کی اپنی پسلیوں میں ایک سے۔ عورت مرد کی پسلی سے نہیں نکلی کبھی نہیں۔'' لیکن اب تک تو یہی سنتے آئے ہیں کہ عورت پسلی سے ہی نکلی ہے۔ سلمیٰ صاحبہ جانتی ہوں گی اصلیت کیا ہے کیونکہ انہوں نے جو صحیح سمجھا وہ لکھ دیا۔ (دوبارہ پڑھیں، وہ سلمیٰ اعوان کے الفاظ نہیں نزار کی نظم ہے نزار کی شاعری معاشرے سے جنگ ہے اسی وجہ سے تو نزار کی شاعری پر پابندی لگی تھی)۔ شاہد لطیف صاحب کا جرگی پر لکھا دلچسپ لگا اور اگر یہ سب کچھ ایسے ہی ہے جیسے لکھا گیا ہے تو حیران کن حد تک عجائبات زمانہ ہے۔ سعید احمد خاں صاحب، آواز کا جادوگر رضا عابدی صاحب کو ڈھونڈ لائے ہیں۔ آج سے تیس چالیس سال پہلے لوگ ریڈیو سے منسلک تھے خاص طور پر بی بی سی سنتے تھے اور عابدی صاحب کے پروگرام کا انتظار کرتے تھے۔ سعید احمد صاحب نے عابدی صاحب کی زندگی کو احاطے میں لیے ہوئے کچھ اپنی طرف سے اور کچھ عابدی صاحب کی زبانی بتاتے ہوئے اچھی تحریر لکھی ہے اور آخر میں پتا چلا کہ وہ رہتے تو خاندان سمیت برطانیہ میں ہیں لیکن ان کے دل میں پاکستان کے شہر کوچے قریے گاؤں اور دیہات دھمال ڈالتے رہتے ہیں۔ ندیم اقبال صاحب کا سفرنامہ جواب صرف سفرنامہ نہیں رہا بلکہ ادب پارہ بنتا جا رہا ہے کو سرگزشت کی تحریروں میں پہلا نمبر کہنا پڑے گا کیونکہ سرجی شہباز کی نوک جھوک کینیڈا معاشرے کی اچھائیاں اور نئے لوگوں کی مشکلات بتانے کے ساتھ ساتھ اب ندیم اقبال صاحب کو نسرین کا سہارا لے کر قاری کو پوری طرح تحریر میں کھینچنے کا گر آگیا ہے۔ آنے والی قسطوں میں ہوسکتا ہے ندیم صاحب کی ڈائری سے اور نسرینیں بھی نکل آئیں۔ تلقین شاہ تحریر میں شروع کی دس لائنیں ہی اشفاق صاحب کو سمجھنے میں کافی ہیں۔ کیا بات ہے جی پہلے آپا بانو قدسیہ صاحبہ اور اب اشفاق صاحب۔ عبدالرب بھٹی صاحب کی ناسور آہستہ روی سے چل رہی ہے۔ کبھی تو تیزی آئے گی۔ مرد بحران ذکر ہے جاوید شیخ کے فلموں تک پہنچنے کے لیے کوشش، ناکامیاں، مقدر کی سختیاں پھر فلموں تک پہنچنا۔ پچاس سے

زائد فلاپ فلمیں لیکن ساتھ ہی نگار ایوارڈ، کوڈک گولڈ میڈل ایوارڈ، گریجویٹ فلم ایوارڈ، نیشنل فلم ایوارڈ، وحید مراد میموریل ایوارڈ۔ جاوید شیخ پر خصوصی ایڈیشن، پرائڈ آف پرفارمنس، جاوید شیخ کی کام سے لگن اور منزل تک پہنچنے کا عزم ظاہر ہوتا ہے۔ ساتھ ہی انور فرہاد صاحب کی کوشش اور علم بھی قابل ستائش ہے۔ اس کے ساتھ زینت منگلسی سے علیحدگی، سلمیٰ آغا کے پیچھے بھاگنا، نیلی سے قربت، شاء سے تعلقات غالباً فلمی لوگوں کی زندگیوں میں یہ چیز داخل ہے۔ ان باتوں کو یہ لوگ برا نہیں سمجھتے۔ یہ سب کچھ ان کی زندگی میں ہونا ضروری ہے اسی لیے تو معاشرہ ان کو اچھا نہیں سمجھتا۔ آخر میں عرض ہے کہ بیت بازی صفحے کے انچارج صاحب دو تین ماہ سے ناراض ہیں مجھ سے اور میری نالائقی دیکھیں کہ مجھے پتا بھی نہیں کہ کیوں۔ ان سے میری سفارش کر دیں پلیز۔ (آپ شعر تو اچھا منتخب کرتے ہیں لیکن کس شعر کا جواب ہے۔ یہ نہیں لکھتے)"

☆نزاہت افشاں، مہورہ، فتح جنگ سے رقم طراز ہیں۔ "اکتوبر کا شمارہ بہترین سرورق کے ساتھ 27 ستمبر کو ملا۔ اداریہ پڑھ کر مجھے مشہور انگریزی ناول نگار جیمز ہیڈلے چیز کا ناول "دنیا میری جیب میں" یاد آ گیا۔ کیونکہ آج جدید ٹیکنالوجی کی بدولت اسمارٹ فون کی وجہ سے دنیا ہماری جیب میں ہے لیکن وہ اخلاقی قدریں جو کہ ہمارے اسلاف کا خاصا تھیں وہ آج مٹ رہی ہیں۔ اقبال نے مدتوں پہلے یہ حقیقت بیان کر دی تھی کہ "ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت، احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات" ہاجرہ مسرور کا ذکر پڑھ کر اچھا لگا۔ ان کے شوہر پروفیسر احمد علی بھی نامور لکھاری تھے۔ ضیا تسنیم بلگرامی نے اس بار علامہ ابن جوزی کی سوانح حیات بیان کرنے میں بہت ہی سخن فہمی اور نفاست سے کام لیا۔ علامہ ابن جوزی نے حصول علم کے لیے جو مشقت برداشت کی اس سے ان کی علم سے سچی لگن کا پتا چلتا ہے۔ راشدی برادران کا تذکرہ بھی دل کو بھایا۔ شکیل صدیقی سے گزارش ہے کہ اسی طرح خیری برادران، علی برادران اور بخاری برادران پر بھی لکھیں۔ شکیل ادریس اس ماہ کی سب سے بہترین اور بھرپور تحریر لائے اور وہ بھی ڈاکٹر جمیل جالبی کے بارے میں۔ جمیل جالبی، سید جالب دہلوی کے قریبی رشتے دار تھے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی، جوش ملیح آبادی جیسے منہ پھٹ آدمی نے بھی اپنے سوانح حیات "یادوں کی برات" میں سید جالب دہلوی کا ذکر بہت محبت اور عقیدت سے کیا۔ ان کی وفات پر سید سلیمان ندوی نے مختصر مگر بھرپور مضمون لکھا تھا جو اب ان کی کتاب "یادِ رفتگاں" میں شامل ہے۔ سلمیٰ اعوان اس بار عرب شاعر نزار قبانی کے ساتھ حاضر تھیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اہل اقتدار ہمیشہ اہل علم اور اہل قلم سے خوفزدہ اور بیزار رہے ہیں۔ رضا علی عابدی کا ذکر بھی موثر انداز میں لکھا گیا، پڑھ کر خوشی ہوئی۔ تنقین شاہ، اشفاق احمد عرف بابا جی پر مختصر تحریر تھی مگر منفرد تھی سو اچھی لگی۔ شمشال سے ٹورنٹو بہترین موڑ پر ہے۔ ایرانی نسرین کی کشتی کے ناخدا بننے سے ندیم صاحب نے معذرت کر لی۔ یہ اچھا ہوا۔ ناسور میں اب مار دھاڑ بڑھتی جا رہی ہے۔ "رہائی" اس ماہ کی بہترین کہانی تھی، فرشتہ دوسرے نمبر پر رہی اور آج کی سیاست کو عیاں کرتی ایک سبق آموز کہانی تھی۔ حماقت میں سائرہ کو اس کے لالچ کی سزا ملی اور اس کا فیصلہ اس کے اپنے گلے کا پھندا بن گیا۔ تیزاب بھی سبق آموز کہانی تھی۔ رافعہ نے سکندر نامی درندے کے ساتھ بالکل ٹھیک کیا۔ شیر کی خالہ اور دل مشکل بھی بہترین کہانیاں تھیں۔ شہرِ خیال کی صدارت رضا احمد اعوان بھکر کے نام تھی۔ طویل مگر دلچسپ تبصرہ تھا۔ آفتاب نصیر اشرفی، رانا محمد شاہد، عبدالجبار رومی اور میری ایلڈر سسٹر سدرہ بانو ناگوری سب بھرپور تبصروں کے ساتھ حاضر تھے۔ بہاولپور کے کلیم اللہ ایڈووکیٹ نے جس حقیقت کو بیان کیا اس پر وہ خراج تحسین کے مستحق ہیں، اللہ کرے زور قلم زیادہ ہو۔ باجی بشریٰ افضل اور ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری اللہ جانے میری یہ دونوں بہنیں کدھر گم ہیں۔ اللہ پاک انہیں قلم اٹھانے کی توفیق دے۔ (ادارہ کسی بھی قلم کار کا فون نمبر کسی دوسرے کو نہیں دیتا اس لیے معذرت خواہ ہیں)"

☆انور سلطان کی کراچی سے آمد "رضا احمد اعوان اپنے بے لاگ تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر فائز تھے۔ ممتاز احمد شاہد خوش نصیب ٹھہرے کہ ان کی ساتھیوں سے کی گئی علیک سلیک ہم تک پہنچی۔ سدرہ بانو اور آفتاب احمد نصیر اشرفی کے تبصرے بہت پسند آئے جبکہ نزہت افشاں نے سچ بیانیوں کو اچھی طرح پرکھا۔ اعجاز حسین سیٹھار کا خط دوسروں کی نسبت زیادہ تفصیلی ہے روبینہ نفیس اور قرۃ العین غیر حاضر ہیں۔ یہ سفرنامے نہیں پڑھتے اس ضمن میں مشورہ ہے کہ بھی ندیم اقبال کو پڑھ کر دیکھیں۔ سلیم اللہ کے خط کی زبان کافی تیز ہے۔ نسیم خان آپ کی بے جا تنقید اچھی نہیں لگی۔ یوٹیوب گھٹیا یا بڑھیا نہیں، استعمال پر منحصر ہے۔ قیصر خان خوش آمدید آپ کا پرمسرت خط سب پر بازی لے گیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہمت نہیں ہارتے۔ شکیل ادریس نے لمبے وقفہ کے بعد شاندار تحقیقی مضمون کا تحفہ دیا۔ دس صفحات کے اس مضمون نے طویل زندگی کا خوبی سے احاطہ کیا کہ۔ جرگی، کے ساتھ شاہد لطیف نے بھی سکوت توڑا۔ مضمون غالباً جلدی میں لکھا تھا لیکن پراسرار تحاریر کے شیدائیوں کے لیے اچھا تحفہ ہے۔ شکیل صدیقی کی پچھلی تحریر دل کو نہیں لگی تھی لیکن اب کی بار صاحب نے کمال کر دیا۔ باتوں ہی باتوں میں حالاتِ زندگی اور جہدِ مسلسل بیان کر گئے۔ آج جب بائیک پر روزانہ پچاس کلومیٹر کا سفر

طے کرتا ہوں تو دل سے دعا نکلتی ہے کہ کاش کراچی میں ٹرانسپورٹ کا مسئلہ حل ہو جائے۔ روشنیاں واپس آجائیں۔ یہ مضمون امی کو بھی بہت پسند آیا۔ انہوں نے مجھ سے بھی پہلے پڑھ لیا تھا۔ شکیل ادریس نے مخصوص انداز میں جمیل جالبی کے فن کا حق ادا کیا۔ ضیا محی الدین کی شخصیت پرت در پرت پیاز کی مانند ہے پرتیں کھلتی گئیں لیکن گری برآمد نہ ہوئی۔ کہہ نہیں سکتے ضیا محی الدین اصل میں ہیں کیا۔ کاشف زبیر کی تحریر سب پر بازی نہ لے جائے یہ ہو نہیں سکتا۔ تمکین شاہ مختصر اور جامع تحریر ہے۔ بلاوجہ کی تفصیلات سے گریز اس صفحات کو نہایت پراثر بنا دیا۔ انور فرہاد کی قلم نگر پسند آئی کچھ ادا کارایسے ہیں جن کی کثرت سے تکرار ہو رہی ہے۔"

☆ ندیم افضل کا جہلم سے شکوہ "کسی سے صاحب نے پوچھا کہ کہاں کھو گئے تو واقعہ یہ ہے کہ ہمارا تیسرا تبصرہ بھی محکمہ ڈاک کی کارکردگی کی نذر ہو گیا۔ بڑے ارمان کے ساتھ سرگزشت دیکھا تھا کہ لازماً ہو گا لیکن افسوس۔ یہ تبصرہ بھی امید اور ناامیدی میں لکھ رہے ہیں کہ شائع ہو جائے۔ رضا احمد اعوان اور آفتاب احمد نصیر اشرفی صاحب سے شروع میں ہی ملاقات ہوگئی تبصرہ پسند آیا۔ سدرہ بانو ناگوری صاحب کیا حال ہے آپ کا اور آپ کے بلکہ ہمارے شہر قائد کا کچھ تبدیلی کے آثار نظر آئے یا نہیں؟ نصرت احمد بہت مبارکباد۔ اللہ آپ کی حاضری کو شرف قبولیت بخشے، آمین۔ ڈاکٹر قرۃ العین صاحبہ عمر شریف کے بارے میں تو کئی بار ذکر ہوا ہے اس لیے انکشاف تو مت کہیے۔ ناصر حسین کا مکتوب بھی اپنا رنگ جمانے میں کامیاب ہوا۔ باقی ساتھیوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ باقی اس کے علاوہ قلم نگری ہمیشہ کی طرح خوبصورت رہی۔ حماقت میں بیوقونی پر ماتم کرنا چاہیے اور کچھ نہیں۔ رہائی اور کی جاناں پڑھ کر احساس ہوا عرصہ دراز کے بعد اتنے خوبصورت موضوعات کے ساتھ سرگزشت حاضر ہوا۔ اور سب سے بڑھ کر تا کہانی موت نمبر شائع کرنے کا اعلان کر دیا۔ یہ تو ہمارے لیے واقعی حیران کن بات تھی۔ بہرحال شدت سے اس گھڑی کا انتظار رہے گا۔ برائے مہربانی زیادہ انتظار مت کروایئے گا۔"

☆ علی عباس لاہور سے لکھتے ہیں "واہ بھئی واہ، کمال ہو گیا، ہمارا پیارا سرگزشت بروقت ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ شہر خیال کی محفل عروج پر ہے کئی نئے دوست محفل میں شامل ہو رہے ہیں۔ دلچسپی بڑھنے کے ساتھ نئے انکشافات ہو رہے ہیں۔ بشریٰ افضل نے عمرہ کی سعادت حاصل ہونے پر مبارک باد دی ہے۔ "خاص نمبر" کا اعلان پڑھ کر اندازے لگا رہے ہیں کہ اس بند پٹاری سے ہمارے ذوق کی تسکین کے لیے کیا کچھ نکلتا ہے، ابھی چند مہینے انتظار کرنا ہو گا۔ رضا علی عابدی، غیر معمولی شخصیت ہیں، انہوں نے ناممکن کو بھی ممکن بنا لیا ہے جرنیلی سڑک گواہ ہے۔ دعا کیجیے کہ اللہ ہمیں بھی ہمت اور بیماری سے لڑنے کا جذبہ عطا اور ہم بھی کچھ لکھ سکیں۔ مختلف کرداروں اور قصے کہانیوں نے معلومات میں اضافہ کیا۔ سچ بیانیوں میں "دماغی توازن" زیادہ دھوم دھڑکے والی کہانی نہیں ہے۔ جب کسی کام کا وقت ہوتا ہے تب لوگ اپنی ہٹ دھرمی سے معاملہ بگاڑ دیتے ہیں اور ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن سے جان نہیں چھڑائی جا سکتی ہے۔ اپنے مزاج کی ضد اور انفرادی فیصلوں سے دوسرے کی اذیت کا سامان کرتے ہیں۔ جب ہاتھ سے پنچھی اڑ جاتا ہے تب افسوس سے سر پیٹنے کے سوا چارہ نہیں ہوتا لیکن حالات میں تبدیلی نہیں آتی۔ "شیر کی خالہ" کی رقیہ ایثار میں بے مثال ہیں۔ وہ سب کچھ کھو دینے کے باوجود بھی پرعزم اور مطمئن ہیں لیکن میرا یقین ہے ان کو کبھی چین نصیب نہ ہو گا۔ "تریاق" میں مرکزی اپنے وزن سے زیادہ اپنے دکھوں کا بھار اٹھائے پھرتا ہے جب جذبوں کو دولت کے ترازو پر تولا جائے تو محبت جرم بن جاتی ہے۔ "حماقت" اپنے لالچی مزاج سے مجبور تھی لیکن جب وہ اپنی خواہشوں کی قبر تلے دب گئی ہے تو اس کو یہ قصہ بھلا کر اپنے اعلیٰ ظرف ہونے کا ثبوت دینا چاہیے تھا۔"

☆ طاہر مجاہد کا خلوص نامہ میانوال رانجھہ سے "ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی بجائے تاریخی اور تصوف کی نامور شخصیت ضیا تسنیم کی کہانی شامل اشاعت تھی جس میں انہوں نے علامہ ابن جوزی کی شخصیت پر ان کے تعلیمی خدمات کے حوالے سے بڑی تفصیل بیان کی ہے جس کی تعریف نہ کرنا بھی رائٹر کی حق تلفی میں شمار ہوتا ہے۔ ویسے تو پورا ڈائجسٹ ہی ماشاءاللہ بہت خوبصورت تھا مگر مجھے سب سے اچھی کہانی جو میرے دل کو چھو گئی ہے: وہ تھی "کی جاناں میں" کا عنوان شاید بلھے شاہ کے کلام سے لیا گیا۔ "قلم نگر" میں اس مرتبہ جاوید شیخ سے متعلق خوبصورت تحریر سامنے آئی۔

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط:

راحیلہ شعیب، ملتان۔ سعدیہ سرفراز، کراچی۔ نعمان اشرف، ظہیر احمد تبسم، حیدرآباد۔ ثنا اقبال، لیہ۔ مسلم علی خان، پشاور۔ ارباز بزمی، فیصل آباد۔ راجا رحیم، کوئٹہ۔ محمد اقبال، سرگودھا۔ فہیم الدین، پشاور۔ راحیل اسلم بٹ، میرپور آزاد کشمیر۔ عنایت علی زیدی، فیصل آباد۔

سخن ساز

ڈاکٹر ساجد امجد

حالات کا موافق نہ ہونا اور زمانے کی بے ثباتی بھی اسے آگے بڑھنے سے روک نہ سکی۔ وہ ادب کی دنیا میں اپنا مقام تعمیر کرتا ہوا ترقی کے مدارج طے کرتا چلا گیا۔ وہ متلاشی تھا ان ستاروں کا جو ادب کی دنیا میں ضیا پاشی کرسکے جبکہ اسے علم تھا کہ اس جھولی میں سو سو چھید ہیں۔ یہ گروہ بندیاں ادب کو دیمک بن کر چاٹ رہی ہیں پھر بھی وہ خدمتِ ادب میں کوشاں رہا۔ اس کی محنت اس کی تحریر میں، اشعار میں بول رہی تھیں مگر اسے وہ مقام نہ مل سکا جس کا وہ متلاشی تھا۔

اردو ادب کے ایک اہم شاعر کا زندگی نامہ

عراق سے آنے والا جہاز منزلیں طے کرتا ہوا بمبئی کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ مسافروں کے ہجوم نے خشکی پر قدم رکھنا شروع کیا۔ اسے کوئی جلدی نہیں تھی لیکن پھر بھی اترنا تو تھا۔ وہ کچھ دیر جہاز سے باہر جانے والوں کا تماشا دیکھتا رہا پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع کیا۔ وہ جیسے ہی جہاز سے باہر آیا ایک آواز نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچی۔ کوئی اس کا نام لے کر اسے پکار رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس اجنبی ملک میں اس کا شناسا کون نکل آیا، اس نے ایک مرتبہ پیچھے پلٹ کر دیکھا بھی تھا لیکن اسے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ پھر یہ آواز قریب سے آئی۔ اس آواز نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''اگر میں پہچاننے میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو آپ کمال الدین ہی ہیں ناں۔''

''ہاں میں کمال الدین ہی ہوں۔ آپ مجھے کیسے جانتے ہیں۔ میں نے تو آپ کو نہیں پہچانا۔''

''آپ بغداد ہی سے تشریف لا رہے ہیں ناں۔''

''ہاں آتو وہیں سے رہا ہوں۔''

''پھر تو آپ وہی ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''میرا نام شریف الدین ہے۔ میں بغداد میں آپ کے کارخانے میں کام کرتا تھا۔ پھر میں بمبئی آگیا۔ اب میں یہیں ہوں۔''

''معاف کرنا بھائی۔ میں نے تمہیں پہچانا نہیں تھا اب پہچان لیا۔''

''کمال الدین صاحب، یہ سوال پھر بھی اپنی جگہ رہ گیا کہ بمبئی آپ کس سلسلے میں آئے ہیں۔''

''ایک تاجر تجارت ہی کی غرض سے آسکتا ہے۔''

''آپ کا کاروبار تو بغداد میں خوب چمک رہا تھا۔''

''بس کچھ حالات ایسے ہو گئے تھے کہ مجھے بغداد چھوڑنا پڑا۔ مال و متاع سمیت کر یہاں آگیا ہوں۔''

''کیا بالکل۔''
''یہی سمجھو اگر کاروبار جم گیا تو یہیں کا ہو جاؤں گا۔''
''کاروبار کیونکر نہ جمے گا۔ یہ بمبئی ہے۔ ہندوستان کا سب سے بڑا تجارتی شہر۔ بشرطیکہ آپ کی تجارتی حلقوں میں جان پہچان ہو۔''
''میں تو اللہ کے بھروسے پر یہاں آیا ہوں۔ جو کچھ کروں گا اپنے زور بازو پر کروں گا۔ یہاں کے دو تین لوگوں سے بغداد میں ملاقات ہوئی تھی۔ انہیں بھی تلاش کر لوں گا۔''
''ابھی کہاں قیام کریں گے؟''
''کسی بھی سرائے میں ٹھہر جاؤں گا۔''
''سرائے میں کیوں، میرا غریب خانہ حاضر ہے۔''
''نہیں بھائی میرے لیے آپ کیوں تکلیف میں پڑتے ہیں۔''
''تکلیف کیسی انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔''
سید کمال الدین نہیں چاہتے تھے کہ اس کے گھر جائیں لیکن وہ شخص پیچھے ہی پڑ گیا۔ قلی کو بلا کر سامان بھی اٹھوا لیا۔ سواری بھی آ گئی۔
''شریف الدین تم یہاں کیا کرتے ہو۔ کوئی کاروبار ہے یا نوکری۔''
''کاروبار ہی سمجھو۔ جہاز پر سامان لادنے والے قلیوں کا ٹھیکے دار ہوں۔''
''یہ تو بہت اچھا ہے۔'' سید کمال الدین نے کہا اور خاموش ہو گئے۔ وہ شاید آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہے تھے۔
بمبئی کی چوڑی سڑکوں اور بلند عمارتوں سے گزرنے کے بعد ان کی سواری ایک اوسط درجے کے مکان کے سامنے رک گئی۔ یہی شریف الدین کا مکان تھا جہاں وہ اپنی والدہ اور دو بہنوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس نے گھر میں پردہ کرنے کو کہا اور کمال الدین کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔
ابھی کچھ دیر گزری تھی کہ ایک ادھیڑ عمر خاتون کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں مشروب کے گلاس تھے۔ کمال الدین انہیں دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا۔
''یہ میری والدہ ہیں۔ پردہ کرتی ہیں مگر آپ تو ان کے بیٹوں کی طرح ہیں۔''
''اس میں کیا شک ہے۔ کبھی اچھا وقت آیا تو بیٹا بن کر بھی دکھا دوں گا۔''

''اچھے برے وقت سب اللہ کے بنائے ہوئے ہیں۔ تم ہمیشہ میرے بیٹے رہو گے۔''
کمال الدین مطمئن ہو گئے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس اجنبی ملک اجنبی شہر میں رہنے کا ٹھکانا مل گیا، اچھے لوگ مل گئے۔ لیکن وہ کسی پر بوجھ بننے کے لیے نہیں آئے تھے۔ تجارت کا تجربہ تھا۔ اچھی خاصی رقم بھی ساتھ لائے تھے۔ چھوٹا موٹا کاروبار تو کر ہی سکتے تھے۔ دوسرے ہی دن سڑکیں ناپنے، حالات دیکھنے نکل کھڑے ہوئے۔ شروع میں کئی چھوٹے موٹے کاروبار کیے۔ پھر کپاس کا کارخانہ کھول لیا۔ اس کارخانے میں خدا نے برکت دی۔ شریف الدین کے گھر کو خیر باد کہہ کر اپنے لیے الگ مکان خرید لیا۔ ایک شریف گھرانے میں شادی بھی کر لی۔ خدا نے ایک بیٹا بھی دیا جس کا نام انہوں نے سید جمال الدین رکھا۔
وقت کا پہیا گردش کرتا رہا۔ سید جمال الدین جوان ہو کر باپ کا ہاتھ بٹانے لگا۔ کاروبار ترقی پر تھا۔ دولت کی ریل پیل تھی۔ سید کمال الدین کے بڑے بھائی بھی بمبئی آ گئے۔
سید جمال الدین کی اپنی تایا سے نہیں بنتی تھی۔ یہی تنازع اسے باپ کے سامنے لے آیا۔ باپ بیٹے آمنے سامنے آ گئے۔ بات گھر کی تھی کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ تنازع کیا ہے۔ سید جمال الدین کی سعادت مندی نے بھی جھگڑے کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا اور ایک دن خاموشی سے بمبئی چھوڑ دیا اور ہندوستان کے دوسرے بڑے شہر دہلی آ گئے۔ جوانی تھی، حوصلہ تھا۔ اس شہر میں روزگار کے ذرائع بہت تھے۔ پہلے ریلوے میں ڈرائیوری کی۔ پھر ٹھیکے داری کو روزگار بنایا۔ زندگی آرام سے گزرنے لگی۔ باپ سے تعلقات بالکل منقطع نہیں ہوئے تھے لیکن دوبارہ بمبئی جانا مناسب نہ سمجھا۔ دہلی ہی کو وطن بنا کر بیٹھ گئے۔ اس شہر میں انہوں نے نہایت معزز خاندان کے ایک فرد مولوی حفیظ اللہ کی صاحب زادی سے شادی کر لی۔ مولوی حفیظ اللہ کے مرید پنجاب تک پھیلے ہوئے تھے۔
سید جمال الدین صاحب ان دنوں گلی شاہ تارا اجمیری گیٹ دہلی میں رہائش پذیر تھے۔ اسی یادگار مکان میں 17 جنوری 1906ء کی صبح ان کے گھر میں فرزند دلپذیر نے جنم لیا۔ اس بچے کا نام انہوں نے سید جلال الدین رکھا۔ یہی بچہ آگے چل کر حیدر دہلوی کہلایا۔ شاعری کی دنیا میں ایسا باکمال ہوا کہ خیام الہند کے لقب سے مشہور ہوا۔

یہ وہ دور تھا جب برصغیر پاک و ہند میں انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کی تحریکیں جنم لے چکی تھیں۔ اسی سال 1906ء میں سر آغا خان کی قیادت میں ایک وفد نے ہندوستان کے وائسرائے سے ملاقات کی اور مسلمانوں کے مطالبات پیش کیے۔ اس کے چند دنوں بعد ہی ڈھاکا میں علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس نواب وقار الملک کی صدارت میں منعقد ہوا۔ وہیں مسلمانوں کے لیے ایک الگ سیاسی جماعت بنانے کے لیے تحریک پیش کی گئی اور اس کے نتیجے میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ دلی کی تہذیب ان دنوں ایک نئی کروٹ لے رہی تھی۔ سیاسی و سماجی تبدیلیوں نے لوگوں کے اذہان وقلوب میں نیا شعور اجاگر کیا۔

دہلی کے شب و روز میں اگرچہ سیاسی اور تہذیبی ماحول میں قدرے تبدیلی آرہی تھی مگر علمی وادبی ماحول میں کچھ زیادہ فرق نہ آیا تھا۔ راتوں کو علمی وادبی محافل جمتی تھیں شاعری کی محفلیں سائل دہلوی، بیخود دہلوی اور ساحر دہلوی کے دم قدم سے آباد تھیں۔ ان اساتذہ سخن کے سیکڑوں شاگرد تھے جو ان کی محفلوں کی رونقیں برقرار رکھے ہوئے تھے۔ شرفا اپنے بچوں میں علم وادب کا لگاؤ پیدا کرنے کے لیے باقاعدہ کتابوں کے ساتھ ساتھ ان کے ہمراہ علمی، ادبی مجالس اور مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔

یہ وہ ماحول تھا جس میں اس بچے نے آنکھ کھولی۔ ایک مہذب اور پڑھے لکھے گھر میں پرورش ہورہی تھی۔ والدہ ایک صاحب شریعت بزرگ مولوی حفیظ اللہ کی صاحبزادی تھیں لہٰذا لوریوں میں دینی تعلیم ہوتی رہی۔ پڑھنے کی عمر کو پہنچا تو ابتدائی تعلیم گھر پر ہوتی رہی۔ پھر زمانے کے دستور کے مطابق مولوی کرامت سے عربی اور مرزا حیرت دہلوی سے فارسی کی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

تعلیم کا یہ سلسلہ مزید آگے بڑھتا لیکن ایک روز ایسی آندھی چلی کہ گھر کا سب سے روشن چراغ بجھ گیا۔ گھر کا اجالا اندھیرا اگلنے لگا۔ سید کمال الدین تین بیٹیوں اور اکلوتے بیٹے سید جلال الدین (حیدر دہلوی) کو ماں کے سہارے پر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے۔

سید کمال الدین کی موت کا صدمہ کم نہیں ہوا تھا کہ تایا اور دادی بمبئی سے دہلی پہنچ گئیں۔ سید کمال الدین کی بیوہ کی ڈھارس بندھی کہ ان کے آنسو پونچھنے کے لیے سسرال کی طرف سے بھی کوئی آیا۔ وہ ساس کے کندھے پر سر رکھ کر بڑی دیر تک روتی رہیں۔ تایا نے بھی بہت کچھ تسلی دی۔ چند روز سید کمال الدین کی باتیں ہوتی رہیں۔ یہ ذکر بھی ہوتا رہا کہ اب ان یتیم بچوں کا کیا ہوگا۔ پھر تایا نے یہ پیشکش بہو کے سامنے رکھ دی۔

"اب آمدنی کا کوئی ذریعہ تو رہا نہیں۔ ان بچوں کی تعلیم و پرورش تمہارے لیے مشکل ہوجائے گی۔ بیٹیوں کی شادی کے دن بھی پلک جھپکتے آجائیں گے۔"

"بھائی صاحب سب اللہ کردے گا۔ میں محنت مزدوری کرکے اپنے بچوں کو پال لوں گی۔"

"لو بھئی، تمہیں ہمارے ہوتے محنت مزدوری کرنے کی کیا ضرورت۔ ان بچوں کو ہم پالیں گے۔ ہم انہیں بمبئی لے جاتے ہیں۔ تم سے ملوانے کے لیے لاتے رہیں گے۔"

"بھائی صاحب، آپ ایک ماں سے اس کے بچوں کو چھین رہے ہیں۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ہم تو ان بچوں کے مستقبل کے لیے کہہ رہے ہیں۔"

"مجھ سے زیادہ ان کے مستقبل کی فکر کون کرے گا؟"

"کیوں کیا ہم غیر ہیں؟"

"یہ میں نے کب کہا۔"

جب والدہ کسی طرح نہ مانیں تو انہوں نے یہ کوشش کی کہ کچھ رقم دے کر بچے حاصل کرلیے جائیں۔ دادا کا انتقال ہوچکا تھا۔ وہ چاہتے تھے ترکے کی رقم جو تقریباً چار لاکھ روپے بنتی تھی والدہ کو دے کر بچے حاصل کرلیں لیکن والدہ نے اتنی بڑی رقم ٹھکرا کر بچے دینے سے انکار کردیا۔

دادی اور تایا نے یہ صاف انکار سن کر سامان باندھ لیا۔

حیدر دہلوی کی والدہ نے وہ تھوڑی سی رقم جو شوہر نے چھوڑی تھی ایک تکیے میں سی کر محفوظ کردی کہ کسی آڑے وقت کام آئے گی اور خود سلائی پر کپڑے سی کر گھر کا خرچ چلانے لگیں۔

اس طرح گھر کا چولہا جلتا رہا لیکن حیدر دہلوی کی تعلیم پر برا اثر پڑا۔

☆......☆

دلی میں ایک بڑا طبقہ کارخانوں کے مزدوروں کا تھا۔ لوگ اعزازاً انہیں کرخندار کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ کارخانے کیا گھریلو صنعتیں تھیں۔ مختلف قسم کی دستکاریاں تھیں۔ یہی وہ لوگ تھے جو دن بھر کی مزدوری کے بعد شام کے وقت

جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جمع ہوتے تھے۔ یہاں ہر قسم کے لوگ ٹولیوں میں نظر آتے تھے۔ شاعر بھی جمع ہوتے تھے۔ شاعری کے دور چلتے تھے۔ ایک دوسرے کو شعر سنائے جاتے تھے۔ داد کے ڈونگرے برستے تھے۔ واہ واہ اور سبحان اللہ کی آوازیں گونجتی تھیں۔ حیدر دہلوی کا گھر جامع مسجد کے قریب تھا۔ وہ بھی شام کے وقت گھر سے نکلتا اور ان تفریحات میں شریک ہو جاتا۔ کہیں تقریریں ہو رہی ہیں، کوئی مسدس حالی اونچی آواز میں گا رہا ہے۔ کسی نے .... میر حسن کی مثنوی چھیڑ رکھی ہے۔

یہ وہ ماحول تھا جس میں اس کا بچپن ٹہل رہا تھا۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے شاعر اس کی مرکز نگاہ تھے۔ وہ جب ان شاعروں میں بیٹھتا، ان کے شعر سنتا تو اس کے دل میں ایک شور سا برپا ہو جاتا۔ کبھی کبھی تو یہ شور اسے اتنا پریشان کرتا کہ وہ گھبرا کر وہاں سے اٹھ جاتا۔ وہ اس شور کو کوئی نام بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اسی رات اس نے خواب میں خود کو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھا۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ وہ روز ہی وہاں جاتا تھا۔ نئی بات تو یہ تھی کہ اس کے چاروں طرف شاعر جمع تھے اور وہ انہیں اپنے شعر سنا رہا تھا۔ اس نے کبھی ایک شعر نہیں کہا تھا لیکن خواب میں وہ شعر سنا رہا تھا۔ بڑے بڑے شاعر اس کے شعروں کی تعریف کر رہے تھے۔ جب وہ شعر سنا چکا تو کسی شاعر نے اس سے کہا۔ تم تو بہت اچھے شعر کہتے ہو۔ ساحر دہلوی کے مکان پر منعقد ہونے والے ماہانہ مشاعروں میں کیوں شریک نہیں ہوتے اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے دل میں اٹھنے والا شور ختم گیا تھا جیسے دل کی بھڑاس نکل گئی ہو لیکن اب ایک دوسری حیرت اس کے سامنے تھی۔ مجھے وہ شعر کیسے یاد آ گئے تھے جو میں سنا رہا تھا۔ پھر وہ ہنس دیا، ارے خواب میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اس نے ذہن پر زور ڈالا۔ اسے ایک شعر بھی یاد نہیں آیا جو وہ کاپی پر اتار لیتا۔ اس نے ایک بھرپور انگڑائی لی اور بستر سے اتر گیا۔ باہر صحن میں سلائی مشین چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس کا مطلب ہے اماں اٹھ گئی ہیں۔ وہ صحن سے ملحق دالان میں آیا۔ اس کی والدہ ہی نہیں اس کی دو بہنیں بھی کام میں مصروف تھیں۔ والدہ کپڑے سی رہی تھیں اور دونوں بہنیں دوپٹوں پر گوٹا لگا رہی تھیں۔

''اٹھ گئے تم، میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ میں تمہیں چائے پراٹھا دے دوں۔ چائے پی لو تو یہ کپڑے فردوس خالہ کے گھر دے آؤ۔ وہ پیسے دیں گی وہ لے آنا۔''

ناشتا کرنے کے بعد اس نے سلے ہوئے کپڑے اٹھائے اور گھر سے نکل گیا۔ اس نے جان بوجھ کر ایک لمبا چکر کاٹا اور جامع مسجد کے سامنے پہنچ گیا۔ اس وقت سیڑھیوں پر کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ وہ یہاں کھڑے ہو کر دیر تک رات کے خواب پر غور کرتا رہا اور پھر فردوس خالہ کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں کچھ دیر بیٹھا۔ خالہ سے باتیں کیں اور پھر گھر کے لیے نکل پڑا۔

وہ عجیب سی الجھن اور سرخوشی لیے گھر لوٹا تھا۔

شام ہوئی تو پھر حسب معمول جامع مسجد کی طرف چلا گیا۔ ابھی پوری طرح محفلیں جمی نہیں تھیں۔ شاید وہ گھبراہٹ میں جلدی گھر سے نکل آیا تھا۔ یہاں پہنچ کر اسے ساحر دہلوی کا نام یاد آیا جو اس نے خواب میں سنا تھا۔ شکل تو دیکھی نہیں انہیں پہچانوں گا کیسے۔ وہ بھی سوچتا ہوا ایڈورڈ پارک کی طرف چلا گیا جو جامع مسجد کے سامنے ہی تھا۔ یہاں بھی بے فکروں کی محفلیں جمتی تھیں۔ یہاں اسے اس کے محلے کا ایک دوست مل گیا۔

''تم کیا یہاں روز آتے ہو۔'' حیدر نے اس سے پوچھا۔

''ہاں یہاں اچھے اچھے شاعر آتے ہیں۔ ان کے شعر سنتا ہوں۔''

''پھر تو تم شاعروں کو جانتے بھی ہو گے۔''

''جو یہاں آتے ہیں انہیں تو جانتا ہی ہوں۔''

''ساحر دہلوی نام کے شاعر کو جانتے ہو۔''

''انہیں کون نہیں جانتا۔''

''کیا وہ یہاں آتے ہیں۔''

''وہ استاد شاعر ہیں۔ وہ یہاں تھوڑی آتے ہیں۔''

''پھر تم انہیں کیسے جانتے ہو۔''

''ان کے گھر مشاعرہ ہوتا ہے۔ میں وہاں جاتا ہوں تم بھی وہاں جایا کرو۔''

''اب مشاعرہ ہو تو مجھے بتانا۔''

''اس میں بتانا کیا ہے۔ ان کے گھر تو کل ہی مشاعرہ ہے۔ میرے ساتھ چلنا۔ ساحر دہلوی تمہیں نظر آ جائیں گے۔''

اس نے یہ رات اور دوسرا دن بے چینی کے بستر پر گزارا۔ دوسرے دن کی رات آئی تو وہ ماں کو بتائے بغیر گھر سے نکل گیا اور اپنے دوست کے گھر پہنچ گیا۔ دوست بھی تیار ہی بیٹھا تھا۔ دونوں مل کر پنڈت امر ناتھ ساحر دہلوی کے گھر

پہنچے۔ یہاں پہنچ کر تو اس کی آنکھیں ہی کھل گئیں۔ اس نے یہاں نہ صرف ساحر دہلوی کو دیکھا بلکہ بیخود دہلوی اور سائل دہلوی کو بھی دیکھا۔ دہلی میں شاعروں کی کمی نہیں تھی۔ یہاں بھی شاعر پرے جمائے بیٹھے تھے۔ وہ بھی اپنے دوست کے ساتھ ایک کونے میں دبک گیا۔

مشاعرہ شروع ہوا۔ کسی نے اس سے بھی پوچھا، صاحبزادے! کیا آپ بھی شعر فرماتے ہیں۔ اس نے نفی میں گردن ہلا دی لیکن عجیب شرمندگی کا احساس ہوا۔ کاش! میں بھی شعر کہتا ہوتا تو اس وقت یہ شرمندگی اٹھانی نہ پڑتی۔

مشاعرہ پوری آب و تاب سے جاری تھا۔ وہ ایک ایک شعر سے اس طرح لطف اندوز ہو رہا تھا جیسے ہر شعر اس کی سمجھ میں آرہا ہو۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ یہ شاعر کتنے خوش قسمت ہیں جو ایک ساتھ اتنے لوگ ان کی تعریف کر رہے ہیں۔ یہ شعراء اس کو کسی دوسری دنیا کی مخلوق نظر آرہے تھے۔ کتنا ہی وقت گزر گیا۔ وہ تو اس وقت چونکا جب اس کے دوست نے اس سے چلنے کے لیے کہا۔ ''جلال رات بہت ہوگئی ہے اب چلنا چاہیے۔''

''ساحر دہلوی کو تو پڑھنے دو۔ انہیں تو سن لوں۔''

''ان کا نمبر آنے تک تو صبح ہو جائے گی۔''

''تھوڑی دیر اور بیٹھتے ہیں۔''

''تم بیٹھو زیادہ دیر ہوگئی تو میری ماں میری کھال کھینچ لیں گی۔''

حیدر دہلوی چاہتا تو یہی تھا کہ اسے جانے دے لیکن اکیلے جاتے ہوئے اسے ڈر لگ رہا تھا۔ اسے مجبوراً اٹھنا پڑا لیکن یہ افسوس رہا کہ وہ ساحر صاحب کو نہ سن سکا۔

اس کے گھر کا دروازہ کچھ اس طرح کا تھا کہ باہر سے ہاتھ ڈال کر کنڈی کھل جاتی تھی۔ اس نے کنڈی کھولی اور دبے پاؤں چلتا ہوا اپنے بستر پر آ گیا۔

وہ خوش تھا کہ اس کا راز کھل نہ سکا لیکن صبح ہوتے ہی اس کی غلط فہمی دور ہوگئی۔

''تم رات گئے تک گھر سے باہر تھے۔ کہاں گئے تھے؟''

''وہ...... اماں...... قریب ہی ایک مشاعرہ تھا۔ ایک دوست کے ساتھ مشاعرہ سننے چلا گیا تھا۔''

''غضب خدا کا! یہ عمر اور مشاعرے سننے کا شوق۔ مجھے ہرگز یہ پسند نہیں ہے کہ تم راتوں کو گھر سے غائب رہو۔''

''مجھے بھی اچھا نہیں لگتا مگر کیا کروں مشاعرے تو رات ہی میں ہوتے ہیں۔''

''آخر ضرورت کیا ہے مشاعرہ سننے کی۔''

وہ سن کر خاموش ہو گیا۔ ماں سے زیادہ بحث کرنا اسے اچھا نہیں لگا بلکہ اس وقت تو اس نے یہ فیصلہ ہی کر لیا تھا کہ ماں ٹھیک کہتی ہیں مجھے رات کو گھر سے باہر نہیں جانا چاہیے۔

جامع مسجد کے آس پاس ہر روز کہیں نہ کہیں مشاعرہ ہوتا تھا کوچہ پنڈت میں ساحر دہلوی کی رہائش گاہ سے ہی کیا منحصر اور بھی کئی ٹھکانے تھے جہاں مشاعرے برپا ہوتے تھے۔

جلال الدین نے کئی دن تو ماں کی نصیحت پر عمل کیا لیکن اس کا شوق نصیحتوں سے دبنے والا نہیں تھا۔ ایک روز اپنے دوست کے ساتھ پھر ایک مشاعرے میں جا پہنچا۔ والدہ نے پھر اسے ٹوکا۔ پھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ نہ اس نے مشاعروں میں جانا چھوڑا نہ والدہ نے نصیحت کرنا چھوڑی۔

مشاعروں کی باقاعدہ شرکت نے اسے بھی شعر کہنے پر اکسایا۔ اس نے کوشش کر کے کچھ اشعار کہے۔ وہ یہ دیکھ کر خود حیران رہ گیا کہ اس میں شعر کہنے کی صلاحیت ہے۔ اس کی دانست میں یہ اشعار بالکل درست تھے۔ اسے معلوم تھا کہ ہر شاعر کا کوئی نہ کوئی تخلص ہوتا ہے۔ پنڈت امرناتھ کا تخلص ساحر ہے اور دہلی کی مناسبت سے دہلوی لکھتے ہیں۔ اس نے بھی اپنا تخلص حیدر رکھا اور اپنی کاپی پر جلی حروف سے حیدر دہلوی لکھ دیا یعنی وہ سید جلال الدین سے حیدر دہلوی ہو گیا۔

وہ چھپ چھپ کر غزلیں کہتا رہا۔ ماں کے خوف سے مشاعروں میں جانا چھوڑ چکا تھا۔

ایک روز اس کے ماموں اس کے گھر آئے۔ وہ گھر پر نہیں تھا۔ اس کے ماموں کے ہاتھ وہ کاپی لگ گئی جس پر اس نے اپنے اشعار لکھ رکھے تھے۔ وہ بہت دیر تک اس کاپی کو الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ اسے اندازہ تو ہو گیا کہ یہ اشعار جلال الدین کے ہیں لیکن کچھ شک بھی تھا۔ یہ شک اس وقت دور ہو گیا جب اسی وقت وہ بھی گھر آ گیا۔

''یہ شعر تم نے لکھے ہیں؟''

''جی ماموں جان۔''

''ان اشعار میں تو حیدر تخلص لکھا ہوا ہے اور تم جلال ہو۔''

"میں نے حیدر تخلص اختیار کرلیا ہے۔ حیدر دہلوی۔"
"بھئی شاعری کے لیے کسی کا شاگرد ہونا ضروری ہوتا ہے۔"
"مجھے تو ساحر دہلوی اچھے لگتے ہیں مگر ان تک میری رسائی نہیں ہے۔"
"رسائی کا کیا ہے۔ ان سے ہماری اچھی دوستی ہے۔ کسی دن لے چلیں گے تمہیں۔ یہ کاپی ساتھ لے چلنا دیکھو وہ تمہارے شعروں کو دیکھ کر کیا کہتے ہیں۔"
"کبھی کیوں آج ہی چلیے۔"
حیدر کے ماموں اسے لے کر ساحر کے گھر کی طرف چلے۔ خوشی کے اس احساس سے اس کا دل اچھل رہا تھا کہ کچھ دیر بعد ہی وہ اپنے محبوب شاعر کے سامنے ہوگا۔ اس کے شعروں کی کاپی اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی اور ماموں کے قدم بہ قدم چلا جا رہا تھا۔ اس وقت اس کی عمر صرف تیرہ سال تھی۔
ساحر اس وقت گھر پر تھے اور تنہا بھی تھے ورنہ دو چار شاگرانہیں ہر وقت گھیرے ہی رہتے تھے۔
حیدر کے ماموں نے اس کا تعارف کرایا اور آنے کا مقصد بیان کیا۔ ساحر نے سر سے پاؤں تک اس چھریرے بدن اور سانولے رنگ کے لڑکے کو غور سے دیکھا اور کچھ سنانے کی فرمائش کی۔
حیدر نے چند غزلوں کے جستہ جستہ اشعار پیش کیے۔

جس کو دنیا بہار کہتی ہے
ترجمہ ہے میری جوانی کا
یا ستارے فلک پہ روشن ہیں
یا دوپٹا ہے کامدانی کا

☆

یاد میں تیری عمر اگر گزرے
خوب کیا بلکہ خوب تر گزرے
چلتے بادل تھے دن جوانی کے
بس ادھر آئے اور ادھر گزرے

☆

عشق کا ترجمان ہے پیارے
دل بھی گویا زبان ہے پیارے
اس پس پردہ جلوہ ریزی پر
مجھ کو تیرا گمان ہے پیارے

☆

ایسے بے داغ اشعار ایک بچے کی زبان سے سنے تو ساحر صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے۔
"میاں صاحبزادے کوئی مکمل غزل سنائیے جس میں آپ کا تخلص بھی موجود ہو۔"
"پیش کرتا ہوں۔"

بنیاد وفا پہلے پہل کس نے رکھی تھی
یہ کون تھا کم بخت یہ کس کی غلطی تھی
خلقت کا سبب میری نظارہ طلبی تھی
جینے سے بھی پہلے مجھے مرنے کی خوشی تھی
جب آنکھ تری سمت سر بزم اٹھی تھی
کچھ اور ہی عالم تھا، الم تھا نہ خوشی تھی
بیمار محبت جو نہ دنیا سے سدھارا
شاید ترے انداز تغافل میں کمی تھی
خود لے گئی اک موج یم حسن بہا کر
اللہ رے کیا چیز مری تشنہ لبی تھی
ڈھونڈا اسے ہر سمت مگر خود میں نہ ڈھونڈا
حیدر یہ ہماری ہی نظر کی غلطی تھی

ایک غزل اور ملاحظہ کیجیے۔

کیوں پریشان و خوار ہیں ہم لوگ
کس کے دل کا غبار ہیں ہم لوگ
ہم سے دنیا کی زیب و زینت ہے
اس چمن کی بہار ہیں ہم لوگ
عظمت دو جہاں نگاہ عشق
حسن کا اقتدار ہیں ہم لوگ
ہم کو ساقی سے خاص نسبت ہے
فطرتاً بادہ خوار ہیں ہم لوگ
اب بھی موقع ہے استفادے کا
کہ ابھی برقرار ہیں ہم لوگ
ہم سے تعبیر جزو کل حیدر
مظہر کردگار ہیں ہم لوگ

اس کے بعد ساحر صاحب نے اسے چند مصرعے دیے کہ ان مصرعوں پر شعر کہو۔ حیدر نے اسی وقت ان مصرعوں پر شعر کہہ دیے۔

اپنی دشواری کو کرلیتا ہوں میں دشوار تر
مشکلیں جس شخص کی سنتا ہوں آساں ہوگئیں

☆

حیدر ہوس سے پاک ہیں اہل نظر کے دل

یہ قطرے خود ہیں قسمتِ دریا لیے ہوئے

☆

بالآخر پھوٹ نکلیں سب گلِ آتش بکف ہو کر
چھپا دی تھیں کسی نے بجلیاں خاکِ گلستاں میں

اب اس میں کوئی کلام نہیں تھا کہ وہ خود شعر کہتا ہے۔ اس نے ساحر صاحب کے سامنے فی البدیہہ یہ اشعار کہہ دیئے تھے۔ ساحر صاحب کا قائل ہونا لازمی تھا۔

''میاں تم تو بنے بنائے شاعر ہو۔ آتے جاتے رہا کرو۔'' ساحر صاحب نے حیدر سے کہا۔

ساحر دہلوی نے اس سے ایک دو نہیں تیرہ غزلیں سنیں اور کہا تو صرف یہ کہا کہ آتے جاتے رہا کرو۔ یہ مشورہ دوستوں کو دیا جاتا ہے شاگردوں کو نہیں۔

''حیدر نے اس مشورے پر پوری طرح عمل کیا اور وہ باقاعدگی سے ان کے پاس حاضر ہونے لگا۔ یہ معما آخر تک معما بنا رہا کہ ساحر نے اس کے کلام پر اصلاح دی یا نہیں۔ حیدر ہمیشہ یہ کہتا رہا۔ میں استاد کے پاس یہ آرزو لے کر گیا تھا کہ ان کی شاگردی پر فخر کروں اور اصلاح لوں۔ انہوں نے مجھ سے تیرہ غزلیں سنیں اور کہا کہ ان میں اصلاح کی کوئی ضرورت نہیں۔'' ساحر صاحب بھی ہمیشہ یہی کہتے رہے۔ ''حیدر سے قسم لے کر پوچھو کہ میں نے کبھی اس کے ایک شعر کی بھی اصلاح کی ہے۔''

یہ دور استادی شاگردی کا تھا۔ شاگرد کی عزت استاد کی عظمت سے ہوتی تھی۔ اس دور کے مشاعروں میں حصہ لینے والے نوجوان شعرا پہلے اپنے استاد کے اشعار سناتے تھے۔ حیدر دہلوی بھی ابتدائی مشاعروں میں ایک رباعی پڑھا کرتے تھے جس کے دو مصرعے یوں ہیں۔

حیدر مری اعجاز بیانی معلوم
ان ہونٹوں نے ساحر کی جبیں چومی ہے

وہ ساحر دہلوی کی محفلوں میں آتا رہا۔ اس نے پنڈت جی کے ہاں ہونے والے ماہانہ مشاعروں کے علاوہ دیگر ادبی تنظیموں کے مشاعروں میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔

ایک بار حیدر کے ماموں نے ساحر دہلوی سے پوچھا۔ ''استاد وہ نوجوان (حیدر دہلوی) جو آپ کے سپرد کیا تھا کیسا جا رہا ہے۔''

پنڈت جی نے بے ساختہ کہا۔ ''یار تم اسے میرا شاگرد بنانے لائے تھے یا استاد۔ وہ تو کچھ زیادہ ہی استاد ہے۔''

خدا جانے یہ طنز تھا، خفگی تھی یا تعریف لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس نے اپنی شاعری اور پڑھنے کے انداز سے فوری توجہ حاصل کر لی۔ اس کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی اچھے اچھوں کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ مشاعروں میں اس کا خوب رنگ جم رہا تھا لیکن اساتذہ وقت اس سے ناخوش تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ اس کی شاعری میں ایک نئی زبان اور جدید فکر نمایاں تھی۔ تمام اساتذہ دلی کو روایتی زبان تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ وہ زبان میں کسی قسم کی تبدیلی کے حق میں نہیں تھے جب کہ وہ دلی کی روایتی ٹکسالیت کا باغی بن کر سامنے آ رہا تھا۔

حیدر دہلوی نے جس دور میں شعر کہنا شروع کیا وہ داغ اور امیر مینائی کی تربیت یافتہ نسل کا دور تھا اور اس وقت دلی میں استاد شعراء کی گونج تھی۔ ان اساتذہ کے درمیان اپنی آواز میں انفرادیت پیدا کرنا کسی معرکے سے کم نہیں تھا۔ وہ اسی معرکہ آرائی میں معروف اور مشاعروں کی فضا تبدیل کرنے میں مشغول تھا۔

یہ کیا دستِ اجل نے کام سونپا ہے مشیت نے
چمن سے توڑنا پھول اور ویرانے میں رکھ دینا

☆

اب سے نہیں اوّل سے ہوں مشتاقِ نظارہ
آنکھوں سے نہیں نیند مقدر سے اڑی ہے

☆

وہ دن گئے کہ صرف گریباں یہ زور تھا
اب ہاتھ میں ہوں دامنِ صحرا لیے ہوئے

☆

وہ یہ تازہ اور نئے مگر مختلف اشعار لے کر مشاعروں میں پہنچا تو تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ مخالفتوں کی آندھیاں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اسے نیچا دکھانے کے لیے نئی نئی منصوبہ سازیاں کی جانے لگیں۔ وہ بھی دبنے والا کب تھا۔ اس نے بہ زبان شعر اعلان کیا۔

یہ ہم صفیر کیا مری وسعت کو پا سکیں
سب سے زیادہ طائرِ رفعت پسند ہوں

ایک تو اس کی کم عمری دوسرے اس کی مختلف شاعری تیسرے اس کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی۔ ان سب نے مل کر مشاعرہ بازوں کو اس کا سخت مخالف بنا دیا۔ ایسے مشاعروں میں نظر انداز کیا جانے لگا۔ اس کے کلام کی پختگی کے باوجود اسے غلط مقام پر پڑھوایا جاتا۔ اساتذہ کے تو عمر

شاگردوں کے بعد پڑھوایا جاتا تو اسے سخت دکھ ہوتا۔

اٹھارہ بیس سال کا نوجوان جب پختہ غزلیں لے کر مشاعروں میں پہنچتا اور مشاعرہ لوٹ لیتا تو اساتذہ کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے۔ ان کے شاگرد اکیلے حیدر دہلوی کو طرح طرح سے تنگ کرنے لگے۔ وہ نہ کسی دولت مند خاندان سے تعلق رکھتا تھا نہ اثر رسوخ رکھتا تھا۔ اس کا نہ کوئی بااثر استاد تھا جو اس کی حمایت میں بولتا۔ ان حالات میں اس نے خود استاد بننے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے اپنے اردگرد نوجوان شعراء کو اکٹھا کرنا شروع کردیا۔ ان میں وہ بھی تھے جو اس کی شاعری سے متاثر ہوکر اس کے پاس چلے آئے اور وہ بھی تھے جو خود شعر نہیں کہہ سکتے تھے لیکن شاعری کے شوقین تھے۔ حیدر دہلوی انہیں خود شعر لکھ کر دیتا اور انہیں مشاعرے میں اپنے ساتھ لے کر جاتے۔ ویسے بھی وہ دور طرحی مشاعروں کا دور تھا۔ وہ مصرعہ طرح پر سو سو شعر کہہ لیتا۔ کچھ خود رکھ لیتا اور باقی شاگردوں میں تقسیم کردیتا۔ اس کا پہلا فائدہ یہ ہوا کہ اگر اسے مشاعرے میں دوسرے نمبر پر پڑھوایا جاتا تو ان شاگردوں کی بدولت اس کا نمبر خودبخود بارھواں یا چودھواں ہوجاتا۔

مشاعروں میں اس کی گرم بازاری دیکھ کر دوسرے استادوں کے شاگرد ٹوٹ کر اس کے پاس آنے لگے۔ ان میں ایک نام نازش حیدری کا بہت نمایاں تھا۔ نازش حیدری بیخود دہلوی اور پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی کے شاگرد تھے اور ان سے ٹوٹ کر حیدر دہلوی کے حلقہ ارادت میں شامل ہوا۔ نازش حیدری صحافت سے متعلق تھے۔ انجام اور جنگ وغیرہ میں کام کرتے تھے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ حیدر دہلوی کا کلام ان اخبارات کی زینت بننے لگا ان کے ساتھ نازش کے چھوٹے بھائی انور دہلوی بھی اس کے شاگرد ہوگئے۔ پھر تو جیسے نوجوان شعراء کا ہجوم اس کے گرد جمع ہوگیا۔ یہ سب اس کے تلامذہ میں شامل تھے۔

اس کی اصلاح کا انداز بھی انوکھا تھا۔ وہ بلا تکان اپنے کئی شاگردوں کی اصلاح بہ یک وقت کیا کرتا تھا۔ ادھر شاگرد نے شعر پڑھا ادھر اس نے مناسب حال اصلاح دی۔ اصلاح کے دوران دو ایک شعر تبریک کے طور پر بھی عطا کردیتا جس سے غزل پختہ تر ہوجاتی۔

جامع مسجد کے سامنے حافظ ہوٹل تھا۔ وہ یہاں باقاعدگی سے بیٹھنے لگا۔ یہیں احباب و شاگرد جمع ہوتے شاعری کے دور چلتے، اصلاح کے دفتر کھلتے، کہیں مشاعرہ ہوتا تو یہیں سب جمع ہوتے اور مشاعرہ گاہ کی طرف روانہ ہوتے۔

شاگردوں کی تعداد بڑھی تو اس نے اپنا حلیہ بھی استادوں کی طرح بنالیا۔ چہرے پر داڑھی رکھ لی تاکہ عمر زیادہ معلوم ہو۔ شیروانی پہننے لگا۔ ترکی ٹوپی سر پر رکھ لی۔ ہاتھ میں چھڑی لے لی حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ مشاعرے میں اکڑ کر بیٹھتا۔ یہ بھی ایک انداز استادی تھا۔

یہ عالم ہو تو اساتذہ وقت سے نوک جھوک لازمی تھی البتہ سائل دہلوی سے اس کی دوستی یا اچھے تعلقات ہمیشہ رہے۔ اسی بے تکلف تعلق کا فائدہ اٹھا کر ایک روز سائل نے اس سے پوچھا۔

''میاں تم مشاعرے میں ہماری شاعری پر زیادہ توجہ نہیں کرتے نہ ہی داد دیتے ہو۔ ہماری شاعری تمہیں پسند نہیں یا کوئی اور وجہ ہے۔''

حیدر دہلوی نے جواب دیا۔ ''یہ بات نہیں آپ استاد شاعر ہیں مگر دونوں کی شاعری ایک جیسی ہے جب کہ میں ذرا الگ اور مختلف شاعری کرتا ہوں۔''

''میاں یہ کیا بات ہوئی۔ کوئی توجیہہ پیش کرو۔''

حیدر دہلوی نے جواب میں فی البدیہہ یہ شعر پڑھ دیا۔

پڑا ہوں میکدے کے در پہ اس انداز سے حیدر
کوئی سمجھا کہ بیخود ہے کوئی سمجھا کہ سائل ہے

اس شعر میں رعایت لفظی کا جو ہنر دکھایا گیا تھا اس کی سائل نے داد تو دی لیکن دل سے قائل نہ ہوئے کیونکہ اس کے بعد بھی معاصرانہ چشمکیں جاری رہیں۔

حیدر دہلوی اب کل وقتی شاعر تھا۔ گھر میں بہت کم نکلتا تھا۔ حافظ ہوٹل اس کا ڈیرا بنا ہوا تھا۔ وہ دن کے کسی حصے میں گھر سے نکلتا اور حافظ ہوٹل پر آکر بیٹھ جاتا۔ جسے بھی اس کی تلاش ہوتی حافظ ہوٹل پہنچ جاتا۔ مشاعروں کی سیاست پر بحثیں ہوتیں، اساتذہ کے اشعار پر تنقیدیں کی جاتیں، شاگردوں کے کلام پر اصلاحیں ہوتیں وغیرہ وغیرہ۔

اس عرصے میں بہت سی سماجی تبدیلیاں رونما ہوچکی تھیں۔ دلی کی سڑکیں موٹروں سے مانوس ہوگئی تھیں۔ رتھ غائب ہوگئے تھے۔ پالکی پس منظر میں چلی گئی تھی۔ ٹرامیں چل رہی تھیں۔ تانگے بھی چل رہے تھے۔ بجلی کی روشنی سے راستے منور تھے۔ لباسوں میں فرق آگیا تھا۔

ان تبدیلیوں کے باوجود دلی کے ادبی ماحول میں کچھ

فرق نہ آیا تھا۔ بیخود دہلوی، سائل اور ساحر کے رنگ شاعری کا دور دورہ تھا۔ روایتی شاعری کے اس تالاب میں پہلا پتھر حیدر دہلوی نے پھینکا جس کی سزا بھی اسے ملی۔ اسے مانا کسی نے نہیں، اس نے خود کو منوایا۔ اس کے لیے جس جدوجہد کی ضرورت تھی۔ وہ اپنا وقت اس جدوجہد میں خرچ کررہا تھا۔ اس کی قادرالکلامی کا سکہ اس وقت دلوں پر جم گیا جب اس کی ایک غزل نے سارے ہندوستان میں دھوم مچادی۔

جنونِ عشق کی گہوارہ جنبانی نہیں جاتی
نہیں جاتی طبیعت کی پریشانی نہیں جاتی
ہمیشہ دامن اشک خوں سے لالہ زار رہتا ہے
یہ فطرت کے تبسم کی گل افشانی نہیں جاتی
نظامِ دہر اگر میرے لیے بدلا تو کیا بدلا
کسی گھر سے بھی شام غم بہ آسانی نہیں جاتی
جنوں میں ہوش کیا جاں بھی بسا اوقات جاتی ہے
نہیں جاتی تو طرز چاک دامانی نہیں جاتی
سنا ہے شوخ جلوے بھی تحیر خیز ہوتے ہیں
گزر جاتی ہے ساری عمر حیرانی نہیں جاتی
میں خود اپنی محبت میں کمی محسوس کرتا ہوں
مری صورت سے دل کی بات پہچانی نہیں جاتی
چمن والوں سے مجھ صحرانشیں کی بودوباش اچھی
بہار آکر چلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی
ابھی ماحول عرفان و ہنر میں پست ہے حیدر
یکایک ہر بلند آواز پہچانی نہیں جاتی

وہ شہرت کی سیڑھیوں پر قدم رکھ رہا تھا۔ اس انتظار میں تھا کہ بلند آواز پہچانی جائے لیکن گھر میں بیٹھنے والی اس کی ماں کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ تو یہ دیکھ رہی تھی کہ اس کا اکلوتا بیٹا راتوں کو دیر سے گھر آتا ہے۔ ہر ماں کی طرح انہوں نے بھی یہی چاہا کہ اس کے پیروں میں شادی کی زنجیر ڈال دی جائے۔

اس روز وہ رات گئے گھر پہنچا تو اس کی ماں خلاف معمول جاگ رہی تھی۔ حیدر کا ماتھا ٹھنکا۔ اللہ خیر کرے، اماں کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟

''اماں جان! خیر تو ہے آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں۔''

''جاگوں نہیں تو اور کیا کروں جس کا ایک ہی بیٹا ہو اور وہ بھی راتوں کو گھر سے غائب رہے تو اس کی بدنصیب ماں جاگے نہیں تو اور کیا کرے۔''

''خدا نہ کرے آپ بدنصیب ہوں۔ آپ کا بیٹا ابھی زندہ ہے آپ کا مقدر بدل دوں گا۔''

''یہ شاعری واعری مجھے ہرگز پسند نہیں۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ میرا بیٹا کم از کم رات کو تو گھر میں رہے۔ تینوں بیٹیوں کی شادیاں ہوگئیں۔ میرے بچے اب میں تنہا رہ گئی ہوں۔''

''اماں جان، میں غلط لوگوں میں نہیں بیٹھتا۔ شاعری کے میدان سر کررہا ہوں۔ بڑے بڑے اساتذہ سے معرکہ آرائی ہورہی ہے۔ بس ذرا یہ میدان فتح کرلوں۔''

''یہ سلسلہ تھمنے والا نہیں اور نہ تو میری بات مانے گا۔ اب ایک ہی صورت ہے کہ میں تیری شادی کردوں۔ میں تو تجھے سدھار نہیں سکی۔ اب وہ ہی تجھے سدھارے گی۔''

''اماں کچھ تو مہلت دیں۔''

''کوئی مہلت نہیں میں نے لڑکی دیکھ لی ہے بس اب میں بات آگے بڑھاؤں گی۔'' حیدر نے سر جھکا لیا۔

والد کی وفات کے بعد گھر کا چولہا جلانے کے لیے حیدر نے شانہ بشانہ کام کیا تھا۔ وہ حد درجہ ذہین اور محنتی تھا۔ جو کام ایک مرتبہ اس کے ہاتھ سے گزر جاتا بھولتا نہیں تھا۔ اس نے بہت سے ہنر سیکھ لیے تھے۔ گھڑی سازی، بائنڈنگ، کمپوزنگ لیتھو پریس کی چھپائی، سنگ سازی اور پریس لائن سے جس قدر بھی متعلقات رائج تھے سب اس کی دسترس میں تھے۔ شادی کرنا اس کے لیے بوجھ نہیں تھا۔ اسے اگر خوف تھا تو یہ کہ یہ شادی کہیں اس کی شاعری میں رکاوٹ نہ بنے۔ وہ شادی کے لیے تیار نہ تھا لیکن ماں کے حکم پر سر جھکانا پڑا۔

اجازت ملتے ہی حیدر کی والدہ نے تیاری شروع کردی۔ حیدر نے بھی سوچا کہ بہنوں کے رخصت ہوجانے کے بعد اس کا شادی کرلینا ہی بہتر ہے گھر کے کام کاج کے لیے کسی عورت کا ہونا ضروری ہے۔

حیدر دہلوی نے والدہ کے کہنے پر شادی کرلی۔ اس نے والدہ کے کہنے پر شادی کی تھی لیکن آنے والی خاتون ایسی سلیقہ مند ثابت ہوئی کہ اس نے پورا گھر سنبھال لیا۔ شاعر پیشہ شوہر کو سنبھالنا کسی بیوی کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے لیکن اس نئی آنے والی نے بھی اس سے شکایت نہیں کی۔ راتوں کی غیر حاضری اسی طرح جاری رہی۔

حیدر کی قسمت میں سکون لکھا ہی نہیں تھا۔ ایک بیٹی کی ولادت کے بعد اس کی بیوی کا انتقال ہوگیا اور بعد ازاں وہ

بچی بھی چل بسی۔

حیدر شاعر تھا۔ اس صدمے کو عرصے تک فراموش نہ کر سکا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان بڑے سے بڑا صدمہ فراموش کر دیتا ہے۔ اس کی اداسی دور ہوتے ہی والدہ نے دوبارہ گھر بسانے پر مجبور کیا۔ والدہ کا کہا بھلا کیسے ٹالتا۔ وہ پھر تیار ہو گیا۔ پہلا تجربہ جتنا خوشگوار تھا دوسرا تجربہ اتنا ہی تلخ نکلا۔ بیوی جھگڑالو تھی۔ دن رات جھگڑے سر اٹھانے لگے۔ اس کی نرم خوئی ان جھگڑوں کو بھی برداشت کر رہی تھی لیکن اس بیوی نے تو حد ہی کر دی۔ اسے پراٹھوں میں زہر دینے کی کوشش کی۔ اتفاق سے یہ راز کھل گیا۔ حیدر نے اسے اسی وقت طلاق دے دی۔

وہ تو اس واقعے کو بھلا کر شاعری اور کاروبار کی دنیا میں واپس چلا گیا لیکن والدہ اس کی قسمت سے افسردہ ہو کر بستر سے لگ گئیں۔ وہ دن رات ان کے بستر سے لگا بیٹھا رہا۔ پریس مشین لگائی ہوئی تھی۔ مالی آسودگی، والدہ کے علاج پر بے دریغ روپیا خرچ کیا لیکن اس روپے سے وہ ان کی زندگی نہ خرید سکا۔

والدہ کی وفات اس کے لیے ایسا صدمہ تھا جس سے وہ مہینوں باہر نہ آسکا۔ اتنا دل برداشتہ ہوا کہ وہ گھر ہی چھوڑ دیا اور اپنی بہن کے گھر رہنے لگا۔ اس کے بہنوئی علیم اللہ خان اس سے بہت محبت کرتے تھے اسی لیے وہ ان کے گھر آ گیا تھا بلکہ وہ خود اسے لے آئے تھے کہ والدہ کے انتقال کے بعد اکیلے گھر میں کیسے رہ سکو گے۔

یہاں آئے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ بہن نے تیسری شادی پر زور دینا شروع کر دیا۔ وہ ابھی پہلی بیوی کی وفا اور دوسری بیوی کی بے وفائی کو بھولا نہیں تھا۔ اب تو جیسے شادی کے نام سے چڑ سی ہو گئی تھی وہ کسی صورت تیار نہیں ہوتا تھا۔ ٹال مٹول سے کام لیتا رہا۔ اس بہن نے دوسری بہنوں کو بھی ساتھ ملا لیا۔ بہنوئی علیم اللہ خان نے بھی زور دینا شروع کر دیا۔ وہ ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ دوست احباب بھی زور دے رہے تھے۔ وہ مجبور ہو گیا۔ بہنوں سے کہہ دیا کہ وہ لڑکی دیکھ لیں۔ بہنوں نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے اور ایک جگہ بات پکی کر دی۔ حیدر دہلوی نے ایک مرتبہ پھر سہرا باندھ لیا۔ شاگردوں کے ہجوم میں برات لے کر پہنچ گیا اور دلہن لے کر بہن کے گھر آ گیا۔

رات گئے تک گھر میں خوب ہنگامہ مچا رہا۔ وہ اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ ابھی بستر پر بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ گھونگھٹ کی اوٹ سے ایک آواز ابھری۔ ”مجھے ہاتھ لگانے سے پہلے میری ایک التجا سن لیں۔“

یہ ایسی غیر متوقع آواز تھی کہ حیدر کے کان سن ہو گئے۔

”کہیے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔“

”آپ شاعر ہیں۔ دوسروں کے دلوں کا درد خوب سمجھتے ہیں۔ میں کسی اور سے محبت کرتی ہوں اس لیے آپ کے ساتھ کبھی نبھا نہ کر سکوں گی۔ آپ کے لیے میں ایک مردہ جسم سے زیادہ نہیں۔“

”جب آپ کسی کی محبت میں گرفتار تھیں تو شادی پر تیار ہی کیوں ہوئیں۔“

”میں نے اپنی ماں کے کانوں میں بات ڈال دی تھی لیکن انہوں نے ہاتھ پاؤں جوڑ کر مجھے خاموش کر دیا۔ میں اس اُمید پر یہاں چلی آئی کہ آپ شاعر ہیں۔ میرے دکھ کو سمجھیں گے اور مجھے آزاد کر دیں گے۔“

”اس آزادی کا تمہیں کیا فائدہ ہوگا۔“

”ایک طلاق یافتہ عورت سے شادی کرنے پر کوئی تیار نہیں ہوگا۔ میرے والدین مجبور ہو جائیں گے کہ اسی شخص سے میری شادی کرا دیں جسے میں چاہتی ہوں۔“

اب کسی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ دونوں طرف خاموشی تھی۔ حیدر بستر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اس وقت کمرے سے باہر نکلنا مناسب نہ سمجھا۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ کس کس کو کیا کیا بتاتا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور تکیہ زمین پر رکھ کر لیٹ گیا۔ گھونگھٹ سے آواز پھر ابھری۔

”آپ زمین پر کیوں لیٹ گئے۔ آپ مسہری پر لیٹ جائیں۔ میں رات بھر جاگ کر گزار لوں گی۔“

”نہیں، یہ مسہری تمہارے جہیز کی ہے۔ اس پر تمہارا حق ہے۔ میں بھی جاگتا ہی رہوں گا۔ نیند میری آنکھوں میں بھی کہاں۔“

”آپ سوچ رہے ہوں گے، میں نے آپ کو کس الجھن میں ڈال دیا۔“

”یہ الجھن میری ہی نہیں تمہاری بھی ہے۔“

”پھر آپ نے کیا سوچا؟“

”صبح بتاؤں گا۔“

”مجھے اُمید ہے آپ بات کو اس خوب صورتی سے بنائیں گے کہ کوئی ہنگامہ نہ کھڑا ہو۔“

''تم آرام سے سو جاؤ۔ میں سنبھال لوں گا۔''
دونوں طرف خاموشی پھر طاری ہوگئی۔ یہ خاموشی صبح اس وقت ٹوٹی جب دروازے پر کسی نے دستک دی۔
''کسی کو کچھ نہ بتانا۔ میں خود بتاؤں گا۔'' حیدر نے کہا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ بہنیں اندر آگئیں اور حیدر کمرے سے باہر نکل گیا۔
کچھ دیر بعد اس نے تینوں بہنوں کو ایک کمرے میں جمع کیا اور اندر سے کنڈی لگا دی۔
''خیریت تو ہے حیدر، ہوا کیا۔''
''جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے غور سے سننا۔ لڑکی نے مجھے بتایا ہے کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ مجھے قبول نہیں کر سکتی۔ میں زبردستی اسے اپنی بیوی نہیں بنا سکتا۔ میں نے اسے طلاق دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''
''ایسے کیسے فیصلہ کرلیا ہے۔ ہمارا اتنا پیسا خرچ ہوا ہے۔ بدنامی الگ ہوگی۔ ہم تو ابھی جاتے ہیں اس حرافہ کے گھر۔ اس کی ماں سے تو جا کر پوچھیں اس آوارہ کو ہمارے سر کیوں منڈھ دیا۔''
''اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ طلاق تو اس کے بعد بھی دینی ہوگی۔ کسی لڑکی کو زبردستی گھر میں نہیں رکھا جا سکتا۔ ان شریف لوگوں کو بے عزت کرنے کا کیا فائدہ۔''
''شریف کہاں سے ہوگئے۔''
''کسی کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں اکیلا جاؤں گا اور اس کی ماں کو اعتماد میں لے کر سب کچھ بتا دوں گا اور یہ درخواست بھی کروں گا کہ اس کی شادی اس لڑکے سے کردی جائے جس سے وہ محبت کرتی ہے۔''
''حیدر، یہ تمہارا ہی ظرف ہے۔ کوئی اور ہوتا تو ہنگامہ کر دیتا۔''
''ہر کوئی حیدر دہلوی نہیں ہوتا۔ بس اب اس لڑکی سے کچھ مت کہنا۔''
اس نے اسی وقت اس لڑکی کو ساتھ لیا اور اپنی سسرال پہنچ گیا۔ اس کی ماں کو اعتماد میں لے کر تمام باتیں گوش گزار کردیں۔ ہاتھ پاؤں جوڑ کر یہ قسم بھی دے دی کہ بس اب بات کو یہیں دفن کردیں اور اگر بیٹی کی زندگی چاہتی ہیں تو اس کی شادی وہیں کردیں جہاں یہ چاہتی ہے۔ خاموشی سے طلاق دے دی اور گھر آ کر اس کا فرنیچر واپس بھجوا دیا۔
ایک مرتبہ پھر تکلیف دہ آزادی اسے مل گئی تھی۔ اس نے بھی سمجھ لیا کہ شاید شادی میرے مقدر ہی میں نہیں میری اولاد میرے اشعار ہیں جو زندہ رہیں گے اور مجھے زندہ رکھیں گے۔ اس نے اپنے آپ کو کاروبار اور شاعری میں پوری طرح غرق کرلیا۔
اس کے بہنوئی نے اس کی دلچسپی دیکھتے ہوئے کاروبار وسیع کرنے کا مشورہ دیا۔ انہی کے مشورے سے اس نے پریس مشین کا کاروبار ختم کر کے ہیٹ بنانے کا کارخانہ قائم کرلیا۔ یہ کارخانہ جامع مسجد کے سامنے تھا۔ اس کے پہلو میں حافظ ہوٹل تھا جہاں ہمیشہ سے اس کی بیٹھک تھی۔ کارخانے سے فارغ ہوتے ہی وہ ہوٹل پر آ کر بیٹھ جاتا۔ یہاں اس کے ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ یہ مجلس آرائی رات گئے تک جاری رہتی۔
اس ہوٹل پر بیٹھنے والے شاگردوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوگیا تھا۔ سب نے مل کر یہ طے کیا کہ ایک ادارہ بنایا جائے جس کے تحت ماہانہ طرحی مشاعرے منعقد کیے جائیں کہنے کی دیر تھی۔ ممبر سازی ہوگئی۔ مشاعروں کے انعقاد کے لیے رقم جمع ہوگئی۔ اس ادارے کے ممبران میں صرف اس کے شاگرد نہیں دیگر احباب بھی شامل تھے۔
دلی کے مشاعرے بڑے خاصے کی چیز تھے اور اس دور کی تہذیبی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتے تھے۔ بیخود دہلوی، سائل دہلوی اور ساحر دہلوی کے شاگردوں کی ٹولیوں کے دم سے ادبی ماحول میں ایک گہما گہمی تھی۔ ان مشاعروں میں اساتذہ دلی کے تلامذہ کے گروہ اپنے اپنے گروہ کی پاسداری میں پیش پیش رہتے تھے۔
اب ان مشاعروں میں ادارہ حیدری کی جانب سے ہونے والے ماہانہ طرحی مشاعروں کا بھی اضافہ ہوگیا۔ یہ مشاعرے حافظ ہوٹل کی بالائی منزل پر منعقد ہوا کرتے تھے۔ ان مشاعروں کے روح رواں حیدر دہلوی تھے۔ یہ مشاعرے اسی کی زیر صدارت منعقد ہوتے تھے۔ شاعروں کی اکثریت اس کے تلامذہ پر مشتمل ہوتی تھی۔ ان شاعروں میں دوسرے شعراء کم ہی شرکت کرتے تھے لیکن ان مشاعروں نے ایک ہلچل سی ضرور پیدا کردی تھی۔ اس کمی کو ادارۂ حیدری نے اس طرح پورا کیا کہ باہر سے شعراء کو مدعو کرنا شروع کردیا۔ کبھی جگر آ جاتے کبھی سیماب کبھی کوئی اور اس اقدام سے ان مشاعروں کی وقعت بڑھنے لگی۔ باہر کے شعراء کو سننے اور دیکھنے کے لیے دوسرے شعراء بھی آنے لگے۔
دلی کی تہذیب افسردہ ضرور تھی لیکن آن بان، شان و

شوکت اب بھی وہی تھی۔ ہر کام میں ساجی مرتبے کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ فرد کی نہیں خاندانوں کی عزت تھی۔ شاعری کی دنیا بھی اس سے خالی نہیں تھی۔ یہاں بھی ان شعراء کی گرم بازاری تھی جو اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتا تھا کوئی نواب تھا کوئی نواب زادہ۔ حیدر دہلوی میں ایسی کوئی ظاہری خوبی نہیں تھی۔ اس کا تعلق تو ایک کرخندار گھرانے سے تھا۔ وہ اب بھی وظیفے پر نہیں اپنی محنت پر پل رہا تھا۔ پھر بھلا جاگیردارانہ ذہنیت کے حامل استاد شعراء اس کی صلاحیتوں کا لوہا کیوں مانتے۔ شعراء اس کے معترف ہونے کی بجائے اس سے حسد کرنے لگے۔ خود اسے بھی احساس ہونے لگا تھا کہ اسے جان بوجھ کر نظر انداز کیا جارہا ہے۔ اسی لیے اس نے ضروری سمجھا تھا کہ اپنے گرد شاگردوں کو جمع کرے اور ان کے ساتھ مشاعروں میں شریک ہو۔ ادارۂ حیدری کا قیام بھی اسی ضرورت کا حصہ تھا کہ اگر کوئی مجھے مشاعروں میں نہیں بلواتا۔ تو میں اپنے مشاعرے خود منعقد کروں گا۔ میں صدارت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں لیکن مجھے ابتداء میں پڑھوادیا جاتا ہے۔ میرے مقام تک کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ اب میں اپنے مشاعروں کی خود صدارت کروں گا۔

مشاعرے خوب چل پڑے تھے لیکن اس وقت کے جرائد مخالفین کے ہاتھ میں تھے۔ ان مشاعروں کی روئیداد چھاپنے سے گریز کیا جارہا تھا۔ حیدر دہلوی۔ کا کلام بھی نہیں چھاپا جارہا تھا۔ اس کے لیے یہ مشورہ کیا گیا کہ ایک رسالہ ادارۂ حیدری کے زیر اہتمام شائع کیا جائے۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ مخالفین پر تنقیدی مضامین بھی شائع کیے جائیں گے اور اپنے لوگوں کے کلام کی اشاعت کا ذریعہ بن جائے گا۔ نازش حیدری صحافت کا تجربہ رکھتے تھے لہٰذا اس جریدے کی دیکھ بھال کے لیے ان کا نام تجویز ہوا۔ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتا تھا اسے کر کے دکھاتا تھا۔ چند دن غور و فکر کرنے کے بعد اس نے اعلان کردیا کہ ہم ماہنامہ الہام جاری کریں گے۔ یہ اعلان اس لیے ضرورت سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا کہ دہلی ادبی ماہناموں کا گڑھ تھا۔ بڑے بڑے نامور صحافی اور ادیب ان جرائد سے وابستہ تھے۔ اس ماحول میں کسی نئے ماہنامے کا اعلان دل گردے کا کام تھا۔

اس نے ادارۂ حیدری کے تحت ماہنامہ الہام جاری کرنا شروع کردیا۔

ماہنامہ الہام ابتداء میں خالصتاً ادبی مجلہ تھا اور اس میں نظمیں، غزلیں، افسانے اور علمی و ادبی مضامین کے علاوہ مشاعروں کی کارروائیاں بھی شائع ہوتی تھیں۔ تقریظ و تنقید کے عنوان سے تنقیدی مضامین بھی الہام میں شائع ہوتے تھے۔

حیدر دہلوی کا دور دراصل طرحی مشاعروں کا دور تھا۔ ادارۂ حیدری میں ہر ماہ طرحی مشاعروں کا انعقاد ہوتا تھا جہاں حیدر دہلوی کے تلامذہ اور دیگر شعراء طرحی غزلیں پیش کرتے تھے۔ اب ایک پلیٹ فارم مہیا ہوگیا تھا ان مشاعروں کی مکمل روئیداد الہام میں شائع ہوتی تھیں۔

الہام چونکہ دہلی سے باہر بھی جاتا تھا اس لیے ان مشاعروں کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ خود حیدر دہلوی کو بھی اس کا فائدہ ہوا۔ اسے ریڈیو کے مشاعروں میں بلایا جانے لگا۔ دہلی سے باہر کے مشاعروں میں بھی مدعو کیا جانے لگا۔ اسے ریاست ٹونک کے مشاعرے میں بلایا گیا تھا۔ دہلی کے اکثر شعرا حسد سے جل بھن گئے۔ اس مرتبہ بھی طرح طرح سے رکاوٹیں ڈالی گئیں کہ وہ اس مشاعرے میں شریک نہ ہوسکے لیکن وہ دبنے والا کب تھا۔ شاگردوں کا ہجوم اسے ریلوے اسٹیشن تک چھوڑنے گیا اور وہ اس مشاعرے میں شرکت کے لیے روانہ ہوگیا۔

یہ مشاعرہ نظر باغ ریاست ٹونک میں منعقد ہوا۔ سرکار ٹونک نواب محمد سعادت علی جان نے بھی نہ صرف خود شرکت کی بلکہ ریاست کے عمال صاحبزادگان بھی موجود تھے۔ ریاست ٹونک کے تمام قابل ذکر شعراء اس مشاعرے میں موجود تھے۔ یہ طرحی مشاعرہ تھا۔ مصرعہ طرح یہ دیا گیا تھا۔

عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا

حیدر دہلوی نے اس مصرعہ طرح پر یہ غزل نکالی۔

اثر آنکھوں پہ کیا ہوگا تیری جلوہ نمائی کا
کہ میں نے منہ تکا ہے مدتوں شام جدائی کا
متاع دل لٹا کر قدر دل معلوم ہوتی ہے
میں رستہ رہزنوں سے سیکھتا ہوں رہنمائی کا
ذرا گھر سے نکل گھر میں ذریعہ ڈھونڈنے والے
ذریعہ خود نکل آتا ہے منزل تک رسائی کا
قفس کی تیلیاں حیدر رگ تن ہوتی جاتی ہیں
لرز جاتا ہوں جس دن ذکر آتا ہے رہائی کا

اس کا دبنگ لہجہ، تحت اللفظ گھن گرج دار آواز اس پر یہ پختہ کلام مشاعرہ لوٹن کبوتر بن گیا۔ دوسرے دن ہر زبان پر اس کے اشعار تھے۔

مشاعرے کی روایت سے ہٹ کر غیر طرحی غزل بھی اس سے سنی گئی۔

نہ دیکھو چشم فطرت سے مجھے حال پریشاں میں
مشیت کا تبسم کھیلتا ہے میرے داماں میں
لہو کا قطرہ قطرہ ہو گیا جب جذب پیکاں میں
تجلی کروٹیں لینے لگی آخر رگ جاں میں
بالآخر پھوٹ نکلیں سب گل آتش بکف بن کر
چھپا دی تھیں کسی نے بجلیاں خاک گلستاں میں
مجھے آوارہ کو میری منزل مقصد نہ پہچانے
کوئی ایسی بھی گردش ہے الٰہی چرخ گرداں میں

☆

یہ ہنگامے سحر کس نے وفا کا نغمہ چھیڑا تھا
کہ جتنے گل ہیں سب جامے سے باہر ہیں گلستاں میں

ازل میں اس سراپا حسن کو بے پردہ دیکھا تھا
ابھی تک بجلیاں سی کوندتی ہیں قلب سوزاں میں

شعری اصناف میں رباعی ہمیشہ سے مشکل صنف رہی ہے کہ اور کسی شاعر کی قادر الکلامی کا ثبوت رہی ہے۔ یہ صنف نئی بھی نہیں لیکن گنتی کے شاعر ہیں جنہوں نے اس صنف کو ہاتھ لگایا۔ حیدر دہلوی نے بھی جب خود کو استاد ثابت کرنا چاہا اور مرعوب کرنے کی خاطر اس نے غزل کے ساتھ ساتھ اس صنف کو بھی اپنایا۔ ''بادۂ عرفان'' کے عنوان سے اس کی رباعیاں الہام میں شائع ہونا شروع ہوئیں اور جلد ہی اپنی فنی اور فکری صلاحیتوں کو تسلیم کرانے کے لیے رباعی جیسی مشکل صنف سخن میں پہلا مجموعہ ''رباعیات حیدر'' پیش کیا تاکہ اس کے حریف استاد شعرا اس کی قادر الکلامی کا اندازہ کر سکیں۔ وہ ایک اہم غزل گو تھا۔ سیکڑوں غزلیں کہہ چکا تھا لیکن پہلا مجموعہ رباعی کا پیش کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے یقیناً یہ جذبہ موجود تھا کہ وہ اپنی قادر الکلامی سے مخالفین کو واقف کرانا چاہتا ہے۔

رباعیات حیدر شائع ہونے کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ادبی حلقے پذیرائی کرتے اور پچھلے گناہوں کا ازالہ کرتے لیکن ہوا اس کے برعکس۔ اس کی قادر الکلامی سے خائف ہو کر اس کے خلاف سازشیں شروع کر دیں اور اسے مشاعروں میں نظر انداز کرنے کی روش تیز کر دی۔ اس دور میں سب سے بڑا میڈیم مشاعرہ ہی تھا اور یہی مشاعروں کی پروجیکشن کا ذریعہ تھے مگر اس کی توانا شاعری سے ''ادبی مافیا'' اس کے خلاف ہو گیا۔ اس کی رباعیوں کا مجموعہ بھی اسی غفلت کا نتیجہ رہا۔ اس کے عقیدت مندوں نے اسے ''خیام الہند'' قرار دیا لیکن ادبی جرائد خاموش رہے۔

رباعیات حیدر میں مختلف موضوعات کے تحت رباعیاں شامل تھیں جن میں شراب و شباب، پیری، حقائق تلخ، انسان، حقائق و معارف، شاعر، برکات وطن اور آثار وطن وغیرہ تھیں۔

مجموعے کا آغاز شراب و شباب کے موضوع پر رباعیوں سے کیا گیا تھا۔

ساقی رخ پرنور دکھائے تو سہی
پردے سے ذرا سامنے آئے تو سہی
کیا حرمت بادہ سے میں آگاہ نہیں
آنکھوں سے پیوں کوئی پلائے تو سہی

☆

بھارت میں پیسوں کیلیے بوڑھوں کو شیر کا نوالہ بنایا جانے لگا

بھارت میں ایک خطرناک اور پریشان کن رجحان دیکھنے میں آیا ہے جہاں غریب افراد پیسوں کے لیے اپنے خاندان کے بزرگوں کو شیروں کا نوالہ بنا رہے ہیں۔ بھارتی ضلع پیلی بھیت میں ٹائیگر ریزرو کے اطراف دیہات میں غریب خاندان اپنے بزرگوں کو جان بوجھ کر شیروں کی کچھار کی جانب بھیجتے ہیں جو ان درندوں کا نوالہ بن جاتے ہیں جس کے بدلے میں متاثرہ خاندان کو چند لاکھ کا معاوضہ مل جاتا ہے جب کہ موت کے اس تکلیف دہ کھیل میں خاندان کے بزرگوں کی مرضی شامل ہوتی ہے۔ حالیہ چند ماہ میں ایسے کئی واقعات دیکھنے میں آئے جب انتہائی غربت کے شکار خاندانوں نے معاوضے کی رقم کے عوض اپنے بزرگوں کو خونخوار شیروں کی جانب بھیجا اور ان کی بریدہ لاش ملی اور خاندان والوں نے متعلقہ وائلڈ لائف ڈیپارٹمنٹ سے ہرجانے کی رقم لاکھوں میں وصول کی۔ ٹائیگر ریزرو کے قانون کے مطابق اگر کوئی دیہاتی حادثاتی طور پر شیروں کا شکار بن جاتا ہے تو بھارتی حکومت انہیں معاوضہ دینے کی پابند ہے۔

بے لطف ہی دنیا میں جیے جاتا ہے
بے کیف یہاں سانس لیے جاتا ہے
زاہد مے گل رنگ سے انکار تجھے
کیوں خونِ جوانی کا کیے جاتا ہے

☆

دنیا کی اداؤں پہ مٹے جاتے ہیں
سامان تباہی کے کیے جاتے ہیں
پیری سے خمیدہ کہیں ہوتی ہے کمر
ہم بوجھ سے عصیاں کے جھکے جاتے ہیں
(پیری)

☆

آئے ہیں ترے مکتب دنیا میں قدوم
انساں ہے یہاں اپنے عمل سے موسوم
اک لفظ نو ایجاد ہے تیری ہستی
تو آپ ہی تجویز کر اپنا مفہوم
(انسان)

☆

ہر منکر حق صدق نوا ہو نہ سکا
منکر ہی رہا محوِ ثنا ہو نہ سکا
اللہ وہ تلفظ ہے زبانِ دل پر
جو بعض زبانوں سے ادا ہو نہ سکا
(حقائق ومعارف)

☆

اس دہر کو جس رخ سے جدھر سے دیکھا
محرومِ حقائق کی نظر سے دیکھا
جب سامنے آیا کوئی دولت کا غلام
شاعر نے حقارت کی نظر سے دیکھا
(شاعر)

وہ ایک باصلاحیت فنکار تھا لیکن اس کی وہ پذیرائی نہ ہوسکی جس کا وہ مستحق تھا۔ زندگی بھر سازشوں اور دشمنیوں کا شکار رہا۔ وہ خود کو شاعری کے بلند منصب پر فائز دیکھتا تھا لیکن اس کے برعکس ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ناروا سلوک کیا جا رہا تھا۔ وہ کچھ نہیں تو اس ناروا سلوک پر شکایت تو کرسکتا تھا۔ یہ شکایتیں اس نے رباعی کی زبان میں کیں اور جب مجموعہ رباعیات شائع ہوا تو ''برکات وطن'' کے عنوان سے اس مجموعے میں شامل کردیں۔

محسود کیا طرز سخن نے مجھ کو
مارا اس کم بخت چلن نے مجھ کو
میں نے تو روایات سخن زندہ کیں
پامال کیا اہل وطن نے مجھ کو

☆

مقصد یہ ہے برباد سخن ہو میرا
دل مخزن صدمات وطن ہو میرا
دجال کے بارے میں بھی اب شک ہے مجھے
ممکن ہے کوئی اہل وطن ہو میرا

☆......☆

اہل ہنر سے مخالفت اپنی جگہ لیکن اس کا نیا کاروبار ہیٹ بنانے کا کارخانہ خوب چل پڑا اور اسے مالی آسودگی حاصل ہوگئی۔ انگریزوں کا دور تھا اور وہ انگریزوں کے لیے ہیٹ بنا رہا تھا۔ اس کے بنائے ہوئے ہیٹ کلکتہ اور آس پاس کے شہروں میں بھیجے جاتے تھے۔ آمدنی خوب ہو رہی تھی۔ کام اتنا پھیل گیا کہ کئی کاریگر رکھ لیے اور کاروبار کی دیکھ بھال کے لیے کارخانے ہی میں رہائش اختیار کرلی۔ ان کاریگروں میں دو کاریگر بھائی مسیح اور طاہر بھی تھے جو اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔ دل سے چاہتے تھے کہ حیدر شادی کرلے۔ بار بار اصرار کرچکے تھے لیکن حیدر کو تو جیسے شادی کے نام سے چڑ ہوگئی تھی۔ کئی مرتبہ سختی سے منع کرچکے تھے۔ آخر دونوں بھائیوں نے مشورہ کرکے اسے اپنے گھر مدعو کیا۔ مقصد یہی تھا کہ شادی کی بات آگے بڑھائی جائے۔ حیدر نے ان کی دعوت قبول کرلی اور ان کے گھر چلے گئے۔ وہاں اس کی ملاقات ان دونوں بھائیوں کی والدہ سے ہوئی۔ ان کی والدہ میں حیدر کو اپنی والدہ کی جھلک دکھائی دی۔ وہی لب ولہجہ وہی انداز گفتگو۔ حیدر ان سے بے حد متاثر ہوا اور اکثر ان کے گھر جانے لگا۔ اس نیک دل خاتون نے انہیں شادی پر آمادہ کرلیا۔

''میرے بھائی کی بیٹی ہے امت النبی، بہت پیاری بچی ہے۔ ابھی کم عمر ہے تمہارے رنگ میں آسانی سے ڈھل جائے گی۔''

انہوں نے حیدر کو لڑکی کے باپ سے بھی ملوا دیا۔ ان کا نام شجاع الدین خان تھا۔ دلی میں جوتوں کا کاروبار کرتے تھے۔ حیدر ان سے مل کر بے حد متاثر ہوا۔ یہ سن کر تو ان سے ہمدردی ہوگئی کہ ان کی بارہ بیٹیاں ہیں وہ سوچنے لگا کہ اگر میں شادی کرلوں تو ان کا کچھ تو بوجھ ہلکا ہوگا۔ اس زمانے میں لڑکی دیکھنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اس نے طاہر کی

والدہ پر اپنی رضامندی ظاہر کردی۔ امت النبی اس کے گھر بیاہ کر آگئی لیکن حیدر اسے دیکھ کر بے حد آزردہ ہوا۔ اس کے سامنے دلہن کے روپ میں نو سالہ بچی تھی۔ اسے ظاہر کی والدہ پر غصہ تو بہت آیا لیکن وہ یہی کر سکتا تھا کہ اس نے اپنی نئی نویلی دلہن کو اس کے گھر بھیج دیا اور یہ گلہ بھی کیا کہ اتنی کم سن لڑکی کی شادی آپ کو نہیں کرنی چاہیے تھی۔

اس نے اس لڑکی کو طلاق نہیں دی لیکن گھر میں بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔

وہ پھر اکیلا رہ گیا۔

پھر وہی شب و روز وہی شاعری وہی کاروبار۔ اُمید پہ دنیا قائم ہے۔

کافر عشق ہی اس وقت بھلے ہیں حیدر
کبھی اللہ نے چاہا تو مسلماں ہوں گے

اسی دوران وہ اپنی بھانجی سرور جہاں کے گھر بیٹھا تھا کہ ایک لڑکی لپک جھپک گھر میں داخل ہوئی مگر الٹے قدموں بھاگ بھی گئی۔

"کون تھی یہ لڑکی؟" حیدر نے پوچھا۔

"اچھی تھی نا۔" سرور جہاں نے شوخی سے کہا۔

"میں نے تو اس غریب کو دیکھا تک نہیں۔ میں تو صرف یہ پوچھ رہا ہوں کہ کون تھی۔"

"تھی آپ کی ایک عاشق زار، آپ کا نام سن کر آہیں بھرتی ہے۔ اکثر میرے پاس آکر بیٹھ جاتی ہے اور آپ کی باتیں کرتی ہے۔ آپ کے سینکڑوں شعر اسے یاد ہو گئے ہیں۔"

"کمال ہے بھئی، ہماری اتنی قدر دان اور ہمیں معلوم تک نہیں۔" حیدر نے ازراہ مذاق کہا۔

"اب تو معلوم ہو گیا۔ اپنے مریض کا کچھ تو علاج کیجیے۔"

"افسوس کہ ہم شاعر ہیں ڈاکٹر نہیں۔"

"اس کا علاج شاعر ہی کے پاس ہے۔"

بات مذاق سے شروع ہوئی تھی مذاق پر ختم ہو گئی۔

حیدر اسے مذاق سمجھ رہا تھا لیکن یہ مذاق سنجیدگی اختیار کر گیا۔ تمام بہنیں بھی اس میں شامل ہو گئیں۔ ایک مرتبہ پھر اس پر زور دیا جانے لگا کہ وہ اس لڑکی یعنی ظفر جہاں سے شادی کر لے۔

"میری شادی امت النبی سے ہو چکی ہے۔"

"آپ خود ہی کہتے ہیں وہ نو سال کی بچی تھی۔ آپ نے اسے اس کے گھر بھیج دیا۔"

"تو کیا غلط کیا۔"

"جب وہ چلی ہی گئی تو کیا رکاوٹ رہ گئی۔"

"میں نے اسے طلاق نہیں دی ہے اور نہ دینا چاہتا ہوں۔"

"اس کے ہوتے ہوئے بھی شادی ہو سکتی ہے۔ ظفر جہاں آپ کو پسند کرتی ہے وہ آپ کا ہر طرح خیال رکھے گی۔"

بہت بحث مباحثہ ہوا اور آخر یہ طے ہوا کہ کسی کے علم میں لائے بغیر یہ شادی کرلی جائے۔ جب بات کھلے گی اس وقت دیکھا جائے گا۔

سرور جہاں نے حیدر دہلوی کی والدہ اصغری بیگم سے بات کی تو انہوں نے فوراً قبول کرلیا کیونکہ وہ اپنی بیٹی کی پسند کو جانتی تھیں۔

اس شادی کو خفیہ رکھا گیا۔ حیدر نے نئی بیوی ظفر جہاں کو کارخانے کے ایک حصے میں رکھا جہاں وہ رہائش پذیر تھے۔ یہ شادی اس وقت تک خفیہ رہی جب تک اس کا پہلا بیٹا پیدا نہیں ہو گیا۔ بیٹے کی پیدائش کی خبر کسی نہ کسی طرح امت النبی کے گھر پہنچ گئی۔ وہاں تو رونا پیٹنا شروع ہو گیا۔

امت النبی کی والدہ تو سخت چراغ پا ہوئیں اور قانونی چارہ جوئی کرنے کی دھمکیاں دینے لگیں لیکن اس کے سسر نہایت سمجھدار شخص تھے۔ انہوں نے کوئی قدم اٹھانے سے پیشتر حیدر کو بلوا بھیجا اور ساری بات سن کر اسے تسلی دی۔

"آپ کی دوسری بیوی بھی ہماری بیٹی کی طرح ہے۔ آپ اسے بھی یہاں لے آئیں۔ دونوں بہنیں ساتھ مل کر رہیں گی۔"

حیدر اپنی بیگم ظفر جہاں کو بھی وہیں لے آیا۔

اس طرح ہنسی خوشی رہتے ہوئے دو سال ہوئے تھے کہ تحریک پاکستان نے زور پکڑا اور ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ سائل دہلوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ بیخود دہلوی مشاعروں سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ ایسے میں حیدر دہلوی ہی دہلی سے مانے ہوئے استاد شاعر کے طور پر مشہور تھے۔ اس کی غزلیں ہر طرف دھوم مچا رہی تھیں۔ ریڈیو کے ادبی پروگراموں میں اسے مدعو کیا جا رہا تھا۔ ہر طرف اس کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ہندو شعرا کو اس کی یہ شہرت قطعی پسند نہیں تھی۔ وہ مذہبی تعصب کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ان تمام تعصبات اور اذیتوں کو اس نے اپنی غزلوں کا حصہ بنالیا۔

بہت ہی تنگ ہے حیدر فضائے دہلی سے
خدا پناہ میں رکھے بس اب یہاں سے مجھے

☆

اس برے وقت میں مجھے حیدر
حق نے کس جرم میں کمال کیا

☆

غالب کے بعد دلی کی حیدر سے لاج تھی
وہ بے نوا فقیر بھی گوشہ نشیں ہے آج

☆

کیا سوچ کر ہیں درپے آزار ہم وطن
حیدر سے ان کو ضد ہے کہ علم و ادب سے ضد

☆

حیدر برا ہے عملہ علم و فن کا حشر
زندہ مثال سامنے مجھ ناتواں کی ہے

وہ ایک نامور استاد شاعر کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا مگر وہ ہندو شعراء کی آنکھ میں کھٹکتا تھا۔ وجہ صرف اتنی تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے مشاعروں میں کسی اور کا چراغ نہیں جل سکتا تھا۔

پاکستان کا قیام دلی کے مسلمانوں کے لیے موت کا پیغام بن گیا۔ بے دریغ قتل عام ہونے لگا۔ محلے کے محلے اس کی لپیٹ میں آگئے۔ بڑے پیمانے پر ہجرت ہونے لگی۔ جو بھاگ سکتے تھے بھاگ گئے جو رہ گئے تہ تیغ کر دیے گئے۔ حیدر دہلوی پر ہاتھ ڈالنا اتنا آسان نہیں تھا لہٰذا اسے ٹھکانے لگانے کے لیے خفیہ سازشیں ہونے لگیں۔ ان سازشوں کا علم جب اس کے دوستوں کو ہوا تو سخت فکر مند ہوئے اور اسے مشورہ دینے لگے کہ وہ پاکستان چلا جائے۔ اس کے کئی عزیز شاگرد اور رشتہ دار ہجرت کر چکے تھے لیکن وہ کسی قیمت پر دلی چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔ اس نے کئی دوستوں کو اپنی نگرانی میں بہ حفاظت لال قلعہ پہنچایا جہاں سے وہ دیگر مسلمانوں کے ساتھ ہجرت کر گئے لیکن وہ خود جما بیٹھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ حالات سدھر جائیں گے لیکن دلی کی زمین اس پر تنگ کر دی گئی۔ خبریں عام تھیں کہ یا تو اسے قتل کر دیا جائے گا یا پھر گرفتار کر لیا جائے گا۔ اب عزت و آبرو خطرے میں تھی۔ اس نے باول نخواستہ دلی چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔

اس فیصلے پر عملدرآمد اتنا آسان نہیں تھا۔ حریفوں سے بچ کر نکلنا آسان نہیں تھا۔ دشمن اس کی تلاش میں تھے۔

1949ء میں وہ اپنے عزیز و اقارب کے ہمراہ رات کے اندھیرے میں غازی آباد کے راستے کلکتہ روانہ ہوا۔ خیال یہ تھا کہ یہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز کراچی چلا جائے گا۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ ہوائی جہاز سے کراچی جانے کے لیے اسے دوبارہ دلی جانا پڑے گا لیکن اب دوبارہ دلی میں داخل ہونا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کیا کرتا ہندوستان میں کہیں بھی رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس نے ڈھاکا جانے کا فیصلہ کرلیا۔

ڈھاکا پہنچ کر اس نے حسب حال یہ رباعی کہی جو خاصی مشہور ہوئی۔

جو کچھ تھا میر وہ گنوا کے آئے
ارباب سیاست پہ لٹا کے آئے
اک قلعہ اعزاز و طرب تھی دلی
اس قلعے کو ہم توڑ کے ڈھاکے آئے

یہ بالکل وہی ماجرا تھا جس نے میر تقی میر کی زبان سے کہلوایا تھا۔

جس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

ڈھاکا پہنچتے ہی سب سے پہلا مرحلہ رہائش کا درپیش تھا۔ ڈھاکا میں اس کے بہت سے چاہنے والے موجود تھے۔ ان میں منظور اشعر بھی تھے۔ ہوٹل میں سامان رکھ کر وہ انہیں ڈھونڈنے نکلا۔ مختلف چائے خانوں میں تلاش کرتا رہا۔ جو شاعر صورت نظر آتی اس سے پوچھتا بالآخر اس نے منظور اشعر کو تلاش کرلیا۔ استاد کی پتا سن کر وہ دکھی تو ضرور ہوا لیکن حالات سے پوری طرح واقف نہ ہونے کی وجہ سے وہ یہ کہنے پر بھی مجبور ہوگیا۔

''حیدر صاحب، اگر آپ دلی ہی میں رہتے تو زیادہ اچھا تھا۔ یہ ڈھاکا ہے۔ یہاں آپ کو وہ ادبی ماحول نہیں مل سکے گا۔''

یہ سنتے ہی حیدر جلال میں آگیا۔

''تمہیں خبر ہے وہاں میری جان کو کتنا بڑا خطرہ ہوگیا تھا۔ اپنے بیگانے سب میرے دشمن بنے ہوئے تھے۔ میں کبھی نہ آتا لیکن جب مجھ پر حملہ ہوا تو مجھے اپنی عزت و آبرو خطرے میں نظر آئی۔''

''حملہ! کیسا حملہ؟''

''میں حسب معمول صبح کی سیر کے لیے ایڈورڈ پارک گیا ہوا تھا کہ چند غنڈوں نے مجھ پر ہاکیوں سے حملہ کر دیا۔

میری ٹانگ ٹوٹ گئی۔ کئی مہینے بستر پر پڑا رہا۔ کیا اس کے بعد بھی دلی نہ چھوڑتا۔"

"یہ غنڈے کون تھے۔"

"جتنے منہ اتنی باتیں مجھے تو بس اتنا معلوم ہے کہ میری ٹانگ ٹوٹی تھی۔ ابھی زندگی کی ڈور نہیں ٹوٹی تھی اس لیے یہاں چلا آیا۔"

"اتنی بڑی خبر تھی لیکن کسی ذریعے سے ہم تک نہیں پہنچی۔"

"میرا کلام تک دنیا سے چھپایا جاتا ہے یہ خبر کیسے پہنچتی۔"

منظور اشعر کی کوشش سے اسے مہاجن پور لائن میں کرائے پر مکان مل گیا اور وہ ہوٹل سے اس مکان میں دونوں بیویوں کے ساتھ منتقل ہو گیا۔

دوسرے دن شہر میں گھومنے کے لیے نکلا تو منظور اشعر کا کہا ٹھیک معلوم ہوا۔ کہاں دلی کہاں ڈھاکا۔ عجیب عجیب صورتیں نظر آئیں۔ ایسی اردو سننے کو ملی کہ کوفت کے سوا کچھ نہ ملا۔ اسے پھر میر تقی میر یاد آ گئے جو دلی سے لکھنو گئے تھے اس پر بھی بات کرنے سے گریز کرتے تھے کہ صاحبو تمہارا کچھ نہیں جائے گا میری زبان بگڑے گی۔ وہ تو لکھنو گئے تھے حیدر تو ڈھاکا آ گیا تھا۔

اس نے اپنی عادت کے مطابق یہ بھی سوچا ہو گا کہ کچھ دن رہ لوں سب کی اردو ٹھیک کر دوں گا۔

شاعری کی سلطنت فتح کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ روزگار کا کوئی ذریعہ پیدا کیا جائے۔ نوکری زندگی بھر نہیں کی تھی اب کیا کرتا۔ اس کی .... بیگم ظفر جہاں نے کلکتہ اسٹیشن پر جامہ تلاشی لینے والوں کی نظر بچا کر کچھ رقم اپنے برقعے کی ٹوپی میں رکھ لی تھی یہ رقم انہوں نے حیدر کے آگے رکھ دی۔ اسی رقم سے اس نے کپڑے اور جوتوں کی بہت بڑی دکان بنائی دکان پر ایک ملازم بھی رکھ لیا۔ دکان کے اوپر ہی رہائش کا بندوبست کر لیا۔

کاروبار جم جانے کے بعد اس نے مشاعروں کا رخ کیا۔ چند مشاعروں میں شرکت کے بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ یہاں کی فضا کچھ اور ہے۔ اس کا خیال تھا کہ یہاں بھی وہ کوئی حافظ کا ہوٹل تلاش کر لے گا۔ ایک مرتبہ پھر دلی والا ماحول بن جائے گا لیکن دریا میں اترنے کے بعد معلوم ہوا دریا کتنا گہرا ہے۔ ڈھاکا کے ادبی حلقوں کی حکمرانی عندلیب شادانی کے ہاتھ میں تھی۔ عموماً انہی کے ہاں مشاعرے منعقد ہوتے یا پھر مشاعروں کی نظامت کے فرائض انجام دیتے۔ یہ فریضہ اس لیے بھی وہ انجام دیتے تھے کہ ہر شاعر کو بلانے سے پہلے پچھلے شاعر کی زمین میں فی البدیہہ شعر پڑھ کر بلاتے تھے گویا منظوم نظامت ہوتی تھی جس سے مشاعرے کا رنگ دوبالا ہو جاتا تھا۔ اس فن میں انہیں مہارت حاصل تھی اور داد کے حق دار بنتے تھے۔ تمام شاعر ان سے ڈرتے رہتے تھے کہ نظامت ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے اگر ناراض ہو گئے تو غلط مقام پر پڑھوا دیں گے۔ ان سے بنا کر رکھی جائے۔ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے لہٰذا طلبہ کی طاقت بھی ان کے ساتھ تھی۔ رام پور کے رہنے والے تھے پٹھانوں کی اکڑ بھی ان میں تھی۔ غصہ ایسا کہ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیں۔ استادی کا زعم بھی تھا۔ حیدر دہلوی کی آمد سے ایک نیام میں دو تلواروں والا معاملہ ہو گیا۔ نہ یہ دبنے والے نہ وہ جھکنے والے۔ چھوٹی موٹی جھڑپیں شروع ہو گئیں۔

یوم اقبال کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ حیدر دہلوی بھی اس مشاعرے میں مدعو تھا۔ حسب معمول عندلیب شادانی نظامت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ عندلیب شادانی نے اسے غلط مقام پر بلایا لیکن حیدر نے دل پر جبر کیا اور غزل پڑھی۔

دل مست، فضا مست، صبا مست، نظر مست
سب لطف سے ساقی کے کیے بعد دگر مست
اللہ رے جوانی کا دل آویز زمانہ
ہر چند کہ تاریک ہے یہ رات مگر مست
رفتار تری ہے کہ برستا ہوا بادل
جس راہ سے تو گزرے وہی راہ گزر مست

مشاعرے میں حیدر دہلوی کو خوب داد ملی۔ جب غزل پڑھ کر وہ اسٹیج سے اتر گیا تو عندلیب شادانی نے اس کی زمین میں یہ شعر پڑھا

کیا مست غزل حضرت حیدر نے سنائی
وہ بیں اُدھر مست ہیں وہ بیں اِدھر مست

اس شعر میں اگرچہ حیدر دہلوی کے خلاف کوئی بات نہیں تھی لیکن اس جیسے نازک طبع کے لیے بھی بہت تھا کہ اس کے سنجیدہ کلام کو پیروڈی میں ڈھال کر مزاحیہ رنگ دیا جائے۔ اس نے اس تضحیک کو محسوس کیا اور عندلیب شادانی کی طرف سے اس کے دل میں ایک گرہ کا اضافہ ہو گیا۔

انہی دنوں ڈھاکا ریڈیو کے ایک مشاعرے میں

عندلیب شادانی نے کچھ ایسی ہی چوٹ کی تو حیدر دہلوی ضبط نہ کرسکا اور اس کا جواب ایک رباعی میں دیا۔

ہر چند کہ ہجرت زدہ انسان ہوں میں
معتوب سیاست ہوں پریشان ہوں میں
اے ابن ادب تنگ نگاہی سے نہ دیکھ
اس عہد کی تاریخ کا عنوان ہوں میں

اساتذہ دہلی کی صف میں نمایاں شخصیت نواب سائل دہلوی نہایت وضع دار بزرگ تھے۔ چلنے سے معذور ہونے کے باوجود دہلی میں حافظ ہوٹل پر رکشا میں بیٹھ کر تشریف لاتے تھے اور حیدر دہلوی سے گھنٹوں مصروف گفتگو رہتے تھے۔ ایک روز حسب معمول تشریف لائے۔ حیدر دہلوی اتفاق سے تشریف نہ رکھتے تھے۔ نازش حیدری اور ایک دوسرے شاگرد نے انہیں سہارا دے کر رکشا سے اتارا اور بٹھایا۔ سائل دہلوی دونوں سے مخاطب ہو کر بولے۔

''میاں! تم جانتے ہو تمہارے استاد کیا ہیں؟''

دونوں نے نواب صاحب کے اس سوال کی وضاحت چاہی۔ سائل دہلوی نے اپنا ہاتھ ناک پر لے جا کر فرمایا، تمہارے استاد یہ ہیں۔ ہم سمجھتے تھے کہ میرے اور بیخود کے بعد دلی مر جائے گی مگر حیدر دلی کی ناک ہیں ہمیں اطمینان ہے کہ دلی نہیں مر سکتی۔

یہ تھا وہ حیدر دہلوی جسے سائل دہلوی دلی کی ناک کہہ رہے تھے۔ وہی حیدر دہلوی تھا جو ڈھاکا میں بے نوا بنا ہوا تھا اور زبان حال سے کہہ رہا تھا

غالب کے بعد دلی کی حیدر سے لاج تھی
وہ بے نوا فقیر بھی گوشہ نشیں ہے آج

اسے اپنی قدر و منزلت کا شدت سے احساس تھا مگر دلی کی طرح یہاں بھی اس کی شعری صلاحیتیں اس کی دشمن بن گئیں۔ دلی میں بھی حریفوں کا سامنا تھا یہاں بھی عندلیب شادانی سے ٹھن گئی۔ شادانی سے مخالفت کا مطلب پورے ڈھاکا کی مخالفت تھا۔ ڈھاکا کی ادبی فضا عندلیب شادانی کے اثر میں تھی اور عندلیب شادانی سے اس کی بن نہیں رہی تھی۔ اس کی فطرت میں ایک فنکارانہ انا تھی جس کا مظاہرہ اکثر ہو جایا کرتا تھا۔ لوگ اس انا کو اس کا غرور سمجھتے تھے حالانکہ اس کی طبیعت میں غرور نہیں تھا ہاں جب اسے اپنی ناقدری کا احساس ہوتا تھا تو پھر اس کا بھڑک جانا لازمی تھا اور چونکہ مشکل سے مشکل وقت میں وہ جھکنا نہیں جانتا تھا اس لیے مغرور سمجھا جاتا تھا۔ عندلیب شادانی اس کے اس

آپ نے پیرس اگر دیکھا نہیں تو اس شہر کی تصویریں ضرور دیکھی ہوں گی۔ آپ کو واضح طور پر دکھائی دے گا کہ پیرس میں یوں تو بہت اونچی اونچی عمارتیں ہیں لیکن وسطی پیرس میں ایسی اونچی اونچی عمارتیں نہیں بنائی گئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ پیرس کے حسن کو برقرار رکھنے کے لیے ایسی پلاننگ کی گئی ہے۔ بلکہ اس کی وجہ ایک خطرناک غلطی ہے۔ تیرہویں صدی میں (جہاں اب پیرس آباد ہے) جپسم اور چونے کے بہت بڑے بڑے ذخائر تھے اور کان کنی کی جاتی تھی۔ اس مقصد کے لیے لاتعداد سرنگیں بنائی گئی تھیں۔ جو بہت دور تک پھیلتی چلی گئی تھیں۔ وہاں ایک طرف تو سرنگوں سے کام لیا جا رہا تھا۔ اور دوسری طرف پیرس شہر کی بنیادیں رکھی جا رہی تھی۔ عمارتیں بنائی جا رہی تھی۔ لیکن کسی نے یہ جاننے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ ان سرنگوں کے جال کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ان سرنگوں کے اوپر ہی عمارتیں بننی شروع ہو گئیں۔ پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ جب شاخ نازک پر آشیانہ بنایا جائے گا تو ایسا ہی ہوگا۔ عمارتیں دھڑا دھڑ گرنے لگیں اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پھر کنگ لوئس کو تشویش ہوئی۔ اس نے ماہرین کی ایک ٹیم مقرر کی کہ دیکھو یہ کیا معاملہ ہے۔ انہوں نے رپورٹ دی کہ بادشاہ سلامت پورا پیرس ہی خطرے میں ہے۔ اب اس عظیم الشان غلطی کی اصلاح نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی لیے یہ طے پایا کہ سینٹرل پیرس یعنی وسطی پیرس میں اونچی عمارتیں نہ بنائی جائیں۔

مرسلہ: ندیم مرزا، حیدرآباد

قطرت کو نہ سمجھ سکے یا انہیں یہ احساس ہوا کہ حیدر ان کے لیے خطرہ بن سکتا ہے لہٰذا وہ انہیں نیچا دکھانے پر تل گئے۔ عندلیب شادانی بہت پہلے سے ڈھاکا میں تھے۔ ان کا ایک حلقہ اثر تھا جب کہ حیدر کے قدم ابھی یہاں نہیں جمے تھے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ حالات سازگار ہو جائیں گے لیکن فضا ان کے خلاف ہوتی چلی گئی۔ یہاں کے مشاعرے معرکہ آرائیاں بنتے گئے۔

اگر اہل فن کی نہیں قدر حیدر
تو پھر کیا رہے گا کوئی فن سلامت

وہ ان معرکہ آرائیوں سے گھبرانے والا نہیں تھا۔ ان حالات سے لڑتا رہا۔ مشاعروں میں شریک ہوتا رہا۔ اپنے اس عزم پر قائم رہا۔

یہ ہم صفیر کیا مری وسعت کو پا سکیں
سب سے زیادہ طائر رفعت پسند ہوں

اس ڈھاکا میں اس نے لیاقت علی خان کی شہادت کی خبر سنی۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ’’اب پاکستان گیا۔‘‘ اس روز وہ گھر میں داخل ہوا تو اس نے بچوں کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ دونوں بیویوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آخر چھوٹی بیگم نے ہمت کی۔ ’’سرتاج خیریت تو ہے۔ باہر کسی سے کوئی بات ہوئی ہے؟ آپ اس سے پہلے اس طرح تو کبھی گھر میں داخل نہیں ہوئے۔ وقار آپ کو دیکھ کر آپ کی طرف لپکا اور آپ نے اسے جھڑک دیا۔ نگہت کو بھی آپ نے منہ نہیں لگایا۔ کیا بات کیا ہے۔‘‘

’’جانتی ہو آج کیا ہو گیا ہے۔‘‘

’’کیا ہو گیا ہے؟‘‘

’’آج وہ ہو گیا ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیاقت علی خان کو بھرے جلسے میں گولی مار دی گئی اور یہ کام ہندوستان کی سرزمین پر نہیں پاکستان میں ہوا ہے اور دکھ کی بات یہ ہے کہ یہ محسن کشی اپنوں کے ہاتھوں سرزد ہوئی ہے۔ کتنی قربانیاں دے کر ہم نے یہ ملک حاصل کیا تھا۔ سازشیں یہاں بھی سرگرم ہو گئی ہیں۔ اب اس ملک کا کیا ہوگا۔‘‘

دونوں بیویاں خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ اس کے جذبے کو دیکھ رہی تھیں۔ آخر بڑی بیگم نے اسے تسلی دی۔ ’’واقعی یہ تو بہت برا ہو گیا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس ملک کو کچھ نہیں ہوگا جس اللہ نے یہ ملک دیا ہے وہی اس کی حفاظت بھی کرے گا۔‘‘

اس حادثۂ جاں کاہ نے اسے کئی دن بے حال رکھا۔ وہ اب تک ڈھاکا میں جیسے تیسے دن گزار رہا تھا لیکن اب اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ اس نے یہاں سے رخصت ہونے کی ٹھان لی۔ بڑی وجہ عندلیب شادانی سے کھٹ پٹ تھی۔ لاہور میں اس کی بھانجی اور بعض سسرالی رشتہ دار رہائش پذیر تھے۔ بعض شاگرد بھی تھے۔ لاہور کے ادبی ماحول سے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا تھا۔ لاہور ادبی جرائد اور اخبارات کا گڑھ تھا۔ نامور ادیب و شاعر یہاں موجود تھے چائے خانے آباد رہا کرتے تھے۔ پاک ٹی ہاؤس کی شہرت ڈھاکا تک سنائی دے رہی تھی۔ یہ سب باتیں تھیں جس نے اس کی توجہ لاہور کی طرف مبذول کر دی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ہجرت کی اور ڈھاکا چھوڑ کر لاہور آ گیا۔

لاہور آیا تو اپنی بھانجی کے شوہر احمد بخاری کے گھر ٹھہرا۔ یہ دولتانہ کی وزارت کا دور تھا۔ احمد بخاری ان دنوں مسلم لیگ کے صدر تھے۔

جب وہ چند روز کی مہمان داری کا لطف اٹھا چکا تو احمد بخاری نے دولتانہ کی خوشنودی کے لیے اپنی بیگم سے کہا وہ اپنے ماموں سے درخواست کریں کہ وہ دولتانہ کی شان میں ایک قصیدہ لکھ دیں۔ حیدر نے یہ فرمائش قبول کر لی۔

جب آٹھ دن گزر گئے تو احمد بخاری نے اس سے قصیدے کے بارے میں پوچھا۔ حیدر نے آنکھیں نیچی کر لیں۔

’’مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔ آپ میرے داماد ہیں آپ جو حکم کریں میں ماننے کو تیار ہوں لیکن قصیدہ لکھنا میری طبیعت کے خلاف ہے۔‘‘

احمد بخاری یہ صاف جواب سن کر مایوس تو ضرور ہوئے لیکن ہمت نہیں ہاری۔ انہوں نے اپنی بیگم سے ایک مرتبہ پھر کہا۔

’’تم حیدر صاحب پر پھر زور دے کر دیکھو۔ انہوں نے اگر قصیدہ لکھ دیا تو میری بڑی بات بن جائے گی۔ ممکن ہے حیدر صاحب کو بھی کوئی گراں قدر انعام مل جائے۔ بھئی ہمارے سسر اگر شاعر ہیں تو ہمیں کوئی فائدہ بھی پہنچنا چاہیے۔‘‘

اس کی بھانجی نے من و عن یہی باتیں حیدر کے کان میں ڈالیں اور اسے قصیدہ لکھنے پر آمادہ کرنا چاہا۔ حیدر طیش میں آ گیا اور وہ باتیں کہہ گزرا جو وہ احمد بخاری سے نہیں کہہ سکتا تھا۔

مجھے اگر دولت کمانا ہوتی تو حیدر آباد اور ٹونک کی ریاستیں کم نہیں تھیں۔ ان ریاستوں کی طرف سے کئی بار پیشکش ہوئی کہ وہ ان کے پاس آجائیں مگر میرے نزدیک شاعری ایک شریف فن ہے۔ میرے اشعار میری اولاد کی طرح ہیں میں انہیں فروخت کر کے بردہ فروشی کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔ آئندہ مجھ سے تقاضا مت کرنا۔

اس کے بعد سرور جہاں کو اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اس سے تقاضا کرتی۔ حیدر دہلوی ایسا غیور تھا کہ سخت تنگدستی کے عالم میں بھی کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اس وقت بھی وہ ضرورت مند تھا۔ ڈھاکا میں کاروبار ختم کر کے آیا تھا۔ لاہور میں سر چھپانے کی جگہ کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ وہ قصیدہ لکھ کر دو لتانہ سے کسی کاروبار کی خواہش کرسکتا تھا لیکن اس کی خودداری نے یہ موقع گنوا دیا۔

اس کا چہیتا شاگرد شہاب دہلوی بہاولپور میں تھا۔ کئی سرکاری عہدوں پر رہ چکا تھا۔ نہایت اثر ورسوخ رکھتا تھا۔ وہ نہ صرف حیدر کا شاگرد تھا بلکہ احسن پر اس کے احسانات بھی تھے۔ جب وہ دہلی میں تھا حیدر دہلوی نے کئی شاگردوں کی ناراضگی مول لے کر اسے اپنے رسالے الہام کا ایڈیٹر بنا دیا تھا جب کہ وہ اس وقت محض اٹھارہ سالہ طالب علم تھا۔ شہاب دہلوی ان احسانات کو بھولا نہیں تھا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ اس کے استاد لاہور میں ہیں اور کسمپرسی میں ہیں تو وہ خود لاہور آیا اور حیدر دہلوی کو اپنے ساتھ بہاولپور لے گیا۔

شہاب دہلوی کا خاندان علمی وادبی روایات کا امین تھا۔ ان کے والد بھی کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کے دادا بھی ادیب وصحافی تھے۔ شہاب دہلوی کے ننھیالی بزرگ بہاولپور میں تقریباً ایک سو سال سے مقیم تھے۔ یہی کشش تھی جو شہاب کو 1947ء میں بہاولپور لے آئی۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے ماہنامہ الہام کا دوبارہ اجراء کیا۔ صحافت کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ بہاولپور میں بلدیاتی انتخاب ہوئے تو ایک نشست پر مسلم لیگ گروپ کی طرف سے شہاب دہلوی کو الیکشن میں کھڑا کیا گیا اور شہاب دہلوی بلدیہ بہاولپور کے ممبر منتخب ہو گئے۔ اس فتح کے بعد شہاب دہلوی کو احساس ہوا کہ وہ سیاست کے مرد میدان نہیں۔ اس کے بعد وہ پوری طرح صحافت کی طرف مائل ہو گئے۔ وہ ادب وصحافت میں سرگرم ہو گئے مختلف جرائد واخبارات کی نمائندگی کرتے رہے۔ وہ پریس کلب کے بانی اراکین میں شامل تھے۔ انہیں حکومت کی طرف

اسپنسر کو رنگ برنگے کاغذ پر لکھنے کا شوق تھا۔ اس کے پاس ہر رنگ کے کاغذ تھے۔ جن کے اس نے رائٹنگ پیڈز بنا رکھے تھے۔ اور وہ اپنی یادداشتیں رنگین کاغذوں پر تحریر کیا کرتا۔ ایک بار وہ ایک ایسا گوند بنانے کی کوشش کر رہا تھا جس سے چیزوں کو بہت مضبوطی کے ساتھ جوڑا جا سکے۔ اس کی میز پر نہ جانے کیسی کیسی اشیا پھیلی ہوئی تھیں۔ طرح طرح کے کیمیکلز اور نہ جانے کیا کیا۔ وہ گوند بنانے کے مرحلے میں تھا۔ اس کی انگلیاں گوند سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ اس کیفیت میں اس کی انگلیاں قریب رکھے ہوئے رنگین کاغذوں سے مس ہو گئیں۔ اور ان خوبصورت رنگین کاغذات پر گوند لگ گئے۔ اسے اپنی اس غلطی پر بہت افسوس ہوا۔ اور غصہ بھی آیا۔ کیونکہ وہ ان کاغذات کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ اس نے جب ان کاغذات کی طرف دھیان دیا تو گوند لگے ہوئے کاغذات آسانی سے الگ بھی ہو گئے۔ پھر اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے ان رنگین کاغذات کی پرچیاں بنالیں اور ان کے کناروں پر وہی گوند لگا کر ایک دوسرے کے ساتھ چپکاتا چلا گیا۔ اور اس طرح جو ایجاد سامنے آئی وہ آپ کے سامنے ہے۔ جی ہاں اسے پوسٹ اٹ نوٹ کہتے ہیں۔ ہر اسٹیشنری کی دکان پر مل جائے گی۔ رنگین کاغذات کی بے شمار پرچیاں۔ ایک دوسرے کے ساتھ چپکی ہوئی۔

کسی کو اپنا فون نمبر یا کچھ اور لکھ کر دینا ہو تو ایک ایک پرچی الگ کرتے جائیں اور اپنا کام کرتے رہیں۔ بظاہر معمولی سی ایجاد لیکن کتنی اہم ہے۔

مرسلہ: زاہد خان، دینہ

سے تمغۂ خدمت بھی ملا تھا۔ انہوں نے الہام کے علاوہ ایک ادبی مجلہ الزبیر بھی شروع کیا۔

شہاب دہلوی نے اپنے استاد کی نہایت شاندار مہمان داری کی۔ ان کے اعزاز میں ایک عظیم الشان مشاعرے کا انعقاد کیا۔ اس مشاعرے میں بہاولپور اور اردگرد کے شعراء اس عظیم شاعر کو سننے کے لیے آئے۔

حیدر نے ایک ساتھ کئی غزلیں پیش کیں۔

اگر ذرا بھی شب ہجر لطف خواب اٹھا
تڑپ کے بستر مشرق سے آفتاب اٹھا
ذرا سی فرصت ہستی پہ سرکشی اتنی
خودی کے نشے میں ڈوبا ہوا حباب اٹھا
یہ جام و بادہ یہ صحنِ چمن یہ ابر بہار
سنبھل کے بیٹھ مغنی ذرا رباب اٹھا
امید دید خیال حیات، خوف ممات
یہ سب حجاب ہیں حیدر یہ سب حجاب اٹھا

☆

نمو کے جوش میں ذوقِ فنا حجاب بنا
شریک بحر جو قطرہ ہوا حباب بنا
تو آپ اپنے ہی جلوؤں میں رہ گیا گم کر
ترا ہی عکس ترے حسن کا جواب بنا
بچھڑ کے تجھ سے ترا سایہ جہاں افروز
سحر کو مہر بنا شب کو ماہتاب بنا
نہ مٹ سکے گا ترا نقش لوح فطرت سے
نہ بن سکے گا نہ اب تک ترا جواب بنا

☆

اپنے گھر ورش پہ احباب کے مشکل سے چلا
میں جنازے کی طرح کوچہ قاتل سے چلا
کبھی رویا کبھی ہر نقش قدم پر تڑپا
میں تری راہ میں آنکھوں سے کبھی دل سے چلا

☆

تیرے جلوؤں کو اس انداز سے مستور کیا
ہر فرشتے نے طواف دل رنجور کیا
ابتدا ہے کا تو آغاز نہ انجام کوئی
ختم اک لفظ پہ افسانہ منصور کیا

شاعروں کی طرف سے اصرار کے بعد حیدر نے چند رباعیاں بھی سنائیں۔ یہ وہ رباعیاں تھیں جو اس کے مجموعہ رباعیات میں شامل نہیں تھیں۔

چھٹکارا غم داغ سے ہو گا کیونکر
منہ دیکھیں گے اب مرگ و لحد کا کیونکر
پیری میں سکت بھی نہیں دنداں بھی نہیں
کاٹیں گے ہم اب عمر کا رشتہ کیونکر

☆

اب دن ہیں تعیش کے نہ عہد طفلی
ہر وقت ہے درپیش عذاب پیری
کافور ہوں سبزہ خط کی صورت
اللہ رے جوانی تری طوطا چشمی

☆

کیوں اتنے پسِ ترک وطن شاق ہیں ہم
اس مملکت پاک کے خلاف ہیں ہم
ماضی کی روایات ہیں زندہ ہم سے
تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق ہیں ہم

اس مشاعرے کی صبح ہوئی تو بہاولپور کے شعرا شہاب دہلوی کے مکان پر جمع ہوئے۔ یہاں بھی شاعری کے دور چلے۔ اثنائے گفتگو یہ بھی اصرار ہونے لگا کہ حیدر کو اب مستقل بہاولپور میں رہنا چاہیے۔ بہاولپور میں رہیں تو کریں کیا۔ شہاب دہلوی انہیں لائے تھے۔ تو کچھ سوچ کر ہی لائے تھے۔

بہاولپور میں ان کے نام کچھ زمینیں الاٹ کردی گئیں جن کی فصلوں سے ہونے والی آمدنی سے ان کا بہت اچھی طرح گزارہ ہوسکتا تھا۔

ڈھاکا، لاہور اور کراچی کے مقابلے میں بہاولپور ایسی جگہ نہیں تھی جہاں ان کا دل لگتا۔ چند ماہ بعد ہی وہ اکتانے لگا کراچی میں ایسے بہت سے شاعر جمع ہوگئے تھے جنہیں وہ حافظ ہوٹل دہلی میں چھوڑ کے آیا تھا۔ انہی دنوں جب ایک مشاعرے میں اس کا کراچی آنا ہوا اور چند روز قیام کا موقع ملا تو اسے یہاں کی ادبی فضا نے اپنا اسیر بنالیا۔

اس وقت کراچی میں ادبی محافل عروج پر تھیں۔ بہت سے بزرگ اساتذہ سخن کراچی میں موجود تھے جن میں جوش ملیح آبادی سیماب اکبرآبادی، حیدر دہلوی، اسد شاہ جہاں پوری، سید آل رضا، سید ہاشم رضا، ارم لکھنوی، جمیل الدین عالی، ادیب سہارن پوری اور کئی دوسرے نامور استاد شاعر شامل تھے۔

اس کے شاگردوں میں نازش حیدری، انور دہلوی، فتنہ دہلوی، فیض دہلوی، بیدل حیدری، عالم حیدری، شیدا

گجراتی، کرار نوری وغیرہ موجود تھے۔

وہ کراچی کے قیام کے دوران اس وقت کے سبحان اللہ ہوٹل میں جا کر شاگردوں کے ساتھ بیٹھا تو اسے دہلی کا حافظ ہوٹل یاد آ گیا۔ اس نے تصور میں دیکھا کہ سامنے دہلی کی جامع مسجد ہے اور کچھ فاصلے پر ایڈورڈ پارک، حیدر کا ڈیرا آباد ہے۔ ادارۂ حیدری اپنا کام کر رہا ہے۔ ''الہام'' کے پرچے دھڑا دھڑ شائع ہو رہے ہیں۔

وہ کراچی سے بہاولپور کی طرف روانہ ہونے لگا تو اس کا عالم ہی دوسرا تھا۔

لمحات کو پیری و جوانی کے گزار
برعکس اس آشفتہ بیانی کے گزار
کیا سوچتا ہے رنج کے اسباب و علل
ہنس بول کے دن مستی فانی کے گزار

ہنس بول کے گزارنے سے اس کا مطلب یہی تھا کہ جو دن زندگی کے رہ گئے ہیں وہ بہاولپور میں نہیں کراچی میں گزارے جائیں۔ کراچی میں ایک کشش اس کے لیے یہ بھی تھی کہ اس کی بھانجی اپنے شوہر کے ساتھ کراچی میں رہ رہی تھی اور بھی دوسرے رشتہ دار کراچی آ گئے تھے۔ کراچی کا عام ماحول بھی اردو سے قریب تھا۔

بہاول پور پہنچتے ہی اس نے مستقل طور پر کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ دونوں بیویوں سے مشورہ کیا۔ انہوں نے بھی رضا مندی ظاہر کر دی۔ شہاب دہلوی نے بہت کوشش کی کہ وہ اپنا فیصلہ تبدیل کر دیں لیکن وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

وہ آنکھوں میں قدر و منزلت کے خواب سجائے کراچی آ گیا۔

کسی شہر میں گھومنے کے لیے آنا الگ بات ہے اور مستقل رہنا الگ بات ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ تو رہائش کا تھا۔ اس نے کچھ دن تو بھانجی کے گھر گزارے اور پھر مستقل رہائش کی فکر ہوئی۔ سر چھپانے کی جگہ چاہیے تھی۔ اس سے بھی زیادہ کسی معقول کاروبار کی حاجت تھی۔

حیدر دہلوی کی بھانجی کے شوہر احمد بخاری کا اچھا خاصا اثر رسوخ تھا۔ وہ کمشنر اے ٹی نقوی سے ملے تاکہ وہ اس سلسلے میں ان سے مدد لیں۔ ان دنوں کراچی میں اے ٹی نقوی کاروباری پرمٹوں کے انچارج تھے۔ وہ کئی اہل قلم حضرات کو پرمٹ دے رہے تھے۔ احمد بخاری ان سے ملے اور کہا حضرت آپ نے حیدر دہلوی کو چھوڑ دیا۔ انہوں نے

ملتان پر عربوں نے پہلی صدی ہجری میں قبضہ کیا اور غزنوی عہد تک اس پر مسلمانوں کا قبضہ برابر رہا۔ 132ھ (749ء) تک ملتان کا تعلق خاندان بنی امیہ سے رہا مگر اموی حکمت کی بساط الٹنے کے بعد اس کا تعلق بنو عباس سے ہوا۔ تیسری صدی ہجری یعنی معتصم کے زمانے تک ملتان عباسی حکومت کے تحت رہا۔ بعد میں ملتان کی صورت یہ رہی کہ اگر مرکز میں خلیفہ طاقت ور ہوتا تو دور دراز کے صوبے اس کے ماتحت رہتے۔ اگر خلیفہ کمزور ہوتا تو دور دراز علاقوں کے عامل خود مختار ہو جاتے۔ ایسے زمانوں میں بھی ملتان، سندھ اور منصورہ کے تحت رہا مگر تیسری صدی ہجری کے وسط میں ملتان، سندھ سے علیحدہ ہو کر ایک خود مختار سلطنت بن گیا جس کی وسعت پچھم میں مکران تک اور دکھن میں منصورہ تک تھی اس زمانے کے اعداد و شمار کے لحاظ سے ایک لاکھ بیس گاؤں اس سلطنت کے حدود میں تھے۔

مرسلہ: سلطان اشرف، لاڑکانہ

کہا خیام الہند حیدر دہلوی کی بات کر رہے ہو۔ بھئی وہ میرے پاس آئے ہی نہیں۔ آپ انہیں لے کر آئیں۔ احمد بخاری نے وعدہ کر لیا کہ وہ انہیں لے کر آئیں گے۔

حیدر دہلوی کو منانے اور راضی کرنے میں کئی دن لگے۔ وہ بہ مشکل تیار ہوا اور داماد کے ساتھ اے ٹی نقوی سے ملاقات کے لیے چلا گیا۔

''آپ یہیں ٹھہریں، میں نقوی صاحب کو آپ کے آنے کی اطلاع دیتا ہوں۔''

احمد بخاری نے انہیں ویٹنگ روم میں بٹھایا اور خود نقوی صاحب کے کمرے میں اطلاع دینے بلکہ اجازت لینے اندر چلے گئے۔ اجازت لے کر وہ واپس آئے تو حیدر دہلوی غائب تھے۔ ادھر اُدھر دیکھا کہیں نظر نہ آئے۔ وہ ان کے مزاج سے واقف تھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ حضرت کو انتظار گوارا نہیں ہوا اور گھر چلے گئے۔

احمد بخاری گھر پہنچے تو حسبِ توقع حیدر صاحب گھر پر ہی تھے۔

''آپ چلے کیوں آئے، نقوی صاحب آپ سے واقف بھی ہیں قدر دان بھی آپ کے لیے بہت کچھ کر سکتے

تھے۔ آپ نے اچھا موقع ضائع کر دیا۔"

حیدر دہلوی نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "میں لحاظ کی وجہ سے مروتاً آپ کے ساتھ چلا گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر میری غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ ان کے آگے دست طلب دراز کروں۔ معاف کرنا میں یہ نہیں کر سکتا۔"

"آپ کو دستِ طلب دراز کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے سب بات کر لی تھی۔"

"پھر بھی میں سائل تو ہوتا۔ اپنی یہ حیثیت مجھے پسند نہیں۔ آیندہ مجھ سے نہ کہیے گا۔"

بات ختم ہو گئی لیکن ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہاتھ پھیلانے کا عادی نہیں تھا لیکن رزق حلال کمانے میں سب سے آگے تھا۔ اس نے دلی میں بھی کئی کاروبار کیے تھے اور مالی آسودگی حاصل کی۔ سب کچھ چھوڑ کر پاکستان آ گیا اور اب شہر بہ شہر گھوم رہا تھا۔ ڈھاکا کے مختصر قیام میں بھی اس نے روزگار کی داغ بیل ڈالی اور اب وہ کراچی میں تھا اور کراچی سے آگے سمندر تھا۔ اب کراچی چھوڑ کر کہیں نہیں جانا تھا۔ اسے سر چھپانے کی جگہ کا بھی بندوبست کرنا تھا اور پیٹ بھرنے کے لیے کسی ذریعے کی تلاش بھی کرنا تھا۔ اس نے چند لوگوں کو اپنے ساتھ ملایا اور ایک کارخانہ قائم کیا جس میں فلٹر اور لوہے کی بالٹیاں وغیرہ بنائی جاتی تھیں۔

برنس روڈ کے قریب سبحان اللہ ہوٹل تھا جسے اس نے اپنا ڈیرا بنایا اور شاگردوں کو لے کر بیٹھ گیا۔ وہ جب حافظ ہوٹل دہلی میں بیٹھا کرتا تھا۔ دن رات چائے کے دور چلتے تھے۔ اس نے کبھی کسی کو جیب میں ہاتھ نہیں ڈالنے دیا۔ بل ادا کرنا اس کی ذمہ داری تھی۔ اس وقت مالی آسودگی تھی۔ اب وہ عالم نہیں رہا تھا لیکن اب بھی اس نے دہلی کی روایت کو قائم رکھا۔ رات گئے جب اٹھتا تو بل اپنی جیب سے ادا کرتا کسی کو زحمت نہ دینے دیتا۔ کوئی خوش حال شاگرد کوشش بھی کرتا تو اسے روک دیتا بلکہ جھڑک دیتا۔ کئی مرتبہ تو ایسا بھی ہوتا کہ چائے کا بل ادا کرنے کے بعد اس کے پاس واپسی کا بس کا کرایہ بھی باقی نہ بچتا اور وہ پیدل ہی گھر کی جانب روانہ ہو جاتا۔

کارخانے کے قیام کے بعد اس نے ڈرگ روڈ کالونی (شاہ فیصل کالونی) میں دو کوارٹر الاٹ کرائے۔ اس وقت یہ کالونی کسی جنگل سے کم نہیں تھی اور شہر سے اتنی دور کہ آنا جانا کسی جہاد سے کم نہ تھا۔ چند بسیں چلتی تھیں۔ انہی بس میں سے کسی بس میں بیٹھ کر وہ بلاناغہ سبحان اللہ ہوٹل پہنچتا جو اب حیدر کا ڈیرا بن گیا تھا۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ ڈرگ روڈ منتقل ہونے کے بعد وہ سبحان اللہ ہوٹل آنا چھوڑ دے گا لیکن غلط فہمی اس وقت دور ہو گئی جب دوسرے ہی دن وہ چھڑی تھامے ہاتھ میں چرمی بیگ لیے ہوٹل میں داخل ہوا اور پھر اس کی وضع داری نے تقاضا کیا کہ وہ کوئی ناغہ کیے بغیر یہاں آتا رہے۔

وہ خوش تھا کہ ڈرگ کالونی جنگل ہے مگر رہنے کا ٹھکانا تو مل گیا۔ اس کی دقتوں کا احساس تو اس وقت ہوا جب شدید بارش ہوئی اور برساتی نالے بھر جانے کی وجہ سے اس کا مکان سیلابی پانی کی زد میں آ گیا۔ یہ پانی اتنا اچانک آیا کہ سنبھلنے سے پہلے ہی گھر کا سامان پانی میں بہنے لگا۔ گھر والے قیمتی سامان کو بچانے کے لیے بھاگے۔ اسی وقت اس کی نظر اپنے بیٹے خالد اور بیٹی نگہت پر پڑی جنہیں پانی اپنے ساتھ بہا کر لے جا رہا تھا۔ مدد کے لیے لوگ بھی آ گئے تھے۔ وہ چیخا۔ "سامان چھوڑ دو صرف میرے بچوں کو بچا لو۔" لوگوں نے مدد کی اور بچوں کو بچا لیا۔

سیلاب گزرا تو ایک دن اور ایک رات کا فاقہ ہو چکا تھا۔ سارا سامان بہہ گیا تھا۔ کھانے پینے کا بندوبست بیوی کے ہاتھ کی انگوٹھیاں بیچ کر کیا گیا۔

امدادی ٹیموں کی طرف سے کھانا بانٹا جاتا تھا لیکن اس نے سختی سے کہہ دیا تھا کہ کھانا لینے کسی بچے کو نہ بھیجنا۔ یہ ہمارا حق نہیں۔ کمبل اور کپڑے تک بانٹے گئے لیکن اس نے کوئی امداد قبول نہ کی۔

وہ گھریلو ذمہ داریوں سے کما حقہ عہدہ برآ ہوتا تھا۔ بچوں کے آرام و آسائش کا مکمل خیال رکھتا تھا۔ بچوں کے لیے اچھے اچھے کپڑے خود خرید کر لاتا۔ اگر کوئی مشاعرہ نہ ہوتا تو آٹھ نو بجے گھر پہنچ جاتا۔ روایتی شعراء کی طرح رات رات بھر گھر سے باہر نہ رہتا۔ اسے اس بات کا شدت سے احساس رہتا کہ اس کے بچے گھر پر اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس کی اسی انصاف پسندی کا تقاضا تھا کہ اپنی دونوں بیگمات کو عمر بھر ایک ہی گھر میں رکھا۔

وہ صبح جلدی بیدار ہونے کا عادی تھا۔ صبح اٹھتے ہی اسے چائے کی طلب ہوتی پھر ہلکا ناشتا کرتا۔ چائے کے ساتھ عموماً سادہ روٹی کھانا پسند کرتا۔ بیسن کی روٹی لہسن کی چٹنی کے ساتھ نہایت شوق سے کھاتا تھا۔ سگریٹ کی بجائے بیڑی استعمال کرتا تھا۔ لباس میں پاجامہ قمیص اور شیروانی اس کا پسندیدہ لباس تھا۔ سیاست سے دلچسپی نہیں تھی لیکن

اخبار پابندی سے پڑھتا تھا۔ محلے داروں سے تعلقات بہت اچھے تھے۔ جھوٹ سے سخت نفرت تھی۔ بعض اوقات سچ بولنے کے لیے بڑے سے بڑا نقصان برداشت کر لیتا تھا۔

اسی حق گوئی نے دلی میں بھی اس کے دشمن پیدا کر دیے تھے۔ کراچی میں بھی بہت سے لوگ اس کے خلاف ہو گئے۔ اس کے خلاف لوگوں میں ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل زیڈ اے بخاری بھی تھے۔ ریڈیو کے ایک مشاعرے میں زیڈ اے بخاری نے نہ صرف اسے غلط مقام پر پڑھوایا بلکہ کسی مصرعے پر اشارے سے طنز بھی کیا۔ حیدر دہلوی اس طنز پر چراغ پا ہو گیا۔ اس نے غزل ادھوری چھوڑی اور زیڈ اے بخاری کی طرف خشمگیں نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، جمیل الدین عالی نے زیڈ اے بخاری کو آڑے ہاتھوں لے لیا۔

"حیدر صاحب استاد شاعر ہیں۔ ان کے ساتھ یہ سلوک مناسب نہیں۔"

یہ مشاعرہ ریڈیو سے براہ راست نشر ہو رہا تھا لہٰذا اسے بند کرنا پڑا۔ اس واقعے کی گونج کئی دن تک سبحان اللہ ہوٹل میں سنائی دیتی رہی۔

اس کے بعد وہ ریڈیو کے کسی مشاعرے میں مدعو نہیں ہوا۔

ریڈیو کے پروگرام اس سے چھن گئے تھے۔ بخاری صاحب کو خوش کرنے کے لیے بہت سے مشاعروں میں بھی اسے نظر انداز کیا جانے لگا تھا لیکن سبحان اللہ ہوٹل کا ڈیرا آباد رہا۔ جہاں دن کے دو بجے سے رات گئے تک محفل جمی رہتی۔ شاگرد ارد گرد جمع رہتے۔ ادبی بحثیں ہوتیں، اصلاح کے دور چلتے، چائے چلتی، رات گئے سب ہوٹل سے اٹھتے۔ اپنی جیب سے وہ بل ادا کرتا۔ دوست رخصت ہوتے، وہ بھی بس میں بیٹھتا اور ڈرگ روڈ اپنے بچوں کے پاس پہنچ جاتا۔

مثل مشہور ہے مفلسی میں آٹا گیلا۔ ایک روز بس کے حادثے میں اس کا ہینڈ بیگ گم ہو گیا جس میں بہاولپور کی زمینوں کے علاوہ کارخانے کی شراکت کے کاغذات بھی تھے۔

کارخانہ اور زمینیں بھی چلی گئیں۔

وہ دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکا۔ مالی آسودگی نے منہ موڑا تو دوست اور شاگرد بھی نظریں چرانے لگے۔ اب اسے اپنے وطن میں بھی اسی صورت حال کا سامنا تھا جس کا شکار وہ دہلی میں ہو چکا تھا۔ یہ افراتفری کا دور تھا۔ ہجرت کے مصائب ابھی کم نہیں ہوئے تھے۔ لوگوں کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ اس نے لوگوں کی بے رخی کو اپنی ناقدری سے تعبیر کیا اور ان تلخیوں کا تذکرہ اشعار میں ڈھال دیا۔

اک گوشہ نشیں راہ گزر کیا جانے
کس سمت ہیں ارباب نظر کیا جانے
شہرت طلبی بے ہنری کی ہے دلیل
تبلیغ ہنر اہل ہنر کیا جانے

☆

یہ بغض بھی یہ ظلم بھی ہنگامی ہے
انجام اس آغاز کا ناکامی ہے
اس بغض سے اس ظلم سے کیا ہوتا ہے
حیدر کا رسول اور خدا حامی ہے

☆

نیکی کا کمینے یہ بدل دیتے ہیں
کتنی وتی ہے تو چل دیتے ہیں
استاد کو استاد بناتا تو کجا
یہ باپ بھی ہر سال بدل دیتے ہیں

☆

حیدر ہر اہل ہوش نے غربت کی راہ لی
تو کس لیے کشاکش رنج و محن میں ہے
قدر ہنر نہ حفظ مراتب نہ سحر خلق
کس کا وطن کہاں کا وطن کیا وطن میں ہے

☆

لاکھ ہر صنف سخن پر ہے تسلط مجھ کو
اور جدت بھی ہے ہر مصرعۂ تر سے مجھ کو
لیکن افسوس ہے حیدر کو تمول کے بغیر
عیب ہوتا ہے یہاں عرض ہنر سے پیدا

اس بے پناہ غربت اور تنگدستی کے باوجود اس نے غیرت وحمیت کا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ وہ چاہتا تو اب بھی اپنے لیے بہت سی راہیں تلاش کر سکتا تھا۔ کسی بڑے دروازے پر جا کر اپنے کمال فن کا ڈھنڈورا پیٹ سکتا تھا لیکن وہ ہمیشہ یہی کہتا رہا۔

حیدر یہ قدم اور اٹھیں جانب دنیا
دنیا انہی قدموں کی ہے ٹھکرائی ہوئی سی

کراچی میں اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ بہاولپور کی زمینوں کی فصلوں سے حاصل ہونے والی رقم تھی۔ اس زمین

کے کاغذات بھی گم ہو گئے تھے۔

ایک بار وہ بہاولپور گیا تا کہ فصلوں کی رقم لا سکے۔ وہاں ٹھہرنا بھی پڑا۔ خوب مشاعرے ہوئے دعوتوں کے سلسلے چلتے رہے۔ دوست دشمن سب شریک ہوئے۔

خوشی خوشی واپس ہوئے۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھا کراچی نہیں پہنچا تھا کہ گلے میں تکلیف شروع ہوئی۔ اس نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے گلا پکڑ لیا۔ اس نے یہی سمجھا ہوگا کہ کھانے میں کوئی ایسی چیز آ گئی ہوگی جس نے گلے میں تکلیف پیدا کر دی۔ گھر تک پہنچتے پہنچتے تکلیف میں کمی آ جائے گی لیکن کراچی پہنچنے کے بعد بھی تکلیف میں کمی نہیں آئی۔ اس نے اسے معمولی تکلیف سمجھا کسی ڈاکٹر کو نہیں دکھایا۔ گھریلو ٹوٹکے کرتا رہا۔ کبھی تکلیف میں کمی آ جاتی کبھی پھر بڑھ جاتی۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا پھر اس تکلیف نے ایک نئی صورت اختیار کر لی۔ اس کی آواز بیٹھ گئی۔ اس کی آواز ہی تو اس کا ہتھیار تھی۔ اس کی آواز طراوے دار تھی۔ اس آواز سے وہ مشاعرہ لوٹ لیا کرتا تھا۔ اب وہی آواز خاموش تھی۔ بڑی مشکل سے بول پاتا تھا۔ ایسے تو یہ ہوا کہ جہاں اس کے چاہنے والوں کے لیے یہ صورتِ حال باعث تشویش تھی وہیں اس کے مشاعرہ باز حریف خوش تھے کہ اس کی آواز دب گئی ہے۔ اب مشاعروں میں ان کی جیت ہوا کرے گی حیدر دہلوی کی نہیں۔ اس نے اس صورتِ حال کو بھی اپنے شعروں میں ڈھال دیا۔

بیٹھی ہوئی آواز کو میری ناگاہ
سنتے ہیں تو کہتے ہیں ماشاء اللہ
اس حادثے پر خوش ہیں بزعم خود لوگ
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

☆

افسوس زباں نطق سے محروم ہوئی
بے گانہ ہر معنی و مفہوم ہوئی
حساد کا پھٹتا تھا کلیجہ جس سے
خوش ہیں کہ وہ آواز ہی معدوم ہوئی

☆

جب مجمع احباب میں مل بیٹھا ہے
حیدر نہ فسردہ نہ خجل بیٹھا ہے
مایوس نہیں ہے وہ گرفتہ آواز
آواز ہی بیٹھی ہے کہ دل بیٹھا ہے

اس نے اپنی تکلیف کی وجہ سے مشاعروں میں شرکت چھوڑ دی تھی لیکن شاعری تو نہیں چھوڑی تھی۔

جذبات ہنر پر جو جوانی تھی وہ ہے
مرقوم جو اعجاز بیانی تھی وہ ہے
اظہار کمالات زبانی نہ سہی
پہلے جو طبیعت میں روانی تھی وہ ہے

اس کی دونوں بیگمات کا کہنا یہ تھا کہ وہ جب بہاولپور گئے تھے تو اسے کسی نے کھانے میں سیندور کھلا دیا تھا جس سے اس کی آواز بیٹھ گئی۔ کسی ڈاکٹر نے اس اندیشے کا اظہار نہیں کیا۔ ممکن ہے سیندور والی بات سچ ہو بہرحال حیدر نے اس تکلیف کو معمولی سمجھا اور یوں تقریباً سال بھر گزر گیا۔

گلے میں شدید تکلیف کے بعد اس کی بھانجی اسے اپنے گھر لے گئی۔ ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ ڈاکٹر نے آپریشن تجویز کیا۔ وہ اپنے داماد احمد بخاری اور دوسرے گھر والوں کے ساتھ مقررہ وقت پر سول اسپتال پہنچ گیا جہاں اس کا آپریشن تھا اور صبح دس بجے کا وقت دیا گیا تھا۔ اس کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ جب تک اس کی باری نہیں آ گئی بیٹھا اخبار پڑھتا رہا۔ کچھ دیر بعد کمپاؤڈر وغیرہ آ گئے اور اسے آپریشن تھیٹر پہنچا دیا گیا۔ آپریشن شروع ہوا۔ آپریشن کے دوران چند منٹ کے لیے ڈاکٹر آپریشن کے دوران کسی اور مریض کی طرف متوجہ ہوا۔ حیدر کو چھینک آ گئی اور اس کا دم نکل گیا۔

یہ بھی کہا جاتا تھا کہ آپریشن کے دوران اسے ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔

10 نومبر 1958ء کو دس بج کر دس منٹ پر سول اسپتال میں وہ خالق حقیقی سے جا ملا۔ وفات کے وقت اس کی عمر صرف 52 سال تھی۔

اس کی ناگہانی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اسی روز ظہر کے بعد اسے سوسائٹی کے قبرستان میں دفنا دیا گیا اگلے روز تمام اخبارات میں اس کی وفات کی خبریں شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئیں۔

"خیام الہند حضرت حیدر دہلوی وفات پا گئے۔"

افسوس زباں نطق سے محروم ہوئی
بے گانہ ہر معنی و مفہوم ہوئی
حساد کا پھٹتا تھا کلیجہ جس سے
خوش ہیں کہ وہ آواز ہی معدوم ہوئی

ماخذات

حیدر دہلوی، ڈاکٹر اختر شمار
عندلیب شادانی، نظیر صدیقی

روایت شکن

زویا اعجاز

ماضی نے گر سنوارا نہیں تو کیا ہوا، اگر عزم و حوصلہ ہو تو خود بھی وقت کو سنوارا جاسکتا ہے۔ اس کی زندہ مثال سلیمہ بیگم ہے۔ یہ سلیمہ بیگم ہے کون اس بارے میں جان کر آپ بھی حیران رہ جائیں گے کہ اس نے ایسا کیا کیا جس کی وجہ سے بلتستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں کی رہنے والی کو پوری دنیا نے قابلِ تقلید مان لیا۔ اعلیٰ اعزاز سے نوازا۔ ایسی ہمت اور ایسا حوصلہ اللہ تعالیٰ پاکستان کی ہر بیٹی کو بخشے۔

برف پوش پہاڑوں کے دامن میں رہ کر بھی اس نے شہرت کی بلندیوں کو چھولیا

فطرت آبِ رواں ہے۔ اس کی روانی زندگی میں تحریک، تسلسل اور بقاء کی علامت ہے لیکن اگر یہی فطرت روایات، جمود اور ٹھہراؤ کا شکار ہو جائے تو کسی جوہڑ سے کم ثابت نہیں ہوتی۔

انسانی فطرت کو پروان چڑھانے اور اوج تک پہنچانے میں والدین کے علاوہ اساتذہ اہم ترین کردار ادا کرتے ہیں۔ انسانیت کے لیے مسیحا اور نسلِ نو کے لیے شخصیت ساز، عمارت گر کی حیثیت رکھنے والے یہ افراد ازل ہی

سے معاشرتی ناقدری اور [illegible] سالی کا شکار رہتے ہیں۔ جبرِ مسلسل کی بدولت آخر یہ [illegible] اپنا اصل مقام فراموش کر کے روایت پرستی میں جت [illegible] جاتے ہیں اور پھر معاشرہ تنزلی کے عبرتناک سفر کی جانب گامزن ہو جاتا ہے۔ اقدار کی چمک ماند پڑنے لگتی ہے اور مستقبل کے معمار ملک و قوم کے لیے بوجھ بننے لگتے ہیں۔

لیکن قدرت کے خودکار منصفانہ نظام کے تحت کچھ روایت شکن ایسے بھی ہوتے ہیں جو تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق تن تنہا اس روایت پرستی کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ ان کی جدوجہد ذاتی سطح سے شروع ہو کر عالمی پیمانے پر ایک مثال بن جاتی ہے۔ ان چیدہ افراد کی کاوشوں کو سراہنے اور مزید وسائل کی فراہمی کے لیے کچھ دردمند اور بااختیار افراد نے 'گلوبل ٹیچرز پرائز' کا اجراء کر رکھا ہے جس میں فاتح معلم کو 'ایک ملین ڈالرز' کی رقم متوازی اقساط کی صورت میں دس سال تک فراہم کی جاتی ہے۔ شعبہ تدریس میں 'نوبل پرائز' کی حیثیت رکھنے والے اس انعامی سلسلہ میں فتح ہر معلم کا خواب ہے۔

رواں سال بھی دنیا کے ہر کونے سے چالیس معلمین کے انتخاب کے بعد دس بہترین افراد کو فائنل مقابلہ کے لیے نامزد کیا گیا اور یہ دسیوں اساتذہ ہمت 'لگن' جدوجہد اور روایت شکنی میں اپنی مثال آپ ہیں۔

ایسی ہی ایک شخصیت کا نام سلیمہ بیگم ہے۔

سلیمہ بیگم کا تعلق گلگت بلتستان کے ایک دور دراز مشرقی گاؤں 'اوشی خنڈاس' سے ہے۔

اوشی خنڈاس میں بمشکل گیارہ سو گھرانے آباد ہیں جو بے حد روایت پسند ہیں۔ پہاڑوں کی اس بچی کے لیے زندگی کبھی بھی سہل نہیں رہی۔ اسے تعلیمی زیور سے آراستہ ہونے کا بے حد شوق تھا لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اس کی برادری میں تعلیم نسواں کی کوئی روایت ہی نہ تھی۔ لڑکیوں کی زندگی بنیادی دینی تعلیم' گھرداری' شادی اور پھر بچوں کی پرورش کے دائرے میں مقید تھی۔

گاؤں میں لڑکیوں کا واحد پرائمری اسکول محض دو کمروں پر مشتمل تھا۔ اس نجی اسکول میں صرف ایک معلمہ تھی۔ پرائمری کے بعد ثانوی تعلیم اس نے ہنزہ میں 'آغا خان اکیڈمی' سے حاصل کی۔ اس کے جنون کا سفر مشکل سے مشکل تر ہونے لگا۔ اس کے سامنے اب صرف دو ہی راستے تھے۔ اعلیٰ ثانوی تعلیم کے لیے گلگت یا کسی اور شہر کے کالج میں داخلہ لے 'یا اپنے خواب فراموش کر کے روایات کی پیروی میں سرِ تسلیم خم کر دے۔ علاقہ میں لڑکیوں کی ثانوی تعلیم ..... کا کوئی رواج نہ تھا' کالج میں داخلہ تو چہ معنی دارد۔ والد پر بھی معاشی اور سماجی دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

سلیمہ کے خلوصِ نیت اور لگن کی بدولت قدرت بھی اس پر بے حد مہربان تھی۔ اس کے والد پدرانہ شفقت سے مغلوب ہو کر اپنی برادری کی روایات کے سامنے سینہ سپر ہو گئے اور اسے گلگت میں 'انٹر کالج ویمن' میں پڑھنے کی اجازت دے دی۔ اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے سلیمہ نے بے انتہا کٹھنائیوں کا سامنا کیا۔ اسے کالج پہنچنے کے لیے روزانہ دو بسوں میں دو گھنٹے سفر کرنا پڑتا لیکن تعلیمی جنون نے اس کے نازک وجود میں آہنی سختی پیدا کر دی تھی۔ ہر مشکل و رکاوٹ اس کے ارادے مزید مہمیز کرتے۔

سائنسی مضامین میں انٹر کے بعد سلیمہ نے اپنی ایک اور دیرینہ خواہش کی تکمیل کے لیے کمر کس لی۔

اسے بخوبی علم تھا کہ برادری کی روایات اور معاشی دباؤ سے نبرد آزما ہونا ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں ہے۔ اپنے والد کی محبت اور اساتذہ کی محنت کا قرض چکانے کا وقت آ چکا تھا۔ اس نے اپنے ہی اسکول میں لڑکیوں کو نویں' دسویں جماعت کے سائنس مضامین پڑھانے کا آغاز کر دیا۔

آٹھ ماہ بعد ان طالبات کا امتحانی نتیجہ اس کی توقعات سے بڑھ کر ثابت ہوا۔ اس کی لگن بارگاہ ایزدی میں قبولیت کا شرف حاصل کر چکی تھی۔ راہیں خود بخود آسان ہونے لگی تھیں۔ اسی دوران محکمہ تعلیم کی جانب سے 'خواتین اساتذہ' کے لیے کچھ آسامیوں کا اعلان کیا گیا۔ سلیمہ کے لیے یہ موقع کسی من و سلویٰ سے کم نہ تھا۔ اس نے محکمہ جاتی ٹیسٹ پاس کرنے کے بعد انٹرویو میں بھی کامیابی حاصل کر لی۔

وقت کے دھارے میں تبدیلی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اوشی خنڈاس کے لیے 1992 ایک تاریخی سال ثابت ہوا اور سلیمہ اس گاؤں میں سرکاری معلمہ تعینات ہو گئی۔ اس اسکول کے حالات بھی انتہائی دگرگوں تھے۔ تین کمروں پر مشتمل عمارت میں صرف ششم جماعت تک طالبات موجود تھیں۔ ہر کمرے میں دو جماعتیں بٹھائی جاتیں۔ اساتذہ کا یہ عالم تھا کہ سلیمہ سے قبل وہاں دو خواتین تھیں جن کی تعلیمی قابلیت 'مڈل' تھی۔ اسکول میں فرنیچر کا تصور ہی ناپید تھا۔ طالبات کو ننگی فرش یا گھاس پر بٹھا کر پڑھایا جاتا۔

سلیمہ ان حالات پر بے حد افسردہ رہتی تھی لیکن اکیلا چنا

بھاڑ پھوڑنا بھی تو کیسے؟

ناتجربہ کاری، وسائل کی شدید کمی اور مشکلات سے زور آزمائی کرتے ڈیڑھ سال کا عرصہ بیت گیا اور پھر بالآخر تبدیلی کی ایک خوشگوار لہر 'ورلڈ بینک' کی صورت میں در آئی۔ اس نے تمام تر صورتِ حال اس 'وفد' کے سامنے بیان کیں۔ نہایت سنجیدگی اور عرق ریزی سے ان معاملات کا جائزہ لینے کے بعد وفد کے اراکین نے اسے 'اسکول مینجمنٹ کمیٹی' (SMC) کے قیام کی تجویز دی تاکہ انتظامی معاملات سے نمٹنے کے لیے اعانت میسر آسکے۔

سلیمہ نے اپنے گاؤں کے نمبردار سے رابطہ کیا اور ایک صبر آزما مدلل گفتگو کے مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد کمیٹی کا قیام عمل میں آگیا۔ ابتدائی طور پر اس کمیٹی میں چھ افراد شامل تھے۔

انتظامی مشکلات کے حل کی راہیں متعین ہوئیں تو اسے اپنی ناتجربہ کاری اور تعلیمی قابلیت میں کمی کا احساس ستانے لگا۔ اعلیٰ تعلیم اور وسعتِ النظری کے بغیر وہ اپنے جنون کا یہ سفر جاری نہیں رکھ سکتی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے محکمہ تعلیم سے رابطہ کیا اور تعلیمی سلسلہ کے ازسرِنو آغاز کی درخواست پیش کردی۔ محکمہ بھی اس کی لگن، کاوشوں اور خلوص کا قائل ہو چکا تھا اس لیے سلیمہ کو اسلام آباد منتقل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔

اسلام آباد میں بہترین تعلیمی اداروں سے بی۔ایس۔سی اور بی۔ایڈ کی ڈگری لیے ساڑھے تین سال بعد وہ ایک نیا عزم اور ہمت سمیٹے اپنے 'اصل' کی جانب لوٹ آئی۔ سلیمہ 'اوشی خنڈ' اس کی وہ پہلی لڑکی تھی جو شہری تعلیمی اداروں سے مستفید ہوئی۔ اس کے لیے اپنی علاقائی اقدار اب بھی مسلمہ تھیں۔ مقامی لوگوں کی عزت و احترام میں بھی وہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی۔ نتیجتاً اس کے شخصی وقار میں اضافہ ہونے لگا۔ مقامی افراد کی نظر میں وہ بہت بلند مقام حاصل کرچکی تھی اور اسی تناسب سے ذمہ داریوں کا بار بھی بڑھنے لگا۔

گاؤں میں واپسی کے بعد اس نے میٹرک جماعت کا باقاعدہ اجراء کیا اور رضاکار اساتذہ کی بھرتی کا آغاز بھی کردیا۔ اوشی خنڈ اس میں وہ اب کسی سلیمہ کو دوسرے شہروں میں تعلیم حاصل کرنے کی اضافی مشقت سے جنگ آزما ہوتے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کا مطمعِ نظر اپنے علاقہ میں تعلیم نسواں کا فروغ تھا۔ مقامی روایات کے مطابق لڑکیوں کو جماعت پنجم تک تعلیم دلوانے کے بعد ان کی شادی کردی جاتی۔ سلیمہ اس روایت میں تبدیلی کی خواہاں تھی۔ وہ اسکول میں بطور ہیڈ ٹیچر سائنسی مضامین کی تدریس کے ساتھ اس تبدیلی کے لیے شب و روز محنت میں جت گئی۔

سلیمہ نے اپنی طالبات کی والدہ کے ساتھ ہفتہ وار اور ماہانہ خصوصی ملاقات کا سلسلہ شروع کیا۔ ان خواتین کو قائل کرنا کسی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ علاقہ کے رہائشی سماجی اور معاشی دباؤ میں بے طرح پس رہے تھے۔ معاشی پسماندگی کا یہ عالم تھا کہ اسکول فیس کی مد میں سات، آٹھ روپے کا انتظام بھی بے حد کٹھن تھا۔ اس نے وسائل مدِنظر رکھتے ہوئے مسائل کا منطقی حل تلاش کرلیا۔

اس کی تجاویز کے مطابق مقامی خواتین نے سبزیوں کی کاشت، مرغیوں کی خریداری اور سلائی کڑھائی کا آغاز کیا۔ دستکاری کی اشیاء بڑے شہروں میں فی کس ڈیڑھ ہزار روپے کے نرخ پر فروخت ہونے لگیں۔ معاشی حالات میں بہتری آتے ہی طرزِ فکر میں بھی واضح مثبت تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔

معاشی استحکام کے بعد سلیمہ 'اسکول مینجمنٹ کمیٹی' میں تبدیلی کی جانب متوجہ ہوئی۔ اسے کمیٹی میں خواتین ارکان کی شمولیت درکار تھی لیکن وہ اس تلخ حقیقت سے بھی لاعلم نہیں تھی کہ اوشی خنڈ اس کے روایتی نظریات اس معاملہ میں بہت کٹر ہیں۔ ان نظریات کے مطابق عورت ذات میں قوتِ ارادی کا عنصر مفقود ہوتا ہے۔ وہ کوئی بھی فیصلہ لینے کی اہل نہیں ہوتیں۔ اس صورتِ حال میں علاقہ کے لوگوں کو قائل کرنا ایک

قرآن الحکیم کی 2 آیت کا ترجمہ اشعار میں

قرآن الحکیم کی سورۃ الصف 61 کی آیت 8+9 کا ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے اس خوب صورت شعر میں کیا ہے۔

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

قرآن کریم کی سورۃ الانفال 8 کی آیت 53 پارہ 9+10 کا ترجمہ علامہ اقبال نے اس خوب صورت شعر میں کیا ہے۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

نجمی رحمٰن۔ یو ایس اے

ناممکن امر تھا۔ سلیمہ نے کمیٹی ارکان کے ساتھ ان گنت باضابطہ ملاقاتیں کیں اور بالآخر انھیں کم از کم چار خواتین کی شمولیت کے لیے راضی کرلیا۔

بظاہر ناممکن نظر آنے والے مسائل کے احسن ترین حل نے اسے خاطر خواہ اعتماد بخشا اور وہ نئی لگن سے دیگر امور میں تبدیلی کے لیے کوشاں ہوگئی۔ اسکول کے اندرونی معاملات میں بھی بہت پیچیدگیاں تھیں۔ والدین بچیوں کو پڑھائی کے لیے زائد وقت دینے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ ہی نہ ہوتے۔ طالبات اپنے گھروں میں اسکول کی جانب سے تفویض کردہ کام مکمل کرنے سے قاصر تھیں۔ تعلیم سے بے بہرہ والدین ماہانہ اور ہفتہ وار میٹنگ میں ایک ہی بات دہرایا کرتے۔ ''ہم اپنی بچیوں کو اسکول بھیج دیتے ہیں۔ اب یہ اساتذہ کی ذمے داری ہے کہ انہیں سب کچھ سکھا پڑھا کر بھیجا کریں۔ اس لیے کہ بچیوں کو گھرداری کے علاوہ کھیتوں میں بھی والدین کا ہاتھ بٹانا ہوتا ہے۔''

سلیمہ نے بے پناہ مزاحمت اور ابتدائی ناکامی کے بعد والدین کو قائل کیا کہ طالبات کو گھروں میں اسباق کی دہرائی کے لیے دو تین گھنٹوں کی فراہمی ان کی ذمہ داری ہے جس سے وہ ہرگز کنارہ کش نہیں ہوسکتے۔ تعلیمی عمل محض چھ گھنٹوں پر محیط نہیں ہوتا بلکہ یہ ہمہ وقت جاری رہتا ہے۔ والدین کے ساتھ بے شمار نشستوں اور بحث و مباحثہ نے اس مسئلہ میں جزوی تبدیلی پیدا کردی تاہم یہ سوچ اور نظریہ آج بھی کسی نہ کسی صورت اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔

پیشہ وارانہ قابلیت اور لگن میں وہ اپنی مثال آپ تھی۔ طالبات کو ہلکے پھلکے انداز میں تدریس نے اسے بے حد مقبول بنادیا۔ اس کی محنت اور سنجیدگی کے باعث اسکول میں میٹرک جماعت کے حالیہ آغاز کے باوجود تین سال تک سالانہ نتیجہ کی شرح 'نوّے فیصد' سے بھی زائد رہی۔ ہر گزرتا سال ادارہ میں بچیوں کی تعداد میں اضافہ کرنے لگا۔ اس کی مثبت تعمیری محنت سے برادری کا اعتماد بھی راسخ تر ہوا۔

سلیمہ نے پہلی بار اپنے علاقہ میں والدین اور اساتذہ کے باہمی تعامل کا باقاعدہ اجراء کیا۔ ان اقدام سے والدین کی دلچسپی بڑھنے لگی اور برادری کے وہ اساتذہ بھی اس کے ہم قدم بننے کے لیے راضی ہوگئے جو قبل ازیں نجی سطح پر تن تنہا چراغ در چراغ جلانے کا بیڑہ اٹھائے ہوئے تھے۔

اس کی انتھک کاوشوں کی بدولت مڈل جماعت کے بعد تعلیمی شرح میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ میٹرک پاس لڑکیوں میں چند ایک نے نرسنگ کا شعبہ اختیار کیا تو نصف درجن نے اسی اسکول میں تدریس کا آغاز کردیا۔ کچھ طالبات قانونی شعبہ سے وابستہ ہوگئیں۔ ان کے والدین کے سماجی و معاشی رتبہ میں بھی لامحالہ برتری پیدا ہوئی۔

غربت اور پسماندگی اب بھی کسی عفریت کی طرح مقامی افراد کے لیے لاینحل مسئلہ تھی۔ سلیمہ نے باہمی مشاورت سے ایک خصوصی گروہ تشکیل دیا جو اپنی آمدن کا چھوٹا سا حصہ غریب لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مختص کردیتا۔ انہیں یونیفارم، کتابوں اور سالانہ فیس کے اخراجات میں اعانت میسر آگئی۔ اس گروہ کی پُرخلوص کوششوں سے 1500 لڑکیوں کے خوابوں کی تتلیوں کو ایک نئی زندگی مل گئی۔ مستحق طالبات کی عزتِ نفس کا احترام ان کی اوّلین ترجیح تھی۔ انھیں مطلوبہ سامان کبھی کسی ہم جماعت کے سامنے نہیں دیا جاتا تھا بلکہ علیحدگی میں ان کے والدین کے سپرد کیا جاتا۔

اوشی کھنڈاس کے اس اسکول میں سائنس لیب کی عدم موجودگی بھی بے حد دشواری کا سبب تھی۔ سائنسی مضامین کے عملی امتحانات کی تیاری ان طالبات کے لیے ہمیشہ دردِسر ثابت ہوتی جس میں رتی بھر کی بیشی بھی براہِ راست ان کے سالانہ بورڈ امتحانات پر اثر انداز ہوا کرتی تھی۔ سلیمہ نے اسکول مینجمنٹ کمیٹی کے علاوہ علاقہ میں موجود طلبہ کے اسکول پرنسپل سے درخواست کی کہ انھیں ہر ماہ صرف ایک ہفتہ طالبات کے عملی امتحانات کے لیے لیب مستعار دے دی جائے۔

سلیمہ کی پیشہ وارانہ زندگی میں اگر ایک جانب مسائل کے انبار تھے تو دوسری جانب دستِ غیبی سے اسے ایسی آسانیاں بھی میسر آرہی تھیں جن کا تصور ہی کچھ عرصہ پہلے ایک ناممکن امر لگتا۔ علاقہ کی وہ طالبات، جن کے لیے کمتر معاشی حیثیت اور برادری کے دباؤ کی وجہ سے اسکول میں پڑھنا ایک 'گناہِ عظیم' تھا اب اپنے خاندان کی مکمل رضامندی سے اس کی عملی معاون ثابت ہونے لگیں۔ اسی دوران دو سابقہ طالبات اسکول میں سائنسی مضامین کی تدریس کرنے لگیں۔ ان کے سابقہ تعلیمی ریکارڈ، ذہانت اور سنجیدگی کو مدنظر رکھتے ہوئے سلیمہ نے حتی الامکان انہیں اپنی پیشہ وارانہ صلاحیتیں منتقل کردیں تاکہ اس کی غیر موجودگی میں اسکول کی تدریسی سرگرمیوں میں کوئی رکاوٹ یا کمی نہ آئے۔

سلیمہ بیگم کی انتظامی صلاحیتیں اور لگن اب کسی سے بھی پوشیدہ نہ تھیں۔ اعلیٰ تعلیمی ادارے اس کی ذاتی علمی قابلیت میں مزید اضافہ کے خواہاں تھے۔ 2002ء میں اسے آغا خان

یونیورسٹی فار ایجوکیشنل ڈویلپمنٹ (AKUED) نے MS ڈگری کی تکمیل کے لیے وظیفہ فراہم کیا۔ اس تعلیمی سفر میں اسے تکنیکی امور میں طاق کیا گیا۔ روایتی طریقوں سے قطع نظر تعلیمی عمل کے دوران طلبہ و طالبات کی دلچسپی برقرار رکھنے کے گر، کمیونٹی کی شمولیت کے جدید سائنسی اور منطقی طریقہ کار کے استعمال نے اس کی صلاحیتوں میں کئی گنا نکھار پیدا کردیا۔

اپنے دیگر ہم جماعت اساتذہ پر سلیمہ کی ذہنی برتری واضح تر نظر آتی رہی تھی اس لیے یونیورسٹی انتظامیہ نے محکمہ تعلیم سے خصوصی اجازت نامہ حاصل کرنے کے بعد اسے گلگت بلتستان کے شمالی علاقوں میں ' آغا خان یونیورسٹی پروفیشنل ڈویلپمنٹ سینٹر' کے لیے متعین کردیا۔ اس تربیتی منصوبہ کے تحت سلیمہ نے گلگت بلتستان کے چھ اضلاع میں سرکاری اسکولوں کے اساتذہ کی تربیت کا آغاز کیا۔ انہیں معیاری تعلیم فراہم کرنے کے تکنیکی انداز، برادری کی شمولیت کے عملی طریقہ کار سے آگاہی، طلبہ کی سماجی و اخلاقی تعلیم کے علاوہ معلمین کی ذاتی بہبود پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی۔

یہ تربیتی و فلاحی منصوبہ پانچ سال جاری رہا اور اس دوران سلیمہ نے گلگت، ہنزہ، استور سمیت کئی اضلاع میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے ہوئے تقریباً سات ہزار سے زائد اساتذہ کی پیشہ وارانہ تربیت کی۔ اس کا ذہن منفرد تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال تھا۔ وہ مسائل ہی کی مدد سے منطقی وسائل تخلیق کرنے میں طاق تھی۔ گلگت بلتستان کا قدرتی حسن عوامی بے پروائی، کم علمی اور جہالت کی بدولت کوڑا کرکٹ، ماحولیاتی آلودگی اور مختلف بیماریوں سے گہنا رہا تھا۔ سلیمہ نے بے حد غور و خوض کے بعد اس کوڑا کرکٹ کو بطور کھاد استعمال کرنے کا تاریخی قدم اُٹھایا۔ علاقہ کے کسانوں کو یوریا اور اس قسم کی دیگر کھادوں کے استعمال سے پیدا ہونے والے مسائل سے آگاہی فراہم کی۔ ان روایتی طریقوں کا استعمال نسل در نسل محیط تھا لہٰذا انھیں نامیاتی کھاد کے استعمال پر قائل کرنا بلاشبہ ایک کٹھن امر ہی سہی، لیکن کامیابی ایک بار پھر سلیمہ کا مقدر ٹھہری۔

آغا خان یونیورسٹی کے معاہدہ کی مدت مکمل ہوتے ہی اسے 'قراقرم یونیورسٹی' نے دو سال کے لیے اپنے ساتھ منسلک کر لیا۔ اس کی قابلیت و صلاحیتیں اس بار بھی دیگر ساتھی اساتذہ سے بہت ارفع ثابت ہوئیں۔

سلیمہ کی پیشہ وارانہ اہلیت کی گونج اب بین الاقوامی سطح پر بھی پہنچ چکی تھی۔ 2010 میں آغا خان پروفیشنل ڈویلپمنٹ نے آسٹریلوی تعلیمی فنڈ کے اشتراک سے علاقائی اساتذہ کی تربیت اور تعلیمی معیار میں بہتری کے لیے ایک نئے معاہدہ کا آغاز کیا۔ اس معاہدہ میں سلیمہ کی شرکت بھی ناگزیر تھی۔ بعدازاں اسے 'یو۔ایس ایڈ' کے ساتھ کام کرنے کے مواقع میسر آئے۔

سلیمہ نے اس صورتِ حال سے بھرپور استفادہ کیا۔ ایڈوانس تعلیمی ڈپلوما میں تدریس کے بعد اس نے مذکورہ ڈپلوما کے لیے ایک کتابچہ بھی تصنیف کیا جس کا مطمع نظر اساتذہ میں غیر روایتی طریقہ تعلیم کی تحریک پیدا کرنے کے علاوہ ان کی ذاتی صلاحیتوں میں نکھار کی افزائش تھا۔ گلگت بلتستان انتظامیہ اور آسٹریلین وفد کے بعد یو۔ایس ایڈ بھی سلیمہ کے بلند ذہنی معیار کی قائل ہوگئی۔

2014 میں جرمن تعلیمی انتظامیہ نے گلگت بلتستان میں GIZ-GFA پروگرام کے تحت اساتذہ کی پیشہ وارانہ تربیت کا آغاز کیا تو ان کا پہلا انتخاب بھی سلیمہ ہی تھی۔ جرمن انتظامیہ اس کی صلاحیتوں سے اس قدر متاثر ہوئی کہ انہوں نے سیکریٹری محکمہ تعلیم سے سلیمہ کو سرکاری نوکری سے عہدہ برآ کرنے کی درخواست کردی۔ جرمن حکومت اسے پاکستان میں اپنے قومی پروگرام کے لیے کوآرڈی نیٹر متعین کرنا چاہتی تھی۔ سیکریٹری کی حوصلہ افزائی، شوہر سے مشاورت اور بے حد سوچ وبچار کے بعد وہ اسلام آباد منتقل ہوگئی۔ اگلے ڈیڑھ سال میں اس نے پاکستان کے طول و عرض میں 18,500 اساتذہ کو اپنے تجربات سے مستفید کیا۔

کہاوت مشہور ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا عمل دخل ہوتا ہے لیکن سلیمہ کی کامیابی کے اس سفر میں دو مردوں، والد اور شوہر نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اوشی کنڈ اس کے روایتی کٹر ماحول میں روایت شکنی سے خوشگوار تبدیلی لانے والی یہ خاتون اس وقت اسلام آباد میں ڈاکٹریٹ کی تعلیم حاصل کر رہی ہے قومی سطح پر اسے مختلف ایوارڈز دیے گئے ہیں۔ سلیمہ بیگم پہلی پاکستانی نژاد خاتون ہیں جسے گلوبل ٹیچرز پرائز کے تحت دس بہترین عالمی اساتذہ میں شامل فہرست کیا گیا۔ (گذشتہ سال پاکستان کی جانب سے عقیلہ آصفی بھی نامزد تھی تاہم عقیلہ افغان نژاد ہے۔)

گلوبل ٹیچرز پرائز کے حصول میں سلیمہ بیگم کو کامیابی میسر نہیں ہوئی لیکن اس کی جدوجہد اظہر من الشمس ہے۔ گلگت بلتستان میں اس نے جو تعلیمی انقلاب برپا کیا اسے تاقیامت بھلایا نہیں جا سکے گا۔

بھیانک سازش

سید احتشام

امریکا کی تاریخ میں اس سے بڑی کسی اور سازش کا ذکر نہیں ملتا۔ بلاشبہ وہ سازش ایسی تھی جس نے امریکا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس سازش کے کئی کردار سامنے آئے جن کو سزا بھی سنائی گئی لیکن ان کا سرغنہ کون تھا یہ بات آج بھی پردۂ راز میں ہے۔

ملک کے صدر اور کئی اہم افراد کے قتل میں کون کون شامل تھا؟

وہ 14 اپریل 1865 گڈ فرائی ڈے کا مذہبی دن تھا۔ واشنگٹن ڈی سی میں دوپہر سے ذرا ہی پہلے اسٹیج کا مایہ ناز ایکٹر جان ویلکس بوتھ اپنی ڈاک لینے فورڈس تھیٹر میں ٹہلتا ہوا داخل ہوا۔ جب وہ مزید قریب پہنچا تو تھیٹر کے مینیجر ہیری فورڈ نے اس چھبیس سالہ نہایت حسین و جمیل خوش پوش نوجوان کو یہ کہہ کر خیر مقدم کیا۔ ”یہ رہا واشنگٹن کا حسین ترین شخص۔“

پھر اس نے اپنے دفتر میں بوتھ کے پرستاروں کی

Interesting News

بچت کرنے کے 7 طریقے | Seven Methods of Savings

computerxtech 0 Oct 13, 2017

پیسہ خرچ کرنا جتنا ضروری ہے، پیسے بچانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ یہ بچی ہوئی رقم مستقبل میں کسی آڑے وقت میں کام آسکتی ہے۔ روز بروز بڑھتی مہنگائی ... Readmore

Interesting News

دنیا کے خطرناک روڈ | World's Most Dangerous Roads

computerxtech 0 Oct 02, 2017

دنیا بھر کے خطرناک ترین روڈ میں ایسی گزرگاہیں شامل ہیں جو اپنی تعمیر، محل وقوع، اونچائی، طوالت اور موسم کی وجہ سے عام سڑکوں کی نسبت مختلف ہیں دنیا بھر... Readmore

Interesting News

عرب امارات کے حکمران کروڑوں ڈالر خرچ کرکے زمین پر مریخ بنائیں گے

computerxtech 0 Oct 01, 2017

امارات کی حکومت نے اگلے 100 سال میں مریخ پر انسانی آبادی بسانے کے منصوبے کا افتتاح کردیا۔فوٹو: حکومت دبئیدبئی: متحدہ عرب امارات کے حکمران 15 ک... Readmore

Interesting News

کیا آپ مریخ پر جانا چاہتے ہیں ؟

computerxtech 0 Oct 01, 2017

مریخ ایک ایسا سیارہ ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ پانی کی موجودگی ہوسکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ سرخ سیارہ انسان کی دلچسپی کا سبب بن چکا ہے فوٹو: فائلانسان چاند پر... Readmore

Interesting News

مریخ کے بارے میں 11 حیرت انگیز معلومات

computerxtech 0 Oct 01, 2017

خلائی کھوجیوں کی بڑی تعداد مریخ پر پہنچی گئی ہے اور امید ہے کہ اگر زمین کے علاوہ زندگی اسی سیارے پر ممکن ہے۔ فوٹو، فائلکراچی: زمین کے بعد مریخ عا... Readmore

Interesting News

اے ٹی ایم استعمال کرنے والے اسے ضرور پڑھیں اور فراڈ سے بچیں

computerxtech 0 Sep 24, 2017

سائبر ٹھگ اے ٹی ایم میں تبدیلی کرکے بھی آپ کو قیمتی سرمائے سے محروم کرسکتے ہیں۔ (فوٹو: فائل)کراچی: پورے ملک میں نقد رقم نکلوانے کے لیے اے ٹی ایم... Readmore

طرف سے موصول ہونے والے خطوط اس کے حوالے کر دیے۔ بوتھ جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ اسٹیج کے ایک بڑھئی نے مینیجر فورڈ سے پوچھا۔ ’’کیا آپ اسٹیٹ باکس تیار چاہتے ہیں؟‘‘

اسٹیٹ باکس سے مراد وہ باکس تھا جو صرف محترم صدر اور ان کی پارٹی کے لیے مخصوص تھا۔

’’ہاں۔‘‘ مینیجر فورڈ نے جواب دیا۔

انہیں وائٹ ہاؤس سے یہ پیغام موصول ہوا تھا کہ اس رات صدارتی پارٹی وہاں ڈراما دیکھنے کے لیے آنے والی ہے۔ بوتھ نے جب یہ سنا تو فورڈ کی طرف دیکھا۔

’’صدر لنکن اور یہاں؟‘‘

’’ہمارا کھیل دیکھنے؟‘‘

ان دنوں ایک پرانا مزاحیہ کھیل ’’امریکن کزن‘‘ اسٹیج کیا جا رہا تھا جو تماش بینوں میں اپنی دلچسپی کھو چکا تھا۔

’’ہاں۔‘‘ فورڈ نے جھک کر کہا۔ ’’شاید اس طرح ہمارے اس باسی کھیل میں کشش پیدا ہو جائے اور یہ مزید بزنس کر لے۔‘‘

’’ہاں شاید۔‘‘ بوتھ نے اس سے اتفاق کیا اور باہر چلا گیا تاکہ تھیٹر کی داخلی سیڑھیوں پر بیٹھ کر آرام سے اپنے پرستاروں کے تعریفی خطوط پڑھ سکے۔

کسی بھی عینی شاہد کو یہ یاد نہیں کہ اس نے بوتھ کے رویے میں کسی قسم کی غیر معمولی بات محسوس کی ہو۔ وہ صحیح معنوں میں ایک شاندار ایکٹر تھا کیونکہ اس کے ذہن میں فوراً ہی ریاست ہائے متحدہ کے صدر کو قتل کرنے کا منصوبہ تشکیل پا گیا تھا اور اس منصوبے کو اسے اگلے دس گھنٹے میں عملی جامہ پہنانا تھا۔

وہ اپنے خطوط پڑھنے کے بعد قصداً دوبارہ تھیٹر میں داخل ہوا، اوپر چڑھ کر گیلری میں گیا اور ایک بغلی راہداری سے ہو کر صدر لنکن کے لیے مخصوص باکس میں جا گھسا۔ وہاں بیٹھ کر وہ رات میں پیش ہونے والے ڈرامے کی ریہرسل دیکھنے لگا۔ اس کھیل کے ایک منظر میں ایک مزاحیہ اداکارہ کو ایک جملہ ادا کرنا تھا۔ اس اداکارہ نے جونہی وہ جملہ اپنے مخصوص انداز میں ادا کیا، بوتھ چوکنا ہو گیا۔ وہ جملہ کچھ ایسے پُرلطف انداز میں ادا کیا گیا تھا کہ بوتھ کو یقین ہو گیا کہ جب کھیل پیش ہو گا تو اس مزاحیہ جملے پر پورا ہال تماش بینوں کے قہقہوں سے گونج اٹھے گا۔

وہ تھوڑی دیر کے بعد تھیٹر سے نکلا اور تیزی سے چل پڑا۔ اس مرحلے پر اس کی مصروفیات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ آپ ٹاؤن، ڈاؤن ٹاؤن اور کراس ٹاؤن میں درجنوں افراد نے اسے دیکھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو بہت اچھی طرح سب کو دکھایا۔ اس نے دوستوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا، خواتین کی طرف دیکھ کر احتراماً اپنا ہیٹ اتارا، راہ گیروں سے ہیلو ہائے کیا۔ اس وقت اس کے جسم پر بے داغ لباس تھا اور پیروں میں شہسواری کے بوٹس تھے جن میں مہمیز کی پھرکی لگی ہوئی تھی۔

وہ تھیٹر سے نکل کر سیدھے گھوڑوں کے ایک اصطبل پہنچا اور اس نے ایک صحت مند گھوڑی کرائے پر حاصل کر لی۔ اس کے بعد وہ فورڈس تھیٹر کے نزدیک ہی واقع ایک بورڈنگ ہاؤس گیا جہاں بھانت بھانت کے بدقماش لوگوں سے وہ گزشتہ کئی ماہ سے میل جول بڑھائے ہوئے تھا۔ کچھ دیر ان کی صحبت میں وقت گزارنے کے بعد وہ ایک بار میں گیا۔ وہاں ایک بوتل برانڈی حلق میں اتاری اور چھ بجے کے قریب کہیں غائب ہو گیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ایک بار پھر گھوم کر تھیٹر میں داخل ہوا، جو اب بالکل ویران تھا، وہ سیدھے اسٹیٹ باکس کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے چاقو کی مدد سے دروازے کے بالائی پینل میں ایک سوراخ کیا، پھر جھک کر فرش پر سے چھیلن سمیٹا اور وہاں سے کھسک گیا۔ گویا اس نے صدر کے قتل کی راہ ہموار کر دی تھی۔

وہ واپس نیشنل ہوٹل پہنچا جہاں وہ رہتا تھا۔ اس نے کھانا کھایا، اس کے بعد اپنے کمرے میں گیا۔ وہاں اس نے ایک وگ، ایک نقلی داڑھی، ایک خنجر، دو ریوالور اور سنگل شاٹ والا ایک مخصوص پستول اٹھا لیا جس سے فائر کرنے پر ایک کنچے کے برابر چھوٹا سا سوراخ ہو جاتا تھا۔ وہ رات کے لگ بھگ آٹھ بجے نیشنل ہوٹل سے نکلا۔ ہوٹل کے استقبالیہ کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے کلرک سے پوچھا کہ کیا وہ اس رات فورڈس تھیٹر جائے گا؟

’’نہیں۔‘‘ کلرک نے جواب دیا۔

’’تمہیں ضرور جانا چاہیے۔‘‘ بوتھ نے اصرار کیا۔ ’’آج رات وہاں اداکاری کے بعض عمدہ نمونے دیکھنے کو ملیں گے۔‘‘

ایسا وہ اس لیے کر رہا تھا کہ لوگ گواہ رہیں اس کے بعد وہ ایک بار پھر تقریباً ایک گھنٹے کے لیے غائب ہو گیا۔ شہادتیں اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اس دوران اس

نے اس بھیانک، گہری اور پیچیدہ تاریخی سازش میں ملوث اپنے دوستوں کے ساتھ حتمی اور فیصلہ کن صلاح و مشورے کیے جو اس رات کی سیاہی ڈھلنے سے پہلے ہی منکشف ہونے والی تھی۔

رات کے ساڑھے نو بجے وہ فورڈس تھیٹر کے پچھواڑے بلیپٹ ایلی میں اسٹیج کے دروازے پر نمودار ہوا۔ پھر وہاں سے چلتا ہوا صدر کی منتظر بگھی کے پاس سے گزرتا ہوا ٹینتھ اسٹریٹ پہنچا جہاں ایک بار واقع تھا۔ وہاں بھی اس نے مے نوشی سے شغل کیا اور پھر واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اس موقع پر بار میں موجود کسی شخص نے اس پر فقرہ چست کیا۔ ''تم کبھی اپنے باپ جیسے ایکٹر نہیں بن سکتے۔''

بوتھ ایڑیوں کے بل مڑا۔ کچھ دیر تک لاجواب سا ہو کر خاموش کھڑا رہا۔ پھر اچانک مسکرایا اور مڑ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بہ آواز بلند کہا۔ ''جب میں اسٹیج سے اتروں گا تو امریکا کا سب سے مشہور شخص ہوں گا۔''

سننے والے اس بات کی گہرائی نہ سمجھ سکے اس نے کتنی بڑی بات کہہ دی تھی۔

جان بوتھ کا باپ جونیس بروٹس بوتھ نیم پاگل شرابی تھا، جو اپنے وقت کا عظیم ترین ایکٹر تصور کیا جاتا تھا۔ اس کے دس بچے تھے جن میں جان بوتھ کا نواں نمبر تھا۔ جان بوتھ نے صرف سترہ سال کی عمر میں اسٹیج پر اداکاری کے جوہر دکھانے شروع کردیے تھے۔ دو سال کے بعد 1858ء میں اس نے ورجینیا کے شہر رچمنڈ میں شیکسپیئر کے ڈرامے ''ہیملٹ'' میں ہیملٹ کا کردار ادا کیا اور وہ راتوں رات اسٹیج کے افق پر چاند کی طرح چمکنے لگا۔ لڑکیاں اس کی دیوانی ہوگئیں۔ وہ سڑکوں پر اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اس کے پیچھے بھاگتیں۔ جب وہ اسٹیج پر نمودار ہوتا تو وہ وفورِ جذبات سے چیخنے لگتیں اور اس کا آٹوگراف لینے کی غرض سے اس طرح ٹوٹ پڑتیں جیسے مکھیاں مٹھائی پر ٹوٹتی ہیں۔

جان بوتھ فروری 1861ء تک جنوب ہی میں سکونت پذیر رہا لیکن چونکہ جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے، اس لیے اس نے شمال میں تھیٹروں میں بکنگ منظور کرلی کیونکہ وہ پیدائشی جنوبی نہیں تھا۔ وہ میری لینڈ میں پیدا ہوا تھا۔ اس لیے غلامی سے اس کی کوئی جذباتی یا مالی وابستگی نہیں تھی۔ جس وجہ سے بغاوت نے جنگ کی صورت اختیار کی تھی اور امریکا جنوب و شمال میں بٹ گیا تھا وہ وجہ غلاموں کی خرید و فروخت تھی۔ جان بوتھ نہ تو غلاموں کی تجارت سے وابستہ تھا اور نہ اسے اس قسم کی تجارت سے نفرت تھی۔ وہ لاتعلق بندہ تھا مگر جب ہمسفر میں تو پیں داغی جانے لگیں تو بوتھ نے کھلم کھلا کہنا شروع کردیا کہ یہ جدید دور کی سب سے دلیرانہ کارروائی ہے اور یہی بات اس کے مخالفین نے پکڑ لی۔ ایک گروپ نے تھیٹر کو تباہ کرنے اور اسے شہر چھوڑنے کی دھمکی دی لیکن وہ اپنی ہمدردی کے باوجود بھاگ کر جنوب کی باغی آرمی میں شامل نہیں ہوا۔ اس نے شہر چھوڑنے سے انکار کردیا۔

جب ہزاروں اتحادی محبِ وطن مر رہے تھے تو جان بوتھ اسٹیج پر ہی رہا اور پانچ سو ڈالر فی ہفتہ کے عوض ہیملٹ، میکبتھ اور اوتھیلو کے کردار کرتا رہا لیکن جلد ہی وہ اسٹیج سے ہٹ کر ایک خطرناک کھیل میں ملوث ہوگیا۔ 1865ء میں وہ انڈر گراؤنڈ باغیوں سے جاملا تھا۔

کنفیڈریٹ سیکرٹ سروس انتہائی منظم تھی۔ یونین کے ہر بڑے شہر میں ان کے جاسوسوں کا جال پھیلا ہوا تھا لیکن بوتھ کا پیشہ ایک انتہائی عمدہ بہروپ تھا۔ وہ آزادی سے محاذوں پر اور ریاستوں کے درمیان آتا جاتا رہتا اور اسٹیج کے پیچھے پیغام رسانوں اور سیکرٹ ایجنٹوں سے ملتا رہا۔ دستاویزی شہادتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ باغیوں کی انٹیلی جنس سے کینیڈا تک میں اس کا رابطہ تھا۔ اس لیجنڈ کے بارے میں اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک غیر ذمے دار جنونی تھا جس کی گردن پر ابراہام لنکن کا خون ہے۔ مگر کیسے یہ بتاتا چلوں۔

☆......☆

دسمبر 1864ء کے اواخر میں بوتھ ایک دن ایک بورڈنگ ہاؤس گیا۔ یہ بورڈنگ ہاؤس، مسز میری یوجینیا سرات نامی ایک خاتون کا تھا اور واشنگٹن میں فورڈس تھیٹر سے چار بلاک کے فاصلے پر 541 ایچ اسٹریٹ پر واقع تھا۔ وہاں دو باغی ایجنٹ کے علاوہ متعدد جعلی شخصیتیں اکٹھا ہوئی تھیں۔ بوتھ کے وہاں جانے کے کچھ ہی دیر کے بعد ایک میلا کچیلا کرایہ دار وہاں وارد ہوا اور ایک کمرے کے لیے اس نے درخواست کی۔ اس کا نام جارج تھا۔ اس کے بعد ہی ایک اور اجنبی وہاں آگیا۔ وہ ایک لحیم شحیم نوجوان تھا۔ اس نے ایک مسیحی مبلغ کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا۔ اس کا نام فادر لوئس پین تھا۔ اس کے ذرا ہی دیر کے بعد ایک اور مفلوک الحال شخص آپہنچا۔ وہ ایک سابق ڈرگ اسٹور کلرک ڈیوڈ ہیرولڈ تھا۔ یہ لوگ مرکزی سازشی تھے۔

☆......☆

سازش کے ابتدائی مراحل میں ایک پلان بنایا گیا۔

اس پلان کے مطابق انہیں صدر کو اغواء کر کے جنوب میں لے جانا تھا۔ صدر کے پکڑے جانے پر شمالیوں کے حوصلے پست ہو جاتے اور جنوبیوں کے حوصلے بلند ہو جاتے۔ دوسرے یہ کہ یرغمال بنا کر ہزاروں قیدیوں کو رہا کرایا جا سکتا تھا لیکن بدقسمتی سے اغوا کا منصوبہ جو مہینوں کی محنت اور سوچ و بچار کے بعد بنایا گیا تھا حماقتوں کا شاہکار ثابت ہوا۔ بوتھ کا پہلا منصوبہ یہ تھا کہ صدر ابراہام لنکن کو فورڈس تھیٹر ہی میں اس کے باکس میں دبوچ لیا جائے۔

اس منصوبے کے مطابق ایک سگنل ملنے پر گیس کے مرکزی والو کو آف کر دیا جائے گا جس سے پورا تھیٹر اندھیرے میں ڈوب جائے گا۔ اغواء کنندگان تیزی سے باکس میں گھس جائیں گے اور صدر کو دبوچ کر نیچے اسٹیج تک لے آئیں گے۔ پھر اسے گھسیٹتے ہوئے باہر کھڑی بگھی میں سوار کر دیں گے اور بگھی تیزی سے رچمنڈ روانہ ہو جائے گی۔ اس کا متبادل منصوبہ یہ تھا کہ گھنے درختوں کے درمیان سے ہو کر گزرنے والی اس بل کھاتی سڑک کے ایک موڑ پر گھات لگا کر بیٹھ جائیں گے جو واشنگٹن سے باہر تین میل آگے ایک ملٹری اسپتال تک جاتی تھی۔ صدر اکثر وہاں جاتا رہتا تھا اور دستور کے مطابق اخبارات میں پیشگی اس وزٹ کا اعلان ہوتا تھا۔

بوتھ نے 18 جنوری کو اپنے پہلے منصوبے پر عمل درآمد کرنے کی کوشش کی۔ کوڈ سائن، پاس ورڈز اور خفیہ آرڈر اس کے ساتھیوں تک پہنچ گئے۔ مختلف مقامات پر انڈر گراؤنڈ باغیوں کو چوکس کر دیا گیا۔ فورڈس تھیٹر کے اسٹیج کے دروازے پر ایک بگھی بھی پہنچ گئی جس میں مناسب پردے لگے ہوئے تھے لیکن یہ منصوبہ بری طرح ناکام ہو گیا کیونکہ وہ ایک طوفانی رات تھی اور صدر ابراہام لنکن نے ایسے خوفناک موسم میں تھیٹر کا رخ کرنا پسند نہیں کیا۔ وہ گھر ہی میں رہا۔

اس کے دو ماہ کے بعد اغوا کی دوسری کوشش اسپتال جانے والی سڑک پر کی گئی۔ اس موقع پر ایچ اسٹریٹ کے بورڈنگ ہاؤس کے سازشیوں کا پورا گروہ شراب پی کر گھوڑوں پر سوار ہو کر شہری حدود سے بہت آگے سڑک کے کنارے لکڑی کے بنے ہوئے ایک اسٹینڈ پر اکٹھا ہو گیا۔ اب بوتھ نے آخری حکم جاری کیا۔ اس کے مطابق سرات کوچوان کو پکڑتی جب کہ پین اور خود بوتھ صدر لنکن کو دبوچتے۔

ذرا ہی دیر میں ایک چمچماتی ہوئی بگھی اپنے شیڈول کے مطابق نمودار ہوئی جسے گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ کوچوان گھوڑوں پر چابک برسا رہا تھا۔ بگھی آئی اور گزر گئی لیکن بگھی میں بیٹھا ہوا شخص صدر لنکن نہیں تھا۔ اس وقت وہ یونین کے فوجیوں کو تمغے بانٹ رہا تھا جو غیر متوقع طور پر باغیوں سے حاصل کیا ہوا ان کا جھنڈا صدر کو پیش کرنے واشنگٹن آئے تھے۔

اغواء کی تیسری کوشش اس وقت پھر ناکامی سے ہمکنار ہوئی جب صدر لنکن نے آخری لمحوں میں تھیٹر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ تیسری مرتبہ بھی ناکامی کا تلخ مزہ چکھنے پر سازشیوں کا چیف بوتھ غصے، جھنجھلاہٹ، مایوسی اور شکست خوردگی کے احساس سے دیوانہ ہو گیا۔ صدر لنکن کو ٹریپ کرنے کی ساری کوشش، ساری محنت، ساری بھاگ دوڑ رائیگاں گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ اب تک ہوا میں جال پھینکتا رہا ہو۔ اسے اپنے انڈر گراؤنڈ ساتھیوں کی خفگی اور ناراضگی کا بھی احساس تھا جنہیں اس نے الرٹ کر دیا تھا۔ اب وہ اور ..... تضحیک کا سامان کر رہے تھے۔ اپنی ذلت اور رسوائی وہ کیسے برداشت کرتا جو اس کی ناکامیوں کے باعث اس کی جھولی میں آ گری تھی جب کہ وہ تو شہرت اور ناموری کے خواب دیکھ رہا تھا۔ بار بار کی ان ناکامیوں پر کڑھتے ہوئے اس نے اغواء کا منصوبہ ترک کر کے اس سے کہیں زیادہ خطرناک قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔

☆......☆

1865ء کے گڈ فرائی ڈے تک اس کا یہ ارادہ پختہ ہو چکا تھا۔ اس اطلاع تے کہ صدر لنکن اس رات فورڈس تھیٹر میں اپنے باکس میں ہوگا، جگہ اور وقت کا تعین کر دیا تھا۔ اس رات بوتھ نے جارج کو نائب صدر اینڈریو جانسن پر قاتلانہ حملے کی ذمہ داری سونپی۔ پین اور ہیرولڈ کو وزیر داخلہ ولیم ایچ سیوارڈ کو ہلاک کرنا تھا۔ گویا ایک ہی وار میں یونین کی سرکردہ ہستیوں کا صفایا کرنا مقصود تھا۔

اس رات بوتھ، فورڈس تھیٹر کی اس راہداری میں نمودار ہوا جو صدر کے باکس تک رہنمائی کرتی تھی۔ اس موقع پر اس نے خود کو لوگوں کی نگاہ سے چھپانے کی زحمت نہیں کی۔ کئی لوگوں نے اسے راہداری میں دیکھا۔ صدر کے باکس کی داخلی گزرگاہ پر کوئی پہرہ نہیں تھا۔ اس حقیقت کے

باوجود کہ صدر کو اغواء کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور واشنگٹن باغی ایجنٹوں اور جوشیلے حامیوں سے بھرا ہوا تھا، دروازے کے باہر بچھی ہوئی، محافظ کی کرسی خالی تھی۔ وائٹ ہاؤس میں لنکن کی میز پر ایک ایسا لفافہ تھا جو اسی خطوط پر مشتمل تھا۔ ان خطوط میں اسے جان سے مارنے کی دھمکیاں دی گئی تھیں اور ایک باغی نے اس پر گولی بھی چلائی تھی۔ اس کے علاوہ، ورجینیا کا ایک گروپ، جس میں معزز افراد شامل تھے، فنڈز اکٹھا کرنے میں مصروف تھا۔ تاکہ صدر لنکن کو قتل کرنے والے کو بطور انعام خطیر رقم دی جاسکے۔ جنوب کی ریاستیں صدر لنکن سمیت شمالی ریاستوں سے محض اس بناء پر بغاوت پر اتر آئی تھیں کہ سیاہ فاموں کو حاصل ہونے والے حقوق کے نتیجے میں شمالی ریاستوں کا غلبہ کسی بھی صورت میں ان کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔

1861ء سے 1865ء تک جاری رہنے والی یہ خانہ جنگی اسی نسلی منافرت کا شاخسانہ تھی جس کے بھیانک شعلوں نے ہزاروں سیاہ فاموں کو چاٹ لیا اور ان کے گھروں کو پھونک ڈالا۔ صدر لنکن ان کا سب سے بڑا ہدف تھا کیونکہ وہ سیاہ فاموں کو ملنے والے حقوق کا سب سے بڑا پاسبان تھا۔ شمالی ریاستوں کے نہ صرف سارے سیاہ فام بلکہ لاکھوں سفید فام بھی اس کے حامی تھے۔ ایسے حالات کے باوجود صدر کے باکس کے دروازے کے باہر سول یا ملٹری پولیس کا کوئی پہرہ نہیں تھا۔

وائٹ ہاؤس کے ایک گارڈ کے مطابق صدر لنکن نے ذاتی طور پر وزیر دفاع ایڈون ایم اسٹینٹن سے اس رات باڈی گارڈ فراہم کرنے کو کہا تھا کیونکہ اس دن سہ پہر میں صدر کو جان سے مارنے کی دھمکی دی گئی تھی۔ صدر نے اسٹینٹن سے خاص طور سے اس کے ایک گارڈ کا کہا تھا جو ایک میجر تھا اور جس کا نام ایکرٹ تھا۔ لیکن اسٹینٹن نے صدر کو جواب دیا کہ اس رات ایکرٹ کو دوسرا اہم کام انجام دینا ہے لہٰذا وہ ایکرٹ کو اس کے ساتھ نہیں بھیج سکتا لیکن ریکارڈ سے ثابت ہوتا ہے کہ میجر ایکرٹ اس رات فارغ تھا اور اسے کوئی اہم فرض تفویض نہیں کیا گیا تھا۔ وہ شام سے گھر پر تھا اور رات دس بجے شیو کر رہا تھا۔

واشنگٹن کے ایک پولیس مین جان ایف پارکر کو صدر کے باکس کے دروازے پر پہرہ دینا تھا۔ اسے یہ ڈیوٹی سونپی گئی تھی لیکن وہ اپنی جگہ سے غائب تھا۔

اخبارات کئی دنوں تک شور مچاتے رہے کہ پارکر کے

خلاف تفتیش کی جائے۔ میٹرو پولیٹن پولیس ریکارڈ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پوری پولیس فورس میں پارکر کا ریکارڈ سب سے گندا تھا۔ اس میں وہ ساری برائیاں تھیں جو پولیس مین میں نہیں ہوتیں۔ وہ ڈیوٹی کے دوران شراب پیتا تھا، حکم عدولی کرتا تھا، انتہائی بدتمیز اور بداخلاق تھا۔ اس کا پورا ریکارڈ سیاہ تھا۔ سب سے تعجب خیز بات یہ ہے کہ ایسے ناکارہ ترین پولیس مین کو خود مسز لنکن کی خصوصی درخواست پر وائٹ ہاؤس میں ڈیوٹی پر لگایا گیا تھا۔ آج تک کوئی نہیں جان سکا کہ ایسا کیوں ہوا تھا؟ جب مسز لنکن کی یہ اسپانسر شپ سامنے آئی تو اس پورے معاملے پر فوری سنسر شپ کی نقاب ڈال دی گئی۔

☆......☆

بوتھ نے اس خالی کرسی کو آہستہ سے پھلانگ کر اس سوراخ سے باکس کے اندر جھانکا جو اس نے اسی دن بنایا تھا۔ صدر لنکن اپنا اوور کوٹ پہنے، اپنی مخصوص ہلنے والی کرسی پر متمکن تھا۔ بوتھ نے اپنی پوزیشن بدل کر جھانکا۔ صدر کے پہلو میں مسز لنکن فروکش تھی۔ اس سے آگے ایک آرام کرسی پر لنکن کی ایک مہمان کلارا ہیرس بیٹھی ہوئی تھی اور باکس کے اندرونی دیوار کے ساتھ ہی ایک دیوان پر اس خاتون کا محافظ بیٹھا تھا۔ وہ ایک نوجوان فوجی میجر تھا اور اس کا نام ریتھ بون تھا۔

بوتھ نے اپنا سنگل شاٹ والا مخصوص ریوالور نکال لیا اور ڈرامے کے اس مزاحیہ فقرے کا انتظار کرنے لگا۔ بالآخر ڈرامے کی اداکارہ نے وہ فقرہ ادا کیا اور پورا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ بوتھ نے دروازے کا ناب ایک جھٹکے سے کھول لیا اور اندر کی طرف جھپٹا۔ اس کا پستول لہرایا، دھماکا ہوا۔ صدر لنکن کی ٹھوڑی اس کے سینے سے لگ گئی۔ وہ یوں ساکت ہو گیا گویا بیٹھے بیٹھے اچانک سو گیا ہو۔

میجر ریتھ بون نے چونک کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔ اسے صدر کی کرسی کے پیچھے ایک انسانی سایہ نظر آیا۔ صدر کے سر سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ریتھ بون اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اسی لمحے بوتھ کا خنجر لہرایا اور ریتھ بون کے بازو کو چیر گیا۔ میجر ریتھ بون تیزی سے پیچھے ہٹا اور بوتھ پر جھپٹا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ بوتھ اس سے چھٹا ہوا، باکس کے کگر پر آ گیا۔ اس نے زور سے دھکا دے کر میجر کو ایک طرف گرا دیا اور ایک ٹانگ گھما کر ریلنگ پر چڑھ گیا۔ میجر ریتھ بون اسے پکڑنے کے لیے ایک بار پھر جھپٹا ہی تھا کہ اس نے خود کو ریلنگ سے نیچے اسٹیج پر گرا دیا۔ اس کوشش میں اس کا بایاں ٹخنہ مڑ گیا۔ وہ درد سے بلبلا اٹھا۔ تکلیف کی شدید لہر کو نظر انداز کرتے ہوئے کھڑا ہوا اور اپنا خنجر لہراتا ہوا اسٹیج کے بازو میں جا گھسا۔ وہاں ایک ایکٹریس اپنا فقرہ بولنے کے انتظار میں کھڑی تھی۔ بوتھ نے اسے زور کا ایک طرف دھکا دیا اور بجلی کی سی تیزی سے اسٹیج کے نیم تاریک دروازے کی طرف لپکا۔ راہداری میں آرکسٹرا کا لیڈر موجود تھا۔ بوتھ نے اس پر خنجر سے دو وار کیے اور اسے زور کا دھکا دیا۔ آرکسٹرا کی پہلی سیٹ پر متمکن واشنگٹن اٹارنی مسٹر اسٹیوارٹ کو صدر کے باکس میں ہوئی گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ اسی لیے جیسے ہی بوتھ نے اسٹیج پر چھلانگ لگائی اسٹیوارٹ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور بوتھ کے پیچھے لپکا لیکن وہ جونہی اسٹیج کو عبور کر کے دروازے پر پہنچا، دروازہ باہر سے ایک دھماکے سے بند ہو گیا۔ اسٹیوارٹ دروازے کی ناب پکڑنے کی کوشش میں ادھر اُدھر ہاتھ مارنے لگا۔

باہر گلی میں جو شخص بوتھ کا گھوڑا تھامے اس کے انتظار میں کھڑا تھا، بوتھ کو دیکھ کر چیخا۔ ”مسٹر بوتھ دروازے سے باہر آ گئے۔“

اسی وقت اسٹیوارٹ بھی چیختا ہوا باہر آ گیا۔ ”رک جاؤ......رک جاؤ۔“ لیکن بوتھ تب تک گھوڑے پر سوار ہو کر اسے ایڑ لگا چکا تھا۔

☆......☆

بوتھ کا سب سے ذہین اور قابل اعتماد ساتھی ڈیوڈ ہیرولڈ، گڈ فرائی ڈے کا پورا دن ادھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ وہ اسلحہ چھپانے کے لیے جارج کے پاس بورڈنگ ہاؤس گیا، پھر بوتھ کی تلاش میں نیشنل ہوٹل گیا۔ اس کے بعد مسٹر فلیچر کے اصطبل پہنچا جہاں سے اس نے ایک گھوڑی کرائے پر لی اور جب اس پر سوار ہونے لگا تو فلیچر نے اسے یاد دہانی کرائی کہ گھوڑی ہر صورت میں رات کے نو بجے تک واپس کرنی ہو گی لیکن ہیرولڈ رات کے نو بجے تک اصطبل نہیں لوٹا۔ دس بج کر دس منٹ پر وہ پین کے ساتھ تھا اور اس کی رہنمائی کرتا ہوا، ویران اسکوائر کو عبور کر کے وزیر داخلہ سیوارڈ کے گھر کے سامنے پہنچا تھا۔ عظیم الجثہ پادری لوئس پین، سیوارڈ کے گھر میں داخل ہو گیا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی ہیرولڈ تیزی سے اپنی گھوڑی سے اترا، اس نے پین کا گھوڑا ایک درخت سے باندھ دیا۔ پھر اچھل کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور یہ جا وہ جا۔

وزیر داخلہ سیوارڈ ایک حویلی میں اپنی بیوی، دو بیٹوں فریڈرک، آگسٹس اور بیٹی فینی کے ساتھ رہتا تھا۔ حال ہی میں اس کی بگھی کو ایک زبردست حادثہ پیش آیا تھا جس میں اس کے جبڑے ٹوٹ گئے تھے۔ دایاں بازو فریکچر ہو گیا تھا۔
14 اپریل کی رات وہ تیسری منزل پر واقع بیڈ روم میں بیڈ پر نیم دراز تھا۔ اس کا دایاں بازو گلے کی پٹی میں تھا اور تھوڑی چمڑے اور لوہے کے پتر میں جکڑی ہوئی تھی۔ درد کی شدت سے اس کی رنگت سفید ہو رہی تھی۔ چہرے کا ایک حصہ بری طرح سوجا ہوا تھا اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ سارجنٹ جنسن میل نرس کی حیثیت سے اس کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ فینی بیڈ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس انتظار میں تھی کہ اس کے باپ کو نیند آ جائے اور وہ سکون سے سو جائے۔
ابھی اس پر غنودگی طاری ہوئی ہی تھی کہ اچانک حویلی کا سکوت زوردار آواز سے مجروح ہو گیا۔ فریڈرک سیوارڈ چونک اٹھا۔ وہ بیٹی سے پوچھنے والا تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر آ گیا۔ فریڈرک نے اس شخص کو روکنے کی کوشش کی تھی کہ اس نے اچانک اچھل کر کولٹ ریوالور نکال لیا اور ٹریگر دبا دیا لیکن نشانہ خطا ہو گیا۔ وہ اجنبی لوئس پین تھا۔ نشانہ خطا ہونے پر اس نے فریڈرک کے سر پر خالی ریوالور سے حملہ کر دیا۔ اضطراب کے عالم میں ضرب پر ضرب لگاتا چلا گیا۔ فریڈرک کا چہرہ خون سے تر ہو گیا تھا۔ وہ فرش پر گٹھڑی کی طرح گر کر بے ہوش ہو گیا۔
تبھی کسی نے پیچھے سے پین کے بازو کو پکڑ لیا۔ عقب میں کھڑی لڑکی ہسٹریائی انداز میں چیخ رہی تھی۔ وہ دو مرد تھے جو اس پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دونوں اس سے گتھم گتھا تھے۔ پین نے ایک شخص کو دھکا دے کر میز پر گرا دیا اور اس پر خنجر سے وار کر کے تیزی سے گھوما اور دوسرے شخص پر وار کیا۔ پھر فرنیچر کو لات مار کر اپنے راستے سے ہٹاتا ہوا بھاگ کر ہال میں پہنچا۔
وہ اپنے پیچھے ایک انتہائی دلخراش اور روح فرسا منظر چھوڑ آیا تھا۔ فریڈرک خون کے جوہڑ میں بے ہوش پڑا تھا۔ آگسٹس کا سر پھٹا ہوا تھا اور پورا چہرہ خون سے تر تھا۔ سارجنٹ رابنسن زخموں سے چور تھا۔ اس کے سینے اور شانوں میں خنجر گھونپا گیا تھا۔ وہ اٹھنے کے قابل نہیں تھا۔ فینی ہسٹریائی انداز میں چیختی ہوئی بے ہوش ہو گئی تھی اور مسز سیوارڈ خوف سے تھر تھر کانپتی ہوئی، بیڈ روم کے ٹوٹے ہوئے فرنیچر کے درمیان سے ہو کر اپنے زخمی شوہر کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ فرش پر بچھی ہوئی قالین خون سے رنگین ہو رہی تھی۔ سیوارڈ فرش پر ساکت پڑا تھا۔ اس کا شکستہ بازو خطرناک زاویے سے مڑا ہوا تھا۔
اپنے کوٹ پر خون کے دھبوں اور خون سے لتھڑے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ لوئس پین چیختا ہوا، زینے پر بھاگ رہا تھا۔ ”میں پاگل ہوں، میں پاگل ہوں۔“
نچلی منزل کے ایک کمرے سے ایک بے خبر شخص برآمد ہوا اور اوپر جانے کے لیے زینہ طے کرنے لگا۔ پین نے ایکدم سے اس پر چھلانگ لگائی اور خنجر دستے تک اس کے سینے میں گھونپ دیا۔ وہ شخص وہیں ڈھیر ہو گیا۔ پین باہر کی طرف بھاگا۔
باہر آتے ہی اس کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ ہیرولڈ اسے چھوڑ کر بھاگ چکا تھا۔ حویلی کی ایک بالائی کھڑکی سے کوئی عورت حلق پھاڑ کر ہسٹریائی انداز میں چیخ رہی تھی۔ ”قاتل...... قاتل...... قاتل......!“
پین نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگانے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ وہ آرام سے گھوڑے کو چلاتا ہوا، سڑک پر آ گیا۔ اس سے اچھی عیارانہ ترکیب بھلا اور کیا ہو سکتی تھی۔
لوئس پین اپنے گھوڑے پر سوار آرام سے چلا جا رہا تھا مگر وہ غلط سمت میں بڑھ رہا تھا حالانکہ ہیرولڈ نے اسے فرار کا راستہ چھ مرتبہ سمجھایا تھا لیکن اس وقت اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ راستہ کون سا تھا۔

☆......☆

شہر بھر میں افواہ گردش کر رہی تھی کہ نائب اور جانسن کو قتل کر دیا گیا ہے۔ جنرل گرانٹ کو گولی مار دی گئی ہے۔ واشنگٹن پر باغیوں نے حملہ کر دیا ہے۔“
صدر لنکن کے سر میں گولی لگی تھی۔ اسے اس مہلک زخم کے ساتھ فورڈس تھیٹر سے اٹھا کر سڑک کے دوسری طرف واقع ایک گھر میں لے جایا گیا تھا۔ جہاں صدر لنکن اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ وزیر دفاع اسٹنٹن جو اب امریکی قوم کا سپریم کمانڈر بن گیا تھا۔ اپنے گھٹنے پر رکھے ہیٹ کو بطور میز استعمال کرتے ہوئے آرمی، نیوی اور اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کو فرمان، احکامات اور ہدایات جاری کر رہا تھا۔ اس نے واشنگٹن میں آٹھ ہزار فوجیوں کو اسی وقت متحرک کر دیا تھا۔ وہ جتنی تیزی سے قلم گھسیٹ رہا تھا اتنی ہی تیزی سے زبانی احکامات بھی جاری کر رہا تھا اور ہاتھ

لہرا لہرا کر چیخ بھی رہا تھا۔ اس نے ملٹری پولیس، سٹی کانسٹیبلری، وفاقی سراغ رسانوں اور تمام گارڈز کو پبلک بلڈنگز کو تحفظ فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ شہر کی تمام سڑکوں پر گشت کرنے کی ہدایات جاری کردیں۔ اس کے ساتھ ہی فورڈس تھیٹر کو سربہ مہر کرنے اور اس ڈرامے آور "امریکن کزن" کے ایک ایک فنکار کو گرفتار کرنے کا حکم بھی جاری کردیا۔

اس نے واشنگٹن سے قاتلوں کے راہِ فرار کو مسدود کرنے کے لیے ریلوے ٹرمینل پر پولیس فورس کی بھاری جمعیت کو متعین کردیا تھا۔ نیول فورسز کو بھی دریائے پوٹومیک کی ناکہ بندی کرنے کے احکامات جاری کردیے تھے۔ آرمی فورس کو دارالخلافہ سے مشرق، شمال مشرق، شمال مغرب اور جنوب کی سمت نکلنے والی چھ سڑکوں کی ناکہ بندی کرنے کی ہدایات دے چکا تھا لیکن فرار کے دو راستوں کو بالکل کھلا چھوڑ دیا تھا جس سے سازش کرنے والے نیوی یارڈ برج کے طویل جنگلات سے گزر کر دریائے ان کوسٹیا عبور کرکے بہ آسانی فرار ہوسکتے تھے۔ یہ دونوں سڑکیں زیریں میری لینڈ تک رہنمائی کرتی تھیں۔ یہ علاقہ انڈر گراؤنڈ باغیوں کا علاقہ رچمنڈ کی گزرگاہ تھا۔ یہ امر انتہائی ناقابلِ فہم ہے کہ اسٹینٹن نے جب واشنگٹن سے باہر جانے والی ہر سڑک کی ناکہ بندی کردی تھی تو قتل کی پوری رات یہ دونوں سڑکیں پوری کھلی کیوں چھوڑ دی تھیں؟

☆......☆

چونکہ خانہ جنگی کا زمانہ تھا۔ حفاظتی اقدامات کے تحت نیوی یارڈ برج کا پھاٹک رات کے 9 بجے بند کردیا جاتا تھا۔ 14 اپریل کی اس رات برج گارڈ کے کمانڈر سارجنٹ سلاس کو رات دس بج کر پینتالیس منٹ پر تاریکی میں ڈوبی ہوئی گیارہویں اسٹریٹ پر کسی تیز رفتار گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی جو تیزی سے قریب آتی جارہی تھی۔ اگلے چند ہی سیکنڈ میں ایک گھڑسوار ان کے قریب آکر رک گیا۔ ایک سنتری نے بڑھ کر گھوڑے کی راس تھام لیں۔

"جناب آپ کون ہیں؟" سارجنٹ سلاس نے پوچھا۔

"میرا نام بوتھ ہے۔" گھڑسوار نے جواب دیا۔

"آپ کہاں جارہے ہیں؟"

"میں اپنے گھر جارہا ہوں۔"

سارجنٹ نے سوچا کہ وہ کسی رئیس کا بیٹا ہوگا جو دارالخلافہ میں عیاشی کرنے کے بعد اپنے گھر لوٹ رہا ہے۔ اس نے چاروں طرف گھوم کر سوار کا جائزہ لیا۔ پھر پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ "ٹھیک ہے۔" وہ سر ہلا کر بولا۔ "آپ جاسکتے ہیں۔"

بوتھ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تیزی سے پل عبور کرتا چلا گیا۔

محکمہ جنگ نے بھی سارجنٹ سلاس کے اس رویے کی نہ تو کوئی تحقیق یا تفتیش کی اور نہ ہی مذمت کرنے کی زحمت گوارا کی۔ اس کے افسرانِ اعلیٰ نے اس کے فیصلے کو بدقسمتی سے تعبیر کیا اور قابلِ درگزر سمجھ کر قبول کرلیا۔ سارجنٹ کے پاس یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی کہ رات گئے وہاں سے گزرنے والے گھڑسوار نے کچھ ہی دیر پہلے ریاست ہائے متحدہ کے صدر کا قتل کردیا ہے۔

تاریخ کے ریکارڈ میں بہت سی بڑی بڑی کوتاہیاں نظر آتی ہیں اور اس رات صدر کا قاتل جان بوتھ ان میں سے ایک کوتاہی کا سہارا لے کر شہر سے نکل گیا تھا۔ کیا یہ اندازے کی غلطی تھی؟ یا کہ ایسی غلطیاں ڈیزائن کی گئی تھیں۔ اس رات بوتھ کو پل پر سے گزرنے کی اجازت دینا، تاریخ میں اکیلے سارجنٹ ہی کا حصہ نہیں ہے۔ بوتھ کے فرار ہونے کے کچھ ہی دیر کے بعد دوسرا گھڑسوار اپنے گھوڑے کو سرپٹ بھگاتا ہوا وہاں پہنچا۔ وہ ڈیوڈ ہیرولڈ تھا۔

"تم کون ہو؟" سارجنٹ سلاس نے اس سے شناخت کا مطالبہ کیا۔

"میرا نام تھامس ہے۔" ہیرولڈ نے منہ بنا کر جواب دیا۔

"تم اتنی رات گئے گھر سے باہر کیا کررہے ہو؟" سارجنٹ نے پوچھا۔

"میں ایک عورت سے ملنے گیا تھا۔" ہیرولڈ نے جواب دیا۔ "اب میں واپس گھر جارہا ہوں۔"

سارجنٹ کو وہ گھڑسوار بے ضرر لگا۔ لہٰذا اس نے سنتری کو پھاٹک کھولنے کا اشارہ کردیا ہیرولڈ بڑی آسانی سے فرار ہوگیا۔ اسے گئے ہوئے صرف چند ہی منٹ گزرے تھے کہ تیسرا گھڑسوار بھی اپنے گھوڑے کو بگٹٹ بھگاتا ہوا وہاں آن پہنچا۔ وہ اصطبل کا مالک فلیچر تھا جس سے ہیرولڈ نے گھوڑا کرائے پر لیا تھا اور فلیچر نے گھوڑا رات 9 بجے واپس اصطبل پہنچانے کی تاکید کی تھی۔ ہیرولڈ، وزیرِ داخلہ سیوارڈ کے گھر سے بھاگتے ہوئے اس اصطبل کے پاس

سے گزرا تھا اور جارج فلیچر کی نظر اس بھاگتے ہوئے گھڑسوار اور گھوڑے پر پڑ گئی تھی۔ وہ اچھل کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا تھا اور ہیرولڈ کا پیچھا کرتا ہوا اس پل تک آ گیا تھا۔

''مجھے پل کے اس پار جانا ہے۔'' اس نے سارجنٹ سلاس سے اصرار کیا۔ ''وہ شخص میرا گھوڑا چرا کر بھاگ رہا ہے۔''

لیکن سارجنٹ سلاس نے اس رات تیسری فاش غلطی کی۔ ''پل بند ہو چکا ہے۔'' اس نے بے رخی سے جواب دیا۔ ''تم نہیں گزر سکتے واپس جاؤ۔''

جارج فلیچر کا مارے غصے کے خون کھول اٹھا۔ وہ اپنے گھوڑے کو موڑ کر سرپٹ بھگاتا ہوا سیدھے واشنگٹن پولیس ہیڈ کوارٹرز پہنچا۔ ''میرا گھوڑا چوری ہو گیا ہے۔'' وہ چیخ کر بولا۔ ''چور نیوی یارڈ برج سے فرار ہو گیا ہے۔''

سپرنٹنڈنٹ نے فوراً ان ہلاکتوں کا تعلق مفروروں سے جوڑ دیا اور آرمی ہیڈ کوارٹرز سے درخواست کی کہ انہیں فوری گھوڑے فراہم کیے جائیں تاکہ پولیس کی جمعیت کو ان مفرور قاتلوں کے تعاقب میں روانہ کیا جا سکے۔ آرمی ہیڈ کوارٹرز نے جواب دیا کہ ان کے پاس کوئی گھوڑا دستیاب نہیں ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے پولیس کو ہدایت کی کہ ہیڈ کوارٹرز میں جم کر بیٹھے رہو اور ملٹری کو یہ تعاقب ہینڈل کرنے دو لیکن انہوں نے اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کیا۔ انہیں اگلے دن اس کا ہوش آیا۔ تب تک قاتل کہیں سے کہیں فرار ہو چکے تھے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیوں؟ آخر ایسا کیوں ہوا؟ آرمی ہیڈ کوارٹرز نے سپرنٹنڈنٹ کی درخواست پر کیوں نہیں کان دھرا اور خود کوئی قدم کیوں نہیں اٹھایا؟ کیا سرخ فیتہ راہ میں حائل ہو گیا تھا یا ایڈون اسٹینٹن کے ناقابل فہم رویے کے پیچھے کوئی گھناؤنی سازش کارفرما تھی؟ اس کا جواب آج تک نہیں مل سکا۔

☆......☆

دریائے اناکوسٹیا عبور کرنے کے بعد ہیرولڈ بوتھ سے مل گیا اور وہ دونوں ایک ساتھ شمال کی سمت بڑھتے چلے گئے۔ آدھی رات ہوتے ہوتے بوتھ اپنے ٹخنے میں آنے والی موچ سے بے حال ہو گیا۔ لنکن کے باکس سے اسٹیج پر چھلانگ لگانے پر اس کے بائیں ٹخنے میں موچ آ گئی تھی اور اب گھوڑے پر سوار ہر جھٹکے پر تکلیف بڑھ رہی تھی۔ درد اس قدر شدید تھا کہ اسے الٹیاں ہونے لگیں۔ اسے برانڈی کی سخت طلب محسوس ہو رہی تھی، اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔

واشنگٹن سے دس میل دور ایک مقام سرات ویل میں ایک سرائے تھی جہاں سازشیوں نے اپنے اسلحے کا ایک بنڈل چھپا رکھا تھا۔ یہاں وہ دونوں رکے اور سرائے کے مالک جان لائڈ کے دروازے پر زور زور سے دستک دے کر اسے نیند سے جگایا۔ اس نے ان کے طلب کرنے پر اسلحے کا وہ بنڈل لا کر ان کے حوالے کر دیا۔ اس دوران بوتھ وہسکی سے اپنی پیاس بجھاتا رہا۔ پھر دونوں اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر پورٹ ٹوبیکو کی سمت روانہ ہو گئے جہاں ایک کشتی انہیں دریائے پوٹومیک عبور کرانے کے انتظار میں تھی لیکن ابھی وہ منزل بہت دور تھی۔

اب تک بوتھ کا پیر اس بری طرح سوج چکا تھا کہ اسے اپنا بوٹ اس پیر میں لوہے کے شکنجے کی مانند کسا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ اس نے ہیرولڈ سے کہا کہ اسے کوئی ڈاکٹر ڈھونڈنا پڑے گا۔ قریب ترین جگہ بریان ٹاؤن تھی جہاں ڈاکٹر سیموئیل ہوا کرتا تھا۔ پچھلی سردیوں میں بوتھ اکثر اس کے پاس آتا رہا تھا لیکن وہ ڈاکٹر سیموئیل کی سیاسی وابستگی کے بابت وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ پھر بھی انہوں نے اس کے پاس جانے کا خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ ایک ہلاکت خیز فیصلہ تھا۔

صبح کے تقریباً چار بجے ہیرولڈ، بوتھ کی رہنمائی کرتا ہوا، سیموئیل کے فارم پر پہنچا اور سڑک کی طرف کھلنے والے پھاٹک پر زور زور سے دستک دینے لگا۔

''کون ہے؟'' تھوڑی دیر کے بعد کسی نے پکار کر پوچھا۔

''ایک شخص گھوڑے سے بری طرح گر گیا ہے اور سخت تکلیف میں ہے۔'' ہیرولڈ نے پکار کر کہا۔ ''کیا ڈاکٹر اس کی ٹانگ ٹھیک کر دے گا؟''

چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا اور ڈاکٹر سیموئیل مڈ نمودار ہوا۔ اس نے بوتھ کو ہیرولڈ کی مدد سے گھوڑے سے اتارا اور دونوں اسے اٹھا کر اندر لے گئے۔ بوتھ نے ایک شال سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا تاکہ ڈاکٹر سیموئیل اسے پہچان نہ سکے۔ ہیرولڈ نے ڈاکٹر سے بوتھ کا تعارف مسٹر ٹائی سن کی حیثیت سے کرایا۔ بعد ازاں ڈاکٹر نے حکام کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا کہ یہی وجہ تھی کہ وہ اور اس کی بیوی اس مفرور زخمی کو پہچاننے سے قاصر رہے تھے۔ اس وقت ڈاکٹر نے بوتھ کے جوتے کو کاٹ کر کھول دیا اور کھپچیوں کی مدد سے

اس کے پیر کو سیدھا رکھنے کے اقدامات کیے۔ پھر اس کے جسم پر کمبل ڈال کر صبح تڑکے اپنے کھیت پر کام کرنے چلا گیا۔

دوپہر میں فارم سے واپس آ کر اس نے بوتھ کے پیر کا پھر معائنہ کیا۔ بوتھ نے اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ رکھا تھا۔ یہ بات کسی بھی فزیشن کو متجسس کر سکتی تھی اور وہ اپنے مریض سے اس کی وجہ پوچھ سکتا تھا لیکن ڈاکٹر مڈ کے بیان کے مطابق اس نے مریض سے کچھ نہیں پوچھا۔ اس کے بجائے وہ کھلیان میں گیا اور اس کے لیے ایک بیساکھی بنا کر لایا۔ اسی سہ پہر وہ دونوں گھڑسوار وہاں سے رخصت ہو گئے۔

☆......☆

وہ سہ پہر سے مسلسل بھاگ رہے تھے اور اب رات ہو گئی تھی۔ جنگل میں ایک چرچ کے قریب وہ راستہ بھول گئے۔ وہ جس پگڈنڈی پر بڑھ رہے تھے وہ پگڈنڈی دلدلی علاقے میں جا کر ختم ہو گئی تھی۔ وہ کچھوے کی رفتار سے آگے بڑھنے لگے۔ گھڑسواری کی وجہ سے اب بوتھ کے دونوں پیر زخمی ہو گئے تھے اور وہ سخت تکلیف میں تھا۔ جب اس نے گھوڑے سے اتر کر پیدل چلنے کی کوشش کی تو اس کی بیساکھی کیچڑ میں دھنس گئی۔ وہ بار بار گرتے پڑتے ہوئے ہفتے کی آدھی رات کو کرنل کاکس کے ہاں پہنچ پائے لیکن اس وقت تک دریائے پوٹومیک کو عبور کرنا بے حد خطرناک ہو چکا تھا۔ وفاق کے سپاہی چپے چپے پر موجود تھے۔ چنانچہ کرنل کاکس نے انہیں چھ دن تک اپنے گھر سے دو میل دور ایک دلدلی علاقے میں چھپائے رکھا اور کھانے پینے کی چیزیں فراہم کرتا رہا۔ اس دوران فوجی اور پولیس شکاری کتوں کی طرح ان کی بو سونگھتے پھر رہی تھی۔

اس دوران بوتھ نے اپنے خیالات ایک ڈائری میں محفوظ کیے جو خودستائی کا اعلیٰ شاہکار ہے۔ اس نے خود کو ایک ایسے ہیرو سے تشبیہ دی جسے عوام الناس سمجھ نہیں سکے۔ اس کا مشن اتنا اعلیٰ و ارفع تھا کہ عام انسانوں کو اس کا ادراک نہیں ہو سکا۔ وہ لکھتا ہے۔

”کاش دنیا میری عظمت کو سمجھ سکے کہ ایک ہی گولی نے مجھے کتنا عظیم بنا دیا ہے حالانکہ مجھے عظمت کی کوئی خواہش نہیں۔ میں یہاں جنگل اور دلدل میں سردی سے ٹھٹھر رہا ہوں اور فاقے کرنے پر مجبور ہوں۔ فوج اور پولیس کی بھاری نفری شکاری کتوں کی طرح میری بو سونگھتی پھر رہی ہے۔ ہر شخص کی انگلی میری طرف اٹھی ہوئی ہے۔ میں یہاں بے بسی اور لاچاری کے عالم میں پڑا ہوں، تو کیوں؟ میں نے آخر کیا کیا ہے؟ میں نے تو آج تک کسی سے نفرت نہیں کی، کسی کو اپنی ذات سے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ میرے اندر ایک عظیم روح ہے، میں ایک مجرم کی حیثیت سے مرنا نہیں چاہتا۔“

☆......☆

قتل کی اس بھیانک اور تاریخی رات کو واشنگٹن پولیس کا سپرنٹنڈنٹ میجر اے سی رچرڈز بھی خود فورڈ تھیٹر میں تماشائیوں کے درمیان موجود تھا اور اس نے بوتھ کو پہلی نظر میں پہچان لیا تھا۔ وہ اٹھ کر صدر کے باکس کی طرف بھاگا۔ باکس کے باہر کرسی پر وہ گارڈ موجود نہیں تھا جسے پہرہ دینے کے لیے متعین کیا گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ رچرڈز اس پہرے دار کو ڈھونڈنے میں ناکام ہو کر بھاگتا ہوا، پولیس ہیڈکوارٹرز پہنچا اور اس نے دس منٹ کے اندر اندر مشینری کو حرکت دے دی۔ اس نے ڈیوٹی پر موجود فورس کو مختصر الفاظ میں اس قومی سانحے سے آگاہ کرتے ہوئے، ریزرو پولیس کو فوری طلب کر لیا اور جاسوسوں کی ایک فوج کو فورڈ تھیٹر روانہ کر دیا۔

رات بارہ بجے کے بعد 15 اپریل کی تاریخ شروع ہو گئی۔ رات کے دو بجے تک فورڈ تھیٹر میں موجود سارے تماش بینوں سے سخت پوچھ گچھ کی جاتی رہی جس کے نتیجے میں تین نام ابھر کر سامنے آئے۔ جان ولکیس بوتھ، ڈیوڈ ای ہیرولڈ اور جان، ایچ سرات سپرنٹنڈنٹ رچرڈز کو ایک اہم پتے کا بھی علم ہو گیا۔ 541 ایچ اسٹریٹ، رچرڈز نے فوراً سراغ رساں جان کلاردو کو حکم دیا کہ اس بورڈنگ پر چھاپہ مار کر بوتھ اور سرات کو گرفتار کرے۔ جان کلاردو نے اپنے دس سراغ رسانوں کی معیت میں رات کے سوا دو بجے بورڈنگ ہاؤس پر چھاپہ مارا۔ وہاں کے ایک رہائشی لوئس ویچ مین نے اطلاعی گھنٹی پر دروازہ کھولا۔ سارے سراغ رساں ایک ساتھ اندر گھس کر ہر طرف پھیل گئے۔ پھر جب وہ واپس ہال میں آئے تو لوئس نے ناگواری سے ان سے پوچھا۔ ”معزز حضرات! رات کے اس پہر اس خانہ تلاشی کا کیا مطلب ہے؟“

کلاردو نے اسے سخت نظروں سے گھور کر دیکھا۔ ”کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ تمہیں پتا ہی نہیں۔ پچھلی رات کو کیا سانحہ پیش آیا ہے؟“

رہائشی لوئس نے اسے خالی نظروں سے اس کی طرف

دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں۔''

کلاردو نے ایک سیاہ گلوبند اسے دکھایا جس پر خون کے دھبے تھے۔ ''کیا تمہیں اس پر خون نظر آرہا ہے؟''

لوئس اس خون آلود مفلر کو گھورنے لگا۔

اسی وقت مسز سرات اپنے بیڈ روم سے برآمد ہوئی۔ لوئس نے وہ خبر اسے سنائی۔ بیوہ مسز سرات یہ سن کر بوکھلا گئی۔ ''اوہ خدایا! مسٹر ویچ مین۔'' وہ اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر متوحش لہجے میں بولی۔ ''ایسا مت کہو۔''

کلاردو کو اس کے تاثرات بالکل اصلی لگے۔ مسز سرات نے پوچھ گچھ کے دوران اعتراف کیا کہ اس نے بوتھ کو گزشتہ روز سہ پہر کے دو بجے دیکھا تھا لیکن اس نے زور دے کر کہا کہ اس نے اپنے بیٹے جان سرات کو دو ہفتے سے نہیں دیکھا کلاردو کو بوتھ اور جان سرات دونوں کو گرفتار کرنا تھا لیکن دونوں ہی اس وقت وہاں موجود نہیں تھے۔ ویچ مین نے رضا کارانہ پیشکش کی کہ وہ افسروں سے تعاون کرنے کے لیے صبح آٹھ بجے پولیس ہیڈ کوارٹرز آئے گا اور اس یقین دہانی کے ساتھ سراغ رساں رخصت ہو گئے۔

☆......☆

وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ مسز سرات کے سر پر قضا ناچ رہی تھی۔ سوموار 17 اپریل کی رات کو واشنگٹن آرمی فورس کے کمانڈر انچارج جنرل کرسٹوفر نے اس بورڈنگ ہاؤس میں موجود ہر فرد کو گرفتار کرنے کے احکامات جاری کر دیے۔ کرسٹوفر کے آدمی پارلر کے باہر انتظار کر رہے تھے۔ اس دوران بورڈنگ ہاؤس کی خواتین اپنے لباس پہن رہی تھیں۔ بعض سپاہی بورڈنگ ہاؤس کے باہر تاریکی میں کھڑے تھے۔ رات کے تقریباً گیارہ بج کر بیس منٹ پر فٹ پاتھ پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک راہ گیر اپنے شانے پر ایک کدال اٹھائے ہوئے نمودار ہوا اور بورڈنگ ہاؤس کے سامنے رک کر اس نے کال بیل بجائی۔ اندر موجود پولیس والوں نے دروازہ کھول دیا اور وہ اندر آ گیا۔ سراغ رسانوں نے اس سے پوچھ گچھ کی تو اس نے جواب دیا کہ مسز میری سرات نے صبح ہی اسے ایک گڑھا کھودنے کے لیے بلا بھیجا تھا۔ پولیس اس سے پوچھ گچھ کر ہی رہی تھی کہ مسز میری سرات کمرے میں داخل ہوئی۔

''کیا تم اس مزدور کو جانتی ہو؟'' ایک سراغ رساں نے نو وارد کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

''خدا گواہ ہے۔ میں نے اس شخص کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

اگلے ہی لمحے سراغ رسانوں نے نو وارد پر ریوالور تان لیے۔ ''اپنی شناخت کراؤ۔''

''لعنت ہو۔'' نو وارد جلے بھنے انداز میں بڑبڑایا اور پھر اس نے ایک سند ان کی طرف بڑھا دی۔

اس سند پر اس کا نام لوئس پین تحریر تھا۔ پولیس نے اسے اسی وقت گرفتار کر لیا لیکن وہ اپنے اسی موقف پر ڈٹا رہا کہ وہ گڑھا کھودنے والا مزدور ہے۔ وہ لوگ اسے لے کر پولیس ہیڈ کوارٹرز آ گئے اور پھر انہوں نے وزیر داخلہ مسٹر سیوارڈ کے نیگرو ملازم ولیم بیل کو طلب کر لیا۔ ولیم بیل پہلی ہی نظر میں پین کو پہچان گیا۔ پولیس نے پین کو فوراً دہری ہتھکڑیاں پہنا دیں اور دریائے پوٹومیک میں قیدیوں کے نیوی جہاز ساؤگس میں سوار کروا دیا جہاں اسے دیگر قیدیوں سے الگ تھلگ قید تنہائی دے دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی محکمہ جنگ نے اعلان کر دیا کہ انہوں نے وزیر داخلہ کے حملہ آور کو گرفتار کر لیا ہے۔

☆......☆

اس سال 17 اپریل 1865ء کا ایسٹر سوموار سرکاری ایجنسیوں کے لیے خوش قسمتی کا دن ثابت ہوا۔ یہ سچ ہے کہ لنکن کا قاتل اور اس کے ساتھی اب تک مفرور رہے تھے۔ تاہم اس سلسلے میں ہونے والی گرفتاریاں خاصی موثر تھیں۔ مسز میری سرات، لوئس پین، بوتھ کے دو گرگے مائیکل اولا فلین اور سیموئیل بی آرنلڈ کے علاوہ بوتھ کا اردلی ایڈورڈ بھی گرفتار ہو چکے تھے۔ اگلے دو دن میں ایک اور اہم سازشی جارج ایزیروٹ بھی 19 اپریل کو اپنے کزن کے فارم ہاؤس سے گرفتار ہو گیا۔ وہ نشے میں دھت اور شراب سے تر بتر تھا۔ اسے بھی قیدیوں کے جہاز ساؤگس کی ایک کوٹھڑی میں دیگر قیدیوں کے ساتھ پھینک دیا گیا۔

ان میں سے کسی بھی قیدی پر فرد جرم عائد نہیں کی گئی تھی۔ محض قتل کے الزام میں قید کیا گیا تھا۔ مقدمہ بعد میں چلایا جانا تھا۔ انہیں بے پناہ اذیت دی گئی۔ تاہم اسٹینٹن اس پر بھی مطمئن نہیں تھا۔ اس نے 23 اپریل کو ایک حکم جاری کیا کہ جہاز پر موجود سارے قیدیوں کے سروں پر کینوس کے بیگ پہنائے جائیں اور گردن پر کس دیے جائیں۔ یہ گیس ماسک جیسے تھے۔ ان میں صرف ناک اور منہ کے پاس سوراخ تھے جن سے وہ سانس لے سکتے تھے اور کھا پی سکتے

تھے لیکن دیکھنے اور سننے سے محروم تھے۔ کینوس کے بیگ اوڑھائے جانے کے بعد قیدیوں کی حالت مزید ابتر ہوگئی۔ گردن پر ڈوری کی سخت بندش کی وجہ سے انہیں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ قیدیوں کے سرجن نے اس ظالمانہ اور غیر انسانی سلوک پر اسٹینٹن سے احتجاج کیا کہ قیدیوں کے گلے کی بندش ذرا ڈھیلی کی جائیں تاکہ ان کا دم نہ گھٹ جائے لیکن اسٹینٹن کی طرف سے اس کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ قیدیوں میں سب سے عظیم الجثہ لوئس پین کے لیے یہ ناقابل برداشت ہوگیا اور وہ پاگل ہوگیا۔ اس نے اپنا سر کوٹھڑی کی دیوار سے ٹکرا کر خودکشی کرنے کی کوشش کی۔

ایسٹر سوموار تک قاتلوں کی تلاش پھیل کر ملک گیر ہوگئی تھی۔ جو کے ساتھ گھن بھی پسنے لگے۔ ایسے بے گناہوں کی گرفتاری بھی عمل میں آئی جو صدر لنکن کے قاتل کی بابت کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ انہیں صرف شریک جرم یا معاون ہونے کے شبہ میں گرفتار کیا گیا تھا۔ ریجنل ملٹری پولیس نے ان مشتبہ افراد کو واشنگٹن روانہ کردیا۔ جلد ہی سٹی پولیس اور دور دراز کے علاقوں کے شیرف کی کارروائیوں کے نتیجے میں جیلیں مشتبہ افراد سے بھر گئیں اور پھر بوتھ کے رشتے داروں پر سرکاری ایجنسیاں قہر بن کر نازل ہوئیں۔ بوتھ کی بہن آسیا بوتھ کلارک کا جو پانچ ماہ کی حاملہ تھی، اس وقت نروس بریک ڈاؤن ہوتے ہوتے رہ گیا جب پولیس اسے ہتھکڑیاں پہنا کر گھسیٹتے ہوئے، واشنگٹن کے پرانے جیل میں لے جا کر ڈال گئی جب کہ وہ بالکل بے گناہ تھی۔

اس کے بعد بوتھ کے بھائی جونیس جونیئر پر قہر ٹوٹا۔ وہ قتل کی رات سنسناٹی میں ایک ڈراما کر رہا تھا۔ اس دوران لنکن کے قتل کی خبر وہاں پہنچی اور مشتعل ہجوم نے اس کے ہوٹل کا گھیراؤ کرلیا۔ وہ بڑی مشکل سے ایک بغلی راستے سے جان بچا کر بھاگا اور بھیس بدل کر فرضی نام سے مشرق کی سمت روانہ ہوگیا لیکن 26 اپریل کو فلاڈیلفیا میں گرفتار ہوگیا۔ جب پولیس نے اسے جیل میں ڈالا تو غصے کی شدت سے اس کے منہ سے کوئی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے خانہ جنگی کے دوران شمال کی حمایت کی تھی۔

بوتھ کے دوسرے بھائی جوزف بوتھ کے سر پر اس وقت حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا جب اسے سان فرانسسکو سے نیویارک پہنچتے ہی اسٹیمر میں گرفتار کرلیا گیا۔ اس قتل میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ پھر بھی پولیس نے اسے ٹھیک ٹھاک طریقے سے رگڑا اور چند گھنٹوں کے بعد رہا کردیا۔ وہ اس تجربے کو کبھی نہیں بھول سکا اور کئی سال تک وہ بوتھ کو اپنا بھائی تسلیم کرنے سے انکار کرتا رہا۔ اسٹینٹن کو جب کوئی قابل ذکر سراغ ہاتھ نہ آیا تو اس نے بوتھ کی فیملی کو جیلوں میں ٹھونسنا شروع کردیا۔

مزے کی ایک اور بات سامنے آئی۔ جب پورا ملک صدر لنکن کے قتل پر سکتے کے عالم میں تھا، بوتھ کی موجودگی کی ایک درجن رپورٹیں ملیں۔ واشنگٹن کے کئی شہریوں نے دعویٰ کیا کہ بوتھ کو انہوں نے پنسلوانیا ایونیو پر دیکھا تھا۔ نیویارک کے شہریوں کو وہ براڈوے پر نظر آیا۔ نیاگرا فالز، بوسٹن اور شکاگو سے بھی اسی قسم کی اطلاعات موصول ہوئیں۔ پنسلوانیا میں پولیس نے ایک شخص بوتھ کے گرد گھیرا تنگ کردیا۔ اس کا پورا نام بھی جان ولکیس بوتھ تھا۔ لیکن وہ کوئی اور تھا۔ اس طرح پولیس اس نام کے ایک اور بے گناہ شخص کا ڈٹرائیٹ سے پیچھا کرتی ہوئی مونٹریال پہنچ گئی اور اسے پکڑ کر دم لیا لیکن وہ بے چارہ بھی کوئی اور بوتھ تھا۔

☆......☆

17 اپریل 1865ء سے بوتھ کی ملک گیر تلاش نہایت زور و شور سے شروع ہوگئی۔ زیریں میری لینڈ میں پرنس جارجز اور چارلس کاؤنٹی کے علاقے دس ہزار گھوڑوں کی ٹاپوں سے تھرا اٹھے۔ سواروں کو بوتھ کا سراغ لگانے میں تھوڑی سی دشواری پیش آئی۔ ایلنس فریش اور پورٹ ٹوبیکو جیسے مقامات پر لگ بھگ آدھے گاؤں والے جان سرات، ڈیوڈ ہیرولڈ، جارج ایزیروٹ سے واقف لگتے تھے۔ سرات ویل میں سرائے کے مالک لائڈ پر اس وقت بجلی سی گری جب ایک شہ سوار دستہ اس کے ہاں آیا۔ فوج کی اتنی بڑی نفری دیکھ کر اس پر کپکپی طاری ہوگئی۔ جب فوجیوں نے اس سے پوچھ گچھ شروع کی تو وہ بلا پس و پیش سب کچھ اگلتا چلا گیا اور یوں پھانسی کے پھندے سے بچ کر وفاقی حکام کی گود میں بیٹھ گیا اور حکومت کا سب سے اہم گواہ بن گیا۔

اس نے حلفیہ بیان دیا کہ قتل کی شام مسز میری سرات اس کے پاس آئی تھی اور اس سے کہا تھا کہ اس کے سرائے میں جو اسلحے چھپائے گئے ہیں، ان اسلحوں کی آج رات ضرورت پڑ سکتی ہے اور وہ اسلحے رات میں طلب کیے جاسکتے ہیں۔

لائڈ کی یہی گواہی بعد میں مسز میری سرات کو پھانسی پر لٹکانے کے کام آئی۔ لائڈ نے یہ بھی اقرار کیا کہ قتل کی رات جان بوتھ، واشنگٹن سے فرار ہوتے ہوئے اس کے ہاں رکا

تھا۔ چنانچہ قاتل کے فرار کی راہ کا تعین ہوگیا۔

اس جال میں پھنسنے والا دوسرا اہم مشتبہ ڈاکٹر سیموئیل مڈ تھا۔ کسی نے لیفٹیننٹ کو ڈاکٹر مڈ کی مخبری کردی اور اس نے لائڈ کے سرائے پر چھاپہ مار کر اسے گرفتار کرلیا۔ شروع شروع میں ڈاکٹر مڈ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا لیکن پھر اس نے صرف یہ اقرار کیا کہ دو گھڑ سوار 15 اپریل کی رات کے اوّلین پہر میں اس کے ہاں آئے تھے اور ان میں سے ایک گھڑ سوار کے ٹوٹے ہوئے ٹخنے کا علاج کرایا تھا جو اپنے گھوڑے سے گر گیا تھا۔

''کیا تم انہیں جانتے تھے؟'' لیفٹیننٹ نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

''نہیں، ہرگز نہیں۔ وہ دونوں میرے لیے بالکل اجنبی تھے۔'' ڈاکٹر نے پُرزور لہجے میں جواب دیا۔

لیکن جب اس سے سختی سے باز پرس کی گئی تو اس نے اقرار کرلیا۔ ''ہاں وہ بوتھ ہی تھا جس کی ٹانگ کا میں نے علاج کیا تھا اور میں نے دلدل عبور کرنے میں اس کی مدد کی تھی۔''

☆......☆

اب جال کسا جانے لگا۔ 20 اپریل کو وزیرِ دفاع اسٹینٹن نے ایک سخت اعلان جاری کیا۔ ''ان تمام لوگوں کو جنہوں نے بوتھ اور ہیرولڈ کو پناہ دی، ان کی پشت پناہی کی، ان کے سراغ پر پردہ ڈالا، کسی بھی طرح سے ان کی مدد کی یا ان سے تعاون کیا یا ان کے فرار میں مدد دی یا انہیں پوشیدہ رکھا، انہیں صدر کے قتل میں شریکِ جرم سمجھا جائے گا اور اس کا مقدمہ ملٹری کمیشن میں چلایا جائے گا۔ اسے سزائے موت بھی دی جاسکتی ہے۔''

اس اعلان نے زیریں میری لینڈ میں زبردست سنسنی پھیلا دی۔ لوگ ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے ڈرنے لگے۔ پھر بھی اطلاعات کا سلسلہ جاری رہا۔ پرووسٹ مارشل جیمز آر او بیرنے کو 21 اپریل کو یہ اطلاع موصول ہوئی کہ کرنل سیموئیل کاکس کے ایک ملازم کا کہنا ہے کہ ادھر کچھ دنوں سے کرنل کاکس خود اپنے ہاتھوں سے کھانا پکا کر دلدلی علاقے کی طرف لے جاتا رہا ہے۔

یہ ایک اہم اطلاع تھی لیکن مارشل جیمز کے سراغ رسانوں کو اس تک پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ جب وفاق کا رسالہ کرنل کاکس کے مکان کے پچھواڑے دلدلی علاقے میں پہنچا تو بوتھ اور ہیرولڈ دریائے پوٹومیک کو عبور کرکے ورجینیا میں داخل ہوچکے تھے۔ یہ قتل کی رات کے ایک ہفتے کے بعد جمعہ اور ہفتے کی شب کے درمیان کا واقعہ ہے۔ ورجینیا پہنچ کر ہیرولڈ نے ایک خاتون مسز کوئیزن بیری کو تلاش کیا جو ایک انڈر گراؤنڈ سازشی اور اس کی رفیق کار تھی۔ مسز کوئیزن بیری نے ان دونوں کو چوری چھپے اپنے آدمیوں کے ہمراہ دوسری جگہ بھیج دیا۔ وہاں ان آدمیوں نے انہیں رازداری سے ایک دوسرے گروپ کے حوالے کردیا۔ اس طرح کئی ہاتھوں سے گزر کر وہ جنگل میں واقع لوکاس نامی ایک سیاہ فام کے کیبن تک پہنچے۔

''تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟'' لوکاس نے انہیں اپنے سامنے پا کر پوچھا۔

''ہم یہاں رات گزارنا چاہتے ہیں۔'' ہیرولڈ نے کہا۔

''تم ایسا نہیں کرسکتے۔'' لوکاس نے جواب دیا۔ ''میں سیاہ فام ہوں اور مجھے سفید فاموں کی مہمان نوازی کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس کے علاوہ میرے پاس صرف ایک ہی کمرا ہے اور میری بیوی بیمار ہے۔''

بیساکھی کے سہارے کھڑے ہوئے بوتھ نے اپنا خنجر نکال لیا۔ ''بڈھے اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' اس کا لہجہ سفاک تھا۔

بوڑھا لوکاس اور اس کی بیوی بے چوں و چرا کیبن سے باہر جا کر سیڑھیوں پر بیٹھ گئے اور انہوں نے ساری رات اسی طرح گزار دی۔ صبح میں وہ دونوں لوکاس کے گھوڑے لے کر وہاں سے چلے گئے۔

☆......☆

سوموار کو ان دونوں بھگوڑوں کی ملاقات تین سپاہیوں سے ہوئی جو بغاوت کا ساتھ دینے والوں میں تھے۔ بوتھ اور ہیرولڈ نے ان سے اپنا تعارف کرایا اور مدد طلب کی۔ ان میں سے ایک اٹھارہ سالہ کیپٹن ولی ایس جیٹ رضاکارانہ طور پر ان کی رہنمائی کرتا ہوا انہیں ورجینیا کے پورٹ رائل سے تین میل دور جنوب میں واقع ایک شخص رچرڈ گیرٹ کے فارم پر لے گیا۔ وہ جگہ واشنگٹن سے اکہتر میل دور تھی۔ وہاں کیپٹن جیٹ نے رچرڈ سے ان الفاظ میں بوتھ کا تعارف کرایا۔ ''یہ میرا دوست جان ولیم بوائڈ ہے، ایک سپاہی۔ یہ رچمنڈ کی جنگ میں زخمی ہوگیا ہے۔ میں بدھ کی صبح خود آکر انہیں لے جاؤں گا۔ تب تک ہر طرح سے ان کا خیال رکھنا۔''

لیکن کیپٹن جیٹ بدھ کی صبح کے بجائے منگل کی شام کو اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا رچرڈ کے مکان کے بیرونی پھاٹک پر آرکا اور اس نے وہیں سے چیخ کر بوتھ کو خبردار کیا۔ ''وفاق کے نیلے کوٹ والے فیری سے دریائے رپاہینوک عبور کرکے پورٹ رائل پہنچ رہے ہیں۔''

یہ سن کر بوتھ اور ہیرولڈ کے ہوش اڑ گئے۔ کیپٹن جیٹ مزید ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جتنی تیزی سے آیا تھا اتنی ہی تیزی سے چلا گیا۔ ابھی تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ شام کے جھٹپٹے میں پوری فضا گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونجنے لگی۔ فوج کا ایک دستہ بگولے کی مانند رچرڈ کے پھاٹک کے سامنے سے گزرا۔ وہ دستہ کیپٹن جیٹ کے تعاقب میں تھا۔ برآمدے میں کھڑے ہوئے رچرڈ کے نوجوان بیٹے ولیم گیرٹ نے یہ منظر دیکھ کر کہا۔ ''یہ لوگ یقیناً باؤلنگ گرین جارہے ہیں۔''

بوتھ اور ہیرولڈ بھی کہیں جارہے تھے۔ گیرٹ اور اس کی فیملی کی اس وقت حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے ان دونوں مہمانوں کو تمباکو فارم کے پچھواڑے واقع پائن کے جنگلات کی طرف جاتے دیکھا۔ بوتھ اپنی بیساکھی کے سہارے مضحکہ خیز انداز میں پھدک پھدک کر چل رہا تھا۔ دونوں گھنے جنگل میں غائب ہوگئے اور اپنے پیچھے شک وشبے میں مبتلا ایک حیران اور ششدر فیملی کو چھوڑ گئے۔

ان دنوں گیرٹ ہاؤس میں کسان رچرڈ گیرٹ کی سالی ہولووے ٹھہری ہوئی تھی۔ وہ ایک اسکول ٹیچر تھی۔ اس کے مطابق اس کا بھانجا ولیم، ان مہمانوں کے اس عجیب و غریب رویے سے بے حد پریشان ہوگیا تھا۔ چنانچہ اس نے ان کے بارے میں تحقیق کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ آس پاس کے لوگوں سے اسے معلوم ہوا کہ نیلے کوٹ والے شہ سوار ایک لنگڑے اور اس کے ساتھی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ واپس آیا تو اس وقت تک بوتھ اور ہیرولڈ واپس آچکے تھے۔

ولیم نے انہیں دیکھ کر غصے سے کہا۔ ''تم لوگوں کو صبح میں یہاں سے ہر صورت میں جانا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم لوگوں کی وجہ سے میرا باپ کسی مصیبت میں پڑے۔''

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن رات میں جب سب لوگ سونے کی تیاری کرنے لگے تو ایک عجیب بات ہوئی۔ بوتھ نے بالائی منزل پر سونے سے انکار کردیا۔ وہ بالائی منزل کے سوا کہیں بھی سونے کو تیار تھا۔ چنانچہ ولیم انہیں سلانے کے لیے تمباکو کے کھلیان میں لے گیا اور وہ جیسے ہی کھلیان میں داخل ہوئے اس نے دروازہ بند کرکے باہر سے قفل لگا دیا اور چابی اپنی خالہ مس ہولووے کو دے دی۔

''یہ چابی کسی کو بھی مت دینا۔'' وہ زور دے کر بولا۔ ''کیونکہ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ یہ دونوں ہمارے گھوڑے چرا کر فرار ہوجائیں گے۔''

یہ معاملہ عجیب اور ناقابل فہم ہے۔ کیونکہ بوتھ کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ اس کے سر کی قیمت ایک لاکھ ڈالر تھی۔ جو بھی اسے زندہ یا مردہ پیش کرتا، اسے حکومت ایک لاکھ ڈالر انعام دیتی۔ دوسرے یہ کہ بوتھ اور ہیرولڈ دونوں ہی خطرناک حد تک مسلح تھے جس کے سر کی قیمت ایک لاکھ ڈالر ہو، اس نے اتنی آسانی سے کھلیان میں بند ہونا کیسے قبول کرلیا۔ اگر انہیں اس بات کا ذرا سا بھی شبہ ہوتا کہ وہ ٹریپ ہوگئے ہیں تو نہ صرف یہ کہ وہ گیرٹ فیملی کو جان سے ماردیتے یا اپنے ریوالور سے دروازے کے قفل کو اڑا کر وہاں سے نکل جاتے لیکن انہوں نے بظاہر کوئی احتجاج نہیں کیا۔

آدھی رات کے وقت ایک اور عجیب بات ہوئی۔ وفاقی فوج کے رسالے نے جس کی کمانڈ لیفٹیننٹ ڈوہرٹی کے ہاتھ میں تھی، باؤلنگ گرین میں اس ہوٹل کو گھیر لیا جس میں کیپٹن جیٹ رہتا تھا۔ اس وقت وہ اپنے کمرے میں بے خبر سو رہا تھا۔ فوجیوں نے اسے بستر سے اٹھایا اور اس کی گردن پر ریوالور رکھ کر گھسیٹتے ہوئے بالائی منزل سے نیچے لے آئے۔ نوجوان کیپٹن کو گہری نیند سے جگایا گیا تھا اور اس کا ذہن ٹھیک سے کام نہیں کررہا تھا۔ فوجی فوراً اپنے مطلب پر آگئے۔ ''بتاؤ تم نے انہیں کہاں چھپایا ہے؟ سچ سچ بتادو ورنہ تمہارا بہت ہی برا حشر ہوگا۔''

نوجوان کیپٹن پہلے ہی بغاوت کے جرم میں کافی سزا بھگت چکا تھا اور اب اسے اپنے سر پر قضا ناچتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ وہ فوراً ٹوٹ گیا۔ اس نے انہیں ان کا ٹھکانا بتادیا جہاں وہ چھپے ہوئے تھے۔ گویا جان بوتھ کے گرد جال مزید تنگ ہوگیا۔

☆......☆

خوابیدہ مس ہولووے اپنے بیڈ پر ایک جھٹکے سے سیدھی ہو بیٹھی۔ باہر گھوڑوں کی ٹاپوں، جھاڑیوں کی سرسراہٹ، دروازے کی زنجیر کی پرشور اور دل ہلا دینے والی کھڑکھڑاہٹ اور برآمدے میں فوجی بوٹوں کی دھمک سے

پوری فضا تھرا رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے زبردست بھونچال آ گیا ہو۔ اچانک کچن کے دروازے پر زور زور سے مکے برسنے لگے۔ لیفٹیننٹ ڈوہرٹی کے سپاہی وہاں آدھمکے تھے۔

"دروازہ کھولو...... دروازہ کھولو......!" باہر سے گرج دار آواز میں فوجی چیخے۔

مس ہولووے نے ایک کھڑکی کے اوپر سرکنے کی آواز سنی اور پھر گیرٹ کی آواز سنائی دی۔ "کون ہے؟"

مس ہولووے بھاگ کر کھڑکی پر پہنچی اور اس نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ ہر طرف فوجی ہی فوجی تھے۔ وہ کھلیان میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے اور پھولوں کی کیاریوں کو روند رہے تھے۔

"دروازہ کھولو۔" انہوں نے دروازے پر بدستور مکے برساتے ہوئے چیخ کر کہا۔ "ورنہ ہم اسے توڑ دیں گے۔"

مس ہولووے ہال کی طرف بھاگی۔ اسے اپنا بہنوئی رچرڈ گیرٹ ہانپتا کانپتا گرتا پڑتا ہوا زینہ اترتا نظر آیا۔

"رکو رکو۔" وہ پکار کر بولا اور کچن کے دروازے کی زنجیر کھولنے لگا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور دروازہ ٹوٹ کر گرنے کو تھا۔

زنجیر کھلتے ہی دروازہ ایک دھماکے سے پورا کھل گیا اور فوجی دندناتے ہوئے گھس آئے۔ ان کے بوٹس کیچڑ میں لت پت تھے۔ چہروں سے بربریت اور سفاکی ٹپک رہی تھی۔

"ہمیں وہ دو آدمی چاہئیں۔" لیفٹیننٹ ڈوہرٹی دہاڑا۔

"وہ تو چلے گئے۔" رچرڈ گیرٹ کے منہ سے نکلا۔

لیفٹیننٹ نے اس کا گلا دبوچ لیا اور اس کا سر دروازے سے ٹکرا کر اس کی کنپٹی پر ریوالور رکھ دیا۔ "بکواس بند کرو اور ان باغیوں کو ہمارے حوالے کر دو۔" وہ حلق پھاڑ کر چیخا۔ پھر اس نے گردن موڑ کر اپنے آدمیوں کو مخاطب کیا۔ "اس باغی کو پکڑ کر لٹکا دو۔ پھر شاید یہ اپنی زبان کھولے۔"

فوجیوں نے رچرڈ کو فوراً پکڑ لیا اور گھسیٹتے ہوئے پورچ کی سیڑھیوں کے پاس لے گئے۔ پھر اسے احاطے کے ایک کونے میں کھڑا کر دیا اور موٹے رسوں کا کوائل نکال کر اس کے ایک سرے پر پھانسی کا پھندا بنانے لگے۔ رچرڈ کے منہ سے ایک کراہ نکل گئی۔ فوجیوں نے اسے گھیر رکھا تھا اور وہ ان کے نرغے میں دم بخود کھڑا تھا۔ فرطِ دہشت سے اس کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔ برآمدے میں اس کی بیوی اور بیٹی خوف اور دہشت سے پھٹی پھٹی نظروں سے یہ ناقابلِ یقین منظر دیکھ رہی تھیں۔ ان کے چہرے کی رنگت کفن کی مانند سفید ہو رہی تھی۔ رچرڈ تھر تھر کانپ رہا۔ پھر جونہی ایک فوجی نے رسے کا دوسرا سرا درخت کی ایک شاخ کی طرف پھینکا، مس ہولووے کے منہ سے بے اختیار ایک دہشت آمیز چیخ نکل گئی۔ اس موقع پر ولیم کی ذہانت کام آئی۔ اس نے بروقت مداخلت کی۔

"معزز حضرات، میں آپ لوگوں کو وہاں لے چلتا ہوں۔" وہ بولا۔

اگلے ایک منٹ میں فوجیوں نے تمباکو کے اس کھلیان کو گھیرے میں لے لیا اور ولیم سے چابی لے کر دروازے کا قفل کھول دیا۔

"باہر نکلو۔" لیفٹیننٹ ڈوہرٹی تحکمانہ لہجے میں گرجا۔

کھلیان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اندر جو لوگ تھے وہ اسلحے بھی رکھتے ہوں گے۔ اندر جاتے ہی وہ حملہ کر دیتے اسی لیے فوجی اندر جانے سے ہچکچا رہے تھے۔

جواب ندارد۔

"سنو۔" ایک فوجی آفیسر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ "ہم کھلیان کو آگ لگا کر ان کی جلی ہوئی لاشیں نکال لیتے ہیں۔" وہ چیخ کر بولا۔ "کچھ جھاڑیاں لے کر آؤ۔"

کئی فوجی حکم کی تعمیل میں ذرا ہی دیر میں جھاڑیوں کا بنڈل اٹھا لائے۔ انہوں نے اسے کھلیان کی دیوار کے ساتھ ڈھیر کر دیا، پھر اس پر کچھ خشک لکڑیاں بھی ڈال دیں۔ "تم دونوں کے لیے آخری موقع ہے۔" لیفٹیننٹ نے چیخ کر کہا۔ "ہم تمہیں پانچ منٹ دیں گے۔"

رات کو جیسے سناٹے نے ڈس لیا ہو اور وقت کی نبض تھم گئی ہو۔ سب لوگ سانس روکے کھڑے تھے۔ کھلیان کے اندر گہرا سکوت تھا۔ اچانک بوتھ کی آواز سنائی دی۔ "تم کون ہو، ہم سے کیا چاہتے ہو؟"

برآمدے میں مس ہولووے شال اوڑھے غم کی تصویر بنی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لکیریں رخسار پر بہنے لگی تھیں۔

کسان رچرڈ گیرٹ اپنی جگہ کسی مجسمے کی طرح ساکت و صامت کھڑا تھا اور بیسیوں رائفلوں کی نالیں اس

کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ کھلیان کے اندر اور باہر ایک بار پھر سناٹا سانس لے رہا تھا۔

''وقت ہو گیا۔'' اچانک لیفٹیننٹ کی آواز سناٹے میں کسی کوڑے کی مانند لہرائی۔

جواب میں کھلیان کے اندر سے ایک گھگھیاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''مجھے اپنی جان بچانے کا ایک موقع دو۔''

وہ دونوں آپس میں تاریک کھلیان کے اندر ایک دوسرے کی مخالفت کر رہے تھے۔ پھر بوتھ جیسے پھٹ پڑا۔ ''تم ایک بزدل ہو جاؤ جاؤ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔'' وہ حلق کے بل چیخا۔ آواز میں وحشیانہ پن تھا۔

چند ہی ثانیے کے بعد دروازے کے پیچھے کھڑ کھڑاہٹ سی ہوئی۔ پھر ایک آواز سنائی دی۔ ''مجھے باہر آنے دو۔ میں سرنڈر کر رہا ہوں۔''

لیفٹیننٹ ڈوہرٹی یہ سن کر دروازے کے بالکل قریب ہو گیا۔ ''جو شخص سرنڈر کرنا چاہتا ہے وہ اپنے دونوں ہاتھ دروازے سے باہر نکالے۔'' وہ تحکمانہ لہجے میں بولا۔

دروازہ بہ آہستگی کئی انچ وا ہو گیا اور ایک ہاتھ باہر آیا۔ اگلے ہی لمحے لیفٹیننٹ نے وہ ہاتھ پکڑ کر ایک شدید جھٹکا دیا۔ قیدی منہ کے بل گرتے گرتے بچا۔ فوجیوں نے پلک جھپکنے سے پہلے ہی اسے دبوچ کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ ہیرولڈ تھا۔ لیفٹیننٹ اسے گھسیٹ کر احاطے کے دوسری طرف لے گیا اور اس نے نہایت چابکدستی سے اسے ایک رسے کی مدد سے ایک درخت سے باندھ دیا۔ لیفٹیننٹ کے پاس ہتھکڑیاں نہیں تھیں۔ سارے فوجی خوشی سے نعرے لگانے لگے۔ ہیرولڈ کی گرفتاری پر پچیس ہزار ڈالر کا انعام تھا۔

اب بوتھ، کھلیان کے اندر تنہا رہ گیا تھا اور بڑھکیں مار رہا تھا۔

فوجیوں نے اس کی بڑھکوں کے دوران جھاڑیوں میں آگ لگا دی۔ آناً فاناً کھلیان نے آگ پکڑ لی اور پورا کھلیان ایک جیتے جاگتے جہنم میں بدل گیا۔ بھڑکتے ہوئے شعلوں کی نارنجی روشنی میں کھلیان کے اندر بوتھ کا ہیولا پنجرے میں قید کسی زخمی درندے کی مانند اپنی بیساکھی کے سہارے اِدھر سے اُدھر پھدکتا پھر رہا تھا۔ وہ جدھر بھی جاتا، آگ کے بھیانک شعلے اس کا استقبال کرتے۔ اچانک ایک گولی چلی اور بوتھ سر کے بل زمین پر گر پڑا۔ اسے جلتے ہوئے کھلیان کے اندر سے گھسیٹ کر باہر لایا گیا اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے۔ وہ دم توڑ رہا تھا لیکن اس کا انداز بڑا ہی ڈرامائی تھا گویا وہ اسٹیج پر مرنے کی اداکاری کر رہا ہو۔ ''ماں سے کہنا میں اپنے ملک پر قربان ہو رہا ہوں۔''

لیکن اس نے مرنے میں خاصا وقت لے لیا۔ بھوکے پیاسے تھکے ہارے، کئی راتوں کے جاگے ہوئے فوجی صبح میں پیٹ بھر ناشتے یا انعام ملنے کی آس میں بوتھ کے مرنے کے انتظار میں بیٹھے بور ہوتے رہے۔ بالآخر پو پھٹے بوتھ نے دم توڑ دیا۔

☆......☆

اسے کس نے اور کس کے حکم سے شوٹ کیا کیونکہ اسے ہلاک کرنے کے نہیں بلکہ زندہ گرفتار کر کے واپس لانے کے واضح احکامات تھے۔ کیونکہ وہ نہایت اہم سوالات کا جواب دے سکتا تھا۔ لنکن کے قتل کی سازش میں ملوث لوگوں کے چہروں سے نقاب اتر سکتی تھی۔ کئی سوال حل طلب تھے کہ جان سرات کہاں ہے؟ رچمنڈ میں کس نے مدد کی؟ واشنگٹن میں کتنے لوگوں نے مدد کی؟ وغیرہ لیکن اب وہ مر چکا تھا۔ کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ کس نے گولی چلائی تھی۔ ایک اطلاع کے مطابق جس پر سب متفق ہیں بوتھ نے خودکشی کر لی تھی۔

لیفٹیننٹ ڈوہرٹی اور اس کے آدمی اپنے انعام کے ساتھ واپس واشنگٹن پہنچنے کے لیے یقیناً بہت بے تاب تھے۔ لیفٹیننٹ نے پھاٹک کے نزدیک کھڑے ایک گھوڑے کی پیٹھ پر سے ایک کمبل اتارا اور برآمدے کی طرف لپکا۔

''لاش کو اس میں لپیٹ دیں۔'' اس نے اپنے ایک ماتحت سے کہا۔

لیفٹیننٹ کے پاس مزید چار قیدی تھے۔ لہٰذا گھوڑوں کی کمی پڑ گئی تھی ورنہ ان نیم جاں قیدیوں کو گھوڑوں پر سوار کر کے لے جایا جاتا۔ خانہ جنگی کے باعث دور دراز کے دیہاتوں میں چھکڑا گاڑیاں بھی ناپید ہو گئی تھیں لیکن ایک مقامی نیگرو نیڈ فری مین کے پاس ایک کھٹارا ایمبولینس تھی جسے گھوڑے کھینچتے تھے۔ وہ انہیں اور لاش کو بیلی پلین میں دریائے پوٹومیک تک لے جانے پر راضی ہو گیا۔ وہاں سے لاش کشتی میں سفر کرتی۔

☆......☆

27 اپریل کی سحر نمودار ہوتے ہوئے یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہوئی واشنگٹن پہنچ گئی کہ بوتھ کی لاش اسٹیمر کے ذریعے لائی جا رہی ہے۔ اس خبر کے پہنچتے ہی

پورے واشنگٹن میں زبردست کھلبلی مچ گئی۔شہر کے سارے ورکر ناشتا چھوڑ کر اپنے گھوڑوں کی طرف بھاگے۔شرفاء نے اپنی اپنی بگھی کو تیار کرنے کا حکم دے دیا۔واشنگٹن کی پوری آبادی اٹھ کر نیوی یارڈ پہنچ گئی۔پورا یارڈ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ہر طرف سر ہی سر نظر آرہے تھے لیکن لاش کو اتارتے وقت عرشے پر ایک کینوس پھیلا دیا گیا تاکہ عوام بوتھ کو نہ دیکھ سکیں۔اس کے فوراً بعد اس کینوس کے نیچے تفتیش کا آغاز ہو گیا۔اسٹیمر پر موجود کوئی بھی آفیسر ذاتی طور پر بوتھ سے واقف نہیں تھا۔لہٰذا ایک عجیب و غریب مسئلہ کھڑا ہو گیا۔یہ مسئلہ لاش کی شناخت کا تھا۔اس مسخ شدہ لاش کے بال بکھرے ہوئے تھے،آنکھوں میں وحشیانہ پن تھا،دانت غرانے کے سے انداز میں باہر جھانک رہے تھے۔کیا یہ وہی شخص تھا جسے لوگ حسن کا دیوتا کہتے تھے؟ جو بے شمار نازنینوں کے دلوں کی دھڑکن تھا؟ جو اسٹیج کا اپالو اور فیشن کا شہزادہ کہلاتا تھا؟

چونکہ لاش کی شناخت کا مسئلہ مشکوک لگتا تھا، لہٰذا ذمے دار افسران سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ بوتھ کے دوستوں اور رشتے داروں کو لاش کی شناخت کے لیے طلب کرتے۔اس وقت بوتھ کا بھائی جونیس بوتھ جونیئر واشنگٹن کی پرانی جیل سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن اسے لاش کی شناخت کے لیے طلب نہیں کیا گیا بلکہ بوتھ کی لاش اسی روز انتہائی رازداری سے جہاز سے اتار کر اسلحے کے ایک بکس میں رکھ کر دفن کر دی گئی۔

☆......☆

9 مئی 1865ء کو بوتھ کے شرکائے جرم پر ملٹری کمیشن میں مقدمے کا آغاز ہوا۔اس مقدمے میں یہ مؤقف اختیار کیا گیا کہ چونکہ صدر کا قتل کمانڈر انچیف اور آرمی کے سربراہ کی حیثیت سے ہوا تھا چنانچہ یہ ایک فوجی جرم تھا۔مورخہ 30 جون کو وہ سارے مدعا علیہان قتل کی سازش میں شریک جرم پائے گئے۔ڈاکٹر سیموئیل مڈ، سیموئیل بل آرنلڈ اور مائیکل اولافلن کو عمر قید کی سزا دی گئی۔ایڈورڈ اسپینگلر کو چھ سال کی سزا ہوئی۔لوئس پین، ڈیوڈ ہیرولڈ، جارج ایزیروٹ اور مسز میری سرات کو پھانسی کی سزا دے دی گئی۔

لیکن کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ مسز میری سرات کو لٹکایا جائے گا۔بہت بعد میں یہ راز کھلا کہ مسز میری سرات کی سزائے موت کے پیچھے ایک گہری سازش کارفرما تھی۔ٹریبونل کے چار سے پانچ ملٹری جج سزائے موت کے خلاف تھے لیکن ایسا لگتا ہے کہ اسٹینٹن کی سفارش پر اور یقیناً اس کی رضامندی سے جج ایڈووکیٹ جنرل جوزف ہولٹ نے ٹریبونل کے ان پانچ ججوں سے ایک سمجھوتے کا اہتمام کیا۔وہ یہ کہ اگر ٹریبونل اتفاق رائے سے مسز سرات کو سزائے موت سناتی ہے، تو صدر جانسن سے رحم کی اپیل کی جائے گی۔چنانچہ اس سمجھوتے کے تحت پانچوں ججوں نے اس پٹیشن پر اپنے دستخط کیے اور سفارش کی کہ مسز سرات کی سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا جائے۔ایڈووکیٹ جنرل جوزف ہولڈ نے یقین دلایا کہ وہ پٹیشن صدر جانسن کو پیش کی جائے گی لیکن صدر جانسن کے بیان کے مطابق وہ پٹیشن کبھی اس کی نظر سے نہیں گزری۔مورخہ 6 جولائی کی صبح صدر جانسن نے ان چاروں کے موت کے پروانے پر اپنے دستخط ثبت کردیے۔سزائے موت پر اگلے ہی دن عملدرآمد ہونا قرار پایا۔

مقدمے کا اختتام شک و شبے کی ایک اور عجیب و غریب دھند میں لپٹا ہوا نظر آتا تھا۔وفاقی فوجیوں نے دم توڑتے ہوئے بوتھ کی جیب سے اس کی ڈائری برآمد کی تھی اور وہ ڈائری واشنگٹن میں اسٹینٹن کے حوالے کردی تھی۔اسٹینٹن کا بیان ہے ”میں نے اس ڈائری کا بغور مطالعہ کیا اور اس کے سارے مندرجات پڑھے۔“

اس کے باوجود اس انتہائی اہم ڈائری کو شہادت کے طور پر پیش کیا جانا تو درکنار مقدمے کے دوران بھی اس کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔کیا اس میں سازشی لیڈروں کی فہرست تھی؟ وہ ڈائری اسٹینٹن کے حوالے کیے جانے کے بعد غائب کردی گئی لیکن 1867ء میں وہ محکمہ جنگ کی ایک بھولی بسری فائل سے بازیاب ہوئی تاہم اس کے اٹھارہ صفحات غائب تھے جن میں سازش کے آغاز سے لنکن کے قتل تک کا ذکر تھا۔وہ صفحات بلیڈ سے کٹے ہوئے تھے۔

☆......☆

مورخہ 7 جولائی کی صبح احاطے میں پھانسی کا پھندا تیار تھا۔تماشائیوں، فوجیوں اور نامہ نگاروں کے چہروں سے پسینے بہہ رہے تھے۔وہ دھوپ میں پھانسی کی سزا پر عمل درآمد ہونے کے منتظر تھے۔اسی دوران قید خانے کا دروازہ کھلا اور مسز میری سرات دو پادریوں کے بازوؤں میں جھولتی ہوئی برآمد ہوئی۔اس کے بعد جارج ایزیروٹ نکلا۔اس کے پیروں میں بیڑیاں تھیں۔پھر ہیرولڈ برآمد ہوا۔سب سے آخر میں لوئس پین نظر آیا۔اس کا چہرہ اٹھا ہوا اور

شامل ہو چکے ہوتے تھے۔ وہ بے خوف نظر آرہا تھا۔ ان چاروں کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ 1911ء تک پھانسی کے پھندے درست کیے، ان چاروں کو موت کی سیاہ ٹوپی اور سفید کپڑوں میں پھانسی کے پھندے پہنائے اور پھر تختہ گرا دیا گیا۔ ان کے بعد تختہ دار پر چار لاشیں لٹک رہی تھیں۔

یہ کہنا تو درست ہوگا کہ صدر ابراہام لنکن کے قتل میں ملوث ان تمام سازشیوں کو گرفتار کرکے تختہ دار تک پہنچا دیا گیا لیکن یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ انصاف کے تمام تقاضے پورے کیے گئے کیونکہ ایک سازشی اپنے انجام سے صاف بچ نکلا۔ وہ تھا جان سرات۔

اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ وزیر دفاع اسٹینٹن نے جان بوجھ کر سرات کو فرار ہونے دیا تھا۔ اسٹینٹن کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ جان سرات بھاگ کر کینیڈا چلا گیا ہے لیکن کسی بھی ملٹری ایجنٹ کو اسے پکڑنے کے لیے نہیں بھیجا گیا۔ چار ماہ کے بعد جان سرات انگلینڈ میں نظر آیا۔ امریکی قونصل نے فوراً اسٹینٹن کو یہ اطلاع بھیجی تو اسے یہ جواب موصول ہوا۔ ”وزیر دفاع سے صلاح و مشورے کے بعد یہ طے پایا ہے کہ جان سرات کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔“

اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد جان سرات کو اٹلی میں اس کی ایک دوست نے پہچان لیا۔ جان سرات نے اسے راز کی ایک بات بتائی۔ ”سازشیوں نے کچھ ایسے لوگوں کے حکم پر یہ کام کیا جو خود پردۂ راز میں ہیں۔“

واشنگٹن کو ایک بار پھر مطلع کیا گیا، جس پر وزیر داخلہ سیوارڈ نے وزیر دفاع اسٹینٹن کو ایک نوٹ لکھ کر بھیجا کہ اس مفرور کی گرفتاری کے لیے اسپیشل ایجنٹ بھیجے جائیں۔ اسٹینٹن نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اسٹینٹن کو اس سلسلے میں جتنے بھی خطوط بھیجے گئے۔ ان کا بھی کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ بالآخر دسمبر 1866ء میں نیوی سیکریٹری ویلس، وزیر داخلہ سیوارڈ کے حکم پر جان سرات کو گرفتار کرنے کے لیے فعال ہوگیا۔ وہ گرفتار کرکے واشنگٹن لایا گیا۔ اس پر دو مرتبہ مقدمہ چلا۔ پہلی جیوری کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔ دوسرا مقدمہ خارج کر دیا گیا کیونکہ وقت گزر چکا تھا۔ کوئی بھی شخص بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ اس کی گرفتاری اور اس پر مقدمہ چلانے میں جان بوجھ کر تاخیری حربے استعمال کیے گئے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ ایسا کیوں کیا گیا؟

☆......☆

ابراہام لنکن کے قاتل جان ویلکس بوتھ کی فیملی کی درخواست پر اس کی لاش فروری 1869ء میں اس کی عارضی قبر سے بالٹی مور کے قبرستان میں منتقل کر لی گئی۔ صدر کے احکام کے بموجب اس کی قبر پر کسی بھی قسم کی یادگار نصب نہیں کی گئی تھی لیکن جب اس کے تابوت کو بالٹی مور کے تجہیز و تکفین کے پارلر میں کھولا گیا تو ایک بار پھر لاش کی شناخت متنازع بن گئی۔ جو لوگ بوتھ کی لاش کو تابوت میں دفن کیے جانے پر غیر مطمئن تھے، انہوں نے فوراً یہ نقطہ اٹھایا کہ بالٹی مور میں کیا جانے والا دانتوں کا معائنہ واشنگٹن کے اس دندان ساز کے ریکارڈ سے میل نہیں کھاتا جس نے بوتھ کے دانتوں کا علاج کیا تھا۔ اس پر خاصی بحث ہوئی اور کافی عرصے تک ہوتی رہی۔ اس سمیت چھوٹے بڑے کئی سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی رہی جس کی گونج لگ بھگ ایک صدی تک سنائی دیتی رہی۔ فاضل مورخین کو یقین ہے کہ بوتھ فیملی کی طرف سے اس کے باقیات کو قبول کر لینے کے بعد کسی شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی لیکن بڑے بڑے اور نہایت اہم ایشوز کی بابت کیا کہا جا سکتا ہے۔ ان بے شمار مجرمانہ سرکاری کارروائیوں اور شواہد کی کیا توجیہہ پیش کی جا سکتی ہے جنہوں نے بلاشبہ اس پورے کیس کو دھندلا رکھا ہے۔

☆......☆

1926ء میں ابراہام لنکن کے بیٹے رابرٹ ٹوڈ لنکن نے اپنی موت سے پہلے اپنے باپ کے ذاتی کاغذات کے ایک بنڈل کو جلا ڈالا۔ اتفاق سے اس وقت اس کا ایک دوست اس کے ہاں پہنچ گیا اور اس نے ان کاغذات کے بارے میں پوچھ لیا۔

صدر کے بیٹے نے جواب دیا۔ ”یہ کاغذات اور لنکن کے کابینہ کے ایک رکن کی غداری کی شہادتوں پر مشتمل تھے۔ میں نے سوچا کہ ایسی شہادتوں کو تلف کر دینے میں ہی سب کی بھلائی ہے۔“

لہٰذا اس شخص کو پہچاننا شاید کبھی ممکن نہ ہو جو اس بھیانک سازش کا مرکزی کردار تھا لیکن وہ اور اس کے ہمراز جو کوئی بھی رہے ہوں انہوں نے اس شخص کو بے نقاب کر دیا جس نے صدر کو غیر محفوظ کر کے جانے پہچانے سازشیوں کو فرار ہونے کے مواقع فراہم کیے۔ وہ سب کے سب ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے تھے اور امریکا کی تاریخ کے سب سے بڑے جرم کے گواہ تھے۔

انوکھی شادیاں

وسیم بن اشرف

شادی ہر معاشرے کے لیے ایک لازمی امر ہے۔ ہر مذہب و ملت نے اسے ضروری قرار دیا ہے لیکن اس امر کی بجاآوری کے لیے ہر معاشرے میں الگ الگ رسم و رواج ہیں۔ بعض علاقوں کی رسمیں اتنی عجیب اتنی دلچسپ ہیں کہ انہیں پڑھ کرہی لطف آجائے۔ اب ذرا سوچیں کہ انہیں دیکھنے میں کتنامزہ آتا ہو گا۔

دنیا بھر سے دلچسپ رسوم شادی کا احوال

ہر دور میں لوگ کچھ نیا کر کے دکھانے کے خواہشمند رہے ہیں۔ لوگوں کے اندر یہ آرزو جنم لیتی رہی ہے کہ ان کی تعریف اور تحسین کے گن گائے جائیں، شادی بھی زندگی کا ایک ایسا ہی ایونٹ ہے، کچھ لوگ سادگی سے اور کچھ سج دھج کے شادی رچاتے ہیں۔ ماضی میں اگر شادی کی رسومات عجیب دغریب ہوتی تھیں تو حال میں بھی ایسی ایسی شادیاں ہو رہی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ بالخصوص مغرب میں تو شادی کو یادگار بنانے کے لیے لوگوں نے ایسے ایسے اقدامات کیے کہ انسان دانتوں میں انگلیاں دبا کر رہ جاتا ہے، شادی ایک ایسا سماجی بندھن ہے جس سے زندگی میں رونق میلہ ہے۔ اس کی بنیاد پر خاندان پھلتے پھولتے ہیں۔ شادی کا بندھن بے حد خوبصورت، پُرکشش اور نازک ہوتا ہے۔ ہر قوم و مذہب میں شادی کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ شادی کے موقع پر ہر ملک میں خاندان اپنے اپنے رواج کے مطابق مختلف رسومات ادا کرتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان رسموں کے انداز بھی بدلتے رہتے ہیں مگر اہمیت کسی بھی دور میں کم نہیں ہوئی۔ لیکن کچھ شادیاں ایسی انوکھی ہوتی ہیں کہ انہیں تادیر یاد رکھا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں دلچسپ، انوکھی، مہنگی ترین اور عجیب ترین شادیوں کا کچھ حال احوال قارئین سرگزشت کی نذر ہے۔

دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اپنی شادی پر کچھ انوکھا کرنے کے لیے اچھوتا انداز اپناتے ہیں۔ برطانوی شہر سنڈرلینڈ سے تعلق رکھنے والے 43 سالہ کلیرا فیلون اور 38 سالہ پال ورکمی کا شمار بھی ایسے ہی افراد میں کیا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا جنہوں نے اپنی شادی پر روایتی پرتعیش گاڑیوں میں سفر کرنے کی بجائے کچرا جمع کرنے والے ٹرک کو ترجیح دی۔ سنڈرلینڈ سٹی کونسل کے لیے کچرا جمع کرنے کا ٹرک چلانے والا یہ جوڑا اپنی ملازمت کی جگہ پر پہلی بار ملا اور ایک دوسرے سے شادی کے عہد و پیمان کر ڈالے۔ شادی کی تقریب کو یادگار بنانے کے لیے اس جوڑے نے روزی روٹی کے ذریعے کو ہی شادی کے لیے اپنا سفری ذریعہ بنانے کی ٹھانی اور 1 لاکھ 27 ہزار پاؤنڈ بن لوری ویگن کو سجا سنوار کر اس کے ذریعے شادی کے وینیو تک پہنچے۔

شاندار پرتعیش گاڑیوں یا پھر گھوڑا گاڑیوں اور بگھیوں کی

بجائے اس انوکھے بجے سجائے ٹرک پر شادی کے استقبالیے تک پہنچنے والے اس جوڑے نے دیکھتے ہی دیکھتے برطانیہ سمیت دنیا بھر میں اپنی منفرد پہچان بنالی ہے۔

شادیاں تو آپ نے بہت دیکھی ہوں گی مگر ایک دوسرے پر گنیں تان کر زندگی بھر ساتھ نبھانے کا عہد کرتے جوڑے آپ کو بھی نظر نہیں آئے ہوں گے۔ جی ہاں امریکی عوام میں آج کل ایک نیا ہی رجحان فروغ پانے لگا ہے وہ یہ

کہ دولہا اور دلہن ہاتھوں میں گنیں اٹھائے شادی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جس کے بعد وہ نشانہ بازی کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ جی یہ پیکیش لاس ویگاس کے ایک گن اسٹور کی ہے جس کے 300 پاؤنڈز کے پیکیج میں گنوں کی فراہمی اور پھر وی آئی پی شوٹنگ رینج میں نشانے بازی کی مشق کرنا ہے۔ شاٹ گن ویڈنگ نامی یہ شادیاں فائرنگ میں بچوں کے قتل کے واقعات کے باوجود لوگوں میں تیزی سے مقبول ہورہی ہیں اور اب تک کسی بھی جوڑے نے اس انداز کی شادی منسوخ نہیں کی ہے۔

دنیا کے سب سے طویل قد انسان کی شادی کا تذکرہ بھی خوب ہے۔ ترکی سے تعلق رکھنے والے دنیا کے سب سے طویل قد سلطان نے شام سے تعلق رکھنے والی اپنی خوابوں کی شہزادی سے شادی کر لی۔ گو اسے ڈھونڈنے میں دیر لگی۔

2.51 میٹر 8 (فٹ 3انچ) طویل سلطان کی بیوی کا قد 1.75 میٹر ہے، 31 سالہ سلطان توسین کی شادی 20 سالہ مروی دیبو سے مردن صوبے میں ہوئی۔ سلطان نے کہا کہ یہ میری زندگی کا سب سے خوشگوار لمحہ ہے، ان کی بیوی نے اُمید ظاہر کی کہ ان کے لیے شادی ہمیشہ کی خوشیاں لائے گی۔

دنیا میں معمر ترین جوڑے کی شادی نے بھی تہلکہ مچادیا تھا۔ پیراگوائے کے ایک ضعیف جوڑے نے اسّی سال تک اکٹھے زندگی گزارنے کے بعد مذہبی طور پر شادی کر لی ہے۔ شادی کے لیے عمر کی بھی کوئی قید نہیں ہے۔ شاید یہ دنیا کا معمر ترین جوڑا ہے۔ جس میں دولہے جوزے مینوئل کی عمر 103 جبکہ دلہن مارٹینا لوپیز کی عمر 99 برس ہے۔ دولہا ویل چیر پر بیٹھ کر شادی کی تقریب میں شریک ہوا۔ اس شادی کی تقریب جوڑے کی گھر کے لان میں ہوئی۔ شادی کی تقریب میں ان کے آٹھ بچوں، پچاس نواسے، نواسیوں، پوتے، پوتیوں، پینتیس پڑپوتے، پڑپوتیوں، پڑنواسے، پڑنواسیوں اور ان کی اگلی نسل کے بیس بچوں نے شرکت کی۔ اس موقع پر پادری نے کہا کہ انہوں نے اس سے پہلے اتنی عمر کے نئے شادی شدہ جوڑا نہیں دیکھا۔ اس جوڑے نے انچاس برس پہلے بھی ایک سول میرج کی تھی لیکن انہوں نے مذہبی طور پر شادی نہیں کی تھی۔ ننانوے سالہ دلہن مارٹینا نے کہا کہ مذہبی شادی پر بہت جذباتی ہورہی ہیں۔ خاندان نے اس شادی کے بعد ایک پارٹی کا انتظام کیا تھا۔

فلمیں تو بہت سے لوگ دیکھتے ہیں لیکن کچھ لوگ انہیں خود پر اتنا سوار کر لیتے ہیں کہ حقیقی زندگی میں بھی ویسا ہی کرنے

کی کوشش کرتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو امریکی ریاست انڈیانا میں ہونے والی اس انوکھی شادی کو ہی دیکھ لیں جس میں دولہا دلہن سے لے کر وہاں آئے ہوئے مہمانوں نے بھی فلموں میں نظر آنے والے خوفناک کردار زومبی بن کر شرکت کی۔ اس

ڈراؤنی شادی میں شریک مہمانوں نے بھوتوں اور چڑیلوں کا روپ اس مہارت سے دھارا کہ انہیں دیکھ کر واقعی حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ عالمی ریکارڈ قائم کرنے والی شادی بھی کمال کی تھی، یہ شادی سری لنکا میں ہوئی۔ شادی کی اس انوکھی تقریب نے عالمی ریکارڈ توڑ ڈالا۔

دنیا میں بہت سے افراد کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی شادی کی تقریب ایسی شاہانہ ہو کہ لوگ دیکھ کر رشک کریں اور اس مقصد کے لیے لاکھوں روپے خرچ کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے، سری لنکا میں شادی کی ایک ایسی انوکھی تقریب منعقد ہوئی جس میں تمام ملازمین نے ایک جیسے لباس زیب

تن کر کے عالمی ریکارڈ بنا ڈالا۔ سری لنکا کے دارالحکومت کولمبو میں ہونے والی شادی کی اس تقریب میں 126 خواتین ملازمین، 25 مرد ملازمین، 20 کم عمر ملازمین اور 23 پھول پکڑنے والی لڑکیوں نے شرکت کر کے ایک نیا عالمی ریکارڈ بنایا، سب خواتین اور مرد ملازمین نے سری لنکا کا ایک جیسا روایتی لباس زیب تن کر رکھا تھا، شادی کی تقریب کی مہمان خصوصی سری لنکا کی خاتون اول شرانتھی راجا پاکسے تھیں۔ شادی کی تقریب کا اہتمام کرنے والی ڈریس ڈیزائنر چمپی سری وردنے کا کہنا تھا کہ شادی کی ریکارڈ ساز تقریب منعقد کرنا ان کا خواب تھا، گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ توڑنا ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ شادی کی تقریب میں موجود گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے افسران کا کہنا تھا کہ سہنالی جوڑے نے تھائی لینڈ کا 96 خواتین ملازمین کے ساتھ شادی کی تقریب میں شرکت کا سابقہ عالمی ریکارڈ توڑا ہے۔

ساتھ ہی ساتھ چند منفرد شادیوں کا ذکر بھی ہو جائے۔ ایک شادی میں دولہا دلہن نے شادی کی بھی تھیم بنائی۔ کرسٹینا میک نکال نے کہا کہ ہماری شادی کی تھیم 'سمندری قزاق' تھی۔ جس میں ہم نے مہمانوں کو بھی دعوت دی کہ وہ ایسا

لباس پہن کر آئیں۔

کھیلوں کے ایک شوقین مارٹن لیمبرٹ کی شادی دو ہزار چھ میں برطانیہ کے آئس ہاکی کے رنک میں ہوئی۔ ایسی ہی ایک شادی سمندر کی تہہ میں ہوئی۔ جیف پارکنسز کی بیٹی لیسلی اور ان کے شوہر بین اپنی شادی کے دن موسم کی طرف سے بالکل بے فکر تھے۔ ان کی شادی امریکا میں سی ایٹل کے علاقے میں سمندر کی سطح کے نیچے ہوئی۔ ایک جوڑے نے برفیلے پہاڑوں پر شادی کا پروگرام بنایا۔ سارا ورادون اور ان کے ہونے والے شوہر نے شادی کی تقریب کینیڈا کے برٹش کولمبیا کے علاقے میں برفیلے پہاڑوں پر انجام دی۔ ایک شادی پر جوڑے نے تتلیوں کو آزاد کرتے ہوئے شادی کے

عہد و پیمان کیے۔ امریکا میں میسیچوسیٹس میں 'سیلک شادی' میں ڈینیل لین میک کی اور بریٹین تھامس تھربر نے تتلیوں کو آزاد کرتے ہوئے شادی کی۔ دسمبر 2010ء میں سمیر پٹیل اور لیسا وائٹ نے لندن کے مشہور لینڈ مارک لندن آئی کے سائے تلے اپنی شادی کی تقریب منعقد کی۔ دارالحکومت ماسکو میں ایک جوڑے نے شادی سائیکلوں پر کی۔ جبکہ سائمن براؤن اور انگکارن پلانگ پڈسا نے تھائی لینڈ کے جزیرے پوکھٹ میں سمندر کے کنارے شادی کی۔

گھٹنوں کے بل بیٹھ کر پھول پیش کرنا اور شادی کی پیشکش کرنا یہ تو آپ نے بہت سی فلموں میں دیکھا ہوگا لیکن اس نوجوان نے تو ڈرامے کی حد کردی۔ اس نوجوان نے اپنی دوست کو انوکھے انداز میں شادی کی پیشکش کی۔ چھت کے کنارے پر کھڑا یہ نوجوان بات کرتے ہوئے اچانک چھت سے نیچے گر پڑا اور جب اس کی دوست نے گھبراہٹ اور تشویش کے عالم میں نیچے جھانکا تو شادی کے ایک خوبصورت پروپوزل کی چھتری اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ ظاہری بات ہے کہ اس انوکھے انداز میں پروپوز کیے جانے کے بعد کون لڑکی ہے جو انکار کرسکتی ہے لہٰذا یہ خاتون بھی فوراً ہی شادی کے لیے راضی ہوگئیں اور منگنی کی انگوٹھی پہن لی۔

''بھارتی تاریخ کی مہنگی ترین شادی'' کا حال بھی جان لیجیے۔ گو آج کل ماڈرن شادیاں بھی ہو رہی ہیں۔ آبادی میں چین و بھارت کے مابین مقابلہ جاری ہے اور بھارت اب چین سے آگے نکلنے ہی والا ہے۔ بھارت میں بھی شادیاں

دھوم دھام سے ہوتی ہیں۔ بھارتی تاریخ کی مہنگی ترین شادی اب بھی لوگوں کو یاد ہے۔ سال 2011 میں بھارت میں ایک ایسی شادی بھی ہوئی جس کی تفصیلات کسی دلچسپی سے خالی نہیں۔ یہ شادی بھارتی تاریخ کی اب تک مہنگی ترین شادی ثابت ہوئی جس میں 15 ہزار باراتی شریک ہوئے جبکہ اس پر کروڑوں روپے کے اخراجات آئے۔ یہ شادی بھارت کی حکمراں جماعت کانگریس کے راہنما کنور سنگھ تنوور کے بیٹے للیت سنگھ اور دلہن یوگیتا کی تھی۔ دلہن کی رخصتی ہیلی کاپٹر میں ہوئی جو اسے جہیز میں دیا گیا تھا۔ شادی میں شرکت کرنے والے ہر فرد کو تحفے کے طور پر 30 گرام سونے اور چاندی کا ایک بسکٹ دیا گیا۔ اس کے علاوہ ہر فرد کو ایک سفاری سوٹ، ایک شال اور 2100 روپے بطور تحفہ دیے گئے۔ شادی تو شادی ولیمہ بھی قابل ذکر رہا۔ ولیمے میں شرکت کے لیے لڑکے والوں کی طرف سے 11 ہزار افراد کو دعوت نامے بھیجے گئے جبکہ دلہن کی طرف سے 7 ہزار افراد کو دعوت دی گئی ہے۔ ولیمے میں شرکت کے لیے تمام افراد کو ہوائی جہاز کے ٹکٹ بھی بھجوائے گئے۔ لڑکی کو سلامی میں ڈھائی کروڑ روپے دیے گئے۔ ولیمہ نئی دہلی میں ہوا۔ جہیز کی مد میں 21 کروڑ روپے نقد اور 25 کروڑ روپے کا ایک گھر دیا گیا۔ اس گھر میں 11 کروڑ روپے کا سامان پہلے سے موجود تھا۔ بھارت کی روایات کے تحت شادی میں بینڈ باجے والوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا جن پر تقریباً ایک کروڑ روپے نچھاور کیے گئے۔

کئی شادیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو دنیا کے کونے کونے میں دیکھی جاتی ہیں۔ برطانوی شہزادے پرنس ولیم اور کیٹ مڈلٹن کی شادی بھی یادگار رہی۔ برطانوی شاہی خاندان کی یہ یادگار شادی دنیا کے کونے کونے میں براہ راست دیکھی گئی۔ یہ شادی تھی ملکہ برطانیہ الزبتھ دوم کے پوتے پرنس ولیم اور کیٹ میڈلٹن کی۔ شادی میں 600 غیر ملکیوں سمیت 1900 مہمانوں نے شرکت کی۔ دنیا بھر میں شادی کی براہ راست تقریب ٹی وی پر دیکھی۔ سفید رنگ کے عروسی لباس میں ملبوس کیٹ سادگی و پرکاری کا شاہکار تھیں تو شہزادہ ولیم شادی کے موقع پر فوجی وردی میں بہت جچ رہے تھے۔ دنیا بھر کی مشہور لیکن منتخب ہستیوں کی شرکت نے جہاں تقریب کو ایک انوکھا رنگ دیا وہیں دلہن کے سادہ مگر انتہائی اسٹائلش لباس نے فیشن کی دنیا میں ایک نیا ٹرینڈ متعارف کرایا، شہزادہ ولیم اور میڈلٹن کی شادی جس قدر دنیا کے لیے ایک حسین و جمیل لمحہ ثابت ہوئی، اسی خاندان سے تعلق رکھنے والے پرنسس زارا کی شادی اس قدر سادگی سے ہوئی کہ سادگی کے سبب ہی اسے سال کی ایک اور یادگار شادی کا درجہ مل گیا۔ یہ شادی ہوئی نہایت خاموشی، رازداری اور سادگی کے ساتھ۔ حتیٰ کہ اس شادی کا اعلان بھی صرف ایک دن پہلے کیا گیا۔ ملکہ برطانیہ

الزبتھ کی پوتی زارا فلپس رگبی کے کھلاڑی مائیک ٹنڈل کے ساتھ رشتہ ازدواج میں بندھیں۔ شادی اسکاٹ لینڈ کے علاقے ایڈن برگ کے ایک چرچ میں انجام پائی جبکہ شادی سے ایک روز پہلے استقبالیہ ایک بحری جہاز پر دیا گیا جس میں شاہی خاندان کے صرف اہم ترین افراد نے شرکت کی۔

ایک حیران کن شادی بھوٹان کے شاہ جگمے کھیسر کی ہے۔ جنہوں نے اپنی کالج کی دوست سے شادی کی۔ بھوٹان کے 31 سالہ بادشاہ جگمے کھیسر نے اپنی کالج کی دوست اور ایک عام لڑکی جیٹسن پیما سے شادی کی۔ اس شادی کا جشن

مسلسل 3 روز تک منایا گیا۔ دولہا اور دلہن ایک دوسرے کو 14 سال سے جانتے تھے۔ شادی کی تقریب دارالحکومت تھمپو میں ہوئی۔ جگمے کھیسر بھوٹان کے پانچویں بادشاہ ہیں۔ وہ امریکا اور برطانیہ سے فارغ التحصیل ہیں۔ انہیں ہمالیہ کا ”دلکش بادشاہ“ بھی کہا جاتا ہے۔ وہ 2008ء میں تخت نشین ہوئے تھے۔ جیٹسن پیما شاہ بھوٹان سے 10 سال چھوٹی ہیں۔

شادیوں کا یہ سلسلہ یونہی جاری ساری رہے گا، آنے والے اپنے دور میں شادیوں کے نت نئے انداز اپنائیں گے لیکن شادی ہر شخص کی زندگی کا ایک ایسا واقعہ ہے، جسے لوگ چاہے بھول جائیں لیکن دولہا دلہن کو یہ دن ہمیشہ یاد رہتا ہے۔

پاکستان میں بھی ایک انوکھی شادی ہوئی ہے جس کی پہلے کبھی مثال نہیں ملتی، بالی ووڈ کی محبت کی کہانیوں کے برعکس دلہن کا تعلق ہندو مذہب اور دولہے کا تعلق مسلمان خاندان سے تھا تاہم شادی میں پسندیدگی ضرور تھی مگر کوئی جبر یا زبردستی نہیں بلکہ دونوں خاندانوں کی منشا سے یہ شادی ہوئی۔ میرپور خاص کے معروف ہندو ڈاکٹر کی بیٹی ایک مسلمان لڑکے کو پسند کرتی تھی۔ باپ نے بیٹی کی پسند کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ بیٹی کو ہندو مذہب تبدیل کر کے مسلمان کیا اور پھر اس کی مسلمان سے شادی کر کے رخصت کر دیا۔ شادی کی تقریب میرپور خاص کے ایک شادی ہال میں ہوئی جہاں دونوں خاندانوں کے افراد نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ شادی کی تقریب کے بعد دلہن کو رسم کے مطابق رخصت کیا گیا۔ واضح رہے کہ ایسی شادی پہلی مرتبہ ہوئی جس میں ہندو اور مسلمان خاندانوں نے اپنے بچوں کی پسند کو ملحوظ خاطر رکھا اور باہمی رضامندی سے ان کو شادی کے بندھن میں باندھ دیا۔

بھارت میں ایسی کئی شادیوں کے واقعات سامنے آئے جس میں لڑکا مسلمان اور لڑکی ہندو ہوتی ہے، تاہم انتہا پسند ہندو تلملا اٹھتے اور اسے 'لو جہاد' قرار دیتے ہیں، چند ماہ قبل بھارتی شہر میسور میں مسلمان لڑکے نے بچپن کی ہندو دوست کے ساتھ دھوم دھام سے شادی کر لی۔ دلہن نے اسلام قبول کیا جس کے بعد دونوں کا نکاح ہوا۔ تقریب میں دلہن کے رشتہ دار بھی شریک ہوئے جس پر ہندو انتہا پسند تلملا اٹھے اور ہنگامہ کیا۔

بالی ووڈ کی محبت کی کہانیوں میں ہمیشہ لڑکا ہندو ہوتا ہے اور لڑکی مسلمان جس کی ایک مثال فلم 'ویر زارا' اور 'بامبے' ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ تینوں خانوں (شاہ رخ، سلمان اور عامر) کی شادی یا محبت کا تعلق ہندو خواتین کے ساتھ رہا ہے۔ کرینہ کپور سے شادی کرنے والے سیف علی خان کی بھی مثال سامنے ہے۔

گوجرانوالا کے علاقے کاموکی میں شادی کے حوالے سے دلچسپ معاملہ سامنے آیا۔ برات لیٹ ہونے پر ایک براتی دلہن کو بیاہ کر لے گیا اور دولہا نے مہمان آئی لڑکیوں میں سے ایک سے شادی رچالی۔

محلہ حبیب پورہ سے تنویر احمد کی برات مقررہ ٹائم ایک بجے کی بجائے تقریباً دو گھنٹے تاخیر سے 4 بجے محلہ صابری کالونی اوکاڑہ میں لڑکے کی خالہ کے ہاں پہنچی تو لیٹ آنے کی وجہ دریافت کرنے پر دولہا تنویر اور دلہن کے بھائی بھولا کی آپس میں تلخ کلامی کے بعد نوبت ہاتھا پائی تک جا پہنچی، جس پر دلہن کے بھائی بھولا نے اپنی بہن کا نکاح تنویر سے کرنے سے انکار کر دیا اور دولہا کے ساتھ برات میں آئے ہوئے قریبی عزیز براتی عثمان سے نکاح کرنے کا اعلان کر دیا جبکہ دلہن کے گھر میں مہمان آئی ہوئی دلہن کی خالہ نے متاثرہ دولہے تنویر سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔

جہاں ہم نے بھارت کی ایک مہنگی ترین شادی کا ذکر کیا وہاں بھارت میں ہی ”پانی کی بیویوں کی کتھا بھی پڑھ لیں“

پانی کی بیویوں کے حوالے سے ایک ہندوستانی گاؤں کی انوکھی روایت سے لطف اٹھائیے۔

ہندوستانی ریاست مہاراشٹر کے خشک سالی سے متاثرہ علاقے ودار بھا کے ایک گاؤں ڈینگانمل میں کہیں بھی پانی کے نلکے نہیں نظر آتے۔ اس گاؤں کے لوگ پینے کا پانی ان کنوؤں سے حاصل کرتے ہیں، جو ایک پہاڑ کے نیچے واقع ہے۔ گاؤں کے لوگ یہاں پہنچنے کے لیے گھنٹوں پیدل چلتے ہیں

اور کنویں پر اپنی باری کا انتظار کرنے کے لیے بھی گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس مشکل سے نجات کا حل گاؤں کی پنچایت نے یہ نکالا ہے کہ پانی لانے کے لیے گاؤں کے مردوں کو مزید دو شادیاں کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ اس گاؤں کے ایک کسان سکھارام بھگت کی تین بیویاں ہیں، تکی، سکھری اور بھاگی۔ ان میں سے ایک کو باضابطہ طور پر بیوی کا درجہ حاصل ہے، باقی دو پانی کی بیویاں کہلاتی ہیں۔ پانی کی بیویاں کہلانے سے مراد یہ ہے کہ گھر کے استعمال کے لیے طویل فاصلے سے پانی بھر کر لانا ان کی ذمہ داری ہے۔ سکھارام نے پہلی بیوی کے ہونے کے باوجود دو مزید شادیاں صرف اس لیے کیں تاکہ دونوں گھر کے استعمال کے لیے پانی لاسکیں۔ اپنی تین شادیوں کے بارے میں اس کا کہنا ہے "میری پہلی بیوی اپنے بچوں کے کام کاج میں مصروف رہتی ہے۔ پانی لانے کے لیے میں نے دوسری شادی کی تھی لیکن اس کی بیماری کی وجہ سے مجھے تیسری شادی کرنی پڑی۔" سکھارام بھگت اسی گاؤں میں کھیتوں میں مزدوری کر کے اپنا گزر بسر کرتا ہے۔ اس کے گھر میں روزانہ تقریباً 100 لیٹر پانی خرچ ہوتا ہے۔ کئی چکر لگانے پر یہ ضرورت پوری ہوتی ہے۔ اس نے بتایا "پہلی بیوی شادی کے فوراً بعد حاملہ ہوگئی تھی، اور کنویں سے پانی نہیں لاسکتی تھی چنانچہ دوسری شادی کی، اس کی عمر زیادہ تھی، کچھ عرصے بعد اس کے لیے بھی کنویں سے پانی بھر کر لانا مشکل ہوگیا۔ لہٰذا تیسری شادی کرنی پڑی۔ سکھارام کی تیسری بیوی کی عمر صرف 26 سال ہے اور اس کے پہلے شوہر کی وفات ہو چکی ہے۔ اس کی تینوں بیویاں ایک ہی گھر میں رہتی ہیں۔ پہلی کے ذمے بچوں کے کام ہیں، جبکہ دوسری گھر کے باقی کام کرتی ہے۔ پہلی کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ باقی دونوں کی ضروریات کا خیال رکھے۔ ان میں اکثر جھگڑے بھی ہوجاتے ہیں پھر بھی بعد کی دونوں بیویاں خوش ہیں۔

اس گاؤں میں لڑکی کی پیدائش پر خوشی منائی جاتی ہے کیونکہ گاؤں والوں کا خیال ہوتا ہے کہ پانی بھرنے کے لیے ایک رکن کا اضافہ ہوگیا ہے۔ تاہم گاؤں کی عورتوں کو اُمید ہے کہ جب ان کی بیٹیاں جوان ہوں گی تو ان کے گاؤں میں بھی پانی کے نل لگ جائیں گے۔

ہندوستان کی بڑی ریاست مہاراشٹر کے بارے میں گزشتہ سال کے سرکاری تخمینے کے مطابق 19 ہزار سے زیادہ گاؤں کے لوگوں کو پینے کا پانی میسر نہیں ہے۔ مہاراشٹر کے اس گاؤں میں پانی بھرنے کا مشقت بھرا کام صرف خواتین ہی کی ذمہ داری ہے۔ ڈینگانمل گاؤں میں بنجر زمین کے ایک حصے پر تقریباً 100 کچے گھر موجود ہیں۔ یہاں زیادہ تر کسان کھیتوں میں مزدوری کرتے ہیں اور بہت معمولی آمدنی میں بمشکل گزارا کرپاتے ہیں۔ اس گاؤں کے ایک فرد کا کہنا ہے کہ پانی کے لیے شادی کرنا۔ یہاں کی روایت ہے۔ یاد رہے کہ ایک سے زائد شادیاں ہندوستان میں غیر قانونی ہیں لیکن اس گاؤں میں پانی کی بیویاں عام ہیں۔ ڈینگانمل گاؤں کے ایک اور فرد نام دیو کا کہنا ہے کہ بڑا خاندان رکھنا آسان نہیں ہے اور خاص طور پر اس صورت میں جب کہ پانی ہی دستیاب نہ ہو۔ نام دیو کی بھی دو بیویاں ہیں۔

آپ نے بھارت کے ایک گاؤں میں پانی کی بیویوں کا دلچسپ احوال پڑھا، اب آپ جانیے کہ دنیا کے مختلف علاقوں میں انوکھی شادیوں اور عجیب و غریب رسومات کے بارے میں، ان شادیوں اور رسومات کا احوال بھی دلچسپی سے خالی نہیں اور حیرت انگیز بھی ہے۔ ارجنٹینا میں نوجوان شادی کرنے سے کترانے لگے ہیں۔ ایک سرکاری ادارے کی جانب سے جاری کردہ اعداد و شمار جن کی رو سے 1990ء میں دارالحکومت بیونس آئرس میں 22000 جوڑے شادی کے بندھن میں بندھے تھے مگر 2013ء میں یہ تعداد نصف (11642) رہ گئی۔ براعظم جنوبی امریکا میں واقع ملک کے نوجوان شادی کرنے سے گریزاں ہیں مگر پچھلے دو سال سے

شادی کی تقاریب کے انعقاد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ان تقاریب میں نوجوان بڑھ چڑھ کر شریک ہوتے اور خوب ہلا گلا کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے محبت فاتح عالم ہے مگر کیا آپ کو معلوم ہے کہ دنیا بھر میں محبت کے اظہار کے طریقے بالکل مختلف اور حیران کر دینے والے ہیں؟ یقین نہیں آتا۔ کوئی بات نہیں دنیا کے مختلف خطوں میں محبت سے جڑی یہ روایات آپ کی حیرت کے لیے کافی ثابت ہوں گی بلکہ ہوسکتا ہے کہ آپ ہیر رانجھا یا لیلیٰ مجنوں جیسی کلاسیک کہانیوں کو بھی بھول جائیں۔ کوریا میں ہر ماہ منایا جانے والا ویلنٹائن ڈے عجیب روایت ہے دنیا بھر میں اکثر افراد محبت کا دن سال میں ایک دفعہ مناتے ہیں مگر بارہ مرتبہ ایسا کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کوریا میں تو لوگ صرف چودہ فروری کو ہی ویلنٹائن ڈے نہیں مناتے بلکہ وہ ہر ماہ کی اسی تاریخ کو خصوصی رومانوی اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ تاہم کبھی انہیں معافی کا دن کا نام دیا جاتا ہے تو کبھی گلے لگانے کا، مگر ہر ماہ کی چودہ تاریخ کو منفرد انداز میں محبت کا اظہار ضرور کیا جاتا ہے۔ ایک دلچسپ منظر ملاحظہ فرمائیں۔

بیویوں کو اٹھانے کی ورلڈ چیمپئن شپ ہر سال دنیا بھر کے لوگ فن لینڈ کے گاؤں سونکا جروی میں جمع ہوتے ہیں جہاں ایک دلچسپ کھیلوں کا مقابلہ ہوتا ہے جس میں مرد

حضرات اپنی بیویوں کو کندھوں پر اٹھا کر دوڑتے نظر آتے ہیں جس کے فاتح کو بیوی کے وزن کے برابر مشروب اور نیک نامی کے سرٹیفکیٹ سے نوازا جاتا ہے۔

روس میں قبر کے ساتھ شادیوں کا ذکر بھی حیران کن ہے۔ ماسکو کے معروف نامعلوم فوجی کا مقبرہ شادیوں کا بھی مقبول ترین مقام ہے جہاں اس فوجی کی قبر کے ساتھ نیا نویلا جوڑا زندگی بھر تعلق نبھانے کے عہد و پیماں کرتا نظر آتا ہے۔ کیا شادی کا بہترین تحفہ ڈھونڈنے میں آپ کو مشکل کا سامنا ہے؟ تو ذرا سوچیے کہ فجی میں کیا ہوتا ہے جہاں شادی کے لیے کسی خاتون کا ہاتھ مانگنے کے لیے لڑکے کو اپنے ممکنہ سسر کو وہیل مچھلی کے دانت بطور تحفہ دینے پڑتے ہیں' کیونکہ وہاں کے لوگوں کا تو ماننا ہے کہ محبت کا حقیقی اظہار ہی اس وقت ہوتا ہے جب آپ سمندر کے اندر سیکڑوں فٹ گہرائی میں جا کر دنیا کے سب سے بڑے ممالیے کے دانتوں کو ڈھونڈ نکالیں۔

کرغیزستان میں دلہنوں کے اغوا کا قصہ بھی عجیب و غریب ہے۔ ایک پرانی کرغیز کہاوت ہے کہ شادی کے روز آنسوؤں کا بہنا خوش باش شادی کی بنیاد ہوتی ہے اور اس پر عمل کرتے ہوئے وہاں کچھ لڑکے لڑکیاں اغوا کر کے انہیں شادیوں پر مجبور کر دیتے ہیں اور ان کے والدین بھی مجبوراً اس رشتے کو تسلیم کر لیتے ہیں اور یہ روایت 1991ء میں غیر قانونی قرار دیے جانے کے باوجود زندہ ہے۔ ویسے دولہا کو اغوا کر کے شادی کرانا.... بھارت میں عام ہے۔ اس کی وجہ جہیز کی لعنت ہے۔ بھاری جہیز دینے کے بجائے اغوا کرنے والے کو تھوڑے سے پیسے دے کر ان کی خدمت حاصل کر لی جاتی ہے۔ لڑکی والوں کو جو لڑکا پسند آتا ہے وہ اسے اغوا کر کے بیٹی سے شادی کرا دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ لڑکوں کو اغوا کار گروپ دھمکی دے دیتا ہے کہ اگر پانچ سال کے اندر تم نے لڑکی کو چھوڑا تو قتل کر دیے جاؤ گے۔

دلہن کا منہ کالا کرنے کے حوالے سے آپ نے سنا یا پڑھا ہوگا۔ دنیا بھر میں شادی سے کچھ عرصے قبل ہونے والی دلہن اور دولہا کے چہروں کو مختلف طریقوں سے چمکانے کا کام کیا جاتا ہے مگر اسکاٹ لینڈ میں معاملہ بالکل الٹا ہے جہاں

کے لوگوں کا ماننا ہے کہ کسی شادی شدہ جوڑے کا کامیاب آغاز ان کی تذلیل سے ہی ممکن ہے۔ جب ہی تو شادی سے قبل دلہن کا منہ سیاہ یا کالا کر کے اس کی باقاعدہ نمائش بھی کی جاتی ہے۔

''محبت کے تالے'' کی رسم بھی کافی دلچسپ ہے۔ روم

بل گیٹس کی 5 پیشگوئیاں

بل گیٹس برسوں سے دنیا کے امیر ترین شخص کا اعزاز اپنے نام کیے ہوئے ہیں، جس کی وجہ ان کی کمپنی مائیکروسافٹ ہے۔ تاہم 1999ء میں انہوں نے مستقبل کے حوالے سے کچھ پیشگوئیاں کی تھیں جو حیران کن حد تک درست ثابت ہوئیں۔ انہوں نے انسانیت کے مستقبل کے حوالے سے بلاسوچے سمجھے بات نہیں کی تھی بلکہ ٹیکنالوجی کے روزمرہ کی زندگی پر اثرات کو کاغذ پر لکھ کر دیا تھا۔ اور اس وقت اسمارٹ فون کا تو تصور بھی نہیں تھا جبکہ انٹرنیٹ بھی کچھ زیادہ اچھی طرح استعمال نہیں ہو رہا تھا۔ فیس بک کی آمد سے پانچ سال پہلے بل گیٹس نے فیس بک جیسی تخلیق کی پیشگوئی کی تھی۔ یہاں ان کی ایسی ہی چند دلچسپ پیشگوئیوں کے بارے میں جانیں جو حقیقت کا روپ اختیار کر گئیں۔

موبائل ڈیوائسز

بل گیٹس نے پیشگوئی کی تھی کہ مستقبل لوگ ایسی چھوٹی ڈیوائسز اپنے ساتھ لے کر گھوما کریں گے جو انہیں مسلسل ایک دوسرے سے رابطے میں مدد دے گی، ان کی مدد سے خبروں کو دیکھا جا سکے گا، پرواز کا وقت اور اسی طرح بہت کچھ معلوم کیا جا سکے گا۔ اور یہ اسمارٹ فون کے موجودہ فیچرز سے درست ثابت ہو چکا ہے۔

سوشل میڈیا

انہوں نے کہا تھا کہ ایسی ویب سائٹس سامنے آئیں گی جو لوگوں کو اپنے دوستوں اور گھر والوں سے بات چیت میں مدد دیں گی، آسان الفاظ میں بل گیٹس نے فیس بک یا ٹوئٹر سے قبل سوشل میڈیا کی آمد کی پیشگوئی کی تھی۔

کے پونٹے میلویو نامی علاقے میں دنیا بھر سے جوڑے آ کر اپنی محبت کی یادگار کے طور پر وہاں ایک تالا لگا جاتے ہیں اور اس کی چابی دریا میں پھینک دیتے ہیں جو اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ ان کا پیار کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔

چینی دولہوں کی مشکل کو کون آسان کرے گا۔ چین میں شادی کے بعد دولہا کا دلہن تک پہنچنے کا راستہ اس کی سہیلیاں روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور پیسوں سے بھرے سرخ لفافوں کی مانگ کرتی ہیں، جسے پورا کرنے کے بعد بھی دولہا کی مشکل آسان نہیں ہوتی بلکہ اسے مختلف گیمز اور جسمانی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اکثر اسے گانے پر بھی مجبور کیا جاتا ہے۔

ویرونا میں جولیٹ کی بالکونی'' کا قصہ بھی مسحور کن ہے۔ کہا تو اسے دنیا کی عظیم ترین داستان محبت جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر سال ہزاروں جوڑے اطالوی شہر ویرونا میں جولیٹ کی اس مشہور زمانہ بالکونی کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں جہاں سے رومیو کو خط وغیرہ بھیجتی تھی۔

''چین کی ایک اور عجیب روایت کا ذکر پڑھیے'' محبت میں کیک کاٹنے کا تو سنا ہوگا مگر مرغی کو کاٹا نہیں؟ مگر چین میں رہنے والے ایک خاص نسل کے افراد میں روایت ہے کہ منگنی کے بعد جوڑے کو ایک مرغی کاٹ کر اس کے جگر کا معائنہ کرنا پڑتا ہے' اگر وہ صحتمند ہو تو یہ اچھا شگون ہوتا ہے اور شادی کی تاریخ طے کر دی جاتی ہے' تاہم ایسا نہ ہو تو جوڑے کو کسی اچھے جگر کی تلاش تک مرغیاں ہی کاٹنا پڑتی ہیں۔

اسی طرح شادی کے موقع پر رونا دھونا تو سمجھ میں آتا ہے مگر چین کے تیوجیہ نسل کے افراد شادی سے ایک ماہ قبل ہی روزانہ ایک گھنٹا رو دھو کر گزارنا پسند کرتے ہیں۔ خاص طور پر دلہن پر تو یہ فرض ہوتا ہے جبکہ اس کی ماں بھی دل کرے تو اس مشغلے میں شامل ہو سکتی ہے۔

''خواتین کی بالادستی'' یہ بھی خوب حقیقت ہے کہ دنیا بھر میں اکثر جگہوں پر خواتین کو بجنا سنورنا پڑتا ہے تاکہ مرد انہیں زندگی بھر کے تعلق کے لیے چن سکیں تاہم نائیجر کے ووڈابالا فولا قبیلہ کا دستور بالکل ہی نرالا ہے' جہاں مردوں کو باقاعدہ میک اپ کر کے تیار ہونا پڑتا ہے اور ناچ گا کر خواتین کو متوجہ کرنا ہوتا ہے جو ان میں سے اپنے لیے شوہر چنتی ہیں۔

جاپانی ''وائٹ ڈے'' کی رسم بھی خوب ہے۔ جاپان میں ویلنٹائن ڈے پر خواتین مردوں کے لیے چاکلیٹس خریدتی ہیں تاہم ایک ماہ بعد وائٹ ڈے منایا جاتا ہے جس میں مردوں کو اپنی گرل فرینڈ کے گفٹس کے مقابلے میں دوگنا زیادہ

کمیونٹی ویب سائنٹس

بل گیٹس کی ایک پیشگوئی یہ تھی کہ کیمونٹی ویب سائٹس سامنے آئیں گی جن میں مختلف موضوعات کی آن لائن کمیونٹیز تشکیل پاسکیں گی، اب ریڈیٹ اس کی ایک مثال ہے۔

آن لائن ملازمت کا حصول

ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ لوگ آن لائن جا کر ملازمتوں کو تلاش کرسکیں گے اور اب پاکستان میں نہ سہی مگر متعدد ممالک میں انٹرنیٹ ملازمت کی تلاش کرنے والوں اور کمپنیوں کے لیے بڑا ذریعہ بن چکا ہے۔ لاتعداد ویب سائٹ میں ملازمت کی تلاش میں مدد دی جاتی ہے۔

ڈیجیٹل اسسٹنٹ

بل گیٹس نے یہ بھی پیشگوئی کی تھی کہ پرسنل اسسٹنٹ یا ساتھی تیار کیے جائیں گے جو کہ آن لائن کنکٹ ہو کر تمام ڈیوائسز کو ایک ساتھ جڑ دیں گے، چاہے وہ دفتر میں ہوں یا گھر میں، جبکہ ڈیٹا کا تبادلہ بھی ہوسکے گا۔ اور اب ایسا ہو چکا ہے، گوگل ناؤ موبائل ڈیوائسز کے لیے ایسا اسمارٹ اسسٹنٹ ہے جو اسی سمت پیشقدمی کررہا ہے، جبکہ آمیزون ایکو اور گوگل ہوم وغیرہ بھی اسمارٹ ہوم کو حقیقی بنارہے ہیں۔

مرسلہ: وسیم بن اشرف، ملتان

خرچ کر کے تحائف خرید کر دینے پڑتے ہیں تا کہ وہ ثابت کر سکیں کہ وہ بھی محبت میں کسی سے کم نہیں۔ "مہندی کے ٹیٹوز" کے بارے میں جانیے کہ افریقا کی عربی و افریقی خواتین کی جانب سے محبت کا منفرد اظہار مہندی کے ڈیزائنز کی شکل میں کیا جاتا ہے۔

"شادی سے پہلے علیحدگی" بے نا حیرت کی بات۔ طلاق موجودہ دنوں میں کافی عام ہو چکی ہے مگر پھر بھی یہ تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوسکتا کہ عین شادی کے دن ہی یہ تعلق ختم بھی ہو جائے، تاہم یوکرائن میں ایسا ہی کچھ انوکھا ہوتا ہے جہاں اپنے والدین کی پسند سے ناراض جوڑے شادی کے دن ہی ایک دوسرے سے الگ بھی ہو جاتے ہیں۔

"موٹاپے کا کرشمہ" یہ ایک دلچسپ روایت ہے کہ شادی سے پہلے وزن کم کرنا کسے یاد نہیں رہتا، مگر جناب افریقی ملک موریطانیہ میں آپ جتنے موٹے ہوں گے اتنے ہی خوبصورت مانے جائیں گے۔ خاص طور پر خواتین پر تو اس فارمولے کا زیادہ اطلاق ہوتا ہے کیونکہ موٹی بیویاں شوہر کے لیے دولتمندی کی علامت سمجھی جاتی ہیں تاہم یہ سننے میں جتنا اچھا لگتا ہے اتنا آسان کام نہیں کیونکہ ان خواتین کو زبردستی کھلا کھلا کر موٹا کیا جاتا ہے جو مختلف طبی مسائل کا شکار ہو جاتی ہیں۔

"جھاڑو سے کودنا" یہ بھی شادی کی ایک رسم ہے۔ امریکا کے انتہائی جنوب میں ایک انوکھی روایت ہے جھاڑو سے کودنا جس کا مطلب ہے کہ اوپر سے چھلانگ لگا کر گزرے جوان کی نئی زندگی کے کامیاب سفر کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں عجیب و غریب اور انوکھی شادیوں کے بے شمار واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ اب بھی یقیناً ناقابل یقین شادیاں ہوتی ہوں گی۔

انوکھی شادیوں کا تذکرہ بہت طویل بھی ہے اور حیران کن بھی، پاکستان میں بڑے حیران کر دینے والے واقعات رونما ہوتے ہیں جیسا کہ مئی 1986ء میں چاؤ خان نامی ایک شخص نے رائے ونڈ میں رہائش اختیار کی۔ اس نے کرائے کا مکان حاصل کیا اور بہت جلد اہل محلہ پر اپنا اعتماد قائم کر لیا۔ چاؤ خان اپنی بیٹی کی شادی کرنے کا آرزو مند تھا۔ اس شخص نے کمال ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے چار مختلف خاندانوں سے اپنی بیٹی کے رشتے کی بات طے کر دی۔ اس نے اس دوران ہر خاندان سے بھاری رقم وصول کرلی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے سب کو شادی کی ایک ہی تاریخ دے دی۔ شادی سے

ایک رات پہلے جاوید خان نے مکان چھوڑ دیا اور نجانے کہاں غائب ہوگیا۔ اگلے دن صبح چار براتیں اس مکان کے باہر اکٹھی ہوگئیں۔ حقیقی صورتِ حال کا علم ہونے پر باراتیوں نے اپنا سر پیٹ لیا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا مکار شخص اپنا کام دکھا چکا تھا۔

ایک اور دلچسپ واقعہ مئی 1985ء میں پیش آیا شہداد پور سے اور نگی ٹاؤن جانے والی بارات سے دلہن کے والدین نے مطالبہ کیا کہ پانی کے دو ٹینکر بھی ساتھ لائے جائیں کیوں کہ یہاں پانی کی انتہائی قلت ہے۔ دلہن کے والدین نے دولہا والوں کو بتایا کہ یہ پانی نہ صرف ذاتی استعمال کے لیے ہوگا بلکہ مقامی لوگوں کے کام بھی آئے گا۔

یکم جنوری 1985ء میں جنوبی افریقا میں اپنی نوعیت کی ایک انوکھی شادی ہوئی۔ دولہا کا باپ اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا لیکن وہ بیٹے کی برات میں موجود تھا۔ وہ کیسے؟ 24 سالہ مارک سان کرکی یہ شدید آرزو تھی کہ اس کا باپ بھی اس کی شادی میں شریک ہو لیکن کرسمس کے دن اس کے باپ کا انتقال ہوگیا۔ دولہا کا کہنا تھا کہ اگر اس کا باپ اس شادی میں شریک نہ ہوا تو اس کی خوشیاں برباد ہو جائیں گی۔ اس نے سب سے پہلے اپنی منگیتر کی رضامندی حاصل کی اور پھر اپنے باپ کے کھلے تابوت کو بارات میں شامل کرلیا۔ جب براتیوں نے یہ منظر دیکھا تو ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

ایک اور انوکھی شادی کا حال بھی ملاحظہ کیجیے۔ یہ قصہ اپنے ہی ملک کا ہے۔ نومبر 1984ء میں پاکستان کے شہر وزیرآباد میں ایک نوجوان کا نکاح ہوا۔ نکاح کے بعد جب دولہا کے دوست اور عزیز و اقارب اسے مبارکباد دینے کے لیے اٹھے تو دولہا میاں غائب تھے۔ مہمانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ دلہن نے رونا دھونا شروع کر دیا۔ دولہا کے والدین انتہائی پریشان تھے کہ ان کے بیٹے نے انہیں کس صورتِ حال سے دوچار کر دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ اچانک کسی نے یاد دلایا کہ وہ شہر میں فٹ بال کا چیمپئن کھلاڑی ہے۔ اس پر تمام لوگ بھاگم بھاگ فٹ بال کے میدان میں پہنچے۔ وہاں ایک عجیب و غریب منظر دیکھنے میں آیا۔ دولہا میاں عروسی جوڑا پہنے ہوئے فٹ بال کو کک لگا رہے تھے۔ دولہا میاں کو سمجھایا گیا کہ بھائی صاحب گھر چلیں اور شادی کی تقریب میں شامل ہوں۔ نکاح کے بعد بھی آپ کا وہاں موجود رہنا ضروری ہے۔ دولہا نے شادی کے شرکا کی خواہش کا احترام کیا اور ان کے ساتھ واپس گھر چلا گیا۔

ایک اور حیرت ناک واقعہ ملاحظہ فرمایئے۔ 2001ء میں جنوبی افریقا میں ایک خاتون زیبی نے اپنے مردہ شوہر سے دوبارہ شادی کی۔ یہ شادی کا اتنا انوکھا واقعہ تھا کہ لوگوں نے دانتوں کے نیچے انگلیاں دبالیں۔ زیبی کے شوہر کا اس کی غیر حاضری میں انتقال ہوگیا تھا۔ چنانچہ اس کے گھر والوں نے ایک گرجا گھر میں زیبی اور اس کے آنجہانی شوہر آئزک کو قانونی طور پر میاں بیوی بنانے کی قدیم رسومات ادا کیں۔ رات بھر خوشی کے شادیانے بجائے گئے۔

دنیا کی دس حیرت انگیز شادیوں کا جان کر بھی سر دھننے کو جی چاہتا ہے، ان شادیوں کا تذکرہ بھی انگشت بدنداں کرنے کے لیے کافی ہے۔ آپ نے انسانوں کی شادیوں کے بارے میں سنا ہوگا اور شرکت بھی کی ہوگی کیا آپ نے سنا ہے کہ کسی نے شادی اپنی من پسند شے سے کی یا پھر خود سے ہی کرلی؟ واقعی یہ سب کچھ آپ کے لیے حیران کن ہوگا؟ یہاں ہم آپ کو چند ایسے ہی لوگوں کے بارے میں بتا رہے ہیں جنہوں نے کسی دوسرے انسان کی بجائے اپنی من پسند شے سے شادی کی یا اگر انسان سے کی بھی تو وہ بھی حیران کن انداز میں اور ان سب شادیوں کی باقاعدہ طور پر تقریبات بھی منعقد کی گئیں۔

37 سالہ ریٹائرڈ فوجی خاتون سان فرانسسکو میں رہائش پذیر ہیں انہیں ایفل ٹاور سے بہت زیادہ محبت ہے اپنی اس محبت کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے ایک بہت بڑی تقریب منعقد کر کے ایفل ٹاور سے شادی کی اور باقاعدہ قانون کے مطابق اپنے نام کے ساتھ ایفل کا اضافہ بھی کیا۔ ایجا 54 سالہ Eija جرمن خاتون ہیں۔ انہوں نے 1979ء میں برلن وال سے شادی کی۔ ایجا کا کہنا ہے کہ انہیں اس وال سے بے پناہ محبت ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے اس وال کو پہلی مرتبہ سات سال کی عمر میں دیکھا تھا اس کے بعد انہیں اس وال سے محبت ہوگئی تھی۔

ایک جاپانی شخص نے نینٹنڈو گیم کے کردار سے شادی کی جو ایک لڑکی کا ہے۔ انہوں نے گوام میں باضابطہ طور پر اپنی شادی کی تقریب منعقد کی جس میں انہوں نے قانونی طور پر اس کردار سے شادی کا اعلان کیا جو صرف گیم کا ایک خیالی کردار ہے۔ ایم اے وولف 32 سالہ امریکن شہری ہے۔ انہوں نے فیئر گراؤنڈ رائڈ سے شادی کی۔ یہ رائڈ پنسلوانیا کے ایموزمنٹ پارک میں نصب ہے۔ "مرحوم دوست سے شادی" ماگالی اور جوناتھن جارج نومبر 2008ء میں شادی کرنے والے تھے۔ ایک موٹرسائیکل ایکسیڈنٹ کا شکار ہوگئے

جس کے نتیجے میں جونا تھن جارج کی موت واقع ہوگئی اس واقعے کے باوجود ماگالی نے اپنی شادی کی تقریب منسوخ نہیں کی اور باقاعدہ طور پر اپنے ہونے والے شوہر کی تصویر کے ساتھ شادی کی۔

"تکیے سے شادی" یہ تو آپ نے سنا ہوگا کہ محبت اندھی ہوتی ہے اور وہ کسی سے بھی ہو سکتی ہے مگر کیا کبھی آپ نے اتنی اندھی محبت کے بارے میں سنا ہے جو انسان کو اپنے تکیے سے ہو جائے۔ کوریا کے رہنے والے لی جن نے اپنے تکیے سے شادی کی جس کے لیے انہوں نے باقاعدہ طور پر ایک تقریب کا اہتمام بھی کیا۔

"سانپ سے شادی" ایک ہندو خاتون جنہوں نے 2000 افراد کے سامنے 2006ء میں ایک سانپ سے شادی کی۔ اس شادی کا اہتمام ہندو رسم و رواج کے مطابق کیا گیا۔ خاتون شادی کی رسومات کے دوران سانپ کے ساتھ بیٹھی رہیں۔ ہندوستان میں چرند، پرند سے شادی عام ہے۔ لڑکی اگر مانگلک ہے تو اسے کتے، بلی یا پیڑ پودے سے شادی کرنا ضروری ہے ورنہ وہ بیوہ ہو جائے گی۔ امیتابھ بچن کی بہو ایشوریہ رائے کی شادی پہلے نیم کے پیڑ سے کرائی گئی پھر اگلے دن اصل شادی ہوئی گوگل پر ایسی شادیوں کی بے شمار تصویریں مل جائیں گی۔

"ویگن سے شادی" ایڈورڈ اسمتھ جنہوں نے اپنی وینلا والکس ویگن بیٹل کے ساتھ شادی کی۔ مسٹر اسمتھ 57 سالہ شخص ہیں ان کا کہنا ہے کہ انہیں پہلی مرتبہ 15 سال کی عمر میں اس گاڑی سے محبت ہوگئی تھی۔

"اسٹیریو سسٹم سے شادی" ایما 43 سالہ برطانوی خاتون ہیں انہوں نے ایک ہائی فائی اسٹیریو سے شادی کی۔ ان کا کہنا ہے کہ انہیں اس سسٹم سے بے پناہ محبت ہے اور وہ اسے جیک کے نام سے پکارتی ہیں۔ ان کے خیال میں جیک ایک مضبوط قابل بھروسا اور خوبصورت ساتھی ہے۔

شادی میں اعداد کا عمل دخل بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ہم آپ کو چین لیے چلتے ہیں جہاں شادی میں 9 کا ہندسہ اہمیت کا حامل ہے۔ چین میں شادی کرنے والے ہندسے دیکھتے ہیں۔ چینی روایت میں 9 کے عدد کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ ان کے علم الاعداد کے مطابق 9 کے عدد سے تشکیل پانے والے چینی لفظ کا مطلب ہے "ہمیشہ قائم رہنے والی" چنانچہ شادی کو پائیدار بنانے کے لیے 9 کے عدد کا بکثرت استعمال کیا جاتا ہے۔ آپ نے کوئی تحفہ دینا ہے تو 9 کی تعداد پوری کرنا ہوگی مثلاً کوئی جراب دینا ہے تو 9 سے جوڑ دے گا۔ کسی نے رومال دینا ہے تو 9 عدد ہوں گے۔ کوئی پھل دینا چاہتا ہے تو 9 دانے ہوں گے۔ یہ 9 تو کم از کم ہے آپ نے زیادہ کرنا ہے تو کوئی حد نہیں، آپ 99، 999، 9999، علی ہذا القیاس کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ مگر 9 کے چکر سے باہر نہیں نکلنا۔ چنانچہ سلامی وغیرہ بھی اس حساب سے دی جاتی ہے۔ دولہا کی جانب سے دیے گئے شادی کے کھانے یعنی دعوت ولیمہ میں ویڈنگ ہال کی آرائش قابل دید ہوتی ہے، ہر طرف بکھری سرخی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ گویا پورے ماحول کو بحرہ احمر میں ڈبکی دے کر چین کے اس قصبے میں رکھ دیا گیا ہو۔ روایتی چینی کھانے میں غیر ملکی مہمانوں کے ذوق و ضرورت کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کی طرح سلامی کا رواج چین میں بھی ہے۔ مگر وصولی کا طریق کار انوکھا۔ وصولی ہال کے مرکزی دروازہ پر ہی کی جاتی ہے۔ مہمان ویڈنگ بک پر اپنا نام اور سلامی میں دی جانے والی رقم کا اندراج کرتے اور سرخ لفافہ اٹینڈنٹ کو تھما دیتے۔ یہاں بھی 9 کے عدد کا راج ہے۔ سلامی کی رقوم بہ اہتمام 9، 99، 999 یا 9999 یوآن پر مشتمل ہوتی ہیں۔ تاکہ بدشگونی کا احتمال نہ رہے۔ رخصتی کا منظر بھی مشرقی رنگ لیے ہوتا ہے۔ دلہن کو گاڑی میں بٹھانے کا فریضہ کسی بھاگوان کے ذمہ ہوتا ہے جو شوہر اور بچوں والی ہو اور ماں باپ اور ساس سسر بھی حیات ہوں اس دوران دلہن کی بہن یا سہیلی اس پر سرخ رنگ کی ننھی سی چھتری تانے رکھتی ہے اور دوسرے ہاتھ سے اس کی نشست پر مٹھی بھر چاول پھینک دیتی ہے۔ گاڑی کے پیچھے سرخ رنگ کی چھلنی اور آئینہ باندھنے کا رواج بھی ہے جسے بدروحوں سے دلہن کے تحفظ کا موجب سمجھا جاتا ہے ہمارے ہاں تو رواج نہیں رہا مگر چین میں آج بھی دلہنیں رخصتی کے وقت آنسو ضرور بہاتی ہیں اور ماں آخری پیار کے بعد اسے چند نصائح کے ساتھ رخصت کرتی ہے۔ چینی دلہنیں مایوں بھی بیٹھتی ہیں۔ شادی سے چند ہفتے پہلے باہر نکلنا چھوڑ دیتی ہیں اور گھر میں زیادہ سے زیادہ وقت والدین، بہن بھائیوں اور سہیلیوں کے ساتھ گزارتی ہیں۔

چین میں جہیز کا رواج بھی ہے۔ جو نئے گھر کی بنیادی ضروریات پر مشتمل ہے جو شادی کے دن سے پہلے دولہا کے گھر پہنچا دیا جاتا ہے۔

چینی شادیوں میں لی شی منی بھی ایک خاصے کی چیز ہے۔ ہمارے ہاں شادی کی تقریب میں مختلف مواقع پر ہونے

والے خرچوں کو مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ جیسے سلامی، منہ دکھائی، رخصتی خرچا وغیرہ۔ چینی ان سب مواقع کے اخراجات کے لیے صرف ایک جادوئی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ''لی شی منی'' لی شی کا مطلب ہے "Good luck for ever" یعنی دائمی خوش بختی۔ لی شی منی سے دولہا بھی مبرا نہیں۔ برأت روانہ ہوتی ہے تو دولہا لی شی منی الگ سے سرخ رنگ کے لفافے میں رکھ لیتا ہے۔

بھارت میں مہنگی ترین شادی کا تذکرہ ہو چکا، اب ایک عجیب و غریب شادی کا حال بھی جان لیجیے۔ شادی پر 10 لاکھ روپے، یعنی یوں کہہ لیجیے 10 ہزار پاؤنڈ کا خرچا آیا۔ یہ وہ رقم ہے جس میں برطانوی جوڑا بہت شاندار طریقے سے شادی رچا سکتا ہے۔

کہتے ہیں جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ لیکن بھارت میں ایک ایسے انوکھے جوڑے نے شادی رچائی جو آپ نے شاید پہلے کبھی نہ دیکھی ہو اور نہ سنی ہو۔ شادی کا نام آتے ہی ڈھول، تاشے، زرق برق کپڑے پہنے برات کے آگے ناچتے گاتے براتی، آتش بازی اور مزے مزے کے کھانوں کا خیال آتا ہے۔

بھارت میں بھی ایک ایسی ہی شادی کی تقریب ہوئی جس میں یہ سب رونق میلہ اور ہلا گلا تو ہوا، لیکن یہ سب کچھ دوسری شادیوں سے کچھ الگ اس طرح تھا کہ اس شادی میں

برات کا دولہا ''بیل'' جبکہ دلہن ''گائے'' تھی۔ اس انوکھی اور دلچسپ شادی کا احوال کچھ یوں ہے کہ شادی پر 10 لاکھ روپے یعنی یوں کہیے 10 ہزار پاونڈ کا خرچا آیا۔

یہ شادی کروائی کس نے اور کیوں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ گائے 'گنگا' اور بیل 'پرکاش' کا بیاہ رچانے والے ریاست مدھیہ پردیش کے شہر اندور کے قریبی رہنے والے گنگا کے مالک گوپال پٹواری۔ گوپال کا کہنا تھا کہ شادی کا مقصد قدرتی آفات مثلاً ژالہ باری، طوفان سے فصلوں کو محفوظ رکھنا ہے۔ اس شادی سے ہمارے گاؤں میں ''شانتی بنی رہے گی''۔ علاقے کے بیشتر کاشت کار لوبیا اور روئی اگاتے ہیں اور ان کی زندگی کا دارومدار ہی اچھی فصل پر ہے۔ گنگا اور پرکاش کی شاہانہ شادی میں گاؤں اور قریبی علاقوں کے 5000 افراد نے شرکت کی۔ گنگا کو خصوصی طور پر تیار کردہ دلہنوں والی ساڑی، ہار اور پھول پہنائے گئے اور میک اپ بھی کیا گیا۔ دوسری جانب دولہا یعنی ''پرکاش'' کی شان بھی نرالی تھی۔ آراستہ پیراستہ بگھی میں ملٹی کلرڈ شیروانی اور اورنج پگڑی میں پرکاش بھی کچھ کم خوبصورت نہیں لگ رہا تھا۔ شادی کی تمام رسومات سادھو جی نے روایتی انداز میں ادا کیں۔ ان رسومات میں ہلدی، گنیش پوجا، منڈپ اور اگنی کے گرد پھیرے بھی شامل تھے۔ شادی کے بعد پٹواری جی خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ پھیروں کے بعد ناچ گانے اور کھانے پینے کا سلسلہ کئی گھنٹوں تک چلا جس میں سب نے دل کھول کر حصہ لیا۔

مہنگی اور عجیب و غریب شادیوں کے احوال کے دوران ملتان میں 2017ء میں ہونے والی اس سستی ترین شادی نے بھی سب کو متوجہ کر لیا۔ ملتان میں دو مہنگی شادیوں کے بعد ایک سستی اور انوکھی شادی ہوئی جس میں شادی کے لیے دولہا میاں تیار ہو کر باراتیوں کے ساتھ میٹرو بس میں سوار ہو کر دلہنیا لینے پہنچے اور وہاں بالوشاہی اور پانی سے تواضع کے بعد دلہنیا لے کر گھر واپس آ گئے۔ دولہا نے شادی کے لیے چھپوائے گئے انوکھے کارڈ میں تمام مہمانوں کو وقت پر پہنچنے کی تلقین بھی کر ڈالی اور کارڈ پر یہ بھی درج کیا کہ اس کے ماموں قدیر میٹرو کے سکے بانٹیں گے۔

ملتان کے علاقے منظور آباد میں دولہے میاں نے پہلے تو یہ انوکھا کارڈ چھپوایا اور پھر برأت کے ساتھ میٹرو اسٹیشن پہنچ گیا۔ سفید شلوار قمیص پر کالی واسکٹ زیب تن کیے دولہا رمضان میٹرو اسٹیشن پہنچا تو ماموں قدیر نے وعدے کے مطابق باراتیوں میں سکے تقسیم کیے اور یوں برأت شاہ رکن عالم اسٹیشن پہنچ گئی۔ دولہا میاں ماموں قدیر کے ساتھ 62 باراتیوں پر 1240 روپے کا خرچ کرنے کے بعد دلہن کے گھر پہنچے تو نکاح ہوا جس کے بعد میٹرو بس پر آئی بارات کی صرف بالوشاہی اور پانی سے ہی تواضع کی گئی۔ وفاقی دارالحکومت اسلام آباد میں بھی ایک انوکھی شادی نے مغلیہ دور کی یاد تازہ کر دی۔ ایک بڑے مذہبی گھرانے کے بیٹے کی شادی میں پولیس اور انتظامیہ

نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی، یوں تو شادی کی تقریبات میں دکھاوا ہمارے معاشرے کا دستور بنتا جارہا ہے مگر کچھ ایسی تقریبات بھی ہیں جن پر نہ چاہتے ہوئے بھی قلم اٹھ جاتا ہے۔ وفاقی دارالحکومت کی شاہراہوں پر گھوڑوں کی بگھی میں سوار یہ نوجوان راولپنڈی کے معزز مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اسلام آباد کی تاریخ کی یہ شاید پہلی شادی ہوگی جس کے لیے ہائی سیکیورٹی زون میں واقع فائیو اسٹار ہوٹل تک پہنچنے کے لیے راولپنڈی اور اسلام آباد کی سول انتظامیہ اور پولیس نے وی آئی پی کلچرل کو فروغ دینے میں اپنی ڈیوٹی خوب نبھائی اور برات کے لیے تمام راستے بند کر کے پروٹوکول دیا گیا بلکہ اسلام آباد کی ضلعی انتظامیہ نے تو اپنے آفیسر بھی تعینات کیے تاکہ پروٹوکول میں کوئی کمی نہ رہ جائے، انوکھی شادی کے تمام راستے صاف کرنے والے اسلام آباد پولیس اور سول انتظامیہ کے افسران حیرت انگیز طور پر گھوڑوں اور اونٹوں کی آمد سے لاعلمی کا اظہار کرتے رہے۔ سعودی عرب میں شادی کی ''انوکھی ترین'' تقریب کا حال بھی قابل ذکر ہے۔

سعودی عرب کے علاقے الجوف میں ایک انوکھی اور غیر روایتی انداز کی شادی دیکھنے میں آئی جہاں دولہا ایک ''ٹرالر'' میں سوار ہو کر اپنے دوستوں کے ہمراہ شادی کی تقریب میں پہنچا اور تمام لوگوں کو حیران کرڈالا۔ سوشل میڈیا پر مذکورہ شادی کا وڈیو کلپ پورے زوروں کے ساتھ گردش میں رہا۔ سعودی حلقوں کی جانب سے اس کو مملکت میں ''انوکھی ترین'' شادی قرار دیا جارہا ہے۔ یاد رہے کہ سعودی عرب کی شادیوں میں دولہا کی بہت بڑی سواری میں آمد کو انوکھا اور غیر مانوس امر شمار کیا جاتا ہے۔ وڈیو کلپ میں دولہا کو شادی ہال کے اندر ایک بڑے ٹرالر ٹرک میں سوار ہو کر داخل ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے جب کہ دولہا کے عزیز و اقارب اور دوست اس کو مبارک باد دینے کے لیے ایک جانب ہو گئے۔

نئی شادیوں کے لیے ایک ہی دن میں چار بیویوں کو طلاق کا معاملہ دلچسپی سے خالی نہیں، یہ واقعہ بھی سعودی عرب کے شہر جدہ میں پیش آیا۔ ایک سعودی شہری نے نئی شادیاں کرنے کے لیے اپنی موجودہ چاروں بیویوں کو ایک ہی دن میں طلاق دے دی لیکن نئی شادیاں کرنے میں بھی ناکام رہا جبکہ سابقہ بیگمات سے دوبارہ شادی کرنے کے لیے اسے ایک لاکھ ساٹھ ہزار سعودی ریال بطور جہیز دینا ہوں گے۔ نیوز ویب سائٹ ایریبئین 24/7 نے سعودی میڈیا کے حوالے سے لکھا کہ طلاقوں کی یہ انوکھی کہانی سوشل میڈیا پر پھیل گئی، چار بیگمات کے شوہر نے چار نئی بیگمات لانے کے لیے پہلے سے موجود چاروں خواتین کو طلاق دینے کا فیصلہ کیا تاہم جب وہ نئی خواتین سے شادی کرنے میں ناکام ہوا تو پہلی بیگمات سے دوبارہ شادی کا فیصلہ کیا لیکن اب سابقہ بیگمات نے بھی جہیز کا مطالبہ کردیا جو تقریباً ایک لاکھ 60 ہزار سعودی ریال (تقریباً 44 لاکھ 63 ہزار پاکستانی روپے) بنتے ہیں۔

آرکیسٹرا کا بندوبست نہ ہونے پر شادی کے ٹوٹ جانے کا انوکھا واقعہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔ بھارت میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر شادیاں ٹوٹنا روزانہ کا معمول بن گیا ہے لیکن اس بار آرکیسٹرا کا بندوبست نہ ہونے پر شادی کے ٹوٹ جانے کا انوکھا واقعہ پیش آیا ہے۔ ریاست اتر پردیش کے ضلع وارانسی (بنارس) کے چولا پور گاؤں میں شادی کی تقریب کے لیے دولہا اور دلہن والوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت تقریب کے لیے دولہا والوں کی جانب سے ڈی جے کا بندوبست کیا جانا تھا لیکن دلہن کے والد ڈی جے پرفارمنس کا مطلب آرکیسٹرا سمجھ بیٹھے۔ لڑکی والے جب تقریب میں پہنچے تو لڑکے والوں نے ان کا بھرپور استقبال کیا اور ساتھ آئے لوگوں نے دیگر مہمانوں کے ساتھ مل کر ڈی جے کے گانوں پر خوب رقص کیا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد دلہن کے والد نے آرکیسٹرا کا بندوبست نہ ہونے پر شور مچانا شروع کردیا اور شادی ختم کرنے کی دھمکی بھی دی۔ انہوں نے الزام عائد کیا کہ دولہا والے اپنے وعدے کی خلاف ورزی کررہے ہیں جس پر مہمانوں نے مداخلت کی اور دونوں کو معاملہ سلجھانے کی ہدایت کی تاہم دلہن کا والد اپنی ضد پر اڑا رہا اور شدید ضد بحث کے بعد شادی ہی ختم کرڈالی۔

یہ محبت کی انوکھی داستان ہے کہ 16 سالہ لڑکے کی 73 سالہ خاتون سے شادی ہوگئی۔ انڈونیشیا میں روایات اور قانون کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک نوجوان نے 70 سال کی معمر خاتون سے شادی کی۔ اس بات کا انکشاف اس وقت ہوا جب شادی کی وڈیو آن لائن وائرل ہوگئی۔ نوجوان دولہے کی عمر 16 سال ہے اور قانونی طور پر اسے شادی کرنے کا حق نہیں ہے۔ بہرحال جب گاؤں کے لوگوں اور حکام نے اس شادی کی اجازت دینے سے انکار کردیا تو جوڑے نے خودکشی کی دھمکی دی۔ اس کے بعد حکام نے بغیر رجسٹریشن کے شادی کی اجازت دے دی۔ انڈونیشیا قانون کے مطابق شادی کے لیے خواتین کی عمر 16 سال اور مردوں کی عمر 19 سال ہونی چاہیے۔ دونوں میں اس وقت قربت بڑھی جب

ملیریا میں مبتلا لڑکے کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بزرگ عورت نے سنبھالی۔ جنوبی سماترا کے اس گاؤں کے سربراہ سک ایلی نے بتایا کہ "چونکہ لڑکے کی عمر کم تھی، اس لیے ہم نے شادی کی اجازت بغیر رجسٹریشن کے دے دی"۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ "ایک غیر اخلاقی عمل کو روکنے کے لیے دو جولائی کو یہ شادی ہوئی۔ لڑکے کا نام سلامت جبکہ ان کی اہلیہ روہایا کی عمر 73 سال تھی"۔ اطلاعات کے مطابق لڑکے کے والد کی کئی سال پہلے موت ہو چکی تھی جس کے بعد اس کی والدہ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ روہایا کی یہ تیسری شادی ہے اور ان کی پہلی دو شادیوں سے کئی بچے بھی ہیں۔

ایک اور واقعہ بھی آپ کی دلچسپی کا سامان لیے ہوئے ہے۔ دولہا کو ڈانس کرنا مہنگا پڑ گیا، دلہن نے شادی سے انکار کر دیا۔ بھارت میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر شادیاں ٹوٹنا معمول بن گیا ہے لیکن اس بار دولہا کے ڈانس کرتے پر شادی کے ٹوٹ جانے کا انوکھا واقعہ پیش آیا ہے۔ بھارتی ریاست اتر پردیش کے علاقے شاہ جہان پور میں ایک دولہے نے اپنی شادی کے دوران اچانک ناگن ڈانس شروع کر دیا۔ اسے یہ حرکت اتنی مہنگی پڑی کہ دلہن نے شادی سے ہی انکار کر دیا۔ نشے میں دھت دولہا جیسے ہی برات لے کر دلہن کے گھر پہنچا تو اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا اور سڑک کے بیچوں بیچ لوٹتے ہوئے ناگن ڈانس کرنا شروع کر دیا۔ دلہن پریانکا ترپاٹی کو جب یہ سب واقعہ معلوم ہوا تو اسے بہت شرمندگی ہوئی اور اس نے فوری طور پر اپنے والدین سے کہہ دیا کہ وہ ایسے شخص سے کسی صورت شادی نہیں کرے گی۔ دونوں خاندانوں نے دلہن کی بہت منت سماجت کی کہ وہ شادی سے انکار نہ کرے تاہم دلہن اپنے فیصلے پر قائم رہی، یوں دولہے میاں کی ایک چھوٹی سی غلطی ان کی عمر بھر کا پچھتاوا بن گئی۔

سنگاپور میں بھی عجیب واقعہ رونما ہوا۔ سنگاپور سے تعلق رکھنے والا ایک جوڑا گزشتہ دو سال سے اچھی بھلی ازدواجی زندگی گزار رہا تھا مگر حال ہی میں شوہر نے ایک ایسا کام کر ڈالا کہ حکومت نے مداخلت کرتے ہوئے ان کی شادی کو غیر قانونی قرار دے دیا ہے۔ شوہر نے اپنی جنس تبدیل کروائی تھی اور تبدیلی جنس کے بعد اپنے شناختی کارڈ کو بھی تبدیل کروایا اور اس پر اپنی جنس عورت لکھوائی تھی۔ جب متعلقہ محکمے کو معلوم ہوا کہ میاں بیوی دونوں کی جنس عورت ہے تو ان کی شادی کو غیر قانونی قرار دے دیا۔

سنگاپور کے قانون کے مطابق شادی شدہ جوڑوں کو پہلی بار رہائش گاہ خریدنے کی صورت میں حکومت کی جانب سے رعایت ملتی ہے، جسے حاصل کرنے کے لیے اس جوڑے نے بھی اپنی معلومات متعلقہ محکمے کو دی تھیں لیکن اس کوشش میں ان کی اصل حقیقت سامنے آ گئی۔ حکام کا کہنا ہے کہ سنگاپور کے قانون کے مطابق شادی ایک عورت اور مرد کے درمیان ہو سکتی ہے لہٰذا یہ جوڑا میاں بیوی قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ ہی انہیں گھر خریدنے کے لیے حکومتی رعایت حاصل ہو سکتی ہے۔ دیگر ترقی یافتہ ممالک کے برعکس سنگاپور نے ہم جنس شادیوں کو تاحال قانونی قرار نہیں دیا۔ سنگاپور کے وزیراعظم کا کہنا ہے کہ یہ ملک ابھی ہم جنس شادیوں کو قانونی قرار دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

ذکر پھر بھارت کا آ گیا ہے، کبھی ڈانس پر شادی سے انکار اور کبھی گنّا کھانے سے دلہن روٹھ گئی۔ دولہے کے گنّے کھانے پر شادی کے ٹوٹ جانے کا انوکھا واقعہ پیش آیا ہے۔ جی ہاں ریاست اتر پردیش کے مرار پچی گاؤں میں شادی کی تقریب میں دولہے کو گنّا چبانا مہنگا پڑ گیا اور دلہن نے اس وقت شادی سے انکار کر دیا۔ دولہا شادی کی رسومات کے دوران گنّا کھا رہا تھا جو اس کی دلہن کو ذرا نہ بھایا اور دیدہ دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے شادی سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر لڑکی کے گھر والوں نے بہت سمجھایا لیکن دلہن اپنی ضد پر اڑی رہی، شدید ضد بحث کے بعد شادی ہی ختم کر ڈالی۔

پاکستان میں بھی ایک واقعہ سنیے اور سر دھنیے۔ رواں برس 21 جنوری کو حیدرآباد پاکستان میں گدھے گدھی کی شادی کر دی گئی۔ "حیدرآباد میں انوکھی شادی کا اہتمام کیا گیا ہے۔ حیدرآباد کے رہائشیوں نے ایک انوکھی شادی کا اہتمام کیا۔ رہائشیوں کی طرف سے گدھے کو دولہا اور گدھی کو دلہن بنایا گیا۔ گدھا گاڑی بان نے اپنے لاڈلے گدھے کو دولہا بنا کر اپنے دوست کی گدھی سے شادی کروا دی۔ گدھا اور گدھی کی شادی کے لیے کئی گدھا گاڑی بانوں نے مل کر خصوصی اہتمام کیا اور خوب مزہ ہلا گلا کیا۔

شادیوں کے ان حیران کن واقعات میں ایک دلچسپ واقعہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ ایک شخص نے "جل پری" کو شادی کی پیشکش کر دی۔ اس جوڑے نے ایک دوسرے سے محبت کو ایک نئی "گہرائی" پر پہنچا دیا ہے۔ جی ہاں امریکی ریاست ٹیکساس سے تعلق رکھنے والے ایرک مارٹینز نے اپنی گرل فرینڈ کمی رلی سے میکسیکو کے علاقے ریویریا مایا میں تعطیلات کے دوران زندگی بھر کے ساتھ کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس جوڑے

نے فوٹوگرافر پولی ڈاؤسن سے اس یادگار لمحے کو کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کرنے کا کہا۔ مگر ایرک نے اپنی ہونے والی دلہن کے لیے صرف یہ سرپرائز ہی نہیں رکھا تھا بلکہ انہوں نے اپنی منگیتر کی بچپن کی خواہش کو بھی حقیقت کا روپ دینے کا اہتمام کیا تھا۔ ایرک نے کیمی ریبی کو کہا کہ وہ ایک بار پھر شادی کی پیشکش کرے گا مگر اس بار پانی میں اور خاتون جل پری کے روپ میں ہوں گی۔ کیمی نے ایک انٹرویو کے دوران بتایا "میری بچپن سے پسندیدہ شہزادی دی لٹل مرمیڈ کی ایریل تھی، جل پریاں جادوئی ہوتی ہیں اور سمندر کی گہرائیوں کو کھنگال سکتی ہیں، اور میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ مجھے پرنس ایرک جیسا شخص ملا، جس نے میرا خواب پورا کردیا"۔ اس مقصد کے لیے ایرک نے خاص قسم کی سرخ انگوٹھی بھی تیار کرائی تھی تاکہ زیرآب فوٹوشوٹ میں اسے نمایاں کیا جاسکے، جبکہ خاتون کے لیے جل پری جیسی گولڈ اور ریڈ رنگ کی دم بھی تیار کروائی۔ اگرچہ اب یہ تصاویر بہت خوبصورت اور آسانی سے لی جانے والی لگ رہی ہیں مگر کیمی کے مطابق یہ انتہائی مشکل کام تھا خصوصاً اس لیے کیونکہ میرا سر چکرا رہا تھا، مگر پھر بھی پانی کے اندر میں خود کو سنبھالنے میں کامیاب رہی"۔

ماؤنٹ ایورسٹ پر شادی کرنے والے جوڑے کی داستان بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے، اس نوبیاہتا جوڑے نے ایک دوسرے سے محبت کو ایک نئی "بلندی" پر پہنچا دیا ہے۔ امریکا سے تعلق رکھنے والے 35 سالہ جیمز سیسوم اور 32 سالہ ایشلے شمیدر نے زندگی بھر کے تعلق میں بندھنے کے لیے انتہائی غیر متوقع مقام کا انتخاب کیا اور وہ ہے دنیا کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ۔ رواں برس مارچ کے آخر میں ہونے والی یہ شادی ماؤنٹ ایورسٹ کیمپ پر ہوئی جہاں وہ اس سے قبل تین ہفتے تک ہائیکنگ کرتے رہے تھے۔ ایشلے نے بتایا "کافی سوچ بچار کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ روایتی انداز سے شادی ہمارے لیے درست انتخاب نہیں، اگرچہ ہم اپنے اس خاص دن کو گھر والوں اور دوستوں کے ساتھ شیئر کرنا پسند کرتے، مگر ہم دونوں نے اس خیال کو اپنایا کہ ان حیران کن تعطیلات کے دوران شادی کے بندھن میں بندھا جائے"۔
اگرچہ یہ شادی کے لیے دنیا کا بلند ترین اور غیر متوقع مقام سمجھا جاسکتا ہے مگر جوڑے نے امریکی روایتی عروسی ملبوسات پہننے کو ترجیح دی۔ جیمز نے سوٹ جبکہ ایشلے نے سفید رنگ کا روایتی عروسی لباس زیب تن کیا، ان کی اس تقریب کو ایک ایڈونچر ویڈنگ فوٹوگرافر چارلیٹن چرچل نے کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کیا۔ فوٹوگرافر نے اپنی ویب سائٹ پر ایک بلاگ پوسٹ میں اس تقریب کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا "سفر کے آغاز میں بہت زیادہ برفباری ہورہی تھی، ہمارے گائیڈ کے مطابق

ہمارے اوپر پورے موسم سرما سے زیادہ برف گر سکتی ہے، 14 ہزار فٹ کی بلندی پر درجہ حرارت منفی 8 سے 10 فارن ہائیٹ تک گر گیا تھا اور ہمارے ہاتھ دستانوں سے نکلتے ہی منجمد ہوجاتے، جیسا کہ تصاویر لینے کی کوشش کے دوران میرے ساتھ ہوا۔" انہوں نے لکھا "جیمز اور ایشلے کی شادی منفی پانچ سے پانچ ڈگری فارن ہائیٹ کے دوران ہوئی، دلہن کے عروسی لباس کے لیے ہم نے خصوصی طور پر انتظام کیا کہ وہ گرم رہے"۔

تاہم تمام تر مشکلات کے باوجود شادی کی تقریب کا انعقاد ہوا۔ فوٹوگرافر کے مطابق جب ہم بیس کیمپ پہنچے تو ہمیں بتایا گیا کہ ہمارے پاس ڈیڑھ گھنٹا ہے جس کے دوران کھانا، شادی، سامان باندھنا اور ہیلی کاپٹر پر سوار ہونا ہے، تو ہم نے ایک گھنٹے کے اندر کھانا، پیا اور شادی کی تقریب نمٹائی جس کی ہم نے چند تصاویر بھی لیں"۔

چار مرتبہ شادی کرنے والے میاں بیوی کا تذکرہ بھی حیران کن اور اپنی طرز کا انوکھا واقعہ ہے۔ آپ نے کئی رومانوی ناولز اور افسانوں میں تو پڑھا ہی ہوگا کہ محبت کا کوئی

مذہب یا ذات نہیں ہوتی اور یقیناً آپ نے ایسی فلمیں بھی دیکھی ہوں گی جن میں ہیرو اور ہیروئن الگ الگ مذہب اور ملک سے تعلق رکھنے کے باوجود شادی کرتے ہیں۔ دنیا کے کئی ممالک میں ایسا حقیقت میں بھی ہوتا ہے کہ دولہا اور دلہن الگ الگ مذہب رکھنے کے باوجود شادی کرتے ہیں اور مذہب بھی تبدیل نہیں کرتے، مگر ایک ہی میاں بیوی چار بار مختلف طریقوں سے شادی کریں ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ بھارت جیسے کثیر المذاہب اور کثیر الثقافتی ملک میں دو مختلف مذاہب کے ماننے والے افراد کی شادی ہمیشہ ہی سماجی مسئلہ رہی ہے، تاہم بہت سارے جوڑے ایسے بھی ہیں جنہوں نے غیر مذہب افراد سے شادی کر رکھی ہے، ایسی شادیاں کرنے والوں میں بولی ووڈ اداکار، سیاستدان، کھلاڑی اور کاروباری افراد شامل ہیں۔

ہندوستان کی ریاست ہریانہ سے تعلق رکھنے والی انکیتا بھی ایک ایسی ہی لڑکی ہے، جس نے ایک مسلمان لڑکے سے شادی کی اور یہ شادی ایک بار نہیں بلکہ چار بار کی۔ انکیتا ہندو مت کی ماننے والی ہیں، جبکہ ان کے شوہر فیض کا تعلق ترقی پسند مسلمان گھرانے سے ہے۔ فیض اور انکیتا کی محبت ڈرامائی طور پر 2 سال قبل شروع ہوئی، جو بتدریج بڑھتی چلی گئی اور پھر دونوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا، مگر یہ آسان اور ممکن نہ تھا۔ انکیتا نے اپنی شادی کی کہانی لکھتے ہوئے اعتراف کیا کہ ان کے گھر والے شادی کے لیے تیار نہیں تھے، تاہم انہوں نے کھل کر مخالفت بھی نہیں کی۔ گھر والوں کو راضی کرتے کرتے انہیں 2 سال گزر گئے مگر دونوں کے اہل خانہ راضی نہ ہوئے پھر بالآخر انہوں نے گھر والوں کی رضامندی کے بغیر ہی شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ انکیتا اور فیض کی شادی کے بعد بالآخر ان کے اہل خانہ بھی راضی ہو گئے، فیض کے مطابق ایک مسلمان مرد کو چار شادیاں کرنے کی اجازت ہوتی ہے، اس لیے انہوں نے ایک ہی دلہن کے ساتھ چار بار شادی کی رسومات ادا کیں۔ شادی کے بعد دونوں نے ایک دوسرے پر اپنا مذہب تبدیل کرنے کے لیے دباؤ نہیں ڈالا، بلکہ دونوں اب بھی اپنے اپنے مذاہب پر یقین رکھنے کے باوجود ایک دوسرے کی زندگی کا اٹوٹ حصہ بن چکے ہیں۔

انکیتا اور فیض نے پہلی شادی ہندو رسم و رواج کے مطابق کی، فیض نے انکیتا کی مانگ میں سندور بھرا اور انہیں مالا پہنائی۔ انکیتا اور فیض نے دوسری شادی اسلامی رسم و رواج کے تحت کی، وہ عدالت گئے اور بھارت کے اسپیشل میرج ایکٹ کے تحت شادی کی، یہ ایکٹ مسلمان مرد کو 4 شادیوں سے بھی روکتا ہے۔ انکیتا اور فیض نے اپنی تیسری شادی اور محبت کو یادگار بنانے کے لیے ہندوستانی فلموں اور رومانوی ناول کی کہانیوں میں بتائے گئے آئیڈیاز کو خوب استعمال کیا۔ وہ تیسری شادی کے لیے بھارتی ریاست گوا پہنچے، جہاں انہوں نے ایک بار پھر اسلامی رسم و رواج کے مطابق دوستوں اور سیاحوں کے سامنے نکاح کیا، اس دوران گیت سنگیت اور رقص کا پروگرام بھی سجایا گیا۔ انکیتا اور فیض نے چوتھی شادی ہندو رسم و رواج کے مطابق کی، انہوں نے ساحل سمندر پر سات پھیرے لیے۔ شادی کی چوتھی تقریب میں بھی انہوں نے گیت سنگیت اور رقص کے پروگرام کا اہتمام کیا۔ دسمبر 2010ء میں ہیر چیل اور لیسا وائٹ نے لندن کے مشہور لینڈ مارک لندن آئی کے سائے تلے اپنی شادی کی تقریب منعقد کی، امریکا میں میساچوسٹس میں اپنی میٹلیک شادی میں ڈینئیل لین میک کی اور برے ٹن تھامس تھرنے تتلیوں کو آزاد کرتے ہوئے شادی کی۔

چوبیس گھنٹوں میں دو شادیاں کر کے ملتان میں ایک نئی روایت ڈالی گئی۔ ملتان میں ایک نوجوان نے ایک دن میں دو شادیاں رچا کر ایک سے زیادہ شادیوں کے متمنی مردوں کے لیے ایک نئی روایت قائم کر دی ہے۔ تیس سالہ اظہر حیدری چوبیس گھنٹوں میں دو شادیوں کا اعلان کر کے پاکستانی ذرائع ابلاغ کی توجہ کا مرکز بنے، اظہر حیدری نے بتایا کہ اس کی دلہنوں میں سے ایک اس کے خاندان کی پسند ہے جبکہ ایک ان کی اپنی پسند ہے۔ انہوں نے کہا کہ دراصل وہ اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے خاندان نے ان پر زور ڈالا کہ وہ اسی خاتون سے شادی کریں جسے ان کے والدین نے بچپن سے طے کر رکھا تھا۔ اس مشکل صورت حال سے نکلنے کے لیے انہوں نے یہ حل نکالا کہ دونوں لڑکیوں سے اکٹھی شادی کر لی جائے۔ انہوں نے کہا کہ دونوں خاندانوں نے ان کی تجویز کو مان لیا اور اب وہ اپنے آپ کو بہت خوش قسمت محسوس کرتے ہیں کیونکہ دو عورتوں نے شاید ہی کسی ایک مرد کو پسند کیا ہے۔ تیس سالہ اظہر حیدری کی پہلی شادی اتوار کے روز اٹھائیس سالہ کزن حمیرا قاسم سے ہوئی جبکہ ان کی دوسری شادی ان کی اپنی پسند رومانہ اسلم سے سوموار کے روز ہوئی۔ پاکستان میں رائج اسلامی قانون مرد کو ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دیتا ہے بشرطیکہ اس میں پہلی بیوی کی رضامندی شامل ہو۔

پاکستان میں ایک سے زیادہ بیویاں ہونا انہونی بات نہیں ہے لیکن دوسری شادی اکثر کئی سالوں کے وقفے کے بعد کی جاتی ہے۔ اس سے پہلے ایک ہی شخص کی چوبیس گھنٹوں میں دو شادیوں کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ پاکستان کے کئی ٹی وی چینلز پر اظہر حیدری کی شادی کی تقریبات کو براہ راست دیکھا گیا تھا۔

ملتان میں مہنگی ترین شادیوں کے بعد مہنگی ترین مہندی کی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ دولہا 2 ہزار مہمانوں اور قیمتی گھوڑے، اونٹوں اور شیروں کے ہمراہ دلہن کے گھر مہندی لے کر پہنچ گیا تھا۔ روسی بزنس مین نے بیٹی کی شادی پر 1 ارب لٹا دیئے تھے۔

یوں تو ہر انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی شادی کو یادگار بنانے کے لیے کوئی کسر نہ چھوڑے لیکن کچھ لوگ تو اس موقع پر خزانے کا منہ ہی کھول دیتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ دیکھنے کو ملا۔ امریکی شہر لاس اینجلس میں جہاں روسی بزنس مین نے اپنی 22 سالہ بیٹی کی شادی میں صرف چند گھنٹوں میں ہی ایک ارب روپے سے زائد لٹا دیئے۔ ایلڈرادوسانو وا نامی روسی بزنس ٹائیکون کی بیٹی کی شادی کی تقریب لاس اینجلس کے ڈولبی تھیٹر میں منعقد کی گئی اور اس موقع پر تھیٹر کو رنگ برنگے مہنگے ترین پھولوں سے سجایا گیا۔ جن کی مجموعی مالیت 5 لاکھ امریکی ڈالر تھی۔ تقریب میں معروف امریکی سنگر لیڈی گاگا نے بھی پرفارم کیا جبکہ تقریب میں دیگر امریکی و روسی اسٹارز بھی شریک تھے۔ اس شادی پر مجموعی طور پر ایک ارب سے زائد خرچ ہوئے، جس میں مہنگا عروسی لباس، کئی فٹ لمبا کیک، آرکیسٹرا پرفارمنس بھی شامل تھی۔ چلتے چلتے پھر بھارت کا ذکر آ گیا۔

بھارت میں ازدواجی بندھن کی بے حرمتیوں کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں۔ ریاست اتر پردیش کے ضلع سہارنپور میں دولہا کی طرف سے گاڑی کا مطالبہ کرنے پر دلہن نے نکاح کرنے سے انکار کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ دلہن کے گھر والوں نے باراتیوں کو یرغمال بھی بنا لیا۔ پولیس کے مطابق نکاح کی رسم جب ادا کی جا رہی تھی تو اچانک دولہا نے کہا کہ نکاح کی رسم تبھی ادا ہوگی جب لڑکی والے اسے گاڑی دیں گے۔ لوگوں نے دولہا کو سمجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنی بات سے ٹس سے مس نہیں ہوا۔ دونوں اطراف کے لوگ اس مسئلے کو حل کرنے میں لگے رہے لیکن اسی دوران دلہن نے نکاح کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ جس کے بعد لوگوں نے باراتیوں کو یرغمال بنا لیا تاہم رات گئے ان کو چھوڑ دیا گیا جس کے بعد بارات دلہن کو لیے بغیر واپس چلی گئی۔

دنیا بھر میں شادی کی رسوم و رواج میں وہاں کی روایات اور تہذیب و ثقافت جھلکتی ہے۔ مسلمانوں میں نکاح، عیسائیوں میں مقدس انگشتری اور ہندوؤں میں اگنی کے سات پھیرے زندگی بھر ساتھ نبھانے کا عہد نامہ ہوتے ہیں۔

پاکستان میں شادیاں بہت رنگین اور رونق والی ہوتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے ہاں شادی کی رسموں میں بے پناہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ذیل میں چند دلچسپ شادیوں کی رسومات کے بارے میں اجمالی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے:

پاکستان میں شادی کی تقریبات کا آغاز ڈھولکی سے ہوتا ہے۔ شادی سے کئی روز پہلے سے ڈھولکی بجنا شروع ہو جاتی ہے جس میں خاندان کی لڑکیاں اور عورتیں شرکت کرتی ہیں۔ شادی کی پہلی باقاعدہ رسم مایوں ہوتی ہے۔ اس میں دلہن کو پیلا جوڑا پہنایا جاتا ہے۔ مہمان بھی پیلے کپڑے پہنتے ہیں۔ دلہن اور دولہا کو ابٹن لگائی جاتی ہے۔ ابٹن کے بعد مہندی کی رسم ہوتی ہے۔ قدامت پرست گھرانوں میں لڑکے اور لڑکی کی مہندی علیحدہ علیحدہ جبکہ ماڈرن گھرانوں میں ایک ساتھ ہوتی ہے۔ برات والے روز دولہا کی سہرابندی کی جاتی ہے۔ دلہن والے برات کا استقبال ہار پھول پہنا کر کرتے ہیں۔ نکاح کی رسم ادا ہونے کے بعد چھوہارے تقسیم کیے جاتے ہیں۔ دودھ پلائی کی رسم ہوتی ہے۔ رخصتی کے وقت دلہن کو قرآن مجید کے سائے میں رخصت کیا جاتا ہے۔

عیسائیوں میں دو فرقے رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ہیں۔ کیتھولک فرقے میں شادی کی رسوم کی ابتدا رشتہ لے جانے سے ہوتی ہے۔ باہمی رضامندی کے بعد بات طے ہو جاتی ہے۔ قریبی عزیزوں کو مدعو کر کے منگنی کا اعلان کیا جاتا ہے۔ دولہا دلہن ایک دوسرے کو انگوٹھی پہناتے ہیں۔ شادی کی تاریخ طے ہوتی ہے اور تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ شادی کی رسم چرچ میں ہوتی ہے۔ دلہن سفید میکسی اور دولہا سیاہ سوٹ پہنتا ہے۔ پادری دعائیں پڑھتا اور شادی کی رسوم ادا کرتا ہے۔ ایجاب و قبول کے بعد پادری شادی کی مقدس انگشتریاں بائبل پر رکھتا ہے جسے دولہا اور دلہن ایک دوسرے کو پہناتے ہیں۔ اس کے بعد پادری ان کے میاں بیوی ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ بعدازاں میاں بیوی شادی کے رجسٹر پر دستخط کرتے ہیں پھر موم بتیاں جلاتے ہیں۔ دو موم بتیاں ان دونوں کی اور تیسری ان کے بندھن کی ہوتی ہے۔ شادی کی

تکمیل کے بعد کیک کاٹا جاتا ہے جو جتنا امیر ہوتا ہے اسی حساب سے کیک کی منزلوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ کیک اور مشروبات سے مہمانوں کی تواضع کی جاتی ہے اور اس کے فوراً بعد ہنی مون پر روانہ ہو جاتے ہیں۔

ہندوؤں میں شادی کی بہت سی رسمیں ہیں۔ ان میں رشتہ لڑکی والے لاتے ہیں۔ پنڈت ''کنڈلی'' ملاتا ہے۔ رضامندی کے بعد منگنی (سگائی) کی تقریب ہوتی ہے اور دو روز بعد شادی کی تاریخ دے دی جاتی ہے۔ ان کے ہاں شادی کی ابتدا ''ونوا'' کی رسم سے ہوتی ہے جسے ہم مایوں کہتے ہیں۔ دلہن کو پیلا جوڑا پہنا کر ابٹن اور مہندی لگائی جاتی ہے۔ شادی والے دن دولہا تیار ہونے کے بعد کھیر کی خالی کٹوری پاؤں سے توڑتا ہے جبکہ لڑکی والوں کے ہاں پنڈت ایک مٹکے میں پانی ڈالتا ہے اور مٹکے پر ناریل رکھتا ہے۔ لڑکی کی ماں وہ مٹکا سر پر رکھ کر لاتی ہے پھر اس کی پوجا کی جاتی ہے۔ ایک رسم میں دودھ بھری ہوئی کٹوری میں دولہا اور دلہن کی انگوٹھیاں ڈال دی جاتی ہیں۔ دونوں پیالے میں ہاتھ ڈال کر انگوٹھیاں تلاش کرتے ہیں جس کو انگوٹھی مل جاتی ہے وہ دوسرے کو دے دیتا ہے یہ عمل تین بار دہرایا جاتا ہے۔ شادی کی اہم ترین رسم اگنی کے سات پھیرے ہیں۔ آگ کو گواہ بنا کر یہ رسم ادا کی جاتی ہے۔ اس میں دولہا کا پٹکا دلہن کے پلوے سے باندھ کر اگنی کے سات پھیرے لیے جاتے ہیں اس دوران پنڈت منتر پڑھتا رہتا ہے۔ لڑکی کا ماموں آگ میں جو ڈالتا ہے اور دلہن کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ اگلے پھیروں میں چچا، بھائی اور باپ بھی رسم دہراتے ہیں۔ پھیرے مکمل ہونے کے بعد دولہا دلہن کی مانگ میں سیندور بھر کر اسے منگل سوتر پہناتا ہے اور آخر میں دونوں ایک دوسرے کو پھولوں کے ہار اور مالا پہناتے ہیں۔ اس کے بعد مہمانوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔

رخصتی کے بعد دلہن سسرال آتی ہے تو سر پر دودھ بھرا کٹورا رکھتی ہے اور چوکھٹ سے گھر کے اندر دودھ کے چھینٹے مارتی ہے۔ چوکھٹ پر ہی ساس دلہن کی آرتی اتارتی ہے۔ وہیں سندور سے بھرا کٹورا رکھا ہوتا ہے جسے دلہن ٹھوکر سے گرا کر سرخ پاؤں سے گھر کے اندر داخل ہوتی ہے۔ دلہن کے ہاتھ میں تل اور جو رکھا جاتا ہے اور منہ دکھائی دی جاتی ہے۔

جاپان کے جزائر اوکی ناوا میں دلہن کو آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ حجلہ عروسی میں داخلے کی متمنی لڑکی کے سر کے بال جلائے جاتے ہیں۔ اس موقع پر قبیلے کا جادوگر کسی جانور کے تیز دانت سے لڑکی کی پیٹھ پر گہری لکیریں ڈالتا ہے اور زخموں میں پسی ہوئی مرچیں بھرنے سے قبل لڑکی کے ہاتھ کو خوب مضبوطی سے باندھ دیتا ہے۔ لڑکی زخموں میں پسی ہوئی مرچوں کی تکلیف سے درد کے مارے تڑپتی رہتی ہے لیکن کامیاب شادی کے لیے اسے یہ تکلیف برداشت کرنا ہوتی ہے۔

سوڈان کے بعض علاقوں میں رواج ہے کہ دلہن اپنے ہونے والے شوہر کے رخسار کو داغ دیتی ہے۔ اس سے یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ اسے اپنے ہونے والے شوہر سے محبت ہے اور یہ داغ اس کی محبت کی مہر ہے جو اس کے رخسار پر ثبت ہے۔ یہ داغ دیتے وقت شوہر کو جو تکلیف ہوتی ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ عشق کی یہ مہر زندگی بھر شوہر کے چہرے پر ثبت رہتی ہے۔

ویلز انگلستان کا مشہور علاقہ ہے۔ وہاں قدیم ایام سے آج تک یہ رسم جاری ہے کہ دولہا دلہن کو حجلہ عروسی میں داخل ہونے کے لیے آگ کے ڈھیر پر سے گزرنا پڑتا ہے۔

کینیا کے مسائی قبیلے میں رخصتی کے وقت دلہن کا باپ اپنی بیٹی کے سر اور جسم پر دودھ کے قطرے چھڑکتے وقت دعائیہ کلمات ادا کرتا ہے کہ اللہ اسے بہت سے بچوں کی ماں بنائے۔ سسرال پہنچتے ہی دلہن کا طمانچوں تھپڑوں اور گھونسوں سے استقبال کیا جاتا ہے۔ کوئی خاتون آگے بڑھ کر دلہن کے سر پر مٹھی بھر گوبر ڈال کر اسے عروسی سلامی پیش کرتی ہے۔ پھر دلہن کی ساس اسے حجلہ عروسی (جو ایک خوبصورت جھونپڑی کی صورت میں ہوتا ہے) میں لے جانے کے لیے آتی ہے۔ پھر عزیز و اقارب بیش قیمت تحفے دے کر اور لاڈ پیار سے اسے حجلہ عروسی میں پہنچا دیتے ہیں۔

مراکش کے ایک قبیلے میں شادی کے موقع پر مذہبی رہنما ایک تیز دھار چاقو دلہن کے گلے پر رکھ دیتا ہے جب دلہن کے گلے سے خون کا ایک قطرہ ٹپک پڑے تو نکاح ہو جاتا ہے۔ اس رسم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دلہن پر واضح ہو جائے کہ وہ اب شوہر کے رحم و کرم پر ہو گی۔

تبت کے سوک قبائل میں شادی کی رسم کی ادائیگی کے لیے دولہا اور دلہن کو ایک ایک پورا کیک کھانا پڑتا ہے اور یہ ضروری ہوتا ہے کہ دونوں میں سے کوئی بھی کیک کھانے میں ناکام رہے تو وہ شادی اسی دن ختم ہو جاتی ہے۔

بھارت کے ایک قبیلے نجو میں شادی کی رسومات میں دلہن کی ماں شریک نہیں ہوتی۔

سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کے باوجود دنیا میں آج بھی ایسی رسوم پائی جاتی ہیں کہ جن کے متعلق سن کر ہی انسان

پریشان ہوجاتا ہے۔ چین کے دور دراز علاقوں میں پائی جانے والی ایک رسم بھی ایک ایسی ہی مثال ہے کہ جس کا جدید دنیا میں تصور کرنا خاصا مشکل ہے۔ یہ رسم دولہے کو ادا کرنا پڑتی ہے جو اپنی دلہن کو اٹھا کر دہکتے ہوئے کوئلوں پر چلتا ہوا گزرتا ہے۔ قدیم چینی روایات کے مطابق نئے جوڑے کے لیے اپنے نئے گھر میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسم ادا کرنا ضروری ہے۔ مقامی افراد کا کہنا ہے کہ اس کے دوررس فوائد ہیں جن میں سے سرفہرست یہ ہے کہ دلہن جب حاملہ ہوگی اور بچے کو جنم دے گی تو اس سارے حمل کے دوران اسے کسی تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، اگر اس کا خاوند پہلے ہی کوئلوں پر چلنے کی تکلیف اٹھا چکا ہوگا۔ قدرتی آفات سے دوچار ہونے کی صورت میں بھی چینی لوگ اس رسم کو ادا کرتے ہیں اور جنوب مشرقی ایشیاء کے کئی اور ممالک میں بھی یہ رسم پائی جاتی ہے۔

ہر علاقے کی رسومات الگ ہوتی ہیں۔ یہ رسومات اس علاقے کی شناخت بن جاتی ہیں۔ کچھ علاقوں میں یہ رسومات توہمات کی صورت بھی اختیار کرلیتی ہیں۔ جیسے زمانہ قدیم میں دریائے نیل کے کنارے آباد لوگ اس بات کو ضروری سمجھتے تھے کہ ہر سال نیل کے کنارے ایک نوجوان دوشیزہ کا خون بہانا بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر دریا بہنا بند ہوجائے گا۔ یہ سلسلہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مصر پر قبضہ کرنے سے پہلے تک چلتا رہا۔

ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ سمندر کے پانی کو چھیڑنے سے سمندر کا دیوتا ناراض ہوجائے گا اور طوفان کی صورت انہیں ہلاک کرڈالے گا۔ یہ عقیدہ اب بڑی حد تک دم توڑ گیا ہے کیونکہ نیوی اور ماہی گیروں کی صورت میں ہندو سمندر سے دوستی کرچکے ہیں۔

چینی اپنے نئے سال کے آغاز پر پٹاخے بجاتے ہیں تاکہ بدروحیں بھاگ جائیں اور پچھلے سال کی بدقسمتی کو ختم کرنے کے لیے نئے سال سے ایک دن پہلے ہی گھر کو صاف کرلیتے ہیں۔ نئے سال کے پہلے دن گھر کو صاف نہیں کرتے تاکہ خوش قسمتی غلطی سے جھاڑو کے ساتھ گھر سے باہر نہ نکل جائے۔ دنیا بھر کے ممالک میں سب سے زیادہ دلچسپ رسومات شادی بیاہ کے موقع پر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ کانگو کے پگمی قبائل میں یہ رواج ہے کہ دلہن اپنے دلہا کے ماتھے پر نوکیلے آلے سے اپنا نام کندہ کرواتی ہے تاکہ کوئی اور عورت اس کے شوہر پر حق نہ جتا سکے۔ اسی طرح کی ایک رسم سوڈان میں بھی رائج ہے جس میں دلہن اپنے شوہر کے منہ کو داغ دیتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے شوہر سے بے پناہ محبت ہے اور داغنے کا نشان اس کی محبت کا ثبوت ہے۔

1991ء میں کرغیزستان میں ایک رسم پر پابندی لگائی گئی جس میں ہونے والی دلہن کو شادی کے دن اغوا کرلیا جاتا تھا اور اسے خوب رلایا جاتا تھا۔ دلہن کے آنسو جتنے زیادہ بہتے اسے اتنا زیادہ اچھی زندگی کی ضمانت سمجھا جاتا۔ دلہن کا زار و قطار رونا شادی شدہ زندگی کے لیے انتہائی نیک شگون سمجھا جاتا تھا۔ یہ رسم اب بھی چوری چھپے ادا کی جاتی ہے۔ اصل میں اس رسم میں دلہن کو رلانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کا رونا آج ہی ختم ہو جائے گا۔ تاہم دولہا کو ساری زندگی رو رو کر ہی گزارنی ہے۔ ہمارے ہاں اس رسم کی اتنی ضرورت نہیں ہے کیونکہ رخصتی کے وقت دلہنیں خود ہی دل کھول کر رو لیتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے ان کا اغوا ضروری نہیں ہوتا۔

میانمار میں لوگ اپنے بچوں کے پیدا ہونے کا دن یاد رکھتے ہیں جب ان کی شادی کا وقت آتا ہے تو اس بات کا خاص دھیان رکھا جاتا ہے کہ ایک ہی دن پیدا ہونے والے لوگوں کی آپس میں شادی نہ ہونے پائے۔ اگر یہ شادی ہو جائے تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلتا۔ مثلاً بدھ کو پیدا ہونے والے لڑکے کی شادی اسی دن پیدا ہونے والی لڑکی سے نہیں کی جاتی۔

سری لنکا میں جوتشی سال میں ایک دن کو شادی کے لیے بہت موزوں قرار دیتے ہیں لوگ اس خصوصی دن کا کئی کئی مہینے انتظار کرتے ہیں اور کئی شادیاں ایک ہی دن سرانجام پا جاتی ہیں۔

چین میں قبروں سے خواتین اور لڑکیوں کی لاشیں نکال کر ان کی مردہ آدمی سے شادی کرنے کے بعد دوبارہ دفن کرنے کے واقعات میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ چین میں توہم پرستی کے مارے لوگوں کا خیال ہے کہ اگر کوئی کنوارہ شخص اس دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے تو اگلی دنیا میں اسے مسائل کا سامنا ہوتا ہے، اسی لیے مرنے والے تنہا افراد کی کسی خاتون یا لڑکی کی لاش سے شادی کرادی جاتی ہے اور اس کے بعد اسے کسی مرد کے ساتھ یا مرد کے برابر قبر میں دفنا دیا جاتا ہے۔ قدیم چینی تہذیب میں یہ بات بھی عام ہے کہ اگر کوئی شخص بغیر شادی کے مرجائے تو اس کی روح بھٹک کر اس کے عزیزوں کو اذیت پہنچاتی رہتی ہے، اسی لیے کئی خاندان اپنے مرنے والوں کے لیے "بھوت دلہن" تلاش کرتے ہیں اور اسے اپنے عزیز کے ساتھ دفن کرتے ہیں، اس طرح ان کے عقائد کے

مطابق تمام بلائیں ٹل جاتی ہیں اور خاندان محفوظ رہتا ہے۔

چین کے مختلف علاقوں میں کنوارے شخص کی موت کے بعد کسی خاتون کا چاندی کا مجسمہ، پلاسٹک کا پتلا اور دیگر اشیاء دفنائی جاتی رہی ہیں تاہم ان میں سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ کسی تازہ قبر کو کھود کر خاتون کی لاش نکالی جاتی ہے پھر اسے میک اپ کر کے نئے کپڑے پہنا کر مرنے والے کی قبر کے ساتھ دفنا دیا جاتا ہے جبکہ یہ لاشیں قبر سے نکالنے کے لیے خطرات مول لینے کے ساتھ ساتھ خطیر رقم بھی خرچ کی جاتی ہے۔ چین میں اس کام کے لیے مردہ خواتین کو چرانے والے کئی خفیہ گروہ کام کر رہے ہیں جو لاشوں کی بڑھتی ہوئی طلب کو پورا نہیں کر سکتے۔ ایک لاش کی قیمت اس وقت پاکستانی 10 سے 15 لاکھ ہے جبکہ 2011ء میں 4 ایسے افراد کو پکڑا گیا تھا جنہوں نے قبر سے 10 خواتین کی لاشیں نکال کر فروخت کی تھیں اور اس کے بدلے میں تقریباً 40 لاکھ روپے حاصل کیے تھے۔ چین میں خواتین کی لاشوں کو بے حرمتی سے بچانے کے لیے کئی خاندان انہیں قبرستان کی بجائے دور دراز کے پہاڑی علاقوں پر دفنا رہے ہیں۔ کچھ لوگوں نے قبروں کو پختہ کر کے خاردار تار لگا دیے اور کچھ نے سی سی ٹی وی کیمرے بھی نصب کرائے ہیں۔ واضح رہے کہ چین میں مردہ خواتین اور مردوں کی شادی پر 1949ء میں پابندی لگا دی گئی تھی تاہم گزشتہ کئی سال سے کچھ علاقوں میں یہ واقعات بڑھ گئے ہیں۔ ہینان اور شانکسی صوبوں میں گزشتہ 3 برسوں میں قبر کھود کر خواتین کی لاشیں نکالنے کے 30 کے قریب واقعات ہو چکے ہیں۔

شادیوں کا ذکر ہوتا ہی رہے گا۔ کچھ بات دنیا بھر میں پہنے جانے والے روایتی عروسی ملبوسات کے بارے میں ہو جائے۔ دنیا کے ہر علاقے کی دلہن جانتی ہے کہ شادی کے دن سب سے زیادہ اہم عروسی لباس ہی ہوتا ہے۔ بیشتر ممالک میں دلہن کا لباس وہاں کی ثقافت کا اظہار ہوتا ہے، اس کا رنگ، ساخت اور دیگر تفصیلات اس جگہ، مذہب وغیرہ کی روایات کی عکاسی کرتے ہیں۔ جیسے ترکی میں دلہن ایک سرخ 'دوشیزگی' کی بیلٹ خوش قسمتی کی علامت کے طور پر پہنتی ہے۔ اریٹیریا میں دلہن گہرے رنگ کے ریشمی تاج اور جامنی و گولڈ عبادہ زیب تن کرتی ہے۔ دنیا بھر میں جوڑے کس طرح کے عروسی ملبوسات پہنتے ہیں، یہ جاننا آپ کے لیے دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا، جس سے ان ممالک کی ثقافتی روایات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ جاپانی شادیوں میں دلہن اکثر دو یا اس سے زائد ملبوسات پوری تقریب میں استعمال کرتی ہے جو کہ سفید اور سرخ رنگ کے ہوتے ہیں۔ گھانا کی روایتی شادی بہت رنگا رنگ ہوتی ہے، وہاں اکثر ملبوسات کے ڈیزائن مختلف رنگوں اور پیٹرن کے حامل ہو سکتے ہیں، ہر خاندان کے لباس کا اپنا پیٹرن ہوتا ہے۔ رومانیہ میں اکثر نوجوان شادی کے موقع پر جدت کو ترجیح دیتے ہیں، تاہم روایتی تقریبات اب بھی اس کے دیہی علاقوں میں ہوتی ہیں، اگرچہ یہ ملک زیادہ بڑا نہیں مگر اس کے ہر خطے کی شادی کے حوالے سے اپنی روایات ہیں۔ اگر آپ کو کسی سری لنکن روایتی شادی میں شرکت کا موقع ملے تو آپ کی نگاہیں دولہا سے نہیں ہٹ سکیں گی۔ بھارت میں سرخ یا گلابی عروسی ملبوسات بھارتی ثقافت میں دلہن کا روایتی انتخاب ہوتا ہے۔ اسکاٹ لینڈ میں دولہا عام طور پر اسکرٹ پہنتا ہے، جبکہ شادی کی تقریب کے بعد دولہا ایک شال دلہن کے کندھے پر ڈالتا ہے جو اس کے خاندان کے رنگوں پر مشتمل ہوتی ہے اور اس طرح یہ دلہن کی نئے خاندان میں رکنیت کی علامت بن جاتا ہے۔

پاکستان کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہمیں اپنے ملک کی روایات کے بارے میں کافی کچھ علم ہے۔

ایتھوپیا واحد افریقی ملک ہے جہاں عیسائیت سرکاری مذہب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شادیاں یونانی یا روسی انداز کی ہوتی ہیں۔ انڈونیشیا میں ایک سے دوسرے جزیرے میں شادی کی روایات مختلف ہوتی ہیں، ویسے بھی تین سو نسلی گروپس اور چھ بڑے مذاہب کو ماننے والے افراد پر مشتمل اس ملک کی ثقافت متعدد رنگوں کی حامل ہے۔ یورپ اور ایشیا کی سرحد پر موجود علاقے قفقاز میں روایتی شادی کے موقع پر دولہا وہاں کا روایتی کوٹ پہنتا ہے جبکہ بیلٹ سے تلوار بندھی ہوتی ہے۔ دلہن اکثر سفید عروسی لباس میں ہوتی ہے جس پر خوبصورت سیاہ پٹیاں لگی ہوتی ہیں۔

چین کا روایتی عروسی لباس سرخ ہے، چین میں ویسے سفید رنگ کو ماتم کا رنگ مانا جاتا ہے۔ شادی کے بعد دولہا دلہن کے سر سے سرخ دوپٹے کو ہٹاتا ہے۔ ملائیشیا میں اکثر دلہن جامنی یا کریم رنگ کے عروسی لباس کا انتخاب کرتی ہے۔ جنوبی کوریا میں روایتی انداز سے شادی کرنے کا رواج حالیہ عرصے میں زور پکڑ چکا ہے، یہاں کی تاریخی روایات کے مطابق دولہا اپنی بیوی کو کمر پر اٹھا کر میز کے گرد گھومتا ہے، جو اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ دلہن اپنے شوہر پر انحصار کر سکتی ہے۔ ناروے میں دلہن ایک روایتی نارویجن لباس پہنتی ہے۔

نائجیریا میں دلہنیں روایتی عروسی ملبوسات کا انتخاب کرتی ہیں جبکہ سر پر ایک مخصوص پگڑی ٹائپ کپڑا بندھا ہوتا ہے۔

طلاق کی دلچسپ رسومات اور عجیب و غریب قوانین کے بارے میں بھی دلچسپ باتیں سامنے آئی ہیں۔ آپ نے شادی کے موقع پر ادا کی جانے والی رسومات کے بارے میں تو سنا ہوگا لیکن دنیا میں چند ایک مقامات ایسے بھی ہیں جہاں شادی کی ناکامی پر بھی مذہبی رسومات ادا کرنے کی روایت موجود ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ شادی کی ناکامی کی وجوہات چاہے کچھ بھی ہوں، شادی ٹوٹنے کا تجربہ لوگوں کے لیے خوشی کا باعث نہیں ہوتا ہے جس میں دونوں فریق کو طلاق کا معاہدہ کرنا ہوتا ہے اور اس حوالے سے اپنے ملک کے قوانین کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ دنیا میں کئی ممالک میں پائی جانے والی طلاق کے عجیب و غریب رسومات اور طلاق کے حیرت انگیز قوانین موجود ہیں۔

جاپان میں ایک ایسا مندر واقع ہے جو اپنے زائرین کو ناکام شادی ٹوائلٹ میں بہانے کی پیشکش کرتا ہے۔ وسطی جاپان کے صوبے گونما میں منٹوکوجی ٹیمپل ازدواجی تعلقات سے چھٹکارا حاصل کرنے والے جوڑوں کو ایک کاغذ پر تمام گلے شکوے لکھنے اور طلاق کی وجوہات بیان کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے، جسے بعد میں فلیش میں بہادیا جاتا ہے۔

یہ 2000ء کی بات ہے جب جرمنی میں ایک پادری مارگوٹ کاسمین نے ملک کے تمام گرجا گھروں میں طلاق کے موقع پر ماتم کی رسم ادا کرنے کی تجویز پیش کی جس کے بعد ان کی تجویز پر گرجا گھروں میں طلاق کے موقع پر بڑے پیمانے پر ماتم کی رسم ادا کی گئی۔ ان تقریبات میں دونوں فریقین دوستوں اور رشتہ داروں کو اپنی شادی کی ناکامی کی وجوہات سے آگاہ کرتے ہیں۔

چین سے تعلق رکھنے والی ایک اقلیتی نسل جینگ کے ہاں طلاق کا ایک مخصوص طریقہ ہے، جس کے مطابق طلاق کے سرٹیفکیٹ پر دستخط گھر کے اندر نہیں کیے جاسکتے اور دستخط کرنے کے فوراً بعد قلم اور دوات کو بد شگن سمجھ کر دور پھینک دیا جاتا ہے۔

2011ء میں چین میں ایک سرکاری ڈاک خانے کی طرف سے ایک ایسی مہم چلائی گئی جس میں شادی شدہ جوڑوں کو ایک محبت نامہ لکھنے کی ترغیب دی گئی، جسے شادی کے سات برس بعد شریک حیات کو ارسال کیا جائے گا، اس اقدام کا مقصد دراصل ملک میں طلاق کی شرح کو کم کرنا تھا تاکہ سات برس بعد محبت نامہ پانے والے میاں بیوی ایک بار پھر سے اس محبت کو یاد کرسکیں جس نے انہیں ملایا تھا۔ دنیا کے کئی ممالک میں طلاق کے ایسے عجیب و غریب قوانین موجود ہیں جہاں طلاق حاصل کرنا ایک ناقابل یقین تجربہ ثابت ہوتا ہے۔

دنیا میں فلپائن واحد ملک ہے جس کا قانون آج بھی اپنے شہریوں کو طلاق کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ تاہم پتا چلتا ہے کہ 1985ء سے 2000ء کے درمیان جاپان میں طلاق کی شرح سب سے زیادہ تھی۔ اس کی وجوہات سے پتا چلتا ہے کہ 2006ء میں جاپانی جوڑوں میں شادی کے بیس برس بعد طلاق لینے کا رواج زیادہ عام ہوگیا تھا۔ ماہرین کا کہنا تھا کہ یہ ریٹائرڈ ہسبنڈ سینڈروم کی وجہ سے تھا یعنی ایسے شوہروں کی وجہ سے جو روزگار کے لیے ملک سے باہر رہتے ہیں اور اپنی بیوی کو زیادہ نہیں جانتے ہیں لیکن، ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں اپنی

بیوی میں ہر طرح کے عیب نظر آتے ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکا کی سات ریاستوں جن میں ریاست نیو میکسیکو اور مسیسپی شامل ہیں، شادی کی ناکامی کی وجہ ایک تیسرے فریق کو ٹھہرایا جا سکتا ہے اور شادی خراب کرنے والے تیسرے شخص پر شادی کے نقصان کے لیے بھاری رقم کا ہرجانہ دائر کیا جاتا ہے، تاہم اس الزام کو ثابت کرنے کے لیے ثبوت کی ضرورت پڑتی ہے۔ امریکی ریاست کنساس میں شادی کو طویل مدت تک قائم رکھنے کے لیے طلاق کا ایک ایسا قانون موجود ہے جس کے تحت دونوں فریق کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ ساس کے ساتھ بدسلوکی یا برے تعلقات رکھنے پر ایک دوسرے کو طلاق دے سکیں۔

امریکی ریاست ڈیلاویئر میں طلاق کے لیے ایک ایسا قانون موجود ہے جس کے تحت اگر ایک شخص ہنسی مذاق یا شرط نبھانے کے لیے شادی کر لیتا ہے تو اسے بعد میں طلاق کا مقدمہ دائر کرنے کی اجازت ہے جبکہ اس قانون سے ہنسی مذاق میں شادی کرنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

آسٹریلیا میں قبائلی خواتین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ یا تو اپنے شوہر کو طلاق دینے کے لیے آمادہ کریں یا پھر شادی سے چھٹکارا پانے کے لیے ایک دوسری شادی کر لیں اس طرح ان کی پہلی شادی خود بخود منسوخ ہو جاتی ہے۔ امریکی ریاست کینٹکی میں اس بات کی اجازت ہے کہ آپ ایک ہی شخص سے طلاق کے بعد تین بار شادی کر سکتے ہیں لیکن چوتھی بار اسی شخص سے شادی کرنے کی اجازت ریاست کا قانون نہیں دیتا ہے۔

امریکی ریاست ٹینیسی میں اگر شریک حیات جان سے مارنے کے لیے کوئی حربہ مثلاً زہر پلانے کی کوشش کرتا ہے تو اس بنیاد پر آپ کی طلاق منظور ہو سکتی ہے۔

نیویارک میں اگر آپ یہ ثابت کر سکیں کہ آپ کے شریک حیات کی دماغی حالت ٹھیک نہیں ہے تو آپ کو طلاق مل سکتی ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ شادی کے دوران شریک حیات کی دماغی حالت کم از کم پانچ سالوں سے خراب رہی ہو۔ برطانیہ میں طلاق حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ شریک حیات کی حد درجہ برائیوں کا ذکر کیا جائے۔ صرف ذاتی ناپسندیدگی کی بنیاد پر طلاق منظور نہیں کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ میں جوڑے طلاق کے لیے شریک حیات میں عجیب و غریب عیب تلاش کرتے ہیں۔ جیسا کہ ایک شوہر نے طلاق کے مقدمے میں کہا کہ وہ اپنی بیوی کو اس لیے طلاق دینا چاہتا ہے کیونکہ وہ ہر روز مچھلی پکاتی ہے۔

شادی، ملبوسات، طلاق کے بارے میں کافی دلچسپ باتیں جاننے کے بعد شادی کی ایک رسم کا تذکرہ برمحل ہے جو اب معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ یہ رسم گھڑولی کہلاتی ہے۔ پنجاب کے دیگر اضلاع کی طرح جھنگ میں بھی شادی کی کچھ انوکھی رسومات و تقریبات اپنی سادگی اور خوبصورتی کی بنا پر ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ ان رسومات میں گھڑولی کی قدیم رسم کو ایک عرصہ تک وہ مقام حاصل رہا ہے جو شاید دوسری کوئی بھی رسم حاصل نہیں کر سکی۔ تاہم وقت کی بے رحم لہروں میں بہتی یہ قدیم رسم اب ماضی کا حصہ بنتی جا رہی ہے۔ گھڑولی کی رسم اس وقت ادا کی جاتی تھی جب نکاح کے بعد برات پنڈال سے دلہن کے گھر لے جائی جاتی تھی۔ گھڑولی دراصل دو گھڑوں پر مشتمل ہوتی ہے جن پر خوبصورت طریقے سے نقش نگاری کی جاتی ہے، ایک گھڑا سائز میں دوسرے گھڑے سے چھوٹا ہوتا ہے۔ چھوٹے گھڑے کو بڑے گھڑے کے اوپر رکھا جاتا ہے اور بعد ازاں ان کو ایک رنگین کپڑے جس پر کڑھائی کا خوبصورت کام ہوتا ہے سے ڈھانپ دیا جاتا ہے۔ اس کو دولہے کی بہنیں یا دیگر عورتیں اٹھاتی ہیں اور ڈھول کی تھاپ پر علاقے کے کسی معزز کے گھر جا کر اس میں پانی بھرا جاتا ہے۔ بزرگ بتاتے ہیں کہ کچھ عرصہ پہلے تک اس پانی سے وضو کروا کر ہی دلہن کو شادی کا جوڑا پہنایا جاتا تھا لیکن اب صرف انگلی ڈبونے پر ہی اکتفا کر لیا جاتا ہے۔ گھڑولی کی معدوم ہوتی رسم میں گھر والوں کی حیثیت کے مطابق ان سے پیسے مانگتے ہیں جو لوگ امیر ہوتے ہیں وہ پیسوں کے ساتھ کوئی پالتو جانور مثلاً بچھڑا یا بکرا وغیرہ بھی دے دیتے ہیں جبکہ متوسط لوگ پانچ سو سے تین ہزار روپے تک دیتے ہیں۔ جدید دور میں لوگ اس رسم کو فرسودہ سمجھ کر نظر انداز کرنا شروع ہو گئے ہیں جس سے گھڑولی بنانے کا کاروبار بری طرح متاثر ہوا ہے۔ اب پہلے جیسا دور اور وہ لوگ نہیں رہے۔ اب لوگ شادی ہالز میں جا کر رسومات کرتے جہاں اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ نکاح اور کھانے کے سوا کوئی اور کام کیا جا سکے۔ ایک وقت تھا جب نہ صرف جھنگ بلکہ پورے پنجاب میں شادی کو اس رسم کے بغیر ادھورا تصور کیا جاتا تھا۔ آج کی شادیاں ان رسموں کے بغیر نامکمل لگتی ہیں۔ زمانے کی تیزی اور جدت کے باعث گھڑولی سمیت پنجاب کے کئی قیمتی رسم و رواج ماضی کا حصہ بن چکے ہیں۔ معاشی بدحالی، مغربی روایات اور جدید فیشن کی بھرمار نے لوگوں کو اپنی ثقافت سے دور کر دیا ہے۔

کاشف زبیر

روان صدی کا مورخ جب تاریخ لکھے گا تو وہ مسلمانوں کو مظلوم ترین قوم کا خطاب دے گا۔ جس طرح مسلمانوں کا خون بہایا جا رہا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ہٹلر نے تھوڑے سے یہودیوں کا قتل عام کرایا تو لوگ اس ہولو کاسٹ پر آج بھی رو رہے ہیں۔ جب کہ اس سے کہیں زیادہ مسلمانوں کا قتل عام قیام پاکستان کے وقت ہوا، اب بھی فلسطین و لبنان میں جس طرح مسلمانوں کا خون بہایا جا رہا ہے یہ تاریخ کا حصہ بن رہا ہے لیکن ان سب سے زیادہ بری افتاد یورپ کے اکلوتے مسلمان ملک کے مسلمانوں پر پڑی ہے۔ جہاں ایک دن میں کئی کئی سو مسلمانوں کو ایذائیں دے دے کر ہلاک کیا گیا۔کس بری طرح وہاں مسلمانوں کی نسل کشی کی گئی اس کا ہلکا سا عکس۔

اس ملک میں مسلمانوں کو چن چن کر شہید کیا گیا جس کی نظیر نہیں ملتی

اس بار موسم سرما شدید تھا۔ بوسنیا کے اس دور دراز چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں لوگ ابھی تک اپنے گھروں میں محصور تھے۔ اپریل کا وسط آنے کے باوجود برف پگھلنے کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ بہار کا موسم دور تھا۔ باغوں میں انگور، سیب بھی نہیں لگے تھے۔ سفینہ کو لگ رہا تھا کہ وہ وقت بھی نہیں آئے گا۔ سفینہ اپنے تین چھوٹے بچوں کے ساتھ اپنے چھوٹے سے گھر میں موجود تھی۔ سردی کی وجہ سے ان کا بیشتر وقت باورچی خانے میں گزرتا تھا جہاں آگ جلتی اور کسی قدر حرارت رہتی تھی۔

سفینہ کا شوہر حاجو بیگ ملک کی فوج میں شامل ہو کر سربوں سے لڑنے گیا ہوا تھا اور سفینہ نے آخری بار ڈیڑھ سال پہلے اسے دیکھا تھا جب وہ کسی محاذ پر جانے سے پہلے

Health

دنیا کا سب سے مہنگا زہر جس کی قیمت اربوں روپے میں ہے | World's Most Expensive Poison

computerxtech 0 Oct 03, 2017

اس ایک لیٹر زہر کی قیمت تقریباً ایک ارب 10 کروڑ پاکستانی روپوں کے مساوی ہے (World's Most Expensive Poison) دنیا کا سب سے مہنگا زہر بچھوؤں کی ایک قسم "ڈ... Readmore

Health

بوڑھوں کو جوان بنانے والی سائنس | Old to Young Conversion Science

computerxtech 0 Sep 11, 2017

انسان کے جسم میں خلیوں کی دو سو سے زائد اقسام پائی جاتی ہیں۔ فوٹو: فائل ... 29 Readmore

Health

صحت کے معاملے میں خواتین کی 10 سنگین غلطیاں | Ten Health Mistakes by the Women

computerxtech 0 Sep 11, 2017

خوبصورت نظر آنے کے لیے خواتین دنیا بھر کے جتن کرتی ہیں لیکن اکثر کو شکایت رہتی ہے کہ انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ فوٹو: فائل کراچی: اچھی صحت اور ح... Readmore

Health

ایسپرین دانتوں کو خرابی سے روک کر انہیں ازخود مرمت کے قابل بناتی ہے | Dental Treatment with Aspirin

computerxtech 0 Sep 11, 2017

کونگز یونیورسٹی کے سائنسدانوں نے انکشاف کیا ہے کہ ایسپرین دانتوں کی حفاظت کرتی ہے۔ فوٹو: فائل لندن: سائنسدانوں نے انکشاف کیا ہے کہ گھروں میں ... Readmore

Health News

فکر اور پریشانی سے نجات پانے کے تین آسان طریقے | Three easy ways to eliminate Tension

computerxtech 0 Sep 03, 2017

ماہرین نفسیات نے پریشان خیالی سے چھٹکارا پانے کے تین اہم طریقے بیان کیے ہیں۔ فوٹو: فائل لندن: ماہر نفسیات کے مطابق پریشان اور فکرمندی کی م... Readmore

Health News

ادرک جوڑوں کے درد کے لیے اکسیر دوا | Benefits of Ginger

computerxtech 0 Sep 03, 2017

ادرک میں کئی اجزا جلن، درد اور سوزش کو کم کرتے ہیں۔ فوٹو: فائل کراچی: ادرک کے جسمانی و طبی فوائد سے ہم سب بخوبی واقف ہیں اور اب ماہرین نے اس کے اس... Readmore

ذرا دیر کے لیے گھر آیا تھا۔ اس نے سفینہ سے کہا۔ ''ممکن ہے یہ ہماری آخری ملاقات ہو مجھ سے وعدہ کرو کہ اگر میں مر گیا تو تم بچوں کا خیال رکھو گی۔''

سفینہ یہ سن کر رو دی تھی لیکن جنگ نے اس قوم کے اعصاب مضبوط کر دیے تھے اور انہوں نے تسلیم کر لیا تھا کہ جب اجتماعی طور پر کسی قوم کو خطرہ لاحق ہو تو فردِ واحد کی زندگی کی اہمیت نہیں رہتی۔ اس احساس کے تحت سفینہ نے جلد خود پر قابو پا لیا۔ اور اس نے شوہر سے وعدہ کر لیا کہ وہ بچوں کا پورا خیال رکھے گی لیکن وہ اس کا انتظار بھی کرے گی۔ بے شک اسے ساری عمر انتظار کرنا پڑے تب بھی وہ کرے گی۔

''جب ہم یہ جنگ جیت جائیں اور میں بھی زندہ نہ رہوں تو تم کسی اچھے آدمی کو اپنا شریکِ سفر بنا لینا۔'' حاجو بیگ نے اس سے کہا لیکن سفینہ دل میں سوچ چکی تھی۔ اس کے لیے دنیا کا واحد مرد حاجو ہی تھا۔ پھر وہ چلا گیا اور اس کے بعد اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ سربوں نے پورے بوسنیا کو یوں اپنی گرفت میں لے رکھا تھا کہ ایک حصہ دوسرے حصے سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ آمد و رفت اور اطلاعات کے راستے بند تھے۔ ملک کا دارالحکومت سراجیوو دو برس سے سربوں کے محاصرے میں تھا۔ سفینہ خود کو تسلی دیتی تھی کہ حاجو خیریت سے ہے کسی وجہ سے اپنی خیریت کی اطلاع دینے سے قاصر ہے۔

اس چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں حاجو بیگ کی کچھ زمین تھی، جس پر گرمیوں میں وہ گندم کاشت کرتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد یہ کام سفینہ نے سنبھال لیا تھا۔ اس کا ایک چھوٹا سا باڑہ تھا جس میں ایک گائے اور دودھ دینے والی چند بکریاں تھیں۔ ان کے علاوہ کچھ مرغیاں اور ٹرکی بھی پال رکھی تھیں جن سے انڈے اور گوشت مل جاتے تھے۔ زمین سے اتنی گندم مل جاتی تھی کہ اپنے لیے نکال کر باقی وہ فروخت کر دیتی تھی تو اس سے کچھ رقم ہاتھ آ جاتی تھی۔ خوراک کے لحاظ سے انہیں کوئی پریشانی نہیں تھی بلکہ اگر کبھی مجاہدین گاؤں میں آ جاتے تو سب کے ساتھ سفینہ بھی ان کی خوراک کی ضرورت پوری کرنے میں حصہ لیتی تھی۔

سفینہ کے تین چھوٹے بچے تھے، سب سے بڑی علینہ سات سال کی تھی پھر اس سے ایک سال چھوٹا غازی اور اس سے دو سال چھوٹا علی تھا۔ تینوں بچے ذہین اور ہوشیار تھے۔ انہوں نے محسوس کیا تھا کہ ان کا ملک اور ان کا گھر مشکل حالات سے دوچار ہے اور ان کی ماں کی مدد کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس لیے وہ عام بچوں کی طرح سفینہ کو تنگ کرنے کے بجائے گھر اور زمین کے کاموں میں اس کی مدد کرتے تھے۔ خاص طور سے علینہ تو باورچی خانے کا آدھا کام سنبھال چکی تھی۔ گھر کی صفائی بھی وہی کرتی تھی۔ جب کہ غازی اور علی باہر کے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹاتے تھے۔

اس علاقے میں عام طور سے اپریل کے آغاز تک برف پگھل جاتی تھی لیکن اس سال اپریل کے پہلے ہفتے میں غیر متوقع طور پر شدید برف باری ہوئی تھی۔ لوگ جو باہر نکل کر اپنے کھیتوں اور باغات کی دیکھ بھال اور سرما میں برفباری اور طوفانوں سے ہونے والی مکانوں کی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کی تیاری کر رہے تھے، پھر سے گھروں میں بند ہو جانے پر مجبور ہو گئے۔ جب سرما کا آغاز ہوتا تو لوگ خوش ہو جاتے تھے۔ کیونکہ گرمیوں میں شدید محنت کے بعد اب انہیں آرام کا موقع مل جاتا تھا۔

گھر والے مل کر کوئی کھیل کھیلتے یا قصے کہانیاں سناتے لیکن رفتہ رفتہ یہ آرام انہیں بور کرنے لگتا تھا۔ وسط سرما تک وہ باہر جانے کے لیے بے تاب ہو جاتے اور جب بہار کا وقت قریب آتا تو ان کی بے تابی بھی عروج پر پہنچ جاتی تھی۔ جیسے ہی زمین برف کی قید سے آزاد ہوتی اور درختوں پر نئے پتے آنے لگتے وہ باہر نکل آتے اور اس وقت ان کی خوشی کا عالم دیکھنے والا ہوتا تھا اور اگر سرما طویل ہو جاتا اور وہ کچھ دنوں یا کچھ ہفتوں کے لیے مزید گھروں میں قید ہو جاتے تب ان کی مایوسی دیکھنے والی ہوتی تھی۔

سفینہ اور اس کے بچوں کا بھی یہی عالم تھا۔ گرما کے آخر میں پکنے والی گندم اور دوسری اشیا کو ذخیرہ کر کے اور فالتو اجناس فروخت کر کے وہ سرما کے لیے لکڑی جمع کر لیتے تھے۔ جانوروں اور پرندوں کے لیے چارا اور دانہ جمع کیا جاتا تھا۔ گھر اور باڑے کی مرمت کی جاتی تھی اور سارے کام نمٹا لیے جاتے تھے۔ نومبر کے پہلے ہفتے سے برف باری کا آغاز ہو جاتا تھا اور یہ سلسلہ مارچ کے آخر تک جاری رہتا۔ اس کے بعد برف پگھلنے لگتی تھی۔

برف باری کے آغاز کے بعد سفینہ خود بھی باہر جانے سے گریز کرتی تھی اور بچوں کو بھی نہیں جانے دیتی تھی اگر کوئی بیمار ہو جاتا تو طبی امداد کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ ان کے گاؤں میں نہ تو کوئی ڈاکٹر تھا اور نہ ہی دواؤں کا انتظام تھا۔ اس لیے سفینہ خاص طور سے بچوں کے معاملے میں بہت احتیاط کرتی تھی۔ اس کے بچوں کو سرما پسند نہیں تھا کیونکہ وہ

کھلے اور آزاد رہنا پسند کرتے تھے۔ جب کہ سردی میں انہیں پانچ مہینے کے لیے اس چھوٹے سے گھر میں محدود ہو جانا پڑتا تھا۔

بچوں کا دل بہلانے کے لیے سفینہ انہیں طرح طرح کے کھانے بنا کر کھلاتی تھی۔ ان کے ساتھ کھیلتی اور انہیں کہانیاں سناتی تھی۔ سردیوں میں ناشتے کے بعد دن چھوٹا ہونے کی وجہ سے یہ لوگ دوپہر کا کھانا نہیں کھاتے رات کا کھانا سورج غروب ہوتے ہی کھا لیتے تھے۔ اس کے بعد وہ باورچی خانے سے مکان کے نیچے بنے تہ خانے میں چلے جاتے۔ ساری سردیاں وہ تہ خانے میں سوتے تھے کیونکہ وہ رات کے وقت گرم ہوتا تھا۔

تہ خانے میں ایک بڑا سا بستر تھا جس پر روئی اور اون سے بھرا دبیز گدا بچھا ہوا تھا اور وہ اس نرم بستر پر اپنے اپنے کمبلوں میں لپٹ کر سو جاتے تھے لیکن سونے سے پہلے وہ سفینہ سے کہانی ضرور سنتے تھے۔ سفینہ پڑھی لکھی تھی۔ اس نے کالج تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اسے کہانیاں پڑھنے کا شوق تھا وہ جب تک کالج کی تعلیم کے دوران اپنی خالہ کے پاس شہر میں رہی اس نے کالج کی لائبریری کی تقریباً تمام ہی کہانیوں کی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ پھر اس کی شادی حاجو سے ہو گئی۔ یہاں گاؤں میں کتابیں مشکل سے دستیاب ہوتی تھیں اور اسے مطالعے کا وقت بھی نہیں مل پاتا تھا۔ پھر اس کی شادی کے پانچ سال بعد بوسنیا پر سربوں کی جانب سے جنگ مسلط کر دی گئی اور نہتے بوسنیائی مسلمان جدید ترین اسلحے سے لیس سربوں کا مقابلہ کرنے لگے۔ ملک کی فوج نہ ہونے کے برابر تھی البتہ رضا کار فوجیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ان کے پاس اسلحہ بھی نہ ہونے کے برابر تھا لیکن وہ اپنے ملک اور قوم کے دفاع کے جذبے سے سرشار ہو کر سفاک سربوں کے مقابل ڈٹے ہوئے تھے۔

رفتہ رفتہ گاؤں کے سارے ہی جوان مرد بلکہ ہر وہ مرد جس کی عمر پندرہ سے پچاس برس کے درمیان تھی جنگ لڑنے چلا گیا اور اب گاؤں میں سوائے عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے کوئی نہیں تھا۔ وہی گاؤں کے سارے کام کرتے تھے۔ مویشی چراتے اور کھیتوں و باغات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ بہت سے گھر ایسے تھے جن میں کوئی ایک بھی مرد نہیں رہا تھا اور سفینہ کا گھر بھی ان ہی میں سے ایک تھا۔ اسے سارا کام خود کرنا پڑتا تھا۔ بچے اس کی مدد کرتے تھے لیکن وہ بھی کس حد تک مدد کر سکتے تھے۔ صبح سے شام تک کام کر کے سفینہ تھکن سے چور ہو جاتی تھی۔ خاص طور سے موسم گرما میں اسے بہت محنت کرنا پڑتی۔

شمالی بوسنیا میں ان کا گاؤں شروع میں جنگ سے دور تھا اور پہلے دو سال وہاں گولی کی آواز بھی نہیں گونجی تھی لیکن پھر سرب رفتہ رفتہ اس طرف بھی آنے لگے۔ دور پہاڑوں پر ان کی طرف سے کی جانے والی گولہ باری کی دھمک ساتھ دیتی راتوں میں روشنی دکھائی دینے لگی تھی۔ جنگ کو اپنے قریب پا کر گاؤں والوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ جنگ سے دور رہنے کے باوجود انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ سرب مسلمانوں کے ساتھ کیا کر رہے تھے۔ وہ جس علاقے پر قابو پاتے وہاں کے ہر مسلمان کو یا تو قتل کر دیتے یا اسے اپنے بنائے ہوئے عقوبت خانوں میں قید کر دیتے تھے۔ جوان عورتوں اور لڑکیوں کو چن چن کر لے جاتے اور بندی کیمپوں میں انہیں مسلسل زیادتی کا نشانہ بناتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ حاملہ ہو جائے اور پھر سربوں کی اولاد کو جنم دے۔ سرب مجرمانہ حملوں کو جنگی حربے کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ جوان مردوں اور لڑکوں کو وہ گرفتار کر کے جنگلوں اور پہاڑوں میں لے جا کر ان کا قتل عام کرتے اور انہیں اجتماعی قبروں میں دفن کر دیتے تھے۔

جب یہ خبریں گاؤں والوں تک پہنچتیں اور انہیں پتا چلتا کہ سرب ان کے علاقے سے اب زیادہ دور نہیں ہیں تو ان میں بے چینی کی لہر دوڑ جاتی تھی اور وہ اپنی اور اپنے پیاروں کی جانوں کے لیے فکر مند ہو جاتے تھے۔ خاص طور سے جن کے گھروں میں جوان عورتیں تھیں ان کی فکریں بھی کہیں زیادہ ہو جاتیں۔ لیکن یہاں سے کہیں نہیں جا سکتے تھے کیونکہ ان کے چاروں طرف مسلمانوں کے دشمن تھے۔ یورپ کا کوئی ملک ان کو پناہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا اور ان کو نہتا رکھنے کے لیے بوسنیا کے چاروں طرف نگرانی کا کڑا حصار بنا دیا گیا تھا۔

سرما کے دوران ہی چاروں طرف سے لڑائی اور بربادی کی خبریں آنے لگی تھیں۔ سربوں نے علاقے میں مسلمانوں کی بستیاں اجاڑنا شروع کر دی تھیں۔ وہ کسی گاؤں کا محاصرہ کر لیتے اور پہلے اسے اپنی توپوں اور مارٹر گنوں سے نشانہ بناتے تھے۔ جب پورا گاؤں ملبے کا ڈھیر بن جاتا اور انہیں مزاحمت کا موہوم سا خدشہ بھی باقی نہیں رہتا تو وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح آبادی میں گھس جاتے اور وہاں جو زندہ فرد نظر آتا اسے بے دریغ موت کے گھاٹ

اتار دیتے۔ جوان عورتوں اور لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے جاتے۔ اگر گاؤں میں کچھ مکانات بچ جاتے تو سرب آگے جانے سے پہلے انہیں آگ لگا دیتے تاکہ کبھی اپنے گھر چھوڑ کر جانے والے مسلمانوں کو واپس آنے کا موقع بھی ملے تو یہاں سوائے راکھ کے ڈھیر کے انہیں کچھ نہ ملے۔ اسی طرح وہ ایک ایک کر کے مسلمانوں کی بستیاں اجاڑ رہے تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ان بے گناہ لوگوں کی حمایت میں کوئی نہیں اٹھے گا۔

یہ بات گاؤں والے بھی جانتے تھے۔ انہیں احساس تھا کہ انہیں اپنا دفاع خود کرنا ہے لیکن وہ جدید اسلحے سے لیس ان درندہ صفت سربوں کے خلاف کیا کر سکتے تھے۔ پورے گاؤں میں گنتی کے چند ہتھیار تھے۔ یوگوسلاویہ میں مسلمانوں پر ہتھیار رکھنے کی سختی سے پابندی تھی اور کسی مسلمان کے پاس سے ہتھیار نکل آتا تو اسے فوراً جیل بھیج دیا جاتا تھا۔ ایسے میں مسلمان نہتے رہ گئے اور سرب جو فوج اور پولیس میں تھے ہر طرح سے مسلح اور طاقت ور تھے۔ جیسے ہی بوسنیا نے آزادی کا اعلان کیا سرب نہتے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ مہذب کہلانے والے یورپ میں قتل و غارت کا وہ طوفان اٹھا کہ اس نے شاید ہٹلر اور چنگیز خان کی روحوں کو بھی دنگ کر دیا ہوگا۔ اس قتل و غارت گری سے زیادہ تکلیف دہ ..... رویہ یورپی اقوام کا تھا جنہوں نے انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ مسلمانوں کا قتل عام نظر انداز کر کے بوسنیا پر اسلحہ حاصل کرنے کی پابندی لگائی۔ ایسی ہی ایک نام نہاد پابندی سربوں پر بھی لگائی گئی تھی لیکن سرب اوّل تو پہلے ہی پوری طرح مسلح تھے او پھر سابق سوویت یونین یعنی روس ان کی ہر طرح سے مدد کر رہا تھا۔

گاؤں کے رہ جانے والے مرد ایک جگہ جمع ہوئے اور انہوں نے سربوں سے دفاع کے طریقوں پر غور کرنا شروع کر دیا۔ دفاع کا واحد طریقہ جو سمجھ میں آیا وہ فرار کا تھا کیونکہ اب وہ یہاں سے نکل کر ہی... اپنی جان بچا سکتے تھے۔ لیکن یہاں سے نکل کر کہاں جاتے کیونکہ چاروں طرف سرب تھے۔ ان کے ہتھیار بہت معمولی تھے صرف کچھ دیر ہی مزاحمت کر سکتے تھے لیکن انہوں نے فیصلہ کر لیا، سربوں نے حملہ کیا تو وہ ان کے آگے ہتھیار نہیں ڈالیں گے بلکہ مرتے دم تک مقابلہ کریں گے۔ ہتھیار ڈالنے کی صورت میں بھی ان کا یہی انجام ہونا تھا۔

اپریل کا آغاز تھا لیکن پورے گاؤں میں ایک سی

ہوئی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کسی نے بہار کی آمد کا استقبال کرنے کا نہیں سوچا تھا۔ اور پھر موسم سرما میں پورے دو دن تک شدید برفانی طوفان آیا تھا۔ ہر طرف برف کے انبار لگ گئے اور گاؤں والے دوبارہ اپنے گھروں میں دبک جانے پر مجبور ہو گئے۔ ان کے پاس خوراک ختم ہو رہی تھی۔ جنگ کی وجہ سے ویسے ہی کھانے پینے کے سامان کی قلت ہو گئی تھی۔ اوپر سے سرما بھی طویل ہو گیا تھا۔

سفینہ کھانا بنا کر نیچے آئی تو بچے بستروں میں دبکے ہوئے تھے۔ علینہ کی طبیعت خراب تھی۔ بھائی اسے کمپنی دینے کے لیے اس کے پاس بیٹھے تھے۔ اس نے ان سب سے کھانے کے لیے اوپر آنے کو کہا۔ ''علینہ تم یہیں رکو میں تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں۔''

غازی اور علی اوپر آ گئے۔ اس نے ان کے لیے میز پر کھانا لگا دیا اور خود علینہ کے لیے پیالے میں سوپ نکال کر نیچے لے آئی۔ علینہ کی طبیعت خرابی کی وجہ سے اس نے گوشت اور خشک سبزیوں کا سوپ بنایا تھا تو بیمار علینہ بھی پی سکتی تھی۔ علینہ بیمار ہونے کے ساتھ خوف زدہ بھی تھی۔ اس نے سن لیا تھا کہ سرب اس کے گاؤں کے پاس آ گئے تھے اور وہ حملہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ سفینہ نے اس کے سینے پر نیپکن بچھایا اور اسے چمچ سے سوپ پلانے لگی۔

''ماما کیا سرب یہاں آ گئے ہیں؟''

سفینہ کا ہاتھ رک گیا۔ ''ہاں.... لیکن تم فکر مت کرو ہم انہیں اندر آنے نہیں دیں گے اور جلد ہماری بہادر فوج آ کر ان سربوں کو مار بھگائے گی۔''

علینہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ ''ماما ایک بار آپ نے ہمیں بھیڑیوں کی کہانی سنائی تھی جنہوں نے گاؤں کا محاصرہ کر لیا تھا۔''

''ہاں سنائی تھی۔'' سفینہ نے سر ہلایا۔ درحقیقت اس نے یہ کہانی ایک بار نہیں ان بچوں کو لاتعداد بار سنائی تھی۔ ہر سرما میں وہ کہانیاں سنتے تھے ان میں سب سے زیادہ شوق سے سنی جانے والی کہانی یہی تھی۔ علینہ نے سوپ ختم کر کے اس سے التجا آمیز انداز میں کہا۔

''ماما آج رات یہ کہانی پھر سنایئے۔''

سفینہ اس دن بہت تھک گئی تھی کیونکہ اس نے چھت سے برف بھی صاف کی تھی مگر وہ بیمار علینہ کی التجا نظر انداز نہیں کر سکی تھی۔ اس نے کہا۔ ''ضرور سناؤں گی میری بچی کیوں نہیں سناؤں گی۔''

جب غازی اور علی کو پتا چلا کہ آج رات ان کو بھیڑیوں والی کہانی سننے کا موقع ملے گا تو وہ بھی خوش ہو گئے تھے۔ اس خوشی میں انہوں نے جلدی جلدی سفینہ کا ہاتھ بٹا کر کام ختم کرایا۔ کچھ کافی رکھی تھی سفینہ نے اپنے لیے کافی بنائی اور دروازے کھڑکیاں اچھی طرح بند کر کے نیچے تہ خانے میں آ گئی۔ بچے بستر میں اپنی اپنی جگہ لیٹ چکے تھے۔ یہ بستر اتنا بڑا تھا کہ وہ سب آرام سے ٹھل کر لیٹتے تھے۔ سفینہ بھی کمبل میں گھس گئی اور اس نے کافی کا مگ پاس رکھ لیا تھا۔

''ماما کہانی سنائیں نا۔'' غازی نے بے چینی سے کہا۔

سفینہ نے مگ اٹھایا اور کہانی کا آغاز کیا۔ یہ نسل در نسل چلنے والی کہانی تھی۔ اس نے کہنا شروع کیا۔ ''بہت عرصے پہلے کی بات ہے......''

یہ اس وقت کی بات تھی جب مشرقی یورپ عیسائیوں اور ترک مسلمانوں کے درمیان میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ کئی سو سال تک جاری رہنے والی اس جنگ نے اس پورے علاقے کو تباہ و برباد کر ڈالا تھا۔ آبادیاں اجڑ گئی تھیں اور شہر ویران ہو گئے تھے۔ لوگ خانہ بدوش بن گئے تھے۔ ایک طرف یہ جنگ جاری تھی تو دوسری طرف عیسائیوں میں آپس میں خانہ جنگی جاری تھی۔ کیتھولک اور آرتھوڈوکس آپس میں لڑ رہے تھے پھران کے بے شمار ذیلی فرقے تھے جو موقع پا کر ایک دوسرے کے خلاف خون ریز کارروائیاں کر جاتے تھے۔ آرتھوڈوکس فرقے سے الگ ہونے والے ایک فرقے نے اپنی الگ شناخت بنائی تھی وہ امن پسند لوگ تھے۔ اب کے امن پسند دوسرے فرقوں کو ظلم کا شکار بنا رہے تھے۔ عیسائی ایک طرف جو آرتھوڈوکس کے ظلم کا شکار تھے تو دوسری طرف کیتھولک ان کی زندگی الگ اجیرن کر کے رکھتے تھے کیونکہ دونوں فرقے اس نئے فرقے کو عیسائیت سے خارج سمجھتے تھے۔ نئے فرقے کے لوگ اپنی جانیں بچانے کے لیے پہاڑوں پر چڑھ گئے اور وہیں اپنی بستیاں بسا لیں۔ کیونکہ نیچے میدانوں میں ان کے دشمن بہت طاقت ور تھے۔ ان کو بڑی مملکتوں کی حمایت حاصل تھی۔ جیسے آرتھوڈوکس کے پشت پناہ یونانی اور روسی تھے جب کہ کیتھولکس کی حمایت میں اٹلی اور فرانس کھڑے تھے۔ اس بے چارے فرقے کو کہیں جائے پناہ نہیں تھی۔

ان کی تعداد بھی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ لیکن سو سال میں انہوں نے اس علاقے میں بے شمار بستیاں آباد کر لی تھیں۔ ان میں سے ایک بستی سفینہ کا یہ چھوٹا سا گاؤں بھی

تھا۔اس وقت اس گاؤں میں صرف نئے فرقے کے لوگ تھے۔ انہیں پھلتے پھولتے دیکھ کر آرتھوڈکس عیسائی زبردست فوجی تیاری کے ساتھ ان پر چڑھ دوڑے اور ایک ایک کرکے ان کی بستیاں تاراج کرنے لگے۔ جو ان کے ہاتھ آتا اسے قتل کر دیتے اور باقی بچ جانے والوں کو غلام بنا لیتے۔

لیکن اس موقع پر عثمانی ترک ان کے نجات دہندہ بن کر آئے انہوں نے حملہ آور فوج کی پشت سے حملہ کر کے اسے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ نتیجتاً لوگوں کے خلاف بہادری کے مظاہرے کرنے والی فوج ترکوں کے سامنے چند گھنٹے بھی نہیں ٹھہر سکی تھی اور اس طرح شکست کھا کر بھاگی کہ پہاڑوں میں دور تک ان کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ نئے فرقے کے لوگوں نے جان بچانے پر ترکوں کا شکریہ ادا کیا اور پھر اس قوم نے ایک انوکھا فیصلہ کیا جو اس سے پہلے دنیا کی شاید ہی کسی قوم نے کیا ہو۔ اپنے ہم مذہبوں کے ظلم و ستم کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے وہ سب کے سب ایک ساتھ مسلمان ہو گئے اور یہی لوگ آج بوسنیا کے مسلمان کہلاتے ہیں۔ یہ ترک یا وسط ایشیائی نہیں ہیں جیسا کہ ان کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے بلکہ یہ ایک یورپی قوم ہے۔ اسی نسل کے مسلمان البانیہ اور پورے مشرقی یورپ میں پھیلے ہوئے ہیں۔

سفینہ کے گاؤں کے لوگ بھی مسلمان ہو گئے اور اسی جگہ آباد رہے۔ جنگیں یونہی جاری رہیں۔ ان کے علاقے پر کبھی ترک قابض ہو جاتے اور کبھی عیسائی غالب آجاتے۔ جب عیسائی آتے تو وہ ان کی زندگی اجیرن کر دیتے۔ ان کا قتل عام کرتے اور ان کی بستیاں اور کھیتیاں اجاڑ دیتے تھے۔ پھر جب ترک آجاتے تو وہ سکون کا سانس لیتے تھے۔

اٹھارویں صدی کا آخری عشرہ یورپ میں سردی کے لیے مشہور ہے اس عشرے میں بے پناہ سردی پڑی تھی اور گرمیاں بہت مختصر سی آئی تھیں۔ اس سردی نے جہاں انسانوں کو پریشان کیا وہیں جنگل کے جانور بھی پریشان ہو گئے تھے۔ کیونکہ سردی کی وجہ سے ان کو خوراک کم ملتی تھی۔ درندوں کی خوراک کم ہوئی تو انہوں نے بوکھلا کر انسانی آبادیوں کا رخ کیا کیونکہ وہاں انہیں کھانے کے لیے پالتو جانور تو مل سکتے تھے۔

ایک سرما کے آخری دن تھے اپریل کا آغاز ہو چکا تھا اور ابھی تک برف باری جاری تھی۔ سردی ایسی تھی کہ انسان گھر سے باہر نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک دن جنگل میں لکڑی کاٹنے والے چرواہوں نے وہاں چند بھیڑیے دیکھے۔ حالانکہ یہ اس موسم میں نیچے میدانوں کی طرف چلے جاتے تھے اور جب برف پگھل جاتی تو اوپر پہاڑوں پر چلے جاتے تھے۔ اس گاؤں کے آس پاس اس سے پہلے کبھی بھیڑیے نظر نہیں آئے تھے۔ یہ بھوکے تھے اور انہوں نے چرواہوں کا گاؤں تک پیچھا کیا۔ شروع میں لوگوں نے اس بات پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن اس کے چند دن بعد ہی جنگل میں جانے والی دو عورتوں پر بھیڑیوں نے حملہ کر دیا اور انہیں ہلاک کر کے کھا گئے۔ جب ان کے گھر والے انہیں تلاش کرنے نکلے تو ان عورتوں کی بس چند ہڈیاں ہی ملی تھیں۔

پہلی بار لوگوں کو احساس ہوا کہ بھیڑیے نہ صرف ان کے علاقے میں آچکے ہیں بلکہ وہ بھوک مٹانے کے لیے انسانوں پر حملے سے بھی دریغ نہیں کر رہے۔ اس کے بعد لوگوں نے جنگل جانا چھوڑ دیا اور اپنی ضروریات گاؤں کے پاس سے پوری کرنے لگے مگر اس دوران میں گاؤں کے گرد بھیڑیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ لوگ خوف زدہ ہو گئے کیونکہ یورپ میں سب سے خطرناک جانور بھیڑیے کو سمجھا جاتا ہے مشرقی یورپ کے بھیڑیے خونخواری اور سفاکی میں شیروں کو بھی مات دیتے ہیں۔ ایسے بے شمار واقعات ہو چکے تھے۔ جب کسی علاقے میں بھیڑیوں کی تعداد بڑھ گئی اور جنگل کے جانور ان کے لیے کم پڑ گئے تو انہوں نے آبادیوں کا رخ کیا اور پالتو جانوروں کے ساتھ انسانوں پر بھی حملے کرنے لگے۔

گاؤں والے اس بات سے واقف تھے اس لیے انہوں نے بھیڑیوں کا تدارک کرنے کے لیے مقامی ترک حکام سے مدد طلب کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ تربیت یافتہ فوج ہی ان کا صفایا کر سکتی تھی۔ اس کام کے لیے دو نوجوان تیار ہوئے جو پہلے بھی شہر تک جا چکے تھے لیکن جب وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلے تو انہوں نے کئی سو بھیڑیوں کو اپنے راستے میں موجود پایا۔ بھیڑیے طویل سرما میں بھوک سے پاگل ہو چکے تھے لہٰذا جب انہوں نے کھانے کے قابل انسانوں اور گھوڑوں کو سامنے دیکھا تو وہ ان پر ٹوٹ پڑے۔ دونوں نوجوان بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر گاؤں واپس آسکے۔ ان کے گھوڑے بھیڑیوں کے ہتھے چڑھ گئے تھے اور اسی وجہ سے ان کی جان بچی تھی کیونکہ بھوکے بھیڑیے گھوڑوں

بھنبھوڑنے لگے تھے اور انسانوں پر ان کی توجہ اتنی نہیں تھی۔

گاؤں سے نکلنا ناممکن لگ رہا تھا اور اب گاؤں والوں کو اس بات کی فکر لاحق ہوگئی تھی کہ کہیں بھیڑیے گاؤں پر حملہ نہ کردیں۔ اگرچہ گاؤں کے گرد ایک چھوٹی سی پتھروں سے بنی چار دیواری تھی لیکن بہت سارے گھر چار دیواری کے باہر تھے اور بھیڑیے آسانی سے ان گھروں پر حملہ کرسکتے تھے۔ لوگوں نے خوف زدہ ہوکر اپنے گھروں کو مضبوط کرنا شروع کردیا۔ پھر ان کا خدشہ درست ثابت ہوا۔ باہر جانے کی ناکام کوشش کے دو دن بعد بھیڑیے گاؤں کے آخری سرے پر واقع ایک مکان سے ملحق باڑے پر حملہ آور ہوئے۔ وہ بھوک سے پاگل ہورہے تھے۔ مکان کے مالک نے تیر چلا کر انہیں روکنے کی کوشش کی مگر بھیڑیے اپنے ساتھیوں کی ہلاکت کی پروا کیے بغیر باڑے کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گئے اور مویشیوں کی چیر پھاڑ کرنے لگے۔ چرواہا بے بسی سے مکان کی چھت سے انہیں دیکھتا رہا۔ اس نے تیر مار کر کئی بھیڑیوں کو ہلاک کردیا تھا لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ جب تک گاؤں والے مدد کو آتے بھیڑیے اس کے سارے جانوروں کو مار چکے تھے اور ان کی لاشیں کھا رہے تھے۔ مداخلت کے آثار دیکھ کر وہ کئی لاشیں کھینچ کر ساتھ لے گئے۔

اس واقعے کے بعد لوگوں نے فوری طور پر گاؤں کی چار دیواری میں جانے کا فیصلہ کرلیا۔ جن کے مکان باہر تھے وہ اپنے اہل خانہ اور جانوروں کو چار دیواری میں منتقل کرنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے چار دیواری کو اونچا اور مضبوط کرنا شروع کردیا تاکہ بھیڑیے اسے پار نہ کرسکیں جن کی تعداد اب ہزاروں میں پہنچ گئی تھی۔

بھوک سے بے تاب یہ بھیڑیے خالی مکانات کا چکر لگانے لگے اور جب انہوں نے دیکھا کہ چار دیواری سے باہر سارے مکان خالی ہوچکے ہیں اور وہاں نہ انسان ہیں اور نہ جانور تو انہوں نے گاؤں کی چار دیواری کا محاصرہ کر لیا۔ انہوں نے چار دیواری پھلانگنے کی کوشش بھی کی لیکن یہ اونچی تھی کہ وہ اسے پار نہیں کرسکے۔ گاؤں کے لوگ جنگجو نہیں تھے ان کے پاس اپنے دفاع کے لیے بس چند ایک ہتھیار تھے۔ خاص طور سے تیر کمان محدود تھے اور وہ بھی چند افراد کے پاس تھے۔ کچھ لوگوں کے پاس تلواریں اور نیزے وغیرہ تھے۔ انہوں نے چار دیواری سے تیر چلا کر بھیڑیوں کو ڈرانے کی کوشش کی لیکن چالاک بھیڑیے اپنے چند ساتھیوں کا نقصان اٹھانے کے بعد ایسی جگہوں سے دور رہنے لگے تھے جہاں سے ان پر حملہ ہوسکتا تھا۔

گاؤں والے چار دیواری میں محفوظ تھے اور بھیڑیے اسے پار نہیں کرسکتے تھے لیکن اتنے افراد چار دیواری میں آنے سے دوسرے کئی مسائل پیدا ہونے لگے تھے۔ صفائی کا فقدان ہوگیا تھا اور انسانی بول و براز کی بو سے دماغ خراب ہونے لگا تھا۔ چار دیواری میں پانی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا وہ برف پگھلا کر اسے استعمال کررہے تھے۔ پھر جلانے کے لیے لکڑی بھی کم پڑنے لگی۔ البتہ ان کے پاس خوراک خاصی تھی۔ چار دیواری کی حد میں موجود برف تیزی سے ختم ہونے لگی اور اب نئی برف باری کا امکان نہیں تھا اور نہ ہی بارش کا موسم تھا۔

دوسری طرف بھیڑیے مسلسل اس تاک میں تھے کہ کسی طرح انہیں چار دیواری میں داخل ہونے کا کوئی راستہ مل جائے۔ ان کی بھوک بڑھتی جارہی تھی۔ موسم سرما طویل ہونے سے وہ ابھی اوپر نہیں جاسکتے تھے اور ان کی خوراک کے ذرائع بھی محدود تھے۔ اگر انہیں جلد کھانے کے لیے کچھ نہ ملتا تو وہ بھوک سے مرجاتے۔ چند جانور مار کر ان کی بھوک نہیں ختم ہوئی تھی۔ پھر چند بھیڑیوں نے چار دیواری میں ایک کمزور جگہ بھانپ لی۔ اس جگہ دیوار کے پاس ایک چھوٹا سا ٹیلا تھا اور وہ اس سے چھلانگ لگا کر دیوار کے دوسری طرف جاسکتے تھے۔ جہاں ان کی خوراک کے لیے بہت کچھ تھا۔

بھیڑیوں نے اس جگہ کو تاڑ لیا اور گاؤں کے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے بہ ظاہر اس جگہ سے تغافل برتنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے ایک منصوبے کے تحت گاؤں کے لوگوں کو بے آرام کرنا شروع کردیا۔ وہ رات ہوتے ہی چار دیواری کے پاس جمع ہوکر اتنا شور کرتے کہ اندر موجود لوگوں کا سونا محال ہوجاتا۔ وہ بھیڑیوں کی خوفناک آوازیں سن کر جاگتے رہنے پر مجبور تھے۔ بھیڑیے کسی جگہ جمع ہوکر ایسا شور کرتے جیسے حملہ کرنے والے ہوں اور گاؤں والے اس طرف دوڑے آتے تھے۔ جب وہ اس طرف آتے تو بھیڑیے کسی دوسری جگہ جمع ہوکر ایسا ہی شور شروع کردیتے تھے۔ ان کا مقصد لوگوں کے اعصاب شل کرنا تھا تاکہ جب وہ اصل میں حملہ کریں تو کوئی مزاحمت نہ کرسکے۔

گاؤں کے لوگ دن رات جاگ جاگ کر واقعی نڈھال ہونے لگے تھے۔ اوپر سے پانی اور ایندھن کی کمی بھی

رنگ لا رہی تھی۔ بچے کھچے پانی پر لوگوں میں جھگڑے ہونے لگے۔ انہوں نے ایک ایک جگہ سے برف حاصل کر کے استعمال کر لی تھی۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں کنویں نہیں کھودے جا سکتے تھے اور ان کی پانی کی تمام ضروریات گاؤں کے باہر موجود چشمے پوری کرتے تھے۔ لکڑی بھی ختم ہو چکی تھی۔ اوپر سے سردی جانے کا نام نہیں لے رہی تھی جن کو آگ جلانے کے لیے لکڑی نہیں ملتی تھی وہ ساری رات ٹھٹھرتے رہتے تھے۔ بہت سارے لوگ خوراک کچی کھانے پر مجبور تھے کیونکہ کھانا بنانے کے لیے بھی لکڑی نہیں رہی تھی۔

ایک رات جب تھکے ہارے گاؤں والے سو رہے تھے اور پہرے پر چند اونگھتے ہوئے افراد تھے تو بھیڑیوں نے تازی ہوئی جگہ سے چار دیواری پھلانگی اور اندر داخل ہو گئے لیکن انہوں نے یہ کام بہت خاموشی سے کیا تھا ان کی کوشش تھی کہ اندر موجود افراد کے خبردار ہونے سے پہلے وہ اچھی تعداد میں اندر پہنچ جائیں۔ ذرا سی دیر میں درجنوں بھیڑیے اندر آ چکے تھے۔ لیکن انسانوں سے پہلے رکھوالی والے کتوں نے ان کی موجودگی محسوس کر لی اور وہ بھونک بھونک کر لوگوں کو خبردار کرنے لگے۔ مگر تھکے ہوئے اور گہری نیند میں ڈوبے لوگوں کو جاگنے اور باہر آنے میں کچھ وقت لگا تھا اور اتنی دیر میں سیکڑوں بھیڑیے اندر گھس آئے تھے۔ جب لوگ باہر آئے تو بھیڑیوں نے پہلے ان پر ہی حملہ کر دیا۔ کئی سو بھیڑیوں کو گاؤں کی چار دیواری میں پا کر لوگوں کے ہوش اڑ گئے تھے۔ ان میں سے اکثر تو پلٹ کر واپس گھروں میں گھس گئے اور جو باہر رہ گئے تھے وہ بھیڑیوں سے مقابلہ کرنے لگے۔ مگر ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ انسانوں پر حاوی آنے لگے۔ درجن بھر پہرے داری پر موجود انسانوں کو ختم کر رہے تھے اس کے بعد بھیڑیے جانوروں پر پل پڑے۔

ایک شور برپا تھا اور لوگ اپنے اپنے گھروں میں قید کانپ رہے تھے۔ بھیڑیے مسلسل چار دیواری میں داخل ہو رہے تھے اور مارے جانے والے انسانوں کے ساتھ جانوروں کو بھی بھنبھوڑ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے سارے ہی جانوروں کو ختم کر دیا اور ان سے اپنی شکم کی آگ بجھائی۔

ساری رات بھیڑیے لاشوں کو بھنبھوڑتے اور کھاتے رہے۔ ان کی غراہٹوں سے گھروں میں قید لوگوں کا خون خشک ہو رہا تھا انہیں معلوم تھا کہ جانوروں کے بعد ان کی ہی باری ہے۔ لوگ اتنے سہمے ہوئے تھے کہ جن گھروں کے افراد مارے گئے تھے وہ بھی مارے خوف کے کھل کر ان کا غم نہیں منا رہے تھے۔ کوئی رو رہا تھا تو اپنی آواز اپنے سینے تک محدود رکھ کر۔ کیونکہ ان کو خوف تھا۔ بھیڑیے ان کی آواز سن کر ان کے مکانوں میں گھس آئیں گے۔ جن کے مکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں کمزور تھیں۔ وہ ان کی مرمت کرنے میں لگ گئے۔ اب بھیڑیوں سے جنگ انفرادی ہو گئی تھی سب کو اپنی اپنی جان خود بچانی تھی۔

ساری رات بھیڑیے تباہی مچاتے رہے اور صبح تک انہوں نے چار دیواری میں موجود ہر جانور کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان کا گوشت کھا کر ان کی شکم سیری ہو گئی تھی لیکن ابھی وہ یہاں سے جانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ابھی یہاں کھانے کے قابل اور بھی بہت کچھ ہے۔ گھروں کے بند دروازوں کے پیچھے سے انہیں انسانوں کی بو آ رہی تھی۔ صبح تک سارے ہی بھیڑیے اندر گھس آئے تھے اور روشنی ہونے پر بھی وہ ہر طرف بکھری لاشوں کو بھنبھوڑتے رہے۔ جھریوں سے نظر آنے والا منظر بہت خوف ناک تھا۔ ہر طرف خون تھا یا لاشیں اور ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ خوف ناک منظر دیکھ کر لوگوں کو اپنا انجام سامنے نظر آنے لگا تھا۔

☆☆☆

دھماکوں نے انہیں چونکا دیا تھا۔ بچے سہم کر سفینہ سے لپٹ گئے۔ علینہ نے سہمے انداز میں پوچھا۔ ”ماما یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ سفینہ نے ان کو تسلی دی۔ ”سامنے والے گاؤں میں لڑائی ہو رہی ہے۔“

بچے مطمئن نظر آنے لگے۔ نازی کو کہانی کا خیال آ گیا اور وہ اشتیاق سے بولا۔ ”ماما پھر کیا ہوا؟“

وہ پہلے کئی بار یہ کہانی سن چکے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ پھر کیا ہوا لیکن وہ ہر بار اتنے ذوق وشوق سے سنتے تھے جیسے پہلی بار سن رہے ہوں۔ سفینہ نے اپنا دھیان باہر سے آتی آوازوں سے ہٹایا اور انہیں پھر کہانی سنانے لگی۔

☆☆☆

ہزاروں کی تعداد میں بھیڑیے گاؤں کی چار دیواری میں آزادانہ گھوم رہے تھے۔ اگرچہ ابھی انہیں خوراک کی کمی نہیں تھی لیکن اس کے باوجود ان کی رال بند گھروں میں

موجود انسانوں پر ٹپکنا شروع ہوگئی تھی۔ وہ گھروں میں گھسنے کی کوشش کرنے لگے۔ عورتیں اور بچے رو رہے تھے اور مرد سانس روکے بیٹھے تھے۔ انہیں احساس تھا کہ یہ آفت اتنی آسانی سے جانے والی نہیں ہے۔ اس دن اور آنے والی رات بھیڑیے بچی کچی لاشوں کو بھنبھوڑتے رہے اور اگلے دن تک وہ ان کی ہڈیاں بھی چبا چکے تھے۔ بے شک جانور بہت سارے تھے لیکن کھانے والے بھیڑیوں کی تعداد ان سے کہیں زیادہ تھی اور وہ سردیوں میں کئی ہفتوں سے بھوکے تھے۔

لوگ مایوس ہوکر اب خدا سے دعا کررہے تھے کہ اس آفت کو ٹال دے۔ پھر رات کسی وقت ہوا میں اچانک تبدیلی آئی اور موسم کسی قدر گرم محسوس ہونے لگا۔ جب اگلی صبح طلوع ہوئی تو لوگوں نے جھریوں اور چھتوں پر بنی کھڑکیوں سے دیکھا کہ آس پاس کے پہاڑوں پر برف پگھل رہی تھی۔ درخت جو کل تک برف سے ڈھکے ہوئے تھے ان کی شاخیں نظر آنے لگی تھیں۔

موسم کی اس تبدیلی نے بھیڑیوں کو بھی چونکا دیا اور انہوں نے ان بلند پہاڑوں کی طرف دیکھنا شروع کردیا جو گرمیوں میں ان کا مسکن تھے اور جہاں وہ افزائش نسل کرتے تھے۔ موسم بدلتے ہی انہیں اپنے بھٹ یاد آنے لگے تھے اور پھر انہوں نے چار دیواری سے باہر جانا شروع کر دیا۔ بھیڑیے جا رہے تھے۔ لیکن سب نہیں بہت سارے اب بھی لاج میں یہاں رکے ہوئے تھے۔ رہ جانے والوں نے جانے والوں کو روکنے کی کوشش کی لیکن جو فطرت کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں وہ رکنے کو تیار نہیں تھے اور جو فطرت پر اپنی ذہانت کو ترجیح دے رہے تھے وہ وہیں رہ گئے لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی۔ شاید ہزاروں میں سے چند سو بھیڑیے ہی گاؤں میں باقی رہ گئے تھے اور باقی دوسرا دن طلوع ہونے سے پہلے وہاں سے جا چکے تھے۔

گاؤں والے منتظر تھے کہ باقی بھی چلے جائیں تو وہ باہر نکلیں۔ اگلے روز موسم مزید بہتر ہوا اور بہار کے واضح آثار نظر آنے لگے۔ درختوں اور گاؤں کے آس پاس پہاڑوں سے برف تقریباً صاف ہوگئی تھی۔ باقی رہ جانے والے بھیڑیوں میں سے بھی کچھ فطرت کی آواز کو نظرانداز نہ کر سکے اور حسرت و یاس لیے گاؤں پر آخری نظر ڈال کر وہاں سے رخصت ہوگئے لیکن ابھی بہت سارے بھیڑیے وہاں موجود تھے اور ان کے ہوتے ہوئے باہر نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

دو دن اور گزر گئے تھے۔ ایک طرف بہت سارے گھروں میں خوراک ختم ہوگئی تھی اور پانی تو شاید ہی کسی گھر میں تھا۔ تو دوسری طرف بھیڑیے پھر سے بھوک سے بے تاب ہونے لگے تھے۔ انہیں آخری بار کچھ کھائے ہوئے دو دن گزر چکے تھے اور ان کے پیٹ پھر سے خالی تھے۔ جب ان کی تاب ختم ہوگئی تو انہوں نے گھروں میں گھسنے کی کوشش شروع کردی۔ وہ دروازوں اور کھڑکیوں سے خود کو ٹکرا رہے تھے اور انہیں توڑنے کی سعی کررہے تھے۔ اندر سے آتی زندہ جسموں کی بو انہیں اور بھی بے تاب کررہی تھی۔

بھیڑیے جن گھروں میں گھسنے کی کوشش کررہے تھے ان کے مکین خوف کے باوجود مدافعت کررہے تھے اور اندر رہتے ہوئے بھیڑیوں کے خلاف ہر ممکن ہتھیار استعمال کر رہے تھے لیکن صاف نظر آرہا تھا کہ زیادہ دیر مدافعت ممکن نہیں تھی۔ ایک بار بھیڑیے کسی گھر کا دروازہ توڑ دیتے تو گھر والوں کو صرف خدا ہی بچا سکتا تھا۔ وہ ایک بار پھر خدا کو یاد کرنے لگے۔ بھیڑیوں کی گاؤں میں موجودگی کو پانچواں دن طلوع ہوا تو ان کے تیور خراب تھے اور روشنی ہوتے ہی انہوں نے گھروں میں گھسنے کی دیوانہ وار کوشش شروع کر دی۔ ان کی گزشتہ دن کے حملوں سے کئی مکانات کے دروازے کمزور ہوگئے تھے اور وہ ان کے تازہ حملوں کے آگے لرزنے لگے تھے۔ ان سے زیادہ اندر موجود لوگ لرز رہے تھے۔ انہیں موت سامنے نظر آرہی تھی۔

پھر جیسے اچانک موسم تبدیل ہوا اسی طرح بھیڑیوں کا رویہ اچانک تبدیل ہوگیا اور وہ حملہ کرتے کرتے رک گئے اور منہ اٹھا کر فضا میں کچھ سونگھنے لگے۔ لوگ انہیں حیرت اور خوف سے دیکھ رہے تھے۔ بھیڑیوں کا رویہ ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ پھر اچانک گاؤں کی چار دیواری کے داخلی دروازے کی طرف سے شور بلند ہوا اور ایک فوجی دستہ اندر داخل ہوا۔ یہ ایک ترک فوجی دستہ تھا جو اس علاقے میں گشت کررہا تھا اور اتفاق سے یہاں چلا آیا تھا۔

بھیڑیوں نے اس فوجی دستے پر حملہ کیا لیکن فوراً ہی اسے لینے کے دینے پڑ گئے جب ترکوں نے بھیڑیوں کو تلواروں اور نیزوں کی نوک پر رکھ لیا۔ جب ان میں سے درجنوں مارے گئے تو پھر انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ پلٹ کر بھاگے لیکن اس احاطے میں کہیں جائے پناہ نہیں تھی کیونکہ باہر جانے کے دو ہی راستے تھے ایک سے گزر کر

بھیڑیے اندر آئے تھے اور دوسرے سے فوجی دستہ اندر آیا تھا۔ یہ راستہ بند تھا اور دیوار والا راستہ مشکل تھا۔ اس سے ایک وقت میں ایک ہی بھیڑیا باہر جا سکتا تھا۔ جب تک بچ جانے والے بھیڑیے اس راستے سے باہر جاتے ان میں سے بھی نصف سے زیادہ مارے جا چکے تھے۔ سپاہی باہر نکل کر گھوڑوں پر ان کا پیچھا کر رہے تھے اور اپنے تیروں سے انہیں نشانہ بنا رہے تھے۔ ایک گھنٹے کے اندر دو سو سے زیادہ بھیڑیے مارے جا چکے تھے۔ گاؤں کے احاطے میں اور اس کے باہر ان بھیڑیوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔

جب بھیڑیوں کے اس حملے کی اطلاع مقامی ترک حکام تک پہنچی تو انہوں نے لوگوں کو محفوظ کرنے کے لیے اس پورے علاقے میں بھیڑیوں کے خلاف ایک شکاری مہم شروع کی اور سپاہی جنگلوں میں بھیڑیوں کو گھیر کر ہلاک کرنے لگے۔ چند مہینوں میں ہزاروں کی تعداد میں بھیڑیے مارے جا چکے تھے اور اب مقامی لوگوں کو ان سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔

کہانی سنتے سنتے بچے سو گئے تھے۔ سفینہ کو بھی نیند آنے لگی۔

☆☆☆

سفینہ کئی برس بعد اپنے گاؤں آئی تھی۔ اب یہاں سوائے جلے ہوئے مکانوں کے کھنڈرات اور ملبے کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چار سال پہلے جب سرب یہاں حملہ آور ہوئے تھے تو اس گاؤں کی آبادی کوئی ایک ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ پہلے انہوں نے حسبِ روایت بے پناہ گولہ باری کی۔ توپوں اور مارٹرز کے گولے ان کے گھروں اور پناہ گاہوں پر برسنے لگے تھے۔ ایک تباہی تھی، ایک قیامت تھی جو ان پر نازل ہوئی تھی۔ جن کے گھر بمباری کا نشانہ بنے وہ ان کے ملبے تلے دفن ہو کر رہ گئے اور جو بچ گئے وہ پناہ کے لیے دیوانہ وار ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ لیکن برستے گولوں میں کہیں جائے اماں نہیں تھی۔

سفینہ کا مکان بھی ایک مارٹر گولے کا نشانہ بنا اور وہ اپنے بچوں کو سمیٹے بیٹھی تھی۔ گولے سے مکان کا اوپری حصہ تباہ ہوا تھا اور اس میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ تہ خانہ بچ گیا تھا لیکن اگر وہ یہاں سے نہ نکلتے تو کچھ دیر میں یہ ان کا مقبرہ بن جاتا۔ سفینہ نے بچوں سے جھوٹ بولا تھا کہ سرب برابر والے گاؤں پر گولہ باری کر رہے تھے۔ وہ ان کے گاؤں کا محاصرہ کر چکے تھے اور اس روز اس محاصرے سے نکلنے کی کوشش کرنے والے تمام ہی مسلمان سربوں کی مشین گنوں کا نشانہ بن گئے تھے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی بچ کر نکلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کے بعد مسلمان اپنے گھروں میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ جو چند مرد لڑنے کے قابل تھے وہ ناقابلِ ذکر قسم کے ہتھیاروں سے گاؤں کا دفاع کر رہے تھے لیکن صاف نظر آ رہا تھا ان کی کوشش لاحاصل تھی۔ سرب جلد ان کے گاؤں پر قابض ہونے والے تھے۔

سربوں نے اپنی توپیں اور مارٹر گنیں نصب کیں اور گاؤں پر بھرپور حملہ کر دیا۔ چاروں طرف آگ و آہن کی بارش جاری تھی۔ سفینہ کا گھر نشانہ بنا تو اس نے بچوں کو لے کر وہاں سے نکل جانا مناسب سمجھا ورنہ وہ یہیں جل کر مر جاتے۔ لیکن جب وہ اوپر آئی تو اسے پتا چلا کہ آگ نے کوئی راستہ نہیں چھوڑا ہے۔ وہ بچوں کو لے کر دیوانہ وار اس آگ سے نکلنے کا راستہ تلاش کرنے لگی۔ اس کوشش میں غازی اور علینہ کہیں گم ہو گئے اور وہ صرف علی کے ساتھ گھر سے نکل سکی تھی۔ آس پاس کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ تقریباً سارے ہی گھر مسمار ہو چکے تھے اور جو بچے تھے ان پر گولے برس رہے تھے۔ سفینہ کو علینہ اور غازی کہیں نظر نہیں آ رہے تھے اور وہ پاگلوں کی طرح انہیں تلاش کر رہی تھی۔ اسے برستے گولوں اور گولیوں کی پروا نہیں تھی۔ علی اس کے ساتھ ساتھ گھسٹ رہا تھا پھر اس نے علی کو حفاظت کے خیال سے ایک چھوٹے سے مکان کی آڑ میں بٹھا دیا اور وہ اپنے جلتے مکان کی طرف واپس آ رہی تھی کہ اسے عقب سے دھماکا سنائی دیا اور اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ مکان غائب تھا جہاں اس نے علی کو بٹھایا تھا۔ کسی گولے نے اسے صفحۂ ہستی سے نابود کر دیا تھا۔ چند منٹ کے اندر سفینہ اپنی ساری کائنات لٹا چکی تھی۔ وہ کچھ دیر پھٹی پھٹی نگاہوں سے غائب مکان کو دیکھتی رہی اور پھر اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ پچھتانے لگی کہ اسے ہوش ہی کیوں آیا۔ وہ سربوں کے ایک جنگی کیمپ میں تھی جہاں اس جیسی بے شمار مسلمان عورتیں اور لڑکیاں بند تھیں۔ سرب ان جوان اور خوبرو مسلمان خواتین کے بطن سے اپنی افزائشِ نسل کے قابلِ نفرت منصوبے پر عمل کر رہے تھے۔ سفینہ نئی آئی تھی اور جلد اسے بھی ان حالات سے گزرنا پڑا جس کا یہاں موجود عورتیں شکار تھیں۔ اس کیمپ میں آنے کے تیسرے مہینے وہ حمل سے ہو گئی۔ اس کے بعد اسے بخش دیا گیا کیونکہ سربوں کا مقصد یہی تھا کہ وہ مسلمان عورتوں کے بطن سے

سربوں کے بچے پیدا کر کے صدیوں پہلے مسلمان ہو جانے والی اس قوم سے انتقام لیا جا سکے۔

اس کیمپ میں جو عورت حمل سے ہو جاتی اسے ایک اور کیمپ بھیج دیا جاتا تھا جہاں بچے کی پیدائش تک اس کی دیکھ بھال کی جاتی تھی اور جب بچہ ہو جاتا تو اسے عورت سے چھین کر کسی مشنری ادارے کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ بہت ساری عورتیں تو پہلے ہی کیمپ میں خودکشی کر لیتی تھیں۔ بہت ساری اس کیمپ میں آ کر اپنی جان ختم کر لیتی تھیں اور اکثر کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اس بچے کو جنم نہ دیں جو جبراً ان کی کوکھ میں لایا گیا تھا۔ اس میں کچھ کامیاب ہوتی تھیں اور کچھ ناکام ہو جاتی تھیں۔ سفینہ نے بھی اس بچے سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکی اور اسے بچے کو جنم دینا پڑا لیکن اسے اس بچے کے چھن جانے سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ وہ خود اس کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ جو عورتیں فارغ ہو جاتی تھیں انہیں دوبارہ ریپ کیمپ بھیج دیا جاتا تھا تاکہ وہ ایک بار پھر سربوں کے بچے پیدا کرنے میں استعمال ہو سکیں۔ مگر سفینہ کی خوش قسمتی کہ ان ہی دنوں بوسنیا کی مسلم فوج نے اس کیمپ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا اور یہاں موجود عورتوں کو آزاد کرا لیا۔ پھر سفینہ کو ایک پناہ گزین کیمپ میں بھیج دیا گیا جہاں وہ جنگ کے خاتمے تک رہی تھی۔ کیمپ سے نکلنے کے بعد اس نے سب سے پہلے اپنے بچوں اور شوہر کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ پورے بوسنیا میں قائم ہر پناہ گزین کیمپ میں گئی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید جس طرح وہ بچ گئی اسی طرح اس کے بچے بھی بچ گئے ہوں۔ اس نے بوسنیا میں فوج اور رضا کاروں کے محکمے سے اپنے شوہر حاجو بیگ کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے بارے میں پتا چلا کہ آخری بار وہ سربرینکا میں موجود تھا اور پھر سرب اس شہر پر قابض ہو گئے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا اور وہاں موجود کسی مسلمان کو زندہ نہیں چھوڑا تھا۔

پورے ایک سال تک اپنے پیاروں کو تلاش کرنے کے بعد سفینہ نے ہار مان لی تھی۔ اس نے سمجھ لیا کہ ان میں سے کوئی اب اس دنیا میں نہیں ہے اور اسے ان کے بغیر ہی زندہ رہنا ہوگا۔ پھر وہ گاؤں کی طرف آئی۔ اسے معلوم تھا کہ وہاں کوئی نہیں ہوگا لیکن وہ پھر بھی آئی اس نے سوچ لیا تھا، اگر وہ اپنے گاؤں کی بچنے والی آخری فرد ہوئی تب بھی وہ اس گاؤں کو دوبارہ آباد کر کے رہے گی۔

پہلا بحری حملہ

حضرت عمرؓ نے 15ھ (35-634ء) میں عثمان ابن ابی العاص ثقفی کو بحرین اور عمان کا گورنر مقرر کیا۔ اسی زمانے میں سب سے پہلے مسلمانوں نے محسوس کیا کہ انہیں اپنے تجارتی جہازوں کی حفاظت کے لیے جو ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آتے جاتے رہتے تھے ہندوستان کے کسی ساحلی بندرگاہ پر قبضے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ عثمان ابن ابی العاص نے ایک بحری بیڑہ تیار کر کے بمبئی کے قریب تانہ (تھانہ) بندرگاہ پر جو اب بھی موجود ہے 15ھ (636ء) میں پہلا بحری حملہ کیا اور یہاں سے بہت سا مال غنیمت لے کر عمان پہنچے۔ یہ مسلمانوں کا ہندوستان پر پہلا بحری حملہ تھا۔

مرسلہ: زاہد سلطان، پشاور

وہ گاؤں پہنچی تو اسے دیکھ کر اسے دھچکا لگا تھا۔ جلے ہوئے اور گرے ہوئے کھنڈروں کے سوا وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا اسے ایسے ہی مناظر دیکھنے کو ملیں گے لیکن پھر بھی اس کے دل کو دھچکا لگا تھا۔ البتہ وہاں کوئی لاش نہیں تھی۔ بوسنیا کی حکومت کے رضا کار یہاں موجود لاشوں کو نکال کر ان کی باقاعدہ تدفین کر چکے تھے۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا جب یہ گاؤں اجڑا تھا۔ بھیڑیوں کے حملے کے بعد کئی بار انسان نما بھیڑیوں نے اسے تاراج کیا تھا۔ ان کو مسلسل مسلمان ہونے کی سزا ملتی رہی تھی لیکن وہ اجڑ کر پھر اسے آباد کر لیا کرتے تھے۔ دشمن کے پاس انہیں اجاڑنے کی طاقت تھی تو اس کمزور قوم کے پاس ہر بار اجڑ کر آباد ہونے کی طاقت تھی لیکن اس بار گاؤں ایسا اجڑا تھا کہ لگتا تھا اب کبھی آباد نہیں ہوگا۔ وہ بوسنیا کے بے شمار گاؤں کی طرح ہمیشہ کے لیے نابود ہو گیا تھا۔ کیونکہ ان بستیوں پر جن بھیڑیوں نے حملہ کیا تھا ان کے پیٹ کبھی نہیں بھرتے تھے اور ان سے بچانے کے لیے کوئی نہیں آیا تھا۔ اس لیے اس بار بھیڑیے کامیاب رہے تھے۔

سفینہ سرد آہ بھر کر ایک بار پھر سے سبز ہو جانے والے جلے درخت کے تنے سے ٹک گئی۔ اس نے سوچا۔ کیا وہ اکیلے اس گاؤں کو پھر سے آباد کر سکے گی؟ اس کے اندر ایک عزم ابھرا کہ اسے یہ کام کرنا ہی ہے۔ اگلے روز سے اس

نے اپنے جل کر کھنڈر ہو جانے والے گھر کی صفائی شروع کر دی اور ایک ہفتے میں اس کا سارا ملبا نکال دیا۔ اب وہ اس کی جگہ نیا گھر بنانے کے لیے تیار تھی۔ فی الحال رہائش کے لیے اس کے پاس ایک خیمہ تھا اور اسے خوراک حکومت کی طرف سے فراہم کی جاتی تھی۔ اس نے خوراک دینے کے لیے آنے والوں سے اوزاروں کی فراہمی کی درخواست کی اور انہوں نے اسے اوزار فراہم کر دیے تھے۔

سفینہ نے سارے گرما میں سخت محنت کر کے اپنے لیے چھوٹا سا اور موسموں سے محفوظ گھر تلاش کر لیا تھا۔ ابھی تک وہ یہاں اکیلی تھی اور اسے ڈر بھی نہیں لگتا تھا۔ وہ جو دیکھ اور بھگت چکی تھی اس کے بعد وہ ہر خوف سے بے نیاز ہو گئی تھی۔

جب تک وہ اپنے گھر اور زمین کو آباد نہیں کر لیتی اسے حکومت کی طرف سے امداد ملتی رہتی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ سردیوں کے بعد اپنی زمین پر کام کرے گی۔ پھر وہ سرما میں سراجیوو چلی گئی اور وہاں عورتوں کی بحالی کے ایک مرکز میں بہ طور رضا کار کام کرنے لگی۔ اس وقت اس کی قوم کو ایک ایک فرد کی ضرورت تھی لہٰذا وہ سرما اپنے محفوظ گھر میں آرام کر کے نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ اس مرکز میں وہ عورتیں تھیں جو جنگ میں اپنے رشتے اور اپنی عصمت دونوں کھو چکی تھیں ان میں سے کئی کی گود میں ایسے بچے تھے جن کے باپ سرب تھے۔ یہ شدید ذہنی اور جسمانی خرابیوں کا شکار تھیں اور مرکز میں ان کی بحالی کی کوشش کی جاتی تھی۔

یہیں سفینہ کی ملاقات اسدالدین سے ہوئی۔ وہ سربر نیکا کا رہنے والا تھا اور ان چند افراد میں سے ایک تھا جو وہاں ہونے والے قتل عام سے بچ نکلے تھے لیکن اس قتل عام میں اس کے خاندان کے سترہ افراد مارے گئے تھے جن میں اس کی بیوی اور دو بچے بھی شامل تھے۔ وہ اپنے خاندان میں بچنے والا واحد فرد تھا۔ دونوں زخم خوردہ تھے۔ اس لیے جلد ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔

بوسنیا کی حکومت بچ جانے والے جوان مرد اور عورتوں کی شادی کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی اور ایسے ہر جوڑے کو آبادکاری کے لیے معقول رقم اور زمین بھی دی جا رہی تھی۔ سفینہ نے اسدالدین کو اپنے گاؤں کے بارے میں بتایا۔ وہ چاہتی تھی کہ اسد اور دوسرے لوگ چل کر اس کے گاؤں کو پھر سے آباد کریں۔ سراجیوو میں بے شمار مسلمان ایسے تھے جو سرب اکثریتی علاقوں سے جان بچا کر آئے تھے اور جنگ کے بعد بھی وہاں واپس نہیں جا سکتے تھے۔ انہیں بوسنیا کی بالکل تباہ ہو جانے والی بستیوں میں بسایا جا رہا تھا۔ سفینہ نے اپنے گاؤں کا نام بھی پیش کر دیا۔

جب وہ سرما کے خاتمے پر گاؤں جانے کے لیے تیار ہوئی تو اس کے ساتھ تیس سے زیادہ مرد و زن پر مشتمل ایک قافلہ تھا جو اس کے گاؤں میں آباد ہونے جا رہا تھا۔ ان میں اسد بھی تھا لیکن اس نے ابھی تک سفینہ سے شادی کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ اسے پسند کرتا تھا۔ جب وہ گاؤں پہنچے تو برف پگھل رہی تھی اور درختوں پر نئے پتے آ رہے تھے۔ ان لوگوں نے پرانے کھنڈرات کے بجائے گاؤں کو نئے سرے سے اور منظم انداز میں بسانے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے مسجد کے لیے ایک جگہ مخصوص کر دی اور پھر اس کے گرد اپنے لیے مکانات کی تعمیر شروع کر دی۔ انہوں نے زمین ہموار کی اور اس کے ساتھ ہی کھیت اور باغات کو بھی بحال کرنے لگے۔

اسد نے اپنے لیے کوئی جگہ منتخب نہیں کی تھی وہ مسجد میں رہ رہا تھا اور اس تعمیر کا زیادہ تر کام وہی کر رہا تھا۔ بہار اور پھر گرم موسم بھی گزر گیا اور سردیوں کے آثار نظر آنے لگے۔ تب سفینہ نے ہمت کر کے خود اسد سے کہا۔ ”کیا تم اپنا گھر نہیں بساؤ گے؟“

اسد جیسے اس کے جملے کا منتظر تھا اس نے سفینہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ”اگر تم مجھے اپنے گھر میں جگہ دو گی تو اسے ضرور آباد کروں گا۔“

تب سفینہ کی سمجھ میں آیا وہ اس کی طرف سے پہل کا منتظر تھا کیونکہ یہ اس کا گاؤں تھا۔ اسے آباد کرنے کے لیے اس کی اجازت کی ضرورت تھی۔ سفینہ نے مسکرا کر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”میرا گھر اب تمہارا ہے۔“

آج سفینہ اپنے گھر میں اپنے شوہر اسد اور چار بچوں کے ساتھ رہ رہی ہے۔ اس سانحے کو سترہ سال گزر چکے ہیں اور گاؤں کی حد تک اس کے آثار مٹ گئے ہیں۔ لیکن جس نسل نے بربادی جھیل کر آبادی کی ہے اس کے دلوں میں یہ آثار ہمیشہ موجود رہیں گے۔ گاؤں کی آبادی پھر سے بڑھ کر کوئی پانچ سو نفوس پر مشتمل ہو گئی ہے۔ اگرچہ ان میں سوائے سفینہ کے کوئی بھی اس گاؤں کا پرانا باسی نہیں ہے لیکن سفینہ جانتی ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ لوگ آتے جاتے رہتے اور گاؤں آباد رہتے ہیں۔ آج اس کا گاؤں پھر آباد ہو گیا تھا۔

فلمی نگری

شومین

انور فرہاد

ماضی میں پاکستانی فلم انڈسٹری اپنی مثال آپ تھی، پھر گویا ایک سازش ہوئی اور حکومت کے خزانے کو لبا لب بھر دینے والی فلمی صنعت چور چور ہو گئی۔ ہنر مند شرفا آہستہ آہستہ الگ ہوتے چلے گئے۔ ایسے وقت میں گنے چنے کامیاب لوگ رہ گئے جنہوں نے موت کی کگار پر پہنچ جانے والی اس صنعت کو سنبھالا دیا اور نامساعد حالات میں بھی جی جان سے محنت کرتے رہے، انہی میں سے ایک بڑے نام کا ذکر جس نے پاکستانی فلمی صنعت کو سنبھالے رکھا۔

فلمی صنعت کے ایک اہم فرد کی داستان جہد داستان

فلمیں بنتی تو بہت ہیں مگر اچھی فلمیں کم بنتی ہیں۔ یہ بات صرف ہم پر ہی صادق نہیں ہوتی۔ پوری دنیا کی فلم انڈسٹریز کا یہی حال ہے۔ کیونکہ اچھی فلمیں اچھے فلم میکرز ہی بناتے ہیں۔ اگر ہم اپنے وطن عزیز کے تناظر میں بات کریں تو ایک زمانہ تھا جب ہمارے ہاں سال بھر میں خاصی فلمیں بنا کرتی تھیں اور اچھی فلمیں بھی اچھی تعداد میں ہوتی تھیں مگر وقت سدا ایک سا نہیں رہتا۔ اس لیے فلم سازی کے میدان میں بھی تبدیلی آئی۔ اچھے فلم میکرز آہستہ آہستہ فیڈ

آؤٹ ہوتے گئے اور ان کی جگہ غلط قسم کے اور نان ٹیکنیکل لوگ آتے گئے۔ جس کا نتیجہ سامنے آنا ہی تھا وہ آیا مگر اللہ کا شکر ہے کہ برے وقت میں بھی کچھ اچھے لوگ اچھی فلمیں بنا کر فلمی صنعت کی ڈوبتی نیا کو بچا رہے ہیں۔

اچھے لوگ چاہے زندگی کے جس شعبے سے بھی تعلق رکھتے ہوں، بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ آج ہم اس نشست میں ایک ایسی ہی فلمی شخصیت کی باتیں کریں گے جو بڑی خوبیوں کی مالک ہے۔ جس سے ہماری فلم انڈسٹری کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ جس نے فلم سازی کے کئی شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اس لیے وہ شوبز کی دنیا میں سب کے لیے قابلِ احترام۔

ہمارے ہاں ایک بہت غلط رواج ہے کہ جب کوئی بڑا آدمی، بڑا فنکار، بڑا کلاکار، بڑا ادیب بڑا شاعر اس جہان فانی سے گزر جاتا ہے تو تب لوگ اس کے گن گاتے ہیں۔ اس کے بارے میں اپنی محبت اور عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔ لیکن اس کی زندگی میں اسے صفر بنائے رکھتے ہیں۔

ہم اسی غلط روایت کو توڑنے کے لیے ہی اپنے ایک لیجنڈ کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ہی آپ کے پاس موجود ہیں۔

یہ عہد حاضر کے بہترین ہدایت کار اور اپنی ذات میں اکیڈمی کی حیثیت رکھنے والے شومین سید نور ہیں۔

یہ بات ہم نے یوں ہی نہیں کہی ہے۔ جیسے جیسے اس تحریر میں آپ ان کے بارے میں پڑھتے جائیں گے ہماری بات کی سچائی آپ پر روشن ہوتی جائے گی۔

سید نور کو پاکستانی فلمی صنعت کا ''شومین'' کا خطاب دیا گیا ہے۔ یہ بہت بڑا خطاب ہے اور ہر کسی فنکار کو عطا نہیں کیا جاتا۔ اس کے لیے راجکپور اور سید نور جیسے گرانقدر خدمات درکار ہوتی ہیں۔ پاکستان میں ''تیری یاد'' کے دور سے اب تک کسی اور فلمی شخصیت کو اس اعزاز سے نوازا نہیں گیا۔ اس لیے ہمیں سید نور پر فخر ہے۔

سید نور سے پہلے بھارت میں شومین کا خطاب راج کپور کو ان کی فنکارانہ عظمت اور بہترین فنی خدمات کے صلے کے طور پر اس خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا۔ پاکستانی فلم انڈسٹری کی بہترین خدمات کے لیے جو انہوں نے فلمی صنعت کے شدید ترین بحران کے دور میں نہایت عمدگی سے سرانجام دیے اسی پر ان کو شومین کا خطاب عطا کیا گیا۔

ہمارے شومین نے انتہائی آزمائشی دور میں نہایت عمدہ اور مثالی فلم میکنگ کا مظاہرہ کر کے اپنی فنی استطاعت کا جو ثبوت دیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ انہوں نے تفریحی، اصلاحی اور کامیاب ترین سپرہٹ فلمیں تخلیق کر کے فلمی صنعت کو زوال کے بھنور سے نکالا۔ ان کا یہ کارنامہ کسی صورت بھی کسی دور میں فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ فلمی تاریخ کا مؤرخ ان کے اس کارنامہ کو سنہری حروف میں لکھے گا۔

سید نور کے کئی فنی روپ ہیں۔ وہ ایک کامیاب فلم رائٹر ہیں۔ ایک مستند ڈائریکٹر ہیں اور ایک قابل اعتماد فلم ساز بھی ہیں۔ شائقین صرف ان کا نام دیکھ کر فلم دیکھنے جاتے ہیں۔ انہوں نے ایسے کئی آرٹسٹ فلم انڈسٹری سے متعارف کرائے جو پاکستانی فلمی صنعت کا اثاثہ ثابت ہوئے۔

سید نور نے جب اپنا فلمی کیریئر شروع کیا تھا، وہ پاکستانی فلمی صنعت کا سنہری دور تھا۔ ایسے دور میں کسی نئے اور نوآموز کا قدم جمانا بڑا دشوار ہوتا ہے مگر ان کے اندر پوشیدہ فنی صلاحیتوں نے اجاگر ہو کر انہیں بڑے بڑوں کے سامنے ثابت قدم رکھا۔ انہوں نے فلمی صنعت کا سنہری دور بھی دیکھا اور زوال کا صبر آزما زمانہ بھی۔ زوال کے دور میں جہاں بہت سے لوگ انڈسٹری کا ساتھ چھوڑ گئے کہ اب یہاں موجود رہنا مناسب نہیں مگر یہ جواں ہمت سید نور تھے کہ انہوں نے ایسے برے حالات میں بھی بھاگنا گوارا نہ کیا۔

ان پر ایک ایسا دور بھی آیا کہ انہیں گن پوائنٹ پر مجبور کیا گیا کہ تم پنجابی ہو پھر بھی اردو فلمیں لکھتے ہو اور اردو فلمیں بناتے ہو تمہیں پنجابی فلمیں بھی بنانی ہیں۔ اپنی ماں بولی میں اگر فلم نہیں بناؤ گے تو نقصان میں رہو گے۔

پنجابی میں فلم نہ بنانا سید نور کا جرم ضرور تھا مگر اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ پنجابی فلم بنانا نہیں چاہتا تھا۔ خود اس کی خواہش تھی کہ وہ پنجابی فلم بنائے لیکن اس دور میں مار دھاڑ، عریانی اور فحاشی سے بھرپور پنجابی فلمیں بنائی جا رہی تھیں سید نور اس نوعیت کی فلم نہیں بنا سکتے تھے۔

مگر انسان کو جان بہت پیاری ہوتی ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا، لہٰذا سید نور نے کہا۔ ''بندوق کی نال ہٹاؤ۔ میں پنجابی فلم بناؤں گا۔''

اس کے بعد انہوں نے پنجابی فلم بنائی مگر وہ جو کہتے ہیں کہ اصل سے خطا نہیں اور کم اصل سے وفا نہیں۔ سید نور

نے پنجابی فلم بنائی ضرور مگر اس میں پنجابی فلموں کا مال مسالہ نہیں ڈالا۔ نہ گنڈا اسا تھا نہ برادری ازم کی لڑائی بھڑائی۔ نہ پنجاب کے اصل کلچر کو بدنام کرنے والے عریانی اور فحاشی کی بے ہودگی تھی۔ سید نور نے جو پنجابی فلم بنائی اس میں پنجاب کو اس کے اصل روپ میں پیش کیا۔ اس فلم کی تکمیل کے دوران میں جن لوگوں نے اس کی شوٹنگ دیکھیں انہوں نے یہی کہا۔ ''یہ تو ایک ڈاکومنٹری فلم ہے۔ پنجابی فلم دیکھنے والوں کے لیے اس میں کوئی جاذبیت نہیں۔''

سید نور کو بھی اس بات کا اندازہ تھا کہ ان کی اس فلم کا کیا حشر ہوگا اور اس بات کا ڈر بھی تھا کہ اب کی بندوق بردار ان کی اس گستاخی کا کیا جواب دیں گے۔ لہٰذا اپنی سلامتی کے لیے وہ اس فلم کی نمائش سے پہلے دبئی چلے گئے۔ نمائش کے روز وہ لاہور سے کسی دوست کے فون کے منتظر تھے کہ جو یہ بتاتا۔ ''یار! وہ سینما گھر جس میں تمہاری فلم ریلیز ہوئی تماشائیوں نے اسے تہس نہس کر دیا۔ تمہارا بھی حشر نشر ہوگا تمہاری تلاش جاری ہے۔''

اپنی سوچ میں گم وہ دھڑکتے دل کے ساتھ ٹیلی فون کے پاس بیٹھے رہے۔ پھر جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور انہوں نے ریسیور کان سے لگایا تو ان کی حالت دیدنی تھی۔ آواز آئی۔ ''شاہ جی۔ چوڑیاں ہٹ ہوگئی سپرہٹ۔''

''مذاق نہ کر یار! میری جان پر بنی ہوئی ہے۔ سچ سچ بتاؤ۔''

''بالکل سچ بتا رہا ہوں۔ اتنا اچھا رسپانس شاید ہی تمہاری کسی فلم کو ملا ہوگا۔''

اب بھی سید نور کو دوست کی بات کا یقین نہیں آرہا تھا۔ کیونکہ انڈسٹری میں ''چوڑیاں'' کو ایک ڈاکومنٹری فلم سے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی تھی مگر یہ کیا ماجرا ہوگیا۔ کیسے ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ ذرا پُرسکون ہوئے تو خود لاہور فون کیا اور ایک دو جاننے والوں سے پوچھا۔

''چوڑیاں'' کی کیا رپورٹ ہے؟''

''سپرڈپرہٹ۔''

''کیوں میرا مذاق اڑا رہے ہو۔''

''خدا کی قسم سچ کہہ رہا ہوں۔''

ہر ایک نے جب ایک ہی جیسا جواب دیا تو انہوں نے اپنے ڈسٹری بیوٹر سے رابطہ کیا۔ ان کی آواز سن کر تقسیم کار بول پڑا۔ ''ارے یار! تم کہاں ہو۔ ہم تو تمہیں پھولوں

زندگی نامہ

خاندانی نام...... محی الدین نور

قلمی نام...... سید نور

پیدائش...... 21 فروری 1951ء

تعلیم...... صحافت میں بیچلرز کی ڈگری

فلمی کیرئیر...... 1970ء میں فلم انڈسٹری جوائن کرلی کیرئیر کا آغاز بطور فیچر رائٹر کیا۔

1970ء سے 1975ء تک ایس سلیمان کے ساتھ بطور اسسٹنٹ کام کیا۔ 1976ء میں پہلا فلم اسکرپٹ لکھا جس پر سوسائٹی گرل نام سے فلم بنی۔

پہلی فلم بطور ہدایت کار...... قسم جو 1993ء میں ریلیز ہوئی

اب تک 55 کے قریب فلمیں ڈائریکٹ کر چکے ہیں۔

شادی...... دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی صحافی ادیبہ و شاعرہ رخسانہ نور سے 20 اپریل 1984ء کو دوسری اداکارہ صائمہ سے 2005ء میں۔

بچے...... رخسانہ نور سے چار بچے ہیں۔ تین بیٹیاں ایک بیٹا۔ بیٹیاں شادی شدہ ہیں اور بال بچے دار۔ بیٹا لاہور میں باپ کے ساتھ پیراگون اکیڈمی سے وابستہ ہے۔

کے ہار پہنانے اور تمہارا منہ میٹھا کرانے کے لیے پورے شہر میں تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔''

''کیوں کیا چوڑیاں کی رپورٹ اتنی خراب ہے کہ تم لوگ......''

''نہیں شاہ جی خراب نہیں، بہت اچھی رپورٹ ہے۔ ہم تو زیادہ سے زیادہ سینما گھر انگیج کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اچھائی کی پذیرائی ضرور ہوتی ہے۔ ''چوڑیاں'' اس لیے سپرہٹ ہوئی کہ پنجابیوں کو اس میں اصل پنجاب نظر آیا۔ وہ جو ایکشن کے نام پر مار دھاڑ، خون خرابہ دیکھتے رہے تھے ان سے انہیں نجات ملی تھی۔

''دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں تخن ور سہرا۔'' کے مصداق ہر فلم بین دوسرے سے کہتا۔ ''جاؤ دیکھو چوڑیاں

ایسی ہوتی ہیں پنجابی فلمیں۔"

اس کے بعد "مجاجن" اور کئی دوسری پنجابی فلمیں بنا کر سید نور نے پنجابی فلموں کی آبرو بچائی۔ ان پر بندوق کی نال رکھنے والوں کو پنجابی فلم بنانے سے مطلب تھا، سید نور نے ان کا مطالبہ پورا کیا اور ایسی پنجابی فلمیں بنائیں جنہیں باکس آفس پر بھی پذیرائی ملی اس طرح وہ پنجابی فلموں کے بھی دولہا بن گئے۔

سید نور کا فنی سفر بھی جہاں بہت پُرنور ہے وہاں بڑا عجیب بھی ہے۔ سید نور نے سید سلیمان جیسے کامیاب اور لیجنڈ ڈائریکٹر کے اسسٹنٹ کی حیثیت سے اپنا فلمی کیریئر شروع کیا۔

جس شخص کی تربیت اس قدر عمدہ ماحول میں رہ کر ہوئی ہو، جس ماحول میں آکر لوگ خود پر فخر کیا کرتے تھے تو یقیناً وہی سب کچھ اس میں آگیا۔ شخصیت، کردار اور فن کی وہ ہی بلندی اس میں آگئی۔

جب سید سلیمان سے ہدایت کاری کی تربیت حاصل کرنے والے سید نور نے اپنے فنی سفر کا آغاز کیا تو لوگ حیران ہوئے بغیر نہیں رہے۔ کیونکہ اس نے ہدایت کاری کو یکسر تج دیا تھا، تبھی تو لوگ کہہ رہے تھے۔

"ارے اس نوجوان نے تو ہدایت کاری کی تربیت حاصل کی تھی مگر یہ کیا، اس نے فلم رائٹر کی حیثیت سے فلم انڈسٹری میں پہلا قدم رکھا۔"

یہ سنگیتا کی پہلی فلم "سوسائٹی گرل" تھی۔ 16 اپریل 1976ء کو "سوسائٹی گرل" سینما گھروں کی زینت بنی اور سید نور کی منفرد کہانی کی وجہ سے ہٹ ہوگئی۔ فلم والوں کی حیرانگی بجا تھی کہ ہدایت کاری کی بجائے اس نے فلم رائٹنگ کا شعبہ اپنایا تھا اور کمال کر دیا تھا۔ ایسی کہانی لکھی تھی کہ سنگیتا جیسی نو آموز کو کامیاب ہدایت کاروں کی صف میں کھڑا کر دیا تھا۔

☆......☆

سید نور کو لکھنے پڑھنے کا شوق ابتداء سے ہی تھا۔ وہ لکھتے بھی تھے اور چھپتے بھی تھے۔ لاہور یوں بھی لکھنے پڑھنے والوں کا شہر ہے۔ سید نور کو بھی یہاں کی ہواؤں اور فضاؤں نے لکھنے لکھانے کی طرف مائل کیا۔ اپنے اس شوق کی وجہ سے انہوں نے کچھ دنوں تک صحافت بھی کی مگر جب اپنے مستقبل کی منزل کے تعین کا وقت آیا تو فلم انڈسٹری کا ہی انتخاب کیا۔ فلم رائٹنگ کا سلسلہ شروع ہوا تو آج تک کامیابی کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ فلمیں بنا بھی رہے ہیں، ان کی ہدایات بھی دے رہے ہیں اور ان کی کہانیاں، مکالمے اور اسکرین پلے بھی لکھ رہے ہیں۔

دراصل یہ لکھنا بھی ایک نشہ ہے۔ چھٹتی نہیں منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ ان کے اس لکھنے لکھانے کا شوق ہی تھا جس نے اپنی شریک حیات کے لیے ایک ایسی ہی لڑکی کا انتخاب کیا جو خود بھی رائٹر تھی۔ شاعرہ تھی۔ ادیب تھی۔ صحافی تھی۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے میں رخسانہ نور کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ جو ان کی پہلی منکوحہ بیوی تھیں۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔ (آمین)

سید نور مصنف ہیں، ہدایت کار ہیں، فلم ساز ہیں، یہ سب لوگ جانتے ہیں مگر بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ انہوں نے فلموں میں اداکاری بھی کی ہے۔ یوں بھی دیکھنے میں وہ ایک وجیہہ اور پُرکشش جوان ہیں اور دیکھنے والوں کو... ہیرو ہی نظر آتے ہیں مگر یہ بہت پہلے کی بات ہے۔ ان کی بطور اداکار پہلی فلم "جدائی" تھی جو پنجابی زبان میں بنائی گئی تھی۔ یہ 1984ء میں سینماؤں کی زینت بنی تھی۔ اس کی کاسٹ میں سید نور کے علاوہ رانی، نازلی، ننھا وغیرہ شامل تھے۔ اس فلم کی خاص بات یہ تھی کہ مشہور بھارتی فلم باغبان، جدائی کی کاپی تھی۔ اس کی کہانی "جدائی" کی کہانی سے مستعار لی گئی تھی۔ "جدائی" کے بعد بھی نور صاحب متعدد فلموں میں بطور اداکار پیش ہوئے لیکن اہم کرداروں میں نہیں، ثانوی کرداروں میں یا مہمان اداکار کے طور پر۔ پھر شاہ جی نے خود ہی اداکاری ترک کردی۔ کیونکہ وہ فلم میکر کے ساتھ ساتھ اسٹار میکر بھی بن گئے تھے۔ انہوں نے نہ صرف کئی نئے لڑکے لڑکیوں کو اداکاری کے میدان میں لا کر بہترین پرفارمر بنایا بلکہ کئی ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کو چاند سورج بنا دیا۔ فلمی صنعت کے زوال کے باعث ناکام ہوجانے والے شان کو اپنی فلم "گھونگھٹ" سے ایسا کامیاب کرایا کہ وہ سپر اسٹار بن گیا۔ عام اداکاراؤں میں شامل ہونے والی صائمہ کو سید نور نے دورِ حاضر کی سب سے بڑی ہیروئن بنا دیا۔ یہ سید نور ہی تھے جنہوں نے بابر علی اور ریشم جیسے جواں سال ہیرو ہیروئن متعارف کرائے۔ اداکار اور گلوکار عدنان سمیع کو نور صاحب نے اپنی فلم "سرگم" میں پہلی بار پیش کیا۔ اسی فلم سے شہرت حاصل کر کے وہ بولی ووڈ کے سپر کلاکار بنے۔

سید نور ایک دن میں شو مین نہیں بنے۔ اس مقام تک پہنچنے کے لیے انہیں بڑی جدوجہد کرنی پڑی۔ بطور رائٹر ان

کی پہلی فلم ''سوسائٹی گرل'' 1976ء میں ریلیز ہوئی۔ ''دشمن چلو'' ان کے فنی کیریئر کی پہلی پنجابی فلم تھی۔ اس کے انہوں نے صرف مکالمے لکھے تھے۔ یہ 1979ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ ''سوہرا تے جوائی'' ان کی وہ پہلی فلم تھی جس کی کہانی اور مکالمے انہوں نے تحریر کیے تھے۔ یہ پنجابی فلم 1981ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ فلم ''قسم'' ان کی وہ پہلی فلم تھی جس سے انہوں نے فلم ساز و ہدایت کار کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ یہ فلم 1993ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ وہ دور تھا جب پاکستانی فلمی صنعت انتہائی زوال کا شکار تھی۔ یہی وہ دور تھا جب غیر معیاری فلم میکنگ کے باعث دل برداشتہ ہو کر جناب الیاس رشیدی نے نگار ایوارڈ کا سلسلہ بند کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ زوال کے اس بدترین دور میں فلمی صنعت کی ڈوبتی نیا کو بچانے کے لیے سید نور کی آمد فلم انڈسٹری کے لیے ہوا کا تازہ جھونکا ثابت ہوئی۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے سنگم، سرگم، زیور، ہوائیں، ہم ایک ہیں، کمانڈو، محافظ جیسی شاہکار فلمیں بنائیں۔ پھر چور مچائے شور، دیوانے تیرے پیار کے، جیوا، گھونگھٹ، ڈاکو رانی، مجاجن جیسی سپرہٹ فلمیں پیش کیں۔ ان کی فلم ''چوڑیاں'' نے کامیابی اور بزنس کے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیے تھے۔

ان کی کامیابیوں کے پیچھے جو عوامل کارفرما ہیں ان میں سب سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ وہ ہمیشہ مختلف موضوعات پر منفرد فلمیں بناتے ہیں۔ گھریلو، رومانی، تفریحی اور اصلاحی فلم میکنگ کے وہ ماہر مانے جاتے ہیں۔ ایکشن فلمیں انہیں پسند نہیں لیکن فرمائشی طور پر انہوں نے ایکشن فلمیں بنا کر یہ ثابت کیا ہے کہ وہ ایکشن فلمیں بھی بنا سکتے ہیں۔ ان کی دیگر فنی خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کہانی کار بھی ہیں۔ ہر فلم کے لیے ایک نئی اور اچھوتی کہانی لکھنا اور ان پر فلم بنانا ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ مجھے ان میں ظہیر ریحان جیسی کچھ باتیں مشترک نظر آتی ہیں۔ میں سابق مشرقی پاکستان کے مایہ ناز مصنف و ہدایت کار ظہیر ریحان کی بات کر رہا ہوں جنہوں نے متعدد منفرد اور یادگار بنگالی فلموں کے علاوہ پاکستان کی پہلی رنگین فلم ''سنگم'' اور پہلی سینما اسکوپ فلم ''بہانہ'' بنائیں۔ ظہیر ریحان بھی بنیادی طور پر فکشن رائٹر تھے۔ وہ خود اپنی فلموں کی کہانی لکھتے تھے۔ جو موضوع اور تھیم کے لحاظ سے اچھوتی ہوتی تھیں جب کہ ان کی ڈائریکشن کا معیار بھی بلند تھا۔ اچھے کاروار جیسے پختہ

سید نور بطور ہدایت کار

قسم۔ جیوا۔ چور مچائے شور
سنگم۔ چوڑیاں۔ مجاجن۔
ڈاکو رانی۔ گھونگھٹ۔ کمانڈو۔ زیور۔ زور
دیواریں۔ ہوائیں۔ راجو بن گیا جنٹلمین۔
دیوانے تیرے پیار کے۔ دوپٹا جل رہا ہے۔
جنگل کوئین۔ باغی لڑکی۔ دل دیوانہ ہے۔ سرگم۔
ہم ایک ہیں۔ محافظ۔

☆☆☆

سید نور کی بطور کہانی نویس فلمیں

سنگدل۔ ڈائمنڈ جوبلی
دلبر۔ ڈائمنڈ جوبلی
بوبی۔ ڈائمنڈ جوبلی
ڈاکو رانی۔ ڈائمنڈ جوبلی
چور مچائے شور۔ ڈائمنڈ جوبلی

☆☆☆

سید نور کی وہ فلمیں جن کی کہانیاں خود نہیں لکھیں

سید نور جنہوں نے بطور مصنف بے شمار فلموں کی کہانیاں لکھیں، وہاں انہوں نے خود اپنی کئی فلموں کی کہانیاں تحریر نہیں کیں۔ ان کی کہانیاں ان کی شریک حیات رخسانہ نور نے تحریر کیں جو کامیاب بھی ثابت ہوئیں اور ان پر بطور کہانی نویس رخسانہ نور کو ایوارڈز اور اعزازات بھی ملے۔ ان فلموں میں ''ہوائیں۔ چوڑیاں۔ مہندی والے ہتھ اور سنگم'' قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں ''ہوائیں۔ چوڑیاں، مہندی والے ہتھ'' کو بہترین کہانی نویس کے نگار ایوارڈز ملے جبکہ ''سنگم'' اور ''چوڑیاں'' کو بہترین کہانی نویس کے قومی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

ان کے علاوہ بھی سید نور کی دیگر فلمیں ہیں جن کی کہانیاں اور مکالمے رخسانہ نور نے لکھے۔ ان میں ''دیوانے تیرے پیار کے''۔ زیور۔ دیواریں۔ دوپٹا جل رہا ہے۔ جنگل کوئین۔ دل دیوانہ ہے۔ باغی لڑکی اور جھومر قابلِ ذکر ہیں۔

ہدایت کار ظہیر ریحان کے پہلے استاد تھے۔ فیض احمد فیض صاحب نے انہیں بین الاقوامی معیاری فلم ''جاگو ہوا سویرا'' کے یونٹ میں شامل کیا تھا۔

ہمارے ہاں زیادہ تر فلم میکر اچھی کہانیوں کا شعور نہیں رکھتے۔ پیشہ ور کہانی کار نے جو کچھ لکھ کر دے دیا اس پر فلم بنا لی۔ ایسی کہانیاں زیادہ تر عامیانہ انداز کی ہوتی ہیں۔ جب کہ کچھ فلم ساز و ہدایت کار کسی سپر ہٹ فلم کا حوالہ دے کر رائٹر سے کہتے ہیں۔ ''بس...... اسی طرح کی کوئی کہانی لکھ دو۔''

مگر قند مکرر کے طور پر بنائی گئی یہ فلمیں پہلی فلم جیسی کامیابی حاصل نہیں کرتیں۔ سید نور نے بطور مصنف دوسرے فلم سازوں اور ہدایت کاروں کے لیے بھی جو کہانیاں لکھیں ان میں بھی اس بات کا خیال رکھا کہ وہ بھی منفرد ہوں۔ مثال کے طور پر سنگدل، دلبر اور بوبی۔ ان تینوں فلموں نے ڈائمنڈ جوبلی کا اعزاز حاصل کیا۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ کوئی کسی کو آسانی سے تسلیم نہیں کرتا۔ اپنے آپ کو منوانا بڑا مشکل اور صبر طلب کام ہے۔ کارکردگی ہی حسن کارکردگی کے اعزاز اور اکرام سے نوازتی ہے مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اچھے کام کو اچھا انعام ضرور ملتا ہے۔ پھر بھلا سید نور کو ان کی بہترین کارکردگی کا صلہ کیوں نہیں ملتا؟ انہیں قومی صدارتی اعزاز ''تمغہ حسن کارکردگی'' اور تمغہ امتیاز سے نوازا گیا اور مختلف شعبوں میں سال بھر کی بہترین کارکردگی پر 20 سے زائد نگار ایوارڈز بھی حاصل کیے جب کہ پرائیویٹ طور پر دیگر ایوارڈز دینے والوں نے بھی ان کی فنی خدمات پر اعزاز واکرام سے نوازا۔

سید نور خاصے پڑھے لکھے اور باشعور فلم میکر ہیں۔ اس لیے میڈیا کا مقابلہ بھی بڑی جواں مردی سے کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی 41 سالہ فنی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ نرم گرم، تلخ ترش حالات سے گزرے ہیں اس لیے صحافیوں کے سخت تنقید و تبصرے پر گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھتے نہیں، بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔ حال ہی میں جب ان کی تازہ ترین فلم ''چین آئے نہ'' نمائش کے مرحلے میں تھی ایک میڈیا مین نے ان سے کہا۔ ''شاہ جی! آپ پر الزام ہے کہ گزشتہ پانچ سالوں میں آپ نے کوئی فلم عوام کے لیے نہیں پیش کی اور اس سے قبل آپ نے پنجابی فلموں کو زیادہ پروجیکٹ کیا جس کی وجہ سے آپ کی اردو فلموں کی تعداد کم ہوگئی۔''

شاہ جی نے بڑے اعتماد اور پُرسکون انداز میں جواب دیا۔ ''پنجابی بھی ہمارے ملک کی زبانوں میں سے ایک ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے چوڑیاں، مجاجن اور مہندی والے ہتھ جیسی معرکتہ الآرا پنجابی فلمیں بنا کر عوام کو میوزیکل فلمیں دیں جو تشدد اور مار دھاڑ سے پاک ہیں۔ اب اس میں میرا کیا قصور کہ دیگر فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے سوائے قتل و غارت گری اور برادری ازم پر مبنی فلمیں بنائیں جن سے ہمیں نقصان پہنچا جب کہ میں نے 90ء کی دہائی میں اردو فلمیں بنائیں تو میرے ساتھ ہی میڈم شمیم آراء، سنگیتا بیگم، اقبال کاشمیری اور حسن عسکری وغیرہ نے بھی قومی زبان کی معیاری فلمیں بنا کر میرا اور فلم انڈسٹری کا حوصلہ بڑھایا۔ جب کہ پنجابی فلموں میں ایسا کچھ نہیں کیا گیا۔ سید نور نے اس موقع پر یہ بھی کہا۔ ''ایک وقت ایسا بھی آیا کہ پاکستانی سینماؤں پر بھارتی فلموں کا راج ہوگیا جس کی وجہ سے پاکستانی اردو فلمیں سینما مالکان کی ضرورت نہ رہیں۔ اس طرح ہماری بڑی بڑی فلمیں مناسب سینما گھر دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے وہ کامیابی حاصل نہ کرسکیں جو ان کا حق تھا۔ اس کی سب سے بڑی اور زندہ مثال ''بھائی لوگ'' اور ''لو میں گم'' ہے جو حقیقتاً معیاری فلمیں تھیں۔ انہیں نمائش کا بہترین موقع ملتا تو وہ باکس آفس پر نمایاں کامیابی حاصل کرتیں لیکن وہ سینما آنرز کی مفاد پرستی کی بھینٹ چڑھ گئیں۔'' اس کے بعد شاہ جی بولے۔ ''یہی وہ واقعات اور حالات تھے جن کی وجہ سے میں نے کچھ عرصہ تک ایک خاص سرکٹ کے لیے فلمیں بنائیں اور صحیح وقت کا انتظار کیا اور عوام کو پانچ برس تک مجھ سے دور رہنا پڑا لیکن عوام کے دلوں میں میری جو محبت اور قدر ہے وہ برقرار رہی۔ میں اس عوامی جذبے کو سلام تحسین پیش کرتا ہوں اور اپنے چاہنے والوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ اب انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ فلموں میں طویل گیپ نہیں آنے دوں گا۔''

سید نور کے بارے میں جیسا کہ عرض کرچکا ہوں ایک سچے اور کھرے انسان ہیں۔ ان کا ایک اپنا انداز ہے۔ جب گن پوائنٹ پر ان سے پنجابی فلم بنانے کو کہا گیا تو انہوں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے میں پنجابی فلم بناؤں گا۔''

انہوں نے پنجابی فلم بنائی مگر اپنی جان بچانے کے لیے اپنے اصولوں کا خون نہیں بہایا۔ جیسی صاف ستھری اور بامقصد اردو فلمیں بناتے تھے ویسی ہی نکھری اور ستھری پنجابی

فلم بنا کر معترضین کے منہ بند کر دیے۔

جب کسی شخصیت کی حیثیت عوامی ہو جائے تو اسے اس کے چاہنے والے جہاں اس پر تعریف و توصیف کے ڈونگرے برساتے ہیں وہاں تیز و تند الزامات کے تیر بھی چلاتے ہیں۔ ان پر ایک الزام یہ بھی لگایا گیا کہ وہ شان اور خصوصاً صائمہ کے بغیر فلم نہیں بنا سکتے۔

اس سلسلے میں شاہ جی نے اپنی صفائی یوں پیش کی۔

''شان اور صائمہ پاکستانی فلم انڈسٹری کے بڑے اسٹارز ہیں۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگا لیں کہ آج بھی کسی عوامی مقام پر ان دونوں اسٹارز کو کھڑا کر دیں۔ آپ کو خود پتا چل جائے گا کہ شہرت اور مقبولیت کیا ہوتی ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ شان اور صائمہ کی مقبولیت کم ہو چکی ہے تو میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ گزشتہ دو برسوں میں کراچی میں بنائے گئے کئی ٹی وی ڈراموں میں صائمہ نے مرکزی کردار ادا کیے۔ جن میں انہیں بے حد پسند کیا گیا اور ان ڈراموں کی ریٹنگ نمبر ون رہی۔ آج کل بھی اے آر وائی پر صائمہ کا ڈراما سپرہٹ ہے۔ ٹی وی کمرشل کے لیے بھی وہ موزوں سمجھی جاتی ہیں۔ حال ہی میں ہم نے ترنگ کا کمرشل کیا جس کا ہم دونوں کو ریکارڈ معاوضہ دیا گیا۔ اسی طرح شان آج بھی کارپوریٹ سیکٹر کی پہلی چوائس اور فلموں کی ضرورت ہے لیکن اس کا اپنا مزاج ہے وہ جس کے مطابق کام کرتا ہے لیکن مقبولیت میں اب بھی نمبر ون ہے۔

بے شک یہ دونوں سپر اسٹارز ہیں مگر مجھ پر یہ الزام درست نہیں کہ میں ان کے سہارے اپنی فلموں کو کامیاب کراتا ہوں۔ ان کے بغیر فلم نہیں بناتا اگر ایسی بات ہوتی تو میری تازہ ترین رومانوی فلم ''چین آئے نہ'' میں بھی دونوں رومانوی پیئر ہوتے لیکن اس فلم میں ان کی بجائے میں نے نئے اور ابھرتے ہوئے اداکاروں اور اداکاراؤں کو کاسٹ کیا۔

میں ہمیشہ کہانی کی ڈیمانڈ کو پیشِ نظر رکھ کر کاسٹنگ کرتا ہوں۔ جہاں شان یا صائمہ کی ضرورت ہوتی ہے وہاں ان کو کاسٹ کرتا ہوں۔ جہاں ان کی ضرورت نہیں ہوتی انہیں نہیں لیتا۔ میری اس نئی فلم ''چین آئے نہ'' کی کہانی میں ایک ینگ لڑکی اور لڑکا درکار تھے جو اپنی پہلی محبت شروع کرتے ہیں اس لیے ان کرداروں میں صائمہ اور شان کی جگہ نہیں بنتی تھی۔ جب کہ فلم کے دیگر کردار بھی ان کے لیے موزوں نہیں تھے۔ اس لیے زبردستی انہیں کاسٹ نہیں کیا

سید نور

پہلی فلمی کہانی......سوسائٹی گرل
پہلی بطور اداکار فلم......جدائی (پنجابی)
پہلی بطور ہدایت کار فلم......قسم
پہلی بطور فلمساز فلم......تسلیم
پہلی پنجابی فلم بطور ہدایت کار......چوڑیاں
بطور رائٹر پہلی پنجابی فلم......دوہی چلو
پہلی فلم بطور مصنف و مکالمہ نگار......سوہرا تے جوائی

سید نور کی کہانی کا بھارتی چربہ

سید نور کی یادگار پنجابی فلم ''سوہرا تے جوائی'' کو بھارت میں ''ہنی مون'' کے نام سے بنایا گیا۔ ممتاز اور علی اعجاز نے جو کردار کیے تھے وہ رشی کپور اور ایک نئی ہیروئن سے کروائے گئے۔ مگر ''ہنی مون'' کو سوہرا تے جوائی جیسی کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ سوہرا تے جوائی کی کہانی سید نور کی تحریر کردہ تھی جبکہ اس کے ہدایت کار حیدر چوہدری تھے موسیقی طافو کی تھی۔ اس کی کاسٹ میں مستانہ، علی اعجاز، ننھا، تمنا، شجاعت ہاشمی اور دردانہ رحمٰن شامل تھے۔ یہ مکمل کامیڈی فلم تھی۔

سید نور کی تحریر کردہ دوسری فلم جس کا بھارت میں کامیاب چربہ بنایا گیا وہ پنجابی فلم ''جدائی'' تھی۔ بھارت میں اسی کہانی کو ''باغبان'' کے نام سے فلمایا گیا جس میں امیتابھ بچن اور ہیما مالنی نے کلیدی کردار ادا کیے تھے۔ ''جدائی'' 1986ء کی فلم ہے۔ جس میں رانی، نازلی، ننھا اور سید نور نے اہم کردار ادا کیے تھے۔

سید نور کے دادا استاد

سید نور نے ہدایت کاری کے اسرار رموز نامور ہدایت کار ایس سلیمان سے حاصل کیں۔ انہوں نے کئی برسوں تک ایس سلیمان کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کیا جبکہ ایس سلیمان نے اپنا ابتدائی زمانہ لیجنڈ ڈائریکٹر انور کمال پاشا کی شاگردی میں گزارا تھا۔ یہ پاشا صاحب ہی تھے جنہوں نے ایس سلیمان کو ہدایت کاری سکھائی۔ اس طرح سید نور انور کمال پاشا کو اپنا دادا استاد قرار دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میری استادی کا سلسلہ محترم و مکرم انور کمال پاشا سے جاملتا ہے۔

جاسکتا تھا۔"

انہی دنوں کی بات ہے۔ میرے ایک صحافی دوست نے ان سے کہا۔ "شاہ جی! کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اب لاہور کے پروڈیوسرز ڈائریکٹرز فلمیں نہیں بناسکتے کراچی والے زیادہ بہتر کام کررہے ہیں۔"

شاہ جی نے برملا کہا۔ "یہ سب بکواس ہے۔ کوئی لاہور اور کراچی والی بات نہیں ہے۔ ایک وقت تھا جب فلم انڈسٹری لاہور میں تھی لیکن کراچی کے فنکار، فلم ساز، ہدایت کار، تدوین کار اور دیگر ٹیکنیشنز نے لاہور آکر اپنا نام اور مقام بنایا۔ مل جل کر فلم انڈسٹری کو 60 برسوں تک چلایا۔ دراصل ہماری فلم انڈسٹری نہیں بلکہ سینما انڈسٹری زوال پذیر ہوئی۔ پھر پاکستان میں جیسے ہی سینما انڈسٹری نے ترقی کی ویسے ہی عوام کا مزاج بھی تبدیل ہوا۔ انڈسٹری ہمارے سنگل اسکرین سینماؤں کی دگرگوں حالت کی وجہ سے برباد ہوئی۔ ان کا حال آج بھی برا ہے۔ اسکرینز پرانی ہیں، کینٹین غیر معیاری، باتھ روم، سیٹیں اور بہت کچھ نامناسب ہے۔ اصل میں سینما تنزل ہوا تھا فلم نہیں۔ عوام کا مزاج اب بدل چکا ہے۔ وہ معیاری سینماؤں میں فلم دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ لاہور ہو یا کراچی اچھا سینما وقت کی اہم ضرورت ہے۔ جو لوگ لاہور اور کراچی کی باتیں کرتے ہیں وہ فلم "چھین آئے نہ" سینما گھروں میں آکر دیکھیں۔ انہیں اپنی بات کا جواب مل جائے گا۔"

ذرا پہلے اداکارہ صائمہ کا ذکر خیر ہوا تھا۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے اس فنکارہ کا کچھ ذکر اذکار ہوجائے اور شاہ جی کے حوالے سے ہی ہو۔ یہ بات تو اب کوئی ڈھکی چھپی نہیں رہی ہے کہ یہ موصوفہ صائمہ سے صائمہ نور بن چکی ہیں اور یہ خوشگوار "وقوعہ" رخسانہ نور کی وفات حسرت آیات کے بعد پیش نہیں آیا، ان کی موجودگی میں رونما ہوا۔

رخسانہ نور ایک طویل عرصہ تک اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن تھیں۔ وہ دنیا میں خود کو خوش قسمت ترین عورت سمجھتی تھیں۔ انہیں اس بات کی بھی خوشی تھی کہ انہوں نے جسے چاہا اسے حاصل بھی کرلیا۔

پھر ان کی زندگی میں ایک ایسا انقلاب آیا جس نے ان کی زندگی میں زہر گھول دیا۔ انہیں معلوم ہوا کہ ان کے محبوب شوہر نے اپنی فلموں کی فیورٹ ہیروئن سے خفیہ طور پر شادی کرلی ہے۔ ایسی شادیاں زیادہ دنوں تک خفیہ نہیں رہتیں۔ ایک دن اس کا بھانڈا پھوٹ گیا اور سید نور کو باضابطہ اعلان کرنا پڑا کہ انہوں نے واقعی صائمہ سے شادی کرلی ہے۔

رخسانہ نور ایک دیدہ ور صحافی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ فلم نگری کے مردوں کی یہ پرانی ریت ہے کہ وہ فلموں میں کام کرنے والی عورتوں کے ساتھ خوشگوار لمحات گزارنا اپنا بنیادی حق تصور کرتے ہیں۔ اپنے شوہر کے بارے میں بھی وہ زیادہ خوش فہم نہیں تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ فلم سازی اور ہدایت کاری کی تھکن اتارنے کے لیے وہ ایسی تفریح کا سہارا لے لیتے ہوں گے مگر انہیں اس بات کا ہرگز یقین نہیں تھا کہ وہ اپنی فلموں کی ہیروئن کو اپنی حقیقی ہیروئن بنالیں گے۔

رخسانہ نور کے لیے یہ بہت بڑا سانحہ بہت بڑا صدمہ تھا جسے وہ برداشت نہ کرسکیں۔ اس سانحے نے ناسور کی صورت میں انہیں موت کی آغوش میں پہنچادیا۔

صائمہ بے شک ایک اچھی اور باصلاحیت اداکارہ ہے۔ اسے سپر اسٹار بنانے میں بلاشبہ سید نور کا بڑا کردار ہے مگر رخسانہ نور بھی کوئی گئی گزری شخصیت کی مالک نہیں تھی۔ وہ ایک شاعرہ تھی ایک ادیبہ تھی ایک صحافی تھی اور پھر سید نور کی شریک حیات بننے کے بعد اس نے فلم انڈسٹری میں بھی بطور کہانی نویس، مکالمہ نگار اور نغمہ نگار کے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ وہ سید نور کی ایک باوقار بیوی تھیں۔ ایسی بیوی کے ساتھ اس کے شوہر کا ایسا سلوک حقیقتاً بڑا تکلیف دہ تھا۔ کوئی بھی بے پناہ چاہنے والی بیوی اپنے شوہر کی ایسی بے وفائی برداشت نہیں کرسکتی۔

یہ کہنا کافی نہیں کہ شاہ جی بھی ایک انسان ہیں اور انسان خطا کا پتلا ہوتا ہے۔ ان سے بھی یہ غلطی ہوگئی۔ لیکن نہیں سید نور کوئی عام آدمی نہیں۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اچھی سوجھ بوجھ کے مالک اور ایک دانا و بینا دانشور ہیں۔ انہیں ایسی انمول بیوی، اس قدر چاہنے والی جیون ساتھی جس نے ان کے لیے اور ان کے بچوں کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔ اس پر سوکن کا بم لاکر بلاسٹ کردیا۔ یہ غلطی معافی کے قابل نہیں۔

فلم والے اپنی ساتھی اداکاراؤں کے ساتھ شادی بیاہ کرتے ہیں۔ یہ کوئی نئی یا بری بات نہیں۔ نذیر نے سورن لتا سے شادی کی۔ سنتوش کمار نے صبیحہ خانم سے، درپن نے نیر سلطانہ سے، ایس سلیمان نے پنا (زرین) سے، محمد علی نے زیبا سے شادی کی مگر ان شادیوں سے کسی کی حق تلفی نہیں ہوئی۔ سید نور اگر رخسانہ نور سے پہلے کسی اداکارہ سے شادی

کرتے یا رخسانہ نور کی وفات کے بعد تو ان کے چاہنے والوں کو اس بات کا دکھ نہیں ہوتا۔ بہر حال جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔

جہاں تک صائمہ کا تعلق ہے۔ اس کے جسم کی آب و تاب میں بھی اب پہلی سی بات نہیں رہی ہے جس کی حدت سے شاہ جی پگھل کر موم ہو گئے تھے۔ اب فلموں میں بھی اس کی وہ مانگ نہیں رہی ہے۔ شاہ جی خود اس بات کا اعتراف کر چکے ہیں کہ اب ٹی وی ڈراموں اور کمرشل ہی میں ان کی گنجائش رہ گئی ہے۔

یہ میرے جذبات و احساسات نہیں، جو اوپر بیان کیے گئے ہیں۔ یہ شاہ جی کے چاہنے والوں اور پرستاروں کے محسوسات ہیں جو میں نے پیش کیے ہیں۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میں شاہ جی کو ان کے فنی محاسن کی وجہ سے بہت بڑا فنکار اور فلم میکر سمجھتا ہوں۔ ان کی ذات سے ہماری فلم انڈسٹری کو بڑے فائدے پہنچے ہیں اور آنے والے دنوں میں بھی ہم ان سے گراں قدر فائدے حاصل کریں گے۔ انہوں نے جو منفرد اور یادگار فلمیں بنائی ہیں وہ انہیں ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھیں گی۔

یوں تو ان کے کریڈٹ میں متعدد کامیاب فلمیں ہیں مگر چوڑیاں، زیور، جیوا، ڈاکو رانی، گھونگھٹ، ہوائیں اور ڈکیت جیسی آل ٹائم سپر کلاس ان کی یادگار فلمیں ہیں۔

اس موقع پر میں ان کی معاشرتی فلم ''زیور'' کا خصوصی طور پر ذکر کروں گا۔ زیور ہمارے معاشرے کی عورتوں کی خاص کمزوری ہے۔ اس کو موضوع بنا کر سعادت حسن منٹو نے ایک یادگار کہانی ''جھمکے'' لکھی تھی جس پر ''بدنام'' نامی فلم بھی بنائی گئی تھی۔ اس فلم کے یہ مکالمے آج بھی ضرب المثل کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔

کہاں سے آئے یہ جھمکے؟

کون لایا تھا یہ جھمکے؟

کس نے دیئے ہیں یہ جھمکے؟

علاؤ الدین جو اس فلم میں ایک غریب تانگے والا ہے اپنی بیوی زمرد کے کانوں میں جب سونے کے جھمکے دیکھتا ہے تو جذباتی ہو جاتا ہے۔

سید نور نے غالباً اسی فلم سے متاثر ہو کر ''زیور'' بنائی۔ جو خواتین کی زیور سے متعلق دلچسپی اور چاہت کا احاطہ کرتی ہے۔ سید نور نے فلم کے تھیم کو کہانی، اداکاری اور ڈائریکشن کی اعلیٰ ترین خوبیوں سے بڑی خوب صورتی کے ساتھ نکتہ و

سید نور کی پنجابی فلمیں

سید نور کی وجہ شہرت ان کی ہدایت کاری میں بننے والی منفرد فلمیں ہیں۔ مگر کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ انہوں نے بے شمار فلمی کہانیاں بھی تحریر کی ہیں جن میں پنجابی فلموں کی تعداد خاصی ہے۔ فلمسازی اور ہدایت کاری شروع کرنے کے بعد انہوں نے قومی زبان کی ہی فلمیں بنائیں تو کچھ لوگوں نے انہیں پنجابیوں کا دشمن سمجھ کر انہیں گن پوائنٹ پر پنجابی فلمیں بنانے پر مجبور کیا۔ ان کو غالباً اس بات کی خبر نہیں تھی کہ جسے وہ پنجابی فلموں کا دشمن قرار دے رہے ہیں اس نے کتنی ہی کامیاب پنجابی فلموں کی کہانیاں لکھی ہیں۔

سوہراتے جوائی (1980ء) مفت بر (1981ء) بوٹی (1981ء) چاچا بھتیجا (1981ء) دوہئی دا سوال اے (1982ء) راکھا (1983ء) دادا استاد (1989ء) کالیا (1984ء) چور چوکیدار (1984ء) بجن دشمن (1985ء) جدائی (1986ء) شیر بہادر (1987ء) ظلم دا طوفان (1986ء) فقیریا (1987ء) شیر باز خان (1988ء) گوری دیاں جھانجراں (1990ء) جنگ ای جنگ (1990ء) مکھڑ جٹ (1990ء) خاندانی بدمعاش (1990ء) چوراں دی رانی (1990ء) سائرن (1990ء) جیلر (1990ء) بڈھا گجر (2003ء) دوہئی لے کے جانی اے (2010ء) جگنی (2011ء) شریکا (2012ء)

عروج تک پہنچایا ہے۔ اپنی متعدد اچھائیوں کی وجہ سے یہ فلم پاکستانی فلموں کا جھومر کہلانے کی مستحق ہے۔ سید نور کی اپنی کامیاب فلموں میں بھی یہ ایک سپر کلاسک فلم کے طور پر نمایاں حیثیت کی حامل فلم ہے۔

''زیور'' کے فلم ساز ایم شفیق بٹ ہیں جب کہ اس کی کاسٹ میں بابر علی، ریما، صاحبہ، جان ریمبو اور شاہد کلیدی کردار میں شامل ہیں۔ اس کی کچھ شوٹنگ ترکی اور استنبول میں بھی کی گئی۔ شاہد جن کو صف اوّل کے ہیروز میں شمار کیا جاتا تھا اس فلم میں اس نے منفی کردار ادا کیا تھا۔ ریما نے

اس فلم میں اپنا کردار اس خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے کہ تمام ناقدین اور مبصرین نے اسے ان کی تمام فلموں سے زیادہ معیاری اور سپر کلاس قرار دیا ہے۔ ''زیور'' ہر لحاظ سے ایک ایسی فلم تھی جسے ریکارڈ کامیابی حاصل کرنی چاہیے تھی مگر اس کے فلم ساز اور تقسیم کار نے فلم کی نمائش سے پہلے جو اہم اور ضروری فریضہ انجام دینا چاہیے اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ فلم چاہے جتنی بھی اچھی ہو، اس کی تشہیر بہت ضروری ہوتی ہے مگر اس پر نہ فلم ساز نے توجہ دی نہ تقسیم کار نے، فلم مکمل ہوتے ہی اس کی تشہیر کے بغیر جلد بازی میں اسے ریلیز کر دی۔ جس کا نتیجہ جو ہونا چاہیے تھا وہ ہوا۔ فلم دیکھنے والوں کو پتا ہی نہ چلا کہ فلم کب آئی اور کب گئی۔ اس طرح ایک سپر کلاس فلم باکس آفس پر سپر فلاپ قرار دے دی گئی۔ اس فلم کی تاریخ نمائش 6 مارچ 1998ء ہے۔

تشہیر یا پبلسٹی کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو سید نور کی فلم ''ہوائیں'' کی مثال دی جاسکتی ہے۔ اس فلم کے ٹریلر نے فلم کی نمائش سے بہت پہلے ملک بھر کے سینما گھروں میں چل کر دھوم مچا دی اور عوام بڑی بے صبری سے اس فلم کا انتظار کرنے لگی اور جب نمائش پذیر ہوئی تو بہت پسند کی گئی۔ اس فلم کی کامیابی سے متاثر ہو کر بعد میں اسی کہانی پر ''یہ وعدہ رہا'' اور ''دی سسٹم'' بنائی گئی۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ندیم نے ''ہوائیں'' میں جو کردار ادا کیا تھا وہی کردار ان سے ''یہ وعدہ رہا'' اور ''دی سسٹم'' میں بھی کرایا گیا اور ان کا گیٹ اپ بھی ''ہوائیں'' والا ہی رکھا گیا۔ مگر یہ دونوں فلمیں ''ہوائیں'' جیسی کامیابی حاصل نہ کر سکیں۔ وجہ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھی کہ سید نور کی فلم میکنگ کا جو انداز ہے اس انداز میں دوسروں کے لیے فلم بنانا آسان نہیں۔ ''ہوائیں'' میں سید نور کی ہدایت کاری فن کی بلندیوں پر تھی۔ اگرچہ ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ ''ہوائیں'' بھارتی فلم ''ارجن'' کی کہانی پر بنائی گئی ہے۔ اس بات کی تصدیق نہ ہو سکی کہ یہ الزام کہاں تک درست ہے۔ ہو سکتا ہے دونوں فلموں کی کہانیوں میں کچھ مماثلت ہو۔ ''ارجن'' ایک کامیاب فلم تھی۔ کامیابی کے لحاظ سے ''ہوائیں'' بھی یادگار فلم ہے۔

فلم ساز شہزاد رفیق کی میوزیکل اور رومانوی فلم ''گھونگھٹ'' کا شاندار ٹریلر بھی ''ہوائیں'' کے ساتھ پورے پاکستان میں ریلیز ہوا تھا۔ جسے بے حد پسند کیا گیا۔ خاص کر اس ٹریلر میں شان کی آخر میں جو انٹری تھی اس نے فلم دیکھنے والوں کو بہت متاثر کیا۔ صائمہ کا بھی کسی اردو فلم میں پہلا بھرپور کردار تھا۔ ''گھونگھٹ'' ریلیز ہوئی اس نے طوفانی کامیابی حاصل کی پورے پاکستان میں سپر ہٹ ثابت ہوئی۔ اس فلم کی کامیابی میں اس کی موسیقی کا بھی اہم کردار تھا۔ کئی گانوں نے تو دھوم مچادی جن میں

☆ دیکھا جو چہرہ تیرا موسم بھی پیارا لگا۔ کانوں میں جھمکا تیرے، ہم کو ستارا لگا۔

اور صائمہ پر پکچرائز ہونے والا گیت۔

☆ نگوڑی کیسی جوانی ہے۔

عوامی حلقوں میں بے حد پسند کیا گیا۔ اس فلم میں سید نور کی ہدایت کاری کا معیار بہت بلند تھا۔ اس فلم کو خواتین نے بھی بے حد پسند کیا۔ اس فلم کی اہم بات یہ ہے کہ اس فلم کی وجہ سے اداکار شان کو نئی زندگی ملی۔ شاہ جی نے ان سے وہ کام لیا کہ دوسرے ہدایت کار حیران رہ گئے۔ ایک وقت ایسا تھا کہ کراچی سرکٹ میں شان کی فلمیں کوئی تقسیم کار لینے کو تیار نہیں ہوتا تھا مگر اس فلم کے بعد وہ اس قدر معروف ہو گئے کہ ان کی لگاتار فلمیں آئیں۔ 12 جولائی 1996ء میں ریلیز ہونے والی اس کامیاب فلم کے ساتھ یہ زیادتی ہوئی کہ اس کے تقسیم کار ادارے شیرا فلمز نے اسے اتار کر سنگیتا کی نئی اردو فلم ''کھلونا'' لگا دی جس سے ''گھونگھٹ'' گولڈن جوبلی سے محروم رہ گئی۔

اس فلم کی کاسٹ میں محسن حسن خان، ریشم، ارباز خان، عندلیب، صائمہ، شان اور سائرہ خان شامل تھے۔ ارباز خان کو چاکلیٹی ہیرو کے طور پر پیش کیا گیا تھا جو شاہ جی کا ہی کارنامہ تھا۔

فلم بے شک ٹیم ورک ہے۔ بہت سے لوگوں کی کارکردگی کے نتیجے میں وجود میں آتی ہے مگر ہدایت کار کی حیثیت فوج کے سپہ سالار جیسی ہوتی ہے۔ اس کی سوجھ بوجھ اور حکمت عملی کی وجہ سے فتح حاصل ہوتی ہے۔ سید نور بھی ایسے ہی ڈائریکٹر ہیں جو اپنی فلموں کی ایسی منصوبہ بندی کرتے ہیں جن کی کامیابی یقینی ہوتی ہے۔ کس سے کس طرح کا کام لینا چاہیے اس ہنر میں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ فلم میکنگ کے سلسلے میں ان کی سوجھ بوجھ اور فہم و فراست عطیہ خداوندی ہے۔

''سنگم'' ان کی رنگین اردو فلم تھی جو ریلیز ہوئی تو اس نے طوفانی کامیابی حاصل کی۔ اگرچہ یہ فلم ابتداء میں تعطل کا شکار رہی۔ فلم ساز ایس بی حسین کی یہ رومانی فلم 1995ء

میں شروع ہوئی مگر مسلسل لیٹ ہوتی چلی گئی۔ ایک مرحلہ ایسا آیا کہ یوں محسوس ہونے لگا کہ یہ فلم کبھی مکمل نہیں ہوگی۔ اس دوران فلم ساز فرزند علی نے اسے حاصل کر کے نہ صرف اسے مکمل کروایا بلکہ اس کی زبردست تشہیر بھی شروع کرا دی۔ پھر جب یہ ریلیز ہوئی تو اس نے لاہور اور کراچی سرکٹ میں طوفانی کامیابی حاصل کی۔ امجد بوبی کی موسیقی اور رخسانہ نور کے نغمات نے بھی سنگم کی کامیابی میں نمایاں کردار ادا کیا۔

سرمئی بادلوں میں

اور

دل توڑ کے نہ جا

نے دھوم مچا دی۔ باقی نغمات بھی بہت پسند کیے گئے۔ ''سنگم'' میں شان کی اداکاری اے ون تھی۔ سید نور کی یادگار ہدایت کاری نے اس فلم کی اہمیت میں نمایاں اضافہ کیا۔ خواتین نے بھی اس فلم میں خصوصی دلچسپی لے کر اس کی کامیابی کو چار چاند لگایا۔ سنگم ہمیشہ اچھی اور کامیاب فلموں میں شمار ہوگی۔ آج بھی راہ چلتے ہوئے جب اس فلم کا کوئی گانا سنائی دیتا ہے تو قدم رک جاتے ہیں اور سید نور کی فنی عظمت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اس فلم کی کاسٹ میں شان، ریشم، شاہ، تمنا، آغا طالش اور اسلم شیخ شامل ہیں۔ اس کی تاریخ نمائش 4 جولائی 1997ء ہے۔

سید نور جنہیں عرف عام میں لوگ شاہ جی کہتے ہیں، ان کی ایک فلم ہے ''سرگم'' اس کے نام سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کا موضوع موسیقی ہے۔ موسیقی جسے روح کی غذا قرار دی گئی ہے اور کہا گیا ہے

سُر سے جس کو پیار نہیں

وہ مورکھ انسان نہیں

شاہ جی نے اس موضوع پر اتنی خوب صورت فلم بنائی ہے کہ اس کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ اسے دیکھتے وقت تماشائیوں کے منہ سے ہر منظر پر واہ واہ نکلتی ہے۔ فلم دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ اسے دیکھتے وقت ہم اس میں ایسے گم ہو جاتے ہیں کہ ہمیں اپنا ہوش نہیں رہتا۔ جب فلم ختم ہوتی ہے تب ہم چونک کر گویا بیدار ہوتے ہیں۔ ایک وقت ایسا تھا کہ جہاں جاؤ سرگم کے گانے بج رہے ہوتے تھے۔ ریکارڈ تعداد میں اس کے آڈیو فروخت ہوئے۔

اس فلم ''سرگم'' کی کہانی پر بھارت کے نامور ہدایت کار سنجے لیلا بھنسالی نے ''ہم دل دے چکے صنم'' بنائی وہ بھی ''سرگم'' کی طرح سپر ہٹ ہوئی۔

''سرگم'' میں شاہ جی نے زیبا بختیار، عدنان سمیع، ندیم، مہاراج کتھک اور مصطفیٰ قریشی سے ایسا کام لیا کہ وہ اپنے کرداروں میں انگوٹھی کے نگینے کی طرح فٹ نظر آئے۔

اس موقع پر یہ تلخ حقیقت بیان کرتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ شاہ جی کے ساتھ ان کی اکثر فلموں کی نمائش کے وقت ناروا سلوک کیا گیا۔ سنگل اسکرین کے سینماؤں کے دور میں سینما گھروں کی کمیابی کی وجہ سے ان کی کئی فلمیں جو بڑی تیز رفتاری کے ساتھ بزنس کر رہی ہوتی تھیں، ان کے تقسیم کار انہیں اتار کر اپنی نئی فلم لگا دیتے تھے۔ جس سے طوفانی کامیابی حاصل کرنے والی فلم کو بریک لگ جاتا تھا۔ چند فلموں کی مثال پیش کروں گا۔ رنگین اردو فلم ''سنگم'' فلم دیکھنے والے خواتین، حضرات بے حد ذوق و شوق سے دیکھ رہے تھے کہ اس کے تقسیم کار نے اسے اتار کر جاوید شیخ کی نئی فلم ''یس باس'' لگا دی۔ جسے کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ جبکہ سنگم کی نمائش کے دوران اردو فلمیں کرم داتا۔ ڈریم گرل اور گھائل ریلیز ہوئیں مگر کوئی بھی سنگم جیسی کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

اس طرح سید صاحب کی فلم ''گھونگھٹ'' کے ساتھ بھی ظلم ہوا جب تقسیم کار حاجی شیرا نے تیز رفتاری کے ساتھ چلتی ہوئی فلم ''گھونگھٹ'' کو اتار کر سنگیتا بیگم کی نئی فلم ''کھلونا'' لگا دی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ گھونگھٹ سے جب جی بھر کر کما لیتے نئی فلم ''کھلونا'' لگاتے یا گھونگھٹ کی نمائش کو ڈسٹرب کیے بغیر نئے سینما انگیج کرتے ''کھلونا'' ریلیز کرتے۔

یہی کچھ ''ہوائیں'' کے ساتھ بھی ہوا۔ اس کے تقسیم کار ادارے راشد اینڈ کو نے 47 ہفتے میں چلتی ہوئی فلم ''ہوائیں'' کو اتار کر نئی فلم ''چوروں کے گھر چور'' لگا دی جو فلاپ ہوگئی۔ اس ادارے نے تین ہفتے کا بھی انتظار نہیں کیا کہ اس کی گولڈن جوبلی ہو جائے تو اس کی جگہ دوسری فلم لگائیں۔

رونا محض سنگل اسکرین سینما مالکان کا نہیں، اب جبکہ ملٹی پلیکس سینماؤں کا دور ہے تو کون سا پاکستانی فلموں کو فائدہ پہنچ رہا ہے؟ شاہ جی کی نئی فلم ''چین آئے نہ'' جو 2017 کی ایک یادگار فیملی فلم ہے۔ جسے اس کے تقسیم کار اور سینما مالکان نے توجہ نہ دے کر سوتیلے پن کا سلوک کیا۔ ورنہ عوام نے تو اس فلم کو بے حد سراہا۔ لیکن مناسب شوز نہ ملنا

اس فلم کے لیے ایک بہت بڑا المیہ ہے۔
''چین آئے نہ'' 11 اگست 2017 کو نمائش کے لیے پیش کی گئی لیکن کراچی سمیت ملک بھر کے مالکان خصوصاً ملٹی پلیکس سینماؤں نے پاکستانی فلم کو مناسب ٹائم نہیں دیا۔ اور جان بوجھ کر صرف مارننگ اور لاسٹ شوز دیئے۔ حد تو یہ تھی کہ 14 اگست کے دن بھی بے حس ملٹی پلیکس مالکان نے بھارتی فلم ''ٹائلٹ'' چلائی۔ کم از کم یوم آزادی کی عظمت کا تو خیال رکھنا چاہیے تھا۔ اس دن پاکستانی فلمیں۔ ''چین آئے نہ'' اور ''جیو سر اٹھا کے'' عوام کی کثیر تعداد نے سنگل اسکرین سینما کیپری پر دیکھا اس دن کیپری میں پورے دن چار شوز چلائے گئے۔ جن میں دو شوز ''چین آئے نہ'' اور دو شوز ''جیو سر اٹھا کے'' کے تھے۔ اگر شوز کے ٹائم مناسب ہوتے تو یہ دونوں فلمیں بھرپور بزنس حاصل کرتیں۔

سید نور بلاشبہ پاکستان فلم انڈسٹری کی پہچان ہیں۔ کل بھی وہ معیاری اور منفرد فلمیں بناتے تھے اور آج بھی اعلیٰ معیار کی فلمیں بنا کر اپنے آپ کو ایک ذہین فلم میکر ثابت کررہے ہیں۔ ان کے کریڈٹ پر بنائی فلمیں ان کی ذہانت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ''چین آئے نہ'' ڈائریکشن کے اعتبار سے ایک بڑی فلم ہے۔ جس کے ایک ایک سین پر محنت کی گئی ہے۔ گذشتہ پانچ برسوں میں سوائے ندیم بیگ، نبیل قریشی، یاسر نواز اور وجاہت رؤف کے کوئی بھی فلم بنانے کا فارمولا سمجھ نہیں پایا۔ جس کی وجہ سے ڈراما ٹائپ فلم بنتی گئیں۔ ''چین آئے نہ'' ایک مکمل فلم لگتی ہے۔ جسے دیکھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ ہم ٹی وی ڈراما نہیں واقعتاً فلم دیکھ رہے ہیں۔ سید صاحب نے ثابت کردیا، صوبیہ خان جیسے نئے چہروں سے بھرپور کام لینا ان ہی کا خاصا ہے۔ شاہ جی نے بطور ہدایت کار ان نئے نولیوں سے توقعات سے بڑھ کر کام لیا ہے۔ ندیم صاحب جیسے لیجنڈ کو فلم میں سرفہرست رکھا۔ جبکہ مصطفیٰ قریشی سے بھی خوب کام لیا۔ گانوں کی پکچرائزیشن میں تو شاہ جی نے کمال کردیا۔ فلم کی کہانی کو نئے انداز سے خوبصورت ٹریٹمنٹ دیا جس کی وجہ سے فلم مزید خوبصورت بن گئی۔ ان تمام باتوں کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا؟

یہاں تو بے چارے مور کو اپنا دل نشین رقص دکھانے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ کیا یہ سید نور جیسے لیجنڈ کے ساتھ ساتھ ہماری فلم انڈسٹری کے ساتھ ظلم نہیں؟ یارو! اتنا تو پاکستانی بنو کہ اپنے وطن عزیز کی مصنوعات کو پھولنے پھلنے کا موقع دو۔ پاکستانی فلموں کی آبیاری کرو۔ بھارتی فلمیں ضرور دکھاؤ۔ لیکن اپنی حب الوطنی کا اتنا تو ثبوت دو کہ قومی فلموں کو بھی نمائش کا مناسب موقع فراہم کرو۔

سید نور جیسے لیجنڈ فلم میکر کی ایک ایسی فلم کو جان بوجھ کر شائقین تک نہ پہنچانا بہت بڑا اخلاقی جرم ہے۔ ان پر ہی نہیں، پوری فلم انڈسٹری کے ساتھ زیادتی ہے۔ شاہ جی کی یہ فلم ''چین آئے نہ'' ایک مکمل فلم ہے۔ ناقدین کے خیال میں یہ فلم 90ز سینما اور ماڈرن ایج کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس فلم میں وہ سب کچھ ہے جو ماڈرن سینما کے نام پر ہم دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔

بہت سے تماشائیوں کو یہ فلم دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس فلم کے بارے میں خاص خاص باتیں بتاؤں۔

پاکستانی نژاد امریکی جاوید صدیقی اور نعیم ہارون ساکھیا ''چین آئے نہ'' کے پروڈیوسر ہیں جبکہ سید نور بھی اس فلم کے شریک فلمساز ہیں۔ اس کی کہانی مکالمے اور اسکرین پلے شاہ جی نے اپنے جادوئی قلم سے خود لکھے ہیں۔

اس فلم کی کاسٹ میں سید نور نے اپنی روایات کے مطابق نئے ستاروں پر انحصار کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر افراد کا تعلق فلمی گھرانوں سے ہے۔ اس فلم کا ہیرو شہروز، سینئر اداکار بہروز سبزواری کے بیٹے ہیں۔ عادل مراد، وحید مراد کے، فرزند ارجمند ہیں۔ فلم کی ہیروئن سحرش خان صبیحہ خانم اور سنتوش کمار کی نواسی ہیں۔ دانش نواز، یاسر نواز کے پتر ہیں۔ فلم کے فوٹو گرافر عرفان مرزا لیجنڈ فوٹو گرافر کامران مرزا کے بیٹے ہیں۔ نامور سنگر وارث بیگ کے سنگر بیٹے عمار بیگ نے بھی اس فلم میں گا کر اپنے کیریئر کا آغاز کیا ہے۔

نئے اور ابھرتے ہوئے آرٹسٹوں کے ساتھ ساتھ شاہ جی نے اپنی اس فلم میں سینئر، پختہ کار اور نامور فنکاروں کو بھی پیش کیا ہے۔ ندیم، مصطفیٰ قریشی، بہروز سبزواری، عتیقہ اوڈھو کو کہانی کے اہم کرداروں میں پیش کیا ہے۔ ندیم صاحب نے فلم میں ہیروئن کے باپ کا کردار کیا ہے۔ عتیقہ اوڈھو ایک خاتون سیاستدان ہیروئن کی والدہ ماجدہ کے طور پر نظر آتی ہیں۔ مصطفیٰ قریشی نے فلم کے ولن کے باپ اور ایک وڈیرے چانڈیو کے روپ میں بڑا جاندار کردار ادا کیا ہے۔

چین آئے نہ کی کہانی رومانی اور ڈرامائی مناظر سے بھرپور ہے۔ کسی بھی رومانی فلم میں موسیقی ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہوتی ہے۔ اس فلم کا میوزک سن کر احساس ہوتا ہے کہ ایک بار پھر پلے بیک سونگس کا ٹرینڈ ان ہونے جا رہا ہے۔ سید نور کے اس میوزیکل رومینٹک فلم کا میوزک ایم ارشد نے دیا ہے۔ جو اس سے پہلے بھی سید نور کے ساتھ بے شمار ہٹس دے چکے ہیں۔ ایم ارشد نامور موسیقار ایم اشرف کے صاحبزادے ہیں۔ اس فلم کے پلے بیک میں راحت فتح علی خان، وارث بیگ، عماد بیگ بینا خان، اور ڈی جے عنی نے اپنی آوازوں کا جادو جگایا ہے۔ اس فلم کے راحت فتح علی خان کی آواز میں دو سویٹ سونگس فلم کی ریلیز سے قبل ہی میوزک چارٹس پر دھوم مچا چکے تھے۔ راحت فتح علی خان نے اس فلم کے لیے

''ہونا تھا پیار ہوگیا''۔ ''میری وفا میرے وعدے پہ اعتبار کرو''

جیسے میلوڈی گیت گائے ہیں۔

شاہ جی نے اس فلم کا پوسٹ پروڈکشن ورک بنکاک سے کرایا ہے ٹرائی اینگل لو اسٹوری میں وہ سب کچھ ہے جن کی آپ سید نور سے توقع کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں یہ ناپسندیدہ رواج ہے۔ چاہے جتنی بھی اچھی فلم ہو، اسے جلدی اتار دی جاتی ہے۔ اس کا مستقبل توڑ دیتا ہے۔ چاہے جتنی بھی اچھی فلم ہو ہمیشہ کے لیے اس پر فلاپ کی چھاپ لگ جاتی ہے۔

''چین آئے نہ'' کے ساتھ جو کچھ ہوا برا ہوا۔ اس سے ان کے چاہنے والوں کو بھی بہت دکھ، بہت صدمہ ہوا۔ مگر شاہ جی فولادی اعصاب کے مالک ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود وہ آنے والے دنوں کے حوالے سے بہت پُرامید اور پُرعزم رہے اور ''آئینہ تو'' کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

نئے اسٹارز جنہیں اس فلم میں پہلی بار متعارف کرایا گیا تھا۔ سید صاحب ان کی مایوسیوں کا بھی ازالہ کرنے کی کوشش میں رہے۔

''آج کل اکثر فلمساز اپنی فلموں کی ریٹنگ بڑھانے کے لیے ندیم صاحب کو کاسٹ کرتے ہیں۔ کیا آپ نے بھی ......''

سوال کرتے صحافی کی قطع کلامی کرتے ہوئے شاہ جی نے کہا تھا۔ ''نہیں ...... میں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ ندیم

دوسرے فلمسازوں اور ہدایت کاروں کے لیے لکھی فلمیں جو بہت مشہور ہوئیں

سوسائٹی گرل۔ عشق عشق۔ لاڈ پیار بیٹی۔ مس ہانگ کانگ۔ نہیں ابھی نہیں۔ سنگدل۔ آہٹ۔ دلیر۔ بوبی۔ لازوال۔ ہم سے ہے زمانہ۔ مس سنگاپور۔ زنجیر۔ ایک ہی راستہ۔ میلا کے جانباز۔ بارود کی چھاؤں میں۔ بلندی۔ قیامت کے بعد۔ مشکل۔ لاکھوں میں ایک۔ اف یہ بیویاں۔ لیڈی اسمگلر۔

بطور اسکرپٹ رائٹر

سید نور کی لکھی ہوئی پہلی فلمی کہانی ''سوسائٹی گرل'' 1976ء میں تحریر کی گئی۔ اس کہانی پر بننے والی فلم نے باکس آفس پر کامیابی کے جھنڈے گاڑے تو سلسلہ ایسا چل نکلا کہ تقریباً سب بڑے ہدایت کاروں نے ان سے کہانیاں لکھوائیں۔ 1992ء تک وہ 200 فلموں کے اسکرپٹ لکھ چکے تھے۔ جن کی تعداد اب سوا چار سو سے زیادہ ہو چکی ہے۔

بہترین اسکرپٹ رائٹنگ پر انہیں بے شمار ایوارڈز مل چکے ہیں۔ جن میں نیشنل فلم ایوارڈز، نگار ایوارڈز کے علاوہ متعدد دیگر ایوارڈز بھی ہیں۔

سید نور کے پرستاروں کی انجمن

اداکاروں کے فین کلب تو ہوتے ہیں تقریباً تمام ہی بڑے فنکاروں کے پرستاروں نے مختلف ناموں سے فین کلب بنا رکھے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض فنکاروں کی موت کے بعد بھی ان کے چاہنے والے ان سے محبت کا پرچار کرتے ہیں۔ جیسے وحید مراد، محمد علی اور سلطان راہی وغیرہ۔ مگر کسی ہدایت کار کے نام پر پہلی بار سید نور کے پرستاروں نے آل پاکستان لورز آف سید نور فین کلب بنا رکھا ہے۔ جس کے بانی اور چیئرمین محمد خان اعوان ہیں۔ جبکہ وائس چیئرمین اداکار اچھی خان ہیں۔ عبدالسلام صدر اور بلال خان جنرل سیکریٹری ہیں۔ تہواروں کے موقع پر فلمی اخباروں میں اپنے کلب کا اشتہار چھپواتے ہیں۔

صاحب کو محض خانہ پری کے لیے نہیں بلکہ کہانی کی ڈیمانڈ کے عین مطابق کاسٹ کیا تھا۔ اس فلم میں ان کا کردار ایک سیاست داں بیوی کے شوہر کا جو اپنے اردگرد ہونے والے حالات وواقعات سے پوری طرح باخبر اور اپنی عزت اور وقار کی خاطر خاموش بھی ہے۔ لیکن فلم کے اختتام پر وہ اپنی بھرپور فارم میں نظر آئے۔''

اپنی اس فلم کی موسیقی کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔ ''ہر کامیاب فلم میں اس کے نغمات کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ اچھا اور معیاری میوزک فلم کی جان ہوتا ہے۔ جسے سن کر اور دیکھ کر عوام انجوائے کرتے ہیں۔ میری سابقہ فلمیں میوزک کے اعتبار سے بھی سپرہٹ تھیں۔ جن میں جیوا۔ گھونگھٹ۔ سرگم۔ دیوانے تیرے پیار کے وغیرہ سرفہرست ہیں۔ ان فلموں کی میوزک نے فلموں کو چار چاند لگا دیئے۔ جنہیں عوام آج بھی یاد کرتے ہیں۔ میری فلم ''چین آئے نہ'' بھی ایک مکمل اور بھرپور میوزیکل فلم۔ جس میں 7 گانے تھے۔ ہر گانا ایک دوسرے سے مختلف اور منفرد ہے۔ جبکہ ان تمام کی پکچرائزیشن بھی لاجواب ہے۔ انہیں گانے والے گلوکاروں اور گلوکاراؤں نے انہیں شاہکار بنا دیا ہے۔''

ایک فلم پر اس کے تخلیق کار کس قدر محنت کرتے ہیں۔ اس کے ایک ایک شعبہ پر کس قدر توجہ دیتے ہیں۔ ایک ایک فریم کو خوبصورت بنانے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرتے۔ مگر افسوس صد افسوس کہ کچھ لوگ محض اپنے تھوڑے سے ذاتی مفاد کی خاطر فلم میکرز کی ساری محنت پر پانی پھیر دیتے ہیں۔

''چین آئے نہ'' اس فلم کا ایک اداکار خصوصی طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ لیجنڈ فنکار وحید مراد کا فرزند ارجمند ہے۔ اگرچہ عادل مراد بحیثیت پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور ایکٹر متعدد ٹی وی ڈراموں اور سوپ کرتا رہا اور شوبز میں اپنے والد کے حوالے سے ہٹ کر بھی اپنی فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتا رہا تھا۔ مگر کسی فلم کے لیے اسے کاسٹ نہیں کیا گیا تھا۔ کراچی میں جہاں اس کی رہائش ہے، اب خاصی فلمیں بن رہی ہیں جن میں ٹی وی آرٹسٹوں کو بھی کاسٹ کیا جاتا ہے۔ سید نور نے اسے پہلی بار اپنی فلم میں بطور اداکار شامل کیا۔ جنوری 2016ء میں شاہ جی کراچی آئے تو عادل مراد کو بلا کر کہا۔ میں ایک رومانٹک اور میوزیکل فلم بنا رہا ہوں اور تمہیں ایک خاص رول میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ عادل مراد نے ہاں یا نہ کہنے سے پہلے کہا۔ ''مجھے اس فلم کی کہانی سنایئے اور اس میں میرا کیا کردار ہے بتایئے۔''

شاہ جی نے اختصار کے ساتھ کہانی سنائی اور کہا۔ ''تمہارا کردار ایک وڈیرے کے بگڑے ہوئے بیٹے کا ہے جو U.K سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آیا ہے اور دولت کے نشے میں کسی کو کچھ نہیں سمجھتا۔''

عادل مراد سوچنے لگا یہ کردار بہت مشکل ہے۔ کیا میں کرسکوں گا؟ پھر بھی اس نے ہامی بھرلی تو اس کی توقعات کے مطابق شاہ جی نے اس کردار کی ڈیمانڈ کے مطابق اسے بنا سنوار کر کیمرے کے سامنے پیش کیا۔ اس کے لیے جس گاڑی کا بندوبست کیا وہ RANQE ROVER تھی۔ اس کا شاہانہ لباس معروف ڈیزائنر امیر عدنان سے تیار کروایا۔ اس کی عیاشی کے لیے ایک فارم ہاؤس کا بھی انتظام کیا۔

چونکہ یہ بگڑا رئیس زادہ سگار کا بھی شوقین ہے لہٰذا اس کے لیے سنگاپور سے خاص طور پر سگار ... منگوائے۔ ایک حقیقت پسند ڈائریکٹر ہونے کے ناتے سید صاحب نے اس کردار کو اس کے حقیقی رنگ میں پیش کرنے کے لیے تمام سہولتیں مہیا کیں۔ تاکہ ہر زاویے سے وہ ایک سیاست دان وڈیرے کا بگڑا ہوا بیٹا نظر آئے۔ یہ سب کچھ اس کردار کی ہائی لائٹس ہیں۔ عادل مراد بطور اداکار ایک باصلاحیت آرٹسٹ ہے۔ سید نور نے اس کی اس صلاحیت کو بھرپور طور پر اجاگر کیا اور اس سے جس طرح چاہتے تھے، اسی طرح پرفارم کروایا۔ فلم مکمل ہوئی تو اس کی اداکاری سے جہاں وہ مطمئن تھے وہاں سینئر فنکاروں نے بھی اس کی تعریف کی۔

وحید مراد کے کچھ پرستاروں نے اس سے شکایتاً کہا۔ ''وحید مراد جیسے سپر ہیرو کے صاحبزادے کو منفی کردار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہم تو چاہتے تھے کہ آپ اپنے والد کے نقش قدم پر چلیں۔''

عادل مراد نے یہ کہہ کر انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ''وحید مراد دنیا میں ایک ہی تھا اور ایک ہی رہے گا۔ اگر میں وحید مراد بننے کی کوشش کرتا ہوں تو شاید میرے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ میں زندگی بھر اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔''

یہ سب باتیں بتانے کا میرا مقصد یہ ہے کہ ہدایت کار سید نور نے جب فلم کے ایک ولن کے کردار پر اتنی محنت کی تو فلم کے ہیرو، ہیروئن اور دیگر اہم کرداروں کو زندگی سے قریب دکھانے کے لیے کیا کیا جتن کیے ہوں گے۔ کتنی

مشکلوں سے گزرے ہوں گے؟ کیا کچھ نہیں کیا ہوگا۔ وہ ہزار یہ ظاہر کرنے کی کوشش کریں کہ جس فلم میں انہوں نے اتنی جان ماری کی اس کا انہیں صلہ نہیں ملا۔ اس کے باوجود دل برداشتہ نہیں ہوئے۔ وہ پُرعزم رہے۔ ان کے اعصاب پر اس بات کا اثر نہیں۔ اپنے باڈی لینگویج سے وہ اپنے فولادی اعصاب کا جتنا بھی اظہار کریں، میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں کہ انہیں ان کی محنت کے رائیگاں جانے کا دکھ نہیں۔ وہ اندر سے بہت دکھی ہیں۔

میں نے اپنے اس خیال کا ذکر جب اپنے ایک صحافی دوست سے کیا تو اس نے بھی میری بات سے اتفاق کیا۔

"یقیناً شاہ جی کو اس بات کا دکھ ہے، اور ہونا چاہیے، یہ ایک فطری عمل ہے۔ جب کسی کو اس کی محنت کا ثمر نہیں ملتا تو اسے دکھ ہوتا ہے۔ صدمہ ہوتا ہے۔" پھر ذرا رک کر دوست نے کہا۔ "یہ عجیب بات ہے کہ لوگوں کو اپنا دکھ درد تو محسوس ہوتا ہے۔ مگر وہ دوسروں کے دکھوں کو دکھ نہیں سمجھتے۔ انہیں دکھ میں دیکھ کر دکھ نہیں ہوتا، ملال نہیں ہوتا۔"

میں نے دوست سے کہا۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

میرے صحافی دوست نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اندرونی طور پر خود بھی دکھی ہے۔ ذرا توقف کے بعد اس نے کہا۔

"شاہ جی کو اس دکھ کی سولی پر تو لٹکنا ہی تھا۔ انہوں نے دوسرے کو دکھ دیتے وقت یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کا مکافات عمل بھی ہوسکتا ہے۔ کبھی وہ خود بھی قلبی اور ذہنی طور پر دکھوں کے صلیب پر مصلوب کیے جاسکتے ہیں۔ یہ تو قدرت کا نظام ہے۔ ہر ایک کو اس کے کیے کی سزا ضرور ملتی ہے۔"

"یار! تم اتنی باتیں کہہ گئے۔ مگر ہنوز میری ناقص عقل میں کچھ نہیں آیا کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

وہ جو بالکل سنجیدہ تھا۔ "تم شاید بھول گئے کہ شاہ جی نے رخسانہ نور کو ایک بڑا دکھ دیتے وقت یہ یاد نہیں رکھا تھا کہ انہوں نے ساتھ جینے مرنے کا عہد و پیماں کیا تھا۔ جو وہ اس وقت بھول گئے جب اس نے اپنا سب کچھ ان پر نچھاور کردیا۔ ان پر اور ان کے بچوں پر اپنی پوری زندگی وار دی۔"

اب میری سمجھ میں آیا کہ میرا صحافی دوست کہنا کیا چاہ رہا ہے۔ مگر میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ مجھے خاموش اور سوچتا ہوا دیکھ کر اس نے کہا۔

"اگر اب بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آیا ہے تو یہ لو اسے پڑھو......" اس نے ایک اخبار کا پورا صفحہ میری طرف بڑھایا۔ اخبار کی پیشانی پر 3 مئی 2007 کی تاریخ درج تھی۔ اس صفحہ پر

"شاہ جی کی مریدنی بن کر جیوں گی۔" کی سرخی سے ایک انٹرویو لگا تھا۔

سید نور سے شادی کے اقرار پر صائمہ کا پہلا انٹرویو تھا اگرچہ میں صائمہ سے شادی کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا جس کا اظہار میں اس تحریر میں بھی کرچکا ہوں۔ مگر چونکہ یہ صائمہ نور کا انٹرویو تھا جو پہلی بار اس نے اس شادی کے بعد دیا تھا۔ اس انٹرویو کے کچھ اقتباسات پیش ہیں۔

"رات کے آٹھ بجے کے قریب میں جب ماڈل ٹاؤن میں صائمہ کے گھر پہنچا تو ان کی چھوٹی بہن روبینہ نے ہمارا استقبال کیا۔ ڈرائنگ روم میں سرخ و سفید صائمہ کالے رنگ کی شلوار قمیص میں بڑی پُروقار دکھائی دے رہی تھیں۔" گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو انہوں نے کہا۔

"ہر عورت کا خواب ایک گھر اور پیار کرنے والا شوہر ہے۔ میں اب اپنا گھر بسانا چاہتی ہوں لہٰذا فیصلہ کیا ہے کہ شاہ جی (سید نور) سے اپنے رشتے کو دنیا سے نہیں چھپاؤں گی۔"

"شوبز سے وابستہ لوگ سمجھتے ہیں کہ آپ دونوں کی شادی بہت سال پہلے ہوگئی تھی۔" اس سوال کے جواب میں صائمہ نے کہا۔

"یہ درست نہیں ہے۔ شادی ہونے دو سال قبل 24 جولائی 2005ء کو سادگی سے ہوئی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب "مجاجن" کی شوٹنگ جاری تھی۔ اس شادی کو پوشیدہ اپنی پروفیشنل مجبوریوں کے باعث رکھا۔ ہمارے ذہن میں یہ تھا کہ شاید ہمارے پرستار اور فلمساز کو ہمارا یہ رشتہ اچھا نہ لگے۔ ہمارے ہاں یہ تاثر بھی پایا جاتا ہے کہ شادی شدہ ہیروئن کی مقبولیت کم ہوجاتی ہے۔ مگر پھر رفتہ رفتہ یہ سوچا کہ یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ ماضی میں زیبا محمد علی، صبیحہ سنتوش اور اب بھارت میں ایشوریا اور ابھیشک کو بھی اچھی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ مجھے اُمید ہے میرے پرستاروں کو میری شادی کی بھی خوشی ہوگی اور وہ ہم دونوں کے لیے دعا بھی کریں گے۔"

"صائمہ! آپ کو پتا ہونا چاہیے کہ سید نور پہلے سے شادی شدہ ہیں۔ ان کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔" صحافی نے کہا۔

صائمہ پوری سچائی سے بولیں۔ "سید نور اور رخسانہ کے بچے میرے بھی ہیں۔ خدا مجھے توفیق دے گا۔ میں اپنے بچوں کو ان کی ماں بن کر ان کا خیال رکھوں گی۔ میں اپنی بیٹیوں کو اپنے ہاتھوں سے رخصت کروں گی۔ اور اپنے بیٹے علی شاہ کے سر پر سہرا بھی سجاؤں گی۔ میں ان کی پہلی بیوی رخسانہ کا دل سے احترام کرتی ہوں۔ وہ ساری زندگی پہلی ہی رہیں گی۔ میں دوسری بن کر رہوں گی۔" یہ کہتے ہوئے صائمہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے تو اس نے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے شادی کی مرضی بن کر جینا چاہتی ہوں۔ خدارا اجازت دیں میں بھی زندگی جی لوں۔"

اس سے پہلے کہ صحافی کوئی دوسرا سوال کرتے صائمہ خود ہی بولیں۔ "بعض لوگ کہہ رہے ہیں کہ شاید میں اُمید سے ہوں اس لیے مجبوراً شادی کا اعلان کر رہی ہوں مگر فی الحال ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم خوش و خرم ازدواجی زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

"آپ خود بھی ماں بننا چاہیں گی؟"

"میں سچے دل سے کہہ رہی ہوں کہ سید نور کے بچے میرے اپنے بچے ہیں۔ پھر میرے گھر میں بہنوں کے بہت سارے بچے ہیں۔ ہر وقت رونق لگی رہتی ہے۔ مگر میری خواہش ہے کہ میں خود بھی ایک بچے کو جنم دوں تاکہ اس مرتبے پر فائز ہوسکوں جس پر صرف ایک ماں ہی ہوسکتی ہے۔"

"سید نور اور صائمہ کی شادی کا باضابطہ اعلان ہدایت کار مسعود بٹ کی فلم کے سیٹ پر کیا گیا۔ یہاں صرف اکیلی صائمہ تھیں۔ سید نور سے متعلق بتایا گیا کہ وہ کراچی میں ایک نجی ٹی وی کے پروگرام میں شریک ہیں۔ مذکورہ انٹرویو کے دوران بھی سید نور موجود نہیں تھے۔ صائمہ نے اس انٹرویو کے دوران بتایا کہ شادی بے حد سادگی سے ہوئی جس میں کسی فلمی شخصیت نے شرکت نہیں کی۔ اس موقع پر سید نور نے مجھے انگوٹھی اور میں نے انہیں گھڑی تحفے میں دی۔ حق مہر شرعی رکھی گئی۔"

انٹرویو کے اختتام پر صائمہ بولیں۔ "میں نے سید نور سے سچی محبت کی ہے۔ خوش نصیب ہوں کہ ان سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئی۔"

میں نے اخبار خاموشی کے ساتھ دوست کی طرف بڑھایا۔ اخبار واپس لے کر اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ "شاہ جی کی دوسری خوبصورت پسند کا انٹرویو پڑھ کر تم نے کیا نتیجہ اخذ کیا؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اس وقت میں اس کے جذبات سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ چند لمحوں تک میرے جواب کا انتظار کرنے کے بعد وہ بولا۔

"صائمہ جی نے تو آسانی سے کہہ دیا۔ ان کی پہلی بیوی رخسانہ کا میں دل سے احترام کرتی ہوں۔ وہ ساری زندگی پہلی ہی رہیں گی۔ اور میں دوسری بن کر رہوں گی۔ بے شک، ایک شوہر کی ایک سے زیادہ بیویاں بھی ہوتی ہیں اور وہ ایک ساتھ بھی رہتی ہیں مگر ایسا اسی صورت میں ہوتا ہے جب شوہر پہلی بیوی کی رضامندی حاصل کرکے دوسری یا تیسری شادیاں کرتا ہے۔ صائمہ بی بی نے تو ان کے بقول پورے دو سال تک شادی کی دوسری بیوی ہونے کی خبر پوشیدہ رکھی۔ اس میں سید صاحب بھی برابر کے حصے دار ہیں۔ میں رخسانہ نور کا نہ حمایتی ہوں نہ ان کا کوئی عزیز رشتے دار۔ میں تو ایک غزل لکھنے والا ہوں۔ جو دیکھتا ہوں۔ جو محسوس کرتا ہوں اس کا اظہار کر دیتا ہوں۔ میں بھی تمہاری طرح شادی کی تمام سہولتوں اور خوبیوں کا معترف ہوں۔ لیکن ان کی صائمہ سے خفیہ شادی کے اقدام کو غلط سمجھتا ہوں۔ جب دوسروں کے ساتھ رخسانہ نور کو بھی شادی کا پتا چلا تو ان پر جو غم کا پہاڑ ٹوٹا اس کا نتیجہ یہ نکلا اور اس کا انجام موت رہا۔ رخسانہ نور کوئی عام خاتون نہیں تھیں۔ وہ ایک حساس دل و دماغ رکھنے والی شاعرہ تھیں، ادیبہ تھیں، صحافی تھیں۔ انہوں نے اپنے اس دکھ کا اظہار نہیں کیا۔ کوئی پریس کانفرنس کر کے دکھ دینے والوں کے خلاف کوئی احتجاج ریکارڈ نہیں کرایا۔ خاموشی کے ساتھ اس صدمے سے بیمار۔۔۔ پڑیں اور خاموشی کے ساتھ اس دنیا سے سدھار گئیں۔"

یہ تو تھا صائمہ جی کا ایک پرانا انٹرویو کا قصہ جو انہوں نے 2007ء میں صائمہ نور بننے کے بعد دیا تھا۔ اب دس سال بعد 2017ء میں اس دو ہستیوں کے جوڑے کا تازہ ترین انٹرویو، یا گپ شپ جو دونوں نے ایک ساتھ اپنے چند پرستاروں کے ساتھ کی۔ یہ انٹرویو یا بات چیت لاہور میں صائمہ نور کی نئی رہائش گاہ میں ہوئی جو شاہ جی نے انہیں بنا کر دیا تھا۔ وہاں ہونے والی باتوں کا بھی خاص خاص حصہ آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

اپنی حالیہ ریلیز شدہ فلم "چھن آئے گا" کے بارے میں کچھ بتائیں۔ مہمانوں میں سے ایک نے پوچھا۔

اس فلم کی ریلیز سے ایک ہفتہ قبل ہی میں بنکاک سے پاکستان پہنچا تھا۔ اس فلم کے تقسیم کار کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ اس نے اس کی ذرا بھی پبلی سٹی نہیں کی ہے۔ جب میں نے اس سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا۔ ''آپ ٹی وی کے مارننگ شوز میں اس کی پبلی سٹی کرلو۔ میری یہ فلم بہت اچھی تھی۔ جس نے بھی دیکھی تعریف کی۔ مگر کچھ مخالفین نے میری اس فلم کے خلاف اس قدر پروپیگنڈا کیا کہ فلم بینوں کی اکثریت یہ فلم دیکھ ہی نہ سکی۔''

مجھے تعجب ہے اس گفتگو کے دوران شاہ جی نے ملٹی پلیکس سینما مالکان کے ناروا سلوک کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ جبکہ چین آئے نہ کی نمائش کے بعد انہوں نے کھل کر ملٹی پلیکس سینما آنرز کے خلاف کہا تھا کہ انہوں نے میری اس فلم اور ''جیو سر اٹھا کے'' کو مناسب شوز نہیں دیے۔ صرف مارننگ شوز یا آخری شوز دیے جبکہ 14 اگست کے دن بھی ہماری فلموں کی بجائے بھارتی فلم ''ٹائلٹ'' کی نمائش کی۔ آپ کو یاد ہوگا۔ اس موقع پر انہوں نے سنگل اسکرین سینما کیپری کی تعریف کی تھی کہ کیپری نے چودہ اگست کے دن چار شوز چلائے دو ''چین آئے نہ''۔ ''دوروپ''۔ ''جیو سر اٹھا کے''۔

.....آگے بات کرتے ہوئے شاہ جی بولے۔ ''اس فلم کی ناکامی سے میں حوصلہ نہیں ہارا ہوں۔ جب تک تن میں جان ہے فلم انڈسٹری کی خدمت کرتا رہوں گا۔ حالانکہ اس فلم سے مجھے مالی طور پر بہت نقصان ہوا ہے۔ میری بہت ساری زمینیں بک گئی ہیں۔ میں مالی طور پر بہت کرائسز میں آگیا ہوں۔ لیکن فلم بنانے کا حوصلہ اور جرأت میرے اندر اب بھی باقی ہے۔ میں انشاء اللہ ایک بار پھر ماضی کی طرح خوبصورت اور کامیاب فلمیں اپنے فلم بینوں کو دوں گا۔

شاہ جی کے اس بیانیہ سے ایسا لگتا ہے جیسے یہ فلم (چین آئے نہ) انہوں نے مکمل طور پر اپنے سرمائے سے بنائی ہے۔ اگرچہ فلم کی تکمیل اور نمائش کے دوران یہ بتایا گیا تھا کہ اس کے فلمساز ان کے دو دست جو پاکستانی نژاد امریکی ہیں۔ انہوں نے پروڈیوس کی ہے۔ ہاں کچھ سرمایہ انہوں نے بھی لگایا ہے اور وہ بھی شریک فلمساز ہیں۔

اس سے پہلے کہ اس انٹرویو کی دیگر باتیں بتاؤں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جہاں اور جس گھر میں یادگار گفتگو ہوئی۔ اس عظیم الشان اور شاندار گھر کے بارے میں بھی آپ کو معلومات فراہم کردوں۔

سید نور صاحب نے ابھی حال ہی میں شہر سے کچھ

صائمہ

صائمہ نور نسلاً پٹھان ہیں۔ ان کی مادری زبان پشتو ہے۔ مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ انہوں نے پشتو فلموں میں قسمت آزمائی کی بجائے پنجابی فلموں کو ترجیح دی اور اداکارہ انجمن کے بعد سلطان راہی کے ساتھ ان کی ایسی جوڑی بنی کہ سلطان راہی کی حادثاتی موت کے بعد ایسا لگا کہ ان کا فلمی کیریئر ختم ہوگیا ہے مگر ایسے میں سید نور نے انہیں اردو فلم گھونگھٹ میں پیش کیا تو وہ اردو فلموں کی بھی کامیاب اداکارہ بن گئیں۔

☆☆☆

ڈاکو رانی

''ڈاکو رانی'' کہنے کو تو ایک فلم ہے لیکن سمجھنے والوں کے لیے ایک پیغام ہے۔ اس فلم کا موضوع استحصالی اور ظالم قوتوں کے خلاف کمزوروں کا ایک اعلان بغاوت ہے۔ ظلم کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کرنے والی رانی کی کمزور آواز نے ڈاکو رانی بن کر ظالموں کو کیفر کردار تک پہنچایا۔

یہ کہانی اس وقت تک دہرائی جائے گی جب تک ظالم اور مظلوم کا وجود باقی ہے۔ ظلم جب حد سے بڑھتا ہے تو پھر ڈاکو رانی جیسے کردار جنم لیتے ہیں۔ انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہونے والی ہماری قوم خان، وڈیروں، چوہدریوں، سرداروں کے ظلم سے اب بھی آزاد نہ ہو پائی ہے۔ سید نور نے اس فلم کے لیے جس جرأت مندانہ موضوع کا انتخاب کیا وہ قابل تحسین ہے۔

☆☆☆

سید نور کا کارنامہ

سید نور فنکاروں کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اپنی اس خوبی کے تحت انہوں نے کئی نئے فنکار متعارف کرائے اور کچھ کو گوہر نایاب بنایا۔ جیسے شان، صائمہ، ثنا، بابر علی، ریشم، معمر رانا، اریانہ خان، سعود، عندلیب، محمد اسلم شیخ وغیرہ ایسے فنکار جن میں سے کسی کو متعارف کرایا تو کسی کو انمول کردیا۔

فاصلے پر ٹھوکر نیاز سے تقریباً 10 کلومیٹر آگے از میر ٹاؤن میں ایک..... شاندار اور عالی شان گھر صائمہ کو بنوا کر دیا ہے۔ یہ گھر اپنی طرز تعمیر کے حوالے سے سید نور کی ذہانت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس پورے گھر کو شاہ جی نے خود ہی ڈیزائن کیا ہے۔ اس گھر میں ان دونوں کا بیڈ روم بھی تخلیق کا بہترین نمونہ ہے۔ بیڈ روم کے ساتھ صائمہ نور کا ڈریسنگ روم ہے جس میں درجنوں الماریاں ہیں اور الماریوں میں سینکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں ان کے ڈریسز ہیں۔ پورے پاکستان میں اتنا وسیع ڈریسنگ روم شاید ہی کسی اور فنکارہ کا ہو۔ ڈریسنگ روم کے ساتھ ایک جدید جم بھی ہے۔ جس میں دنیا بھر کی جدید ترین ایکسر سائز مشینیں موجود ہیں۔ گھر کے اوپر والے حصے میں بنائی گئی انکسی ہے۔ اس انکسی کو بھی بہت ہی خوبصورت انداز میں ڈیزائن کیا گیا ہے۔ شاہ جی کے بقول اس پورے گھر کو انہوں نے خود ہی ڈیزائن کیا ہے اور ابھی چند روز قبل ہی وہ لوگ یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔

سید نور گھر بسانے کے لیے گھر بنانے کے معاملے میں کبھی پیچھے نہیں رہے۔ آپ کو یاد ہو یا نہ ہو۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنی پہلی بیوی رخسانہ نور کو بھی شادی سے پہلے لاہور کے اقبال ٹاؤن میں ایک کوٹھی بنوا کر دی تھی۔ ٹھیک ہے وہ اس نوع کی نہیں تھی جیسی صائمہ نور کی ہے۔ وقت وقت کی بات ہے۔ وہ شاہ جی کا اور دور تھا۔ اب ان کا اور دور ہے۔ وہ رخسانہ نور تھی، اہل قلم تھی، یہ صائمہ نور ہے، ایک سپر اسٹار ہے۔

مہمانوں نے شاہ جی سے پوچھا آپ کی ایک دو نہیں بلکہ درجنوں لکھی ہوئی ایسی فلمیں ہیں جنہیں پڑوسی ملک نے کاپی کی۔ جیسے دہلیز پر انہوں نے "اونچے لوگ" بنائی مگر ان کی فلم دہلیز کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکی۔

شاہ جی بولے۔ "دہلیز کا پورا اسکرپٹ سلمیٰ آغا انڈیا لے کر گئی تھیں۔ یوں سمجھیں میرے ہی لکھے اسکرپٹ پر فلم تیار کی گئی ہے دہلیز اصل میں ایک انگلش ناول کی کہانی پر ہے اور اس ناول پر دہلیز سے قبل انڈیا میں دو فلمیں "ہلچل" اور "بدلاوا" بنائی جا چکی تھیں۔ مگر انہیں بھی وہ کامیابی نہ مل سکی جو ہماری فلم دہلیز کو ملی۔ دہلیز ہی نہیں، بلکہ اسی ناول پر سپر ہٹ فلم "بوبی" بھی لکھی اور دونوں ہی فلموں نے ڈائمنڈ جوبلی کا اعزاز حاصل کیا۔ جن دنوں دہلیز کامیابی سے زیر نمائش تھی نذر شباب مرحوم میرے پاس آئے اور کہا کہ آئندہ ماہ سیتا پاکستان آ رہی ہیں میری خواہش ہے کہ ان کے سری لنکا سے پاکستان آنے پر ایک فلم ان کے ساتھ کروں۔ لہٰذا آپ جلد از جلد مجھے کوئی ریڈی میڈ اسکرپٹ بنا دیں تو میں نے کہا۔

"اس وقت تو دہلیز ہی کے چرچے ہیں۔ آپ کو یہی لکھ دیتا ہوں اس پر نذر شباب بولے۔" شاہ جی! دہلیز تو ابھی سینماؤں میں چل رہی ہے۔ اس پر میں نے کہا۔

دہلیز کو ایسا بنا کر لکھوں گا کہ کوئی کہہ نہیں سکے گا کہ یہ دہلیز والی کہانی ہے۔ یہی ہوا بہت کم لوگ جان سکے کہ دہلیز اور بوبی ایک ہی کہانی پر مبنی ہیں۔ کیونکہ بوبی میں محمد علی کا کردار اور دیگر چیزوں نے بوبی کو ایک جداگانہ رنگ دے دیا تھا۔

محمد علی کے علاوہ نئے اداکاروں پر بھی میں نے خوب محنت کی میری ایک فلم تھی "ہم سے ہے زمانہ" اس میں شیوا والا کردار میں نے جاوید شیخ کے لیے لکھا تھا۔ اس فلم کا تمام یونٹ کھٹمنڈو پہنچ گیا تھا لیکن جاوید شیخ نہیں پہنچے۔ جاوید فاضل صاحب غصے کے بہت تیز تھے۔ انہوں نے کہا کہ جاوید شیخ کو چھوڑ دیں۔ ہم یہاں نیپال سے ہی اس کردار کے لیے کسی آرٹسٹ کو لے کر کام چلا لیتے ہیں۔ اس پر میں نے بھی انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ فلم کا اہم ترین کردار ہے اور یہ لکھا ہی جاوید شیخ کے لیے گیا ہے۔ قدیر خان صاحب نے بھی کہا کہ جب تک ہم دوسرے فنکاروں کا کام شوٹ کر لیتے ہیں۔ مگر جاوید فاضل صاحب کسی کی بات ماننے پر تیار نہ تھے۔ انہیں جاوید شیخ پر بہت غصہ تھا۔ انہوں نے کہا۔ "ٹھیک ہے پھر میں یہ فلم چھوڑ رہا ہوں۔"

جاوید فاضل صاحب کے غصے کے آگے سب کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور ہم نے نیپالی نوجوانوں کے آڈیشنز لینے شروع کر دیے۔ مجھے یاد ہے، نوجوانوں کی ایک لمبی قطار آڈیشن دینے کے لیے کھڑی تھی۔ قطار کے درمیان میں کھڑے شیوا پر جیسے ہی میری نظر پڑی مجھے یہ نوجوان سر سے پاؤں تک مکمل فلمی لگا اور میں قطار کے درمیان سے اس کو نکال لایا۔ اور یوں ہم سے ہے زمانہ میں ہم نے شیوا کو کاسٹ کر لیا۔ قارئین کرام! اگر آپ نے یہ فلم دیکھی ہے تو آپ کو یاد ہوگا کہ شیوا ندیم صاحب کے ساتھ اداکاری کرتے ہوئے کافی آگے نکل گیا تھا۔

بالکل اسی طرح "چیف صاحب" میں جاوید شیخ نے نیلی والے کردار کے لیے پہلے صائمہ نور کو کاسٹ کیا تھا مگر بعد میں یہ کردار نیلی سے کرایا۔

ہوا یہ تھا کہ جن دنوں جاوید شیخ ''چیف صاحب'' شروع کر رہے تھے ان دنوں نیلی اور جاوید شیخ میں اختلافات چل رہے تھے۔ جاوید شیخ نے اس فلم کی بیرون ملک شوٹنگ پر جانے کے لیے، صائمہ نور کا پاسپورٹ بھی لے لیا تھا اور ٹیلر کو لا کر ڈریسز کے لیے ناپ بھی لے گئے تھے۔ مگر کچھ دنوں بعد پتا چلا کہ جاوید شیخ نیلی کو لے کر اپنے پورے یونٹ کے ساتھ ترکی چلے گئے ہیں۔ انہوں نے صائمہ کو بتانا تو درکنار پاسپورٹ تک واپس دے کر نہیں گئے۔ کیونکہ ان کی نیلی سے صلح ہوگئی تھی۔ یہ واقعہ بالکل ویسا ہی تھا جیسے گھونگھٹ میں نیلی کی جگہ صائمہ آگئی تھی۔

سلطان راہی کی وفات کے بعد صائمہ بالکل فارغ تھی۔ گھونگھٹ میں پہلے نیلی کو کاسٹ کیا گیا تھا۔ مگر اللہ جانے کس بنا پر نیلی سے جاوید شیخ کی نہ بن سکی تو شہزاد رفیق صائمہ کے پاس آئے اور کہا کہ آپ میری فلم ''گھونگھٹ'' میں کام کریں۔ ان دنوں صائمہ کو اردو فلم کرنا کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ٹھیک ہے آپ اپنے اسٹوری رائٹر کو کہیں کہ وہ آکر میرا کردار سنائے۔ اگر مجھے سمجھ آیا تو کرلوں گی۔ شہزاد صاحب نے جب یہ بات بتائی تو سید نور غصے میں آگیا۔ میں نے کہا کہ میں نے کبھی ندیم صاحب کو جا کر اسٹوری نہیں سنائی۔ میں اس کل کی لڑکی کو جا کر اسٹوری سناؤں گا؟''

بہرحال ان دنوں صائمہ کو کام کی ضرورت تھی۔ اس نے شہزاد رفیق کے کہنے پر فلم سائن کرلی۔ اس فلم میں اس کا ایک مختصر سا کردار تھا۔ وہ اپنے کردار کے حوالے سے کوئی بھی بات کرتی یا اپنا کوئی مسئلہ ڈسکس کرتی تو میں جھنجلا کر کہتا۔ ''آپ کی جو بھی شکایت ہو، جو بھی مسئلہ ہو۔ آپ پروڈیوسر سے کہا کریں۔ جس پر وہ شہزاد صاحب سے بولی۔ سیٹ پر ڈائریکٹر ہوتا ہے پروڈیوسر نہیں۔ میں کہاں بار بار آپ کو ڈھونڈتی پھروں گی۔ لہٰذا میں آپ کے ڈائریکٹر کے ساتھ کام نہیں کرسکتی۔''

شہزاد صاحب نے اسے سمجھا بجھا کر رام کیا۔ پھر جب اس نے فلم کا پہلا شارٹ دیا تو اس کی پرفارمنس دیکھ کر حیرت میں مبتلا ہوگیا۔ اور پھر میرا اکاروبہ میرے ساتھ خاصا بہتر اور دوستانہ ہوگیا تھا۔ اور اس کے بعد پرفارمنس کو دیکھتے ہوئے اس فلم میں مختصر کردار کو مزید بڑھا دیا۔ شاہ جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''شاہ جی! چوڑیاں، مہندی والے ہتھ، اور مجاجن، پنجابی زبان کی یہ تینوں ہی فلمیں آپ کی اور صائمہ جی کی نئی صلاحیتوں کی ایک اعلیٰ مثال ہیں۔ آپ کو ذاتی طور پر ان تینوں میں کون سی فلم زیادہ پسند ہے۔'' مہمانوں میں سے ایک نے پوچھا۔

تینوں ہی وہ فلمیں ہیں جنہیں ایک دوسرے سے کمپیئر کرنا کسی طور پر بھی مناسب نہیں۔ تینوں ہی اپنی اپنی جگہ خوب سے خوب تر ہیں۔ لیکن جہاں تک میری پسند کا تعلق ہے مجھے ذاتی طور پر ''مہندی والے ہتھ'' بہت زیادہ پسند ہے۔ شاہ جی نے کہا تھا کہ صائمہ بول اٹھی۔

''مجھے ان سب سے زیادہ ''ڈاکو رانی'' پسند ہے۔''

''ڈاکو رانی میں آپ نے دونوں ہاتھ چھوڑ کر گھوڑا دوڑایا تھا۔ اس کی تعریف نہ کرنا بدذوقی ہوگی۔''

''ڈاکو رانی کا یہ سین جب میں شوٹ کر رہا تھا اور اچانک سیم (صائمہ) نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر شارٹ دیا تو میں گھبرا گیا کہ شاید گھوڑا بدک گیا ہے۔ یا سیم کو کوئی مسئلہ ہو رہا ہے۔ میں نے فوراً کٹ کی آواز لگائی اور سیم کی جانب دوڑا تو انہوں نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

''شاٹ آپ نے لے لیا نا؟''

میں نے کہا نہیں، میں تو گھبرا گیا تھا تو سیم نے کہا کہ سین میں ریلیٹی کے لیے میں نے خود دونوں ہاتھ بلند کر کے گھوڑا دوڑاتے ہوئے یہ شارٹ دیا تھا۔ (یہ بات قابل ذکر ہے کہ شاہ جی، صائمہ کو پیار سے سیم کہہ کر مخاطب کرتے ہیں) ڈاکو رانی میں سیم کو بہترین اداکارہ کا قومی ایوارڈ بھی ملا تھا۔ لیکن ان کی عجیب طبیعت ہے، آپ نے دیکھا ہوگا یہ کبھی بھی نہ کسی ایوارڈ شو میں یا دیگر تقریبات میں جاتی ہیں نہ کسی کو انٹرویو دیتی ہیں۔ نہ کسی سے زیادہ بات چیت کرتی ہیں۔ بس اپنے کام سے کام رکھتی ہیں۔ مجھے بے حد حیرت ہے کہ آج یہ اتنے اچھے موڈ میں اور اتنا فرینڈلی آپ لوگوں سے خوب باتیں کر رہی ہیں۔

(صائمہ، شاہ جی کے بازو میں اپنا ہاتھ ڈالے ان کے کندھے پر سر رکھے بڑی معصومیت سے اپنے بارے میں ان کے یہ کمنٹس سن رہی تھیں)

شاہ جی نے ڈاکو رانی کے حوالے سے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جس روز قومی ایوارڈ کی تقریب تھی میں نے سیم کو سختی سے تاکید کی کہ یہ تقریب ضرور اٹینڈ کرنا۔ یہ تمہارے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ ایوارڈ اپنے ہاتھ سے وصول کرنا تو مجھے اس نے بڑی محبت سے کہا۔ ہاں میں

ضرور جاؤں گی۔ بس آپ میری سیٹ روک کر رکھنا۔ میں آجاؤں گی۔ میں تقریب کے دوران ان کا انتظار کرتا رہا۔ دوسرے ایوارڈ کے بعد جب بہترین اداکارہ کا ایوارڈ اناؤنس کیا گیا تو اس کو وصول کرنے کے لیے مجھے اسٹیج پر بلایا گیا۔ اور میں نے ان کا وہ ایوارڈ وصول کیا۔ یہ تقریب پی ٹی وی لائیو دکھا رہا تھا۔ میں یہ تقریب اٹینڈ کر کے جب گھر پہنچا تو دیکھا کہ یہ ملازمہ سے اپنے سر میں تیل لگوا رہی ہیں۔ مجھے بہت غصہ تھا۔ میں نے کہا۔ تم نہیں آئیں نا ایوارڈ شو میں۔

تو وہ بڑی معصومیت سے بولی کہ میں پی ٹی وی پر یہ ساری تقریب دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنے غصے کا اظہار اس طرح کیا کہ وہ یہ ایوارڈ آج تک انہیں نہیں دیا اور ان کا وہ ایوارڈ آج بھی میں نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔“

اس اثنا میں صائمہ نور ایک دم کھڑی ہوگئیں اور بولیں۔ ”ناشتے کو کافی دیر ہوگئی ہے۔ میں آپ سب کے لیے اچھی سی چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

ایک پرستار نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”صائمہ جی ایک بڑی فنکارہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دیندار خاتون بھی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار شب معراج کے موقع پر سعود بٹ نے ان کی لاکھ منتیں کیں لیکن ان کا موقف تھا کہ ”آج بڑی رات ہے۔ لہٰذا میں کام نہیں کروں گی۔“

”ہاں سعود بٹ نے مجھے بھی فون کر کے کہا تھا کہ آپ کسی طرح صائمہ کو راضی کرلیں۔ میرا صرف ایک سین رہتا ہے۔ کل شان ملک سے باہر چلا جائے گا اور کافی عرصہ بعد واپسی ہوگی۔ میں نے بھی سیم کو سمجھانے کی بہت کوشش کی اور کہا کہ یہ کوئی گانا یا ڈانس وغیرہ کی شوٹنگ نہیں ہے صرف ایک سین رہ گیا ہے جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن سیم کا ایک ہی جواب تھا کہ یہ عبادت کی رات ہے اور اس رات میں میں ایسا کوئی کام نہیں کرسکتی۔ شاہ جی اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔ ایک بار آدھی رات کو میری آنکھ کھلی تو مجھے سسکیوں سے کسی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تو دیکھا۔ سیم جائے نماز پر بیٹھی رو رو کر اور گڑگڑا کر اللہ کے حضور اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہی ہے۔ واضح رہے کہ سیم بڑی باقاعدگی سے ہمیشہ نماز پنج گانہ کا اہتمام کرتی ہے۔“

میں یہ واقعہ پڑھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ ”یہ کون سے گناہ ہیں جن کی معافی صائمہ نور رو رو کر اللہ سے مانگتی ہیں؟ پھر میرے ذہن میں ایک بجلی سے کوندی۔ کہیں یہ ایک شادی شدہ اور بال بچے دار خاتون کے حق پر ڈاکا ڈالنے کا احساس تو نہیں؟ شاید...... شاید...... شاید ایسا ہی ہو۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ رخسانہ نور جس طرح اس صدمے سے بیمار ہوئیں اور جس طرح اس دنیا سے رخصت ہوئیں۔ یہ بے حد تکلیف دہ واقعہ ہے۔ اس وقت شاید صائمہ کو بھی اس سنگینی کا احساس نہیں ہوگا۔ لیکن بعد میں دوسروں کی طرح وہ بھی اس بارے میں سوچنے لگی ہوں کہ انہوں نے حقیقتاً بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ شاید اس کا کبھی کسی کے سامنے اظہار نہ کیا ہو۔ لیکن اندر سے یہ احساس انہیں ہمیشہ کچوکے لگاتا رہتا ہو۔

شاہ جی کی بات ابھی ختم ہوئی تھی کہ صائمہ کے ہمراہ گھر کا ملازم چائے کی ٹرالی لے کر داخل ہوا۔ صائمہ جی نے سب لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے چائے پیش کی۔

ذرا دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد موضوع بدلتے ہوئے ایک مہمان نے شاہ جی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ شاہ جی! ”چین آئے نہ“ کی ہیروئن کو لوگوں کی طرف سے سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟“

بات دراصل یہ ہے کہ جب مجھے پتا چلا کہ وہ کراچی میں کام تلاش کرتی پھر رہی ہے تو میرے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ اس فیملی کی لڑکی جس فیملی کے ہماری فلم انڈسٹری پر بہت احسانات ہیں۔ محترمہ صبیحہ خانم کی نواسی اور پھر سب سے بڑھ کر میرے استاد محترم سید سلیمان صاحب کی بھی وہ نواسی ہی ہیں تو میں نے انہیں فون پر ہی اپنی فلم کی ہیروئن سائن کرلیا۔ مجھے آج بھی اپنے اس فیصلے پر کوئی شرمندگی یا ندامت نہیں ہے۔ لوگوں کا کام باتیں کرنا ہے سو وہ ہر حال میں کرتے رہیں گے۔ تیسری اس فلم پر تو زیادہ تر ان لوگوں نے تنقید کی جنہوں نے یہ فلم دیکھی ہی نہیں۔

شاہ جی بول چکے تو ایک پرستار نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ”بلاشبہ شاہ جی کی یہ بات سو فیصد درست ہے کہ اس فلم پر تنقید کرنے والوں میں ان لوگوں کی اکثریت شامل ہے جنہوں نے یہ فلم دیکھی ہی نہیں ہے۔ اور پھر ان کے مخالفین نے اس فلم کی آڑ لے کر نہ جانے کیسے کیسے گھٹیا الزامات شاہ جی پر لگائے۔ وہ یہ بھول گئے کہ یہ وہی سید نور ہیں جنہوں نے ہمیشہ اس ڈوبتی ہوئی فلم انڈسٹری کو اپنی محنت اور لگن سے قسم، سنگم، سرگم، جیوا، گھونگھٹ، چور مچائے شور، چوڑیاں، ڈاکو رانی، مہندی

والے ہتھ، دیوانے تیرے پیار کے، دو پٹا جل رہا ہے۔ اور مجاجن جیسی سپر کلاس فلمیں دے کر فلم انڈسٹری کو سہارا دیا۔ ان کی ایک فلم کی ناکامی پر سوشل میڈیا پر ان کے خلاف جس طرح واویلا مچایا گیا وہ بے حد شرمناک ہے۔ انہیں اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ شاہ جی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے اس انڈسٹری سے ساری زندگی جو کمایا وہ اسی انڈسٹری پر لگایا ہے۔ آج بھی ''ہیرا گون'' فلم اکیڈمی اور ان کی پروڈیوس کردہ فلمیں اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

قارئین یقیناً اس بات کا انتظار کر رہے ہوں گے کہ اب تک رخسانہ نور کے بچوں کا ذکر نہیں آیا تو آخر... میں ان کا ذکر بھی کر دوں۔

آج سے دس سال پہلے جب صائمہ نور نے سید نور سے ہونے والی شادی کو دو سال تک خفیہ رکھنے کے بعد اس کا اعلان کیا تھا تو وعدہ کیا تھا کہ میں شاہ جی کی مریدنی بن کر رہوں گی۔ رخسانہ نور کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح رکھوں گی۔ بیٹیوں کو اپنے ہاتھ سے رخصت کروں گی اور ظل شاہ کے سر پر سہرا سجاؤں گی۔ ہوسکتا ہے انہیں اسی وقت یہ احساس ہوگیا ہو کہ یہ کام رخسانہ نور کی بجائے ان ہی کو کرنا پڑے گا۔

آج سے کوئی تین سال پہلے کی بات ہے۔ یعنی 2014ء کو جب رخسانہ نور حیات تھیں اور امریکا میں تھیں۔ ان ہی دنوں کی بات ہے۔ ایک مستند صحافی نے شاہ جی سے ان کے بچوں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا۔ میری تینوں بیٹیاں اپنے شوہروں اور بچوں کے ساتھ امریکا، برطانیہ اور جاپان میں ہیں۔ خیر سے نانا بھی بن چکا ہوں۔ وہ مجھ سے ادب اور پیار سے ملتے ہیں میں خود بھی ان سے ملنے جاتا ہوں۔ جبکہ میرا بیٹا ظل شاہ آج کل لاہور میں ہے اور میرے ساتھ ہی شباب اسٹوڈیو (ہیرا گون) ... میں کام کرتا ہے۔ لوگ باتیں بناتے ہیں کہ میں نے 50 برس کی عمر میں صائمہ کے ساتھ شادی کر کے اپنی پہلی بیوی اور بچوں کو رلایا ہے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ سلطان راہی کی ناگہانی موت کے بعد لوگوں نے صائمہ کو سلطان راہی کی بیوہ قرار دے دیا تھا بے چاری کا کیریئر تباہ ہوگیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ عدت کے دن گزار رہی ہے۔ انہی دنوں میں نے صائمہ کو اپنی فلم ''گھونگھٹ'' میں بالکل ایک نئے انداز میں متعارف کرایا۔ اردو زبان کی فلم میں صائمہ کے اس نئے روپ کو دیکھ کر فلم بین حیران رہ

کینسر کے پھیلاؤ کی عکس بندی

جسم میں کینسر کے خلیوں کی نقل و حرکت تو جاپان میں ویڈیو کے ذریعے عکس بند کیا گیا ہے۔ اس ویڈیو میں جسم کے عام خلیوں کو سبز رنگ میں اور کینسر زدہ خلیے سرخ رنگ میں دکھائے گئے ہیں۔ یونیورسٹی آف ٹوکیو اور ریکن کوانٹیٹو بائیولوجیکل سینٹر کا کہنا ہے کہ اس ٹیکنالوجی کی مدد سے اس مہلک عمل کی وضاحت ہو سکے گی۔ اس تحقیق کے دوران چوہے کو استعمال کیا گیا ہے تاہم یہی طریقہ جلد ہی انسانوں کے علاج کے لیے استعمال کیا جاسکے گا۔ کینسر کے جسم میں پھیلنے کے عمل کو میٹاسٹسس کہتے ہیں۔ کینسر کے پھیلنے سے پہلے ہی کینسر کو روکنا آسان ہوتا ہے لیکن اگر یہ پھیل جائے تو پھر کنٹرول بہت مشکل ہے۔ کینسر کا پھوڑا خود تو بڑھتا ہی ہے لیکن اس کے کچھ حصے الگ ہوکر جسم میں خون کے ساتھ گردش کرتے ہیں اور مزید جگہوں پر کینسر کے خلیے بن کر زخم بناتے رہتے ہیں۔ تجربے کے دوران ڈاکٹرز نے چوہے کے جسم میں کینسر کے ٹشوز ڈالے۔ اس کے بعد اس بیماری کے پھیلاؤ کو جانچنے کے لیے ایسے کیمیائی مادے اس کے جسم میں ڈالے جس کی مدد سے چوہے کے جسم کے اندرونی اعضا بہت زیادہ شفاف ہو گئے۔ اور کینسر کے خلیوں کی شناخت ہوسکی۔ سیل رپورٹ نامی جریدے میں شائع تحقیق میں کینسر کے خلیوں کی پھیپھڑوں، آنتوں اور جگر میں پھیلاؤ کی تفصیل شامل کی گئی ہے۔ تحقیق میں شامل ڈاکٹر کوہی میاز ونو کا کہنا تھا' کینسر کے بیشتر خلیے دورانِ سفر مر گئے لیکن کینسر نے ان کے دوبارہ بڑھنے کے لیے پھر سے کیمیائی سگنلز بھیجنا شروع کر دیے۔ محققین نے ان میں سے ایک کے اثرات کو بھی پرکھا جسے 'ٹی جی ایف بیٹا' کہا جاتا ہے اور دیکھا کہ یہ ڈرامائی انداز میں بہتر ہوا اور پھیپھڑوں میں کینسر کے خلیوں کی کالونی بنا دی۔ خیال کیا جا رہا ہے کہ اس ٹیکنالوجی کو خود بخود ٹھیک ہو جانے والی بیماریوں سمیت کئی دوسری بیماریوں کے لیے بھی استعمال کیا جاسکے گا۔

مرسلہ: وارث علی، ملتان

گئے۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں خود صائمہ کے دام عشق میں پھنس گیا ہوں۔ آپ یقین کریں جب میں نے صائمہ سے پہلی بار اظہار محبت کیا۔ وہ ایک باشعور لڑکی تھی اور ٹاپ کی ہیروئن' وہ خود دل ہی دل میں مجھے آئیڈیل شوہر تسلیم کر چکی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

"شاہ جی! یہ ہاتھ پکڑا ہے تو اس کو کبھی چھوڑنا مت۔"

اور میں نے وعدہ وفا کر کے اس ہاتھ کو ہمیشہ کے لیے تھام کر صائمہ سے فلرٹ، عشق، اسکینڈل کرنے کے بجائے انہیں عزت سے اپنی دوسری بیوی بنالیا اور جہاں تک یہ بات کہ میری دوسری شادی کی وجہ سے میری پہلی بیوی ناراض ہوگئی۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ مجھے تین جوان بیٹیوں کی موجودگی میں یہ شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مگر مجھے اوپر والے کی ذات پر یقین تھا۔ اگر میرا دل سچا ہے تو میری پہلی بیوی اور بیٹیاں مجھے معاف کر دیں گی اور الحمد للہ رخسانہ نور نے دل سے صائمہ کو قبول کیا ہے اور میری تینوں بیٹیوں نے بھی مجھے معاف کر دیا ہے۔ جہاں تک رخسانہ نور کی ناراضگی کی بات ہے میں ابھی آپ کی بات بذریعہ موبائل فون ان سے کرواتا ہوں۔

شاہ جی نے اس وقت اپنے موبائل فون سے امریکا میں رخسانہ نور سے رابطہ کیا اور کہا۔ "وہ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔" یہ کہہ کر فون انہوں نے تھمادیا۔

ادھر سے رخسانہ کی آواز سنتے ہی صحافی نے پوچھا۔ "آپ کو شاہ جی کی یاد آتی ہے؟"

"شاہ جی کے بغیر ایک لمحہ بھی جی نہیں سکتی۔ شاہ جی کو جلد ہی میرے پاس بھیجیں۔"

اس کے بعد شاہ جی نے صائمہ سے فون پر لاہور رابطہ کیا (واضح رہے یہ انٹرویو کراچی میں ہو رہا تھا) اور صائمہ سے پنجابی زبان میں علیک سلیک کرنے کے بعد کہا۔ "میرے صحافی دوست سے بات کرو۔" اور فون اسے تھمادیا۔

صحافی نے پوچھا "آپ اس وقت شاہ جی کے بغیر کیسا محسوس کر رہی ہیں؟"

"ان کے بغیر مجھے لاہور اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ شاہ جی ایک پیار کرنے والے انسان ہیں۔ حالانکہ میری فیملی کے لوگوں نے مجھ سے کہا تھا کہ صائمہ تم 60 سال کے ایک شادی شدہ شخص سے جو چار بچوں کا باپ ہے، اس سے شادی کر رہی ہو بعد میں تم بہت پچھتاؤ گی۔ مگر آپ یقین کریں میں نے بڑی........ عمر کے شخص سے شادی کر کے دس سال کا عرصہ گزار دیا اس کے باوجود خوش ہوں۔ وہ ہم دونوں کے ساتھ مساوی سلوک کرتے ہیں جو ان کی شخصیت کے حوالے سے میری نظر میں کافی ہے۔"

صائمہ سے گفت گو کے بعد شاہ جی نے صحافی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ کی بھابی (رخسانہ نور) اور اپنی پہلی بیوی سے جب عشق کیا تو اس کو اپنایا۔ سب جانتے ہیں، بی اے جرنلسٹ، رخسانہ میرا انٹرویو کرنے آئی تھی۔ فرسٹ انٹرویو میں وہ مجھے اس قدر پسند آگئی کہ میں نے الٹا اس کا انٹرویو کر کے جھٹ محبت پٹ شادی کر کے اسے بیوی بنالیا۔

شاہ جی نے خود پر لگائے جانے والے الزام کی نفی کرنے کی کامیاب کوششیں کیں۔ رخسانہ نور اور صائمہ نور سے صحافی کی بات کروا کر اسے مطمئن کر دیا۔ مگر جہاں تک رخسانہ نور کی بات ہے۔ یہی کہا اور سمجھا جائے گا کہ وہ ایک وفا شعار بیوی تھیں۔ اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ وہ اپنے دکھ درد کا پرچار کرنے کی قائل نہیں تھیں۔ غالباً اسی لیے وہ خاموشی کے ساتھ امریکا چلی گئی تھیں۔ شاہ جی کا یہ کہنا کہ وہ ان سے ناراض نہیں اور انہوں نے دل سے صائمہ کو قبول کر لیا تھا۔ درست نہیں۔ شاہ جی اور صائمہ نے دو سال تک اس شادی کو خفیہ رکھا اور جب کسی مجبوری کی وجہ سے اس شادی کا اعلان کیا تو رخسانہ نور کے پاس اس کے علاوہ اور کیا راستہ تھا کہ وہ خاموشی سے یہ ظلم برداشت کر لیں۔

دوسری شادی کے بعد شاہ جی کے بچے کس حال میں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ اس سوال کا جواب شاہ جی کے ایک تین سال پرانے انٹرویو سے مل گیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس انٹرویو کے تذکرے کو میں یہیں ختم کر دوں مگر اس بولڈ انٹرویو میں صحافی مذکور نے شاہ جی پر جو مزید الزامات لگائے وہ بھی بڑے دلچسپ ہیں اور ان کے جواب سے بھی معلومات کے کچھ بند دریچے کھلتے ہیں اس لیے سب نہیں۔ کچھ مزید سوال جواب بھی حاضر خدمت ہیں۔"

انٹرویو میں صحافی نے پوچھا۔ "آپ پر الزام ہے کہ آپ ایک سفید ہاتھی ہیں جو فلمسازوں کے ساتھ ہٹ فلم کے باوجود گھاٹے کا سودا کرتے ہیں۔"

شاہ جی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "آپ کا یہ الزام بالکل درست ہے کہ مجھے لوگ بطور ڈائریکٹر سفید ہاتھی کہتے ہیں۔ مگر یہ الزام صرف ان لوگوں نے لگایا جنہیں میں

نے ہٹ، سپر ہٹ فلمیں ماضی میں بنا کر دیں۔ اس وقت وہ سب خوش دکھائی دیتے تھے جب میں نے لکھ پتی کو کروڑ پتی فلمساز بنا دیا تو وہ کریڈٹ مجھے کوئی نہیں دیتا ہے۔ آپ کو پتا ہے، میری سپر ہٹ فلم ''چوڑیاں'' کا بجٹ صرف 55 لاکھ روپے تھا اور اس فلم نے 50 کروڑ روپے کا بزنس کر کے برصغیر کی سب سے زیادہ چلنے والی فلم کا اعزاز حاصل کیا۔ میری اس فلم سے فلمساز کروڑ پتی بن گیا۔ میں نے کبھی فلمساز کی رقم ضائع نہیں کی۔ ہمیشہ بجٹ میں رہ کر فلم بنائی۔ ایورنیو پکچرز کی ''دیوانے تیرے پیار کے'' اپنے دور کی ایک سپر ہٹ فلم تھی۔ گل برادران نے مجھے مالی طور پر جو بجٹ دیا تھا میں نے اس سے کم میں یہ فلم بنائی۔ اس فلم کی کامیابی اور اسے پیش کرنے کے انداز کو شہزاد گل اور سجاد گل نے بے حد پسند کیا۔ اور مجھے انعام سے نوازا۔ میرے کریڈٹ میں فلم انڈسٹری کے زوال کے وقت چند فلمیں ہیں۔ میں نے جس طرح فلم مکمل کر کے فلمسازوں کی ضد کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا کچن چلایا۔ اس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ مگر یہ میری مجبوری تھی۔ کیونکہ ہمیں فلمسازوں اور سینما سرکٹ نے مجبور کیا کہ اس ٹائپ کی فلمیں بناؤں۔ مگر مجھے بعد میں اس کا احساس ہو گیا۔ اس لیے میں نے قومی زبان کی فلم ''جھومر'' بنائی۔ مگر اس فلم کی ناکامی سے میں بے حد مایوس ہو گیا تھا۔ کیونکہ سینما گھروں کے مالکان نے ناانصافی کا مظاہرہ کر کے اس خوبصورت اور اعلیٰ معیار کی فلم کو ہمیشہ کے لیے فلاپ ڈکلیئر کر کے ڈبوں میں بند کر دیا۔ جس کی وجہ سے میں مایوس ہو گیا تھا۔''

''فلمی دنیا آپ کی ناکامی کی وجہ صائمہ کو قرار دیتا ہے کہ آپ نے صائمہ کے عشق میں اپنی ذاتی زندگی اور فلمی زندگی... سے ایک بہت بڑا جوا کھیلا ہے۔ آپ کی پہلی بیوی رخسانہ نور اور آپ کے بچے آپ کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے بیرونِ ملک شفٹ ہو گئے۔'' ایک دکھتا ہوا سوال کیا گیا۔

''یہ ایک نیا الزام ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ نے اگر عشق کیا دوسری شادی کی ہے تو کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ جو میرا ذاتی معاملہ بھی ہے۔ مگر ہم چونکہ پبلک پراپرٹی ہیں، لوگوں کو بالکل یہ حق ہے کہ وہ ہمارے حوالے سے گفت و شنید کریں مگر خدارا مجھ پر میری ذاتی زندگی کے حوالے سے اس طرح فضولیات پر مبنی من گھڑت باتیں نہ کریں۔ ایسے الزامات پر مجھے دکھ ہوتا ہے۔ مجھے پتا ہے کہ یہ آپ کا الزام نہیں ہے۔ آپ مجھ سے وہ سوالات پوچھ رہے ہیں جو الزام

غلطیاں جنگ کے میدان کی۔

ہٹلر کے بارے میں سب ہی جانتے ہیں کہ وہ کیسا آدمی تھا۔

یہ کہنا بالکل درست ہے کہ جو جتنا بڑا انسان ہوتا ہے۔ اس کی حماقتیں بھی اتنی ہی بڑی ہوتی ہیں۔ ہٹلر نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ اس نے روس کو فتح کرنے کی پلاننگ کی اور فوجوں کو روس کی طرف روانہ کر دیا۔ بہت زبردست فوج تھی۔ اور یہ جذبہ بھی تھا کہ ہر حال میں فتح حاصل کرنی ہے۔ لیکن تاریخ کی ایک بہت بڑی غلطی سرزد ہو چکی تھی۔ ایک تو سردی کا موسم۔ اور وہ بھی روس کی سردی۔ ان بے چاروں کو موسم گرما کی وردیاں پہنا کر بھیج دیا گیا تھا۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ ایسی فوج کا کیا انجام ہوگا۔ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ پوری فوج سردی سے ٹھٹھر کر رہ گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں فوجی ہلاک ہو گئے۔ اور بچ جانے والوں کا دشمنوں نے صفایا کر دیا کچھ غلطیاں ایسی بھی ہوتی ہیں۔

مرسلہ: نیاز کھوسو، لسبیلہ

****

یورپ میں ایک جنگ بہت مشہور ہوئی۔ یہ جنگ Agin court کی جنگ کہلاتی ہے۔ یہ جنگ فرانس اور برطانیہ کے درمیان ہوئی تھی۔ اس جنگ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ فرانس والوں کو عددی لحاظ سے فوقیت حاصل تھی۔ اس کے باوجود وہ بری طرح ہار گئے۔ اس ہار کی وجہ بھی بہت دلچسپ تھی۔ فرانس کی فوجوں کے لیے اسلحہ ڈیزائن کرنے والا ایک شخص تھا۔ جس نے اس زمانے کے لیے کمان اور تیر بنا کر دیے۔ ان کمانوں کی خاص بات یہ تھی کہ وہ کمانیں انسانی قد سے بڑی تھیں۔ اس ماہر اسلحہ ساز کا کہنا تھا کہ ان کمانوں سے چلائے ہوئے تیروں میں بہت فورس ہوتا ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ عین جنگ کے وقت ان کمانوں کو کھینچنا ہی مشکل ہو گیا۔ بے چارے فرانسی فوجی کمانوں سے تیر چلانے کی کوشش ہی کرتے رہے اور برطانوی فوجوں نے انہیں تباہ کر دیا۔

مرسلہ: واجد الحسن، کراچی

میرے مخالفین مجھ پر لگاتے ہیں۔" شاہ جی نے سنجیدہ انداز میں جواب دیا۔

"شاہ جی آپ پر ایک بڑا الزام یہ بھی ہے کہ آپ گذشتہ سات سال سے لالی ووڈ میں موجود ہیں مگر سوائے چند روایتی پنجابی فلموں کے عملی طور پر کچھ نہیں کر رہے ہیں، ماضی میں آپ نے بے شمار سپرہٹ فلمیں قومی زبان کی تخلیق کیں پھر کیا وجہ ہے کہ آپ ہر چھ ماہ بعد چند فلموں کے اعلانات کر کے محض خبروں میں ان رہنے کے لیے ڈراما کر کے غائب ہو جاتے ہیں؟"

"ایک اور الزام کا تیر چلا۔ میں نے کوئی سلیمانی ٹوپی نہیں پہنی ہے؟ میں روزانہ آپ کو اسٹوڈیو، ٹی وی کے ٹاک شوز، فلم والوں کی تقریبات، سینما گھروں میں نئی فلموں کے پریمئر کے حوالے سے ہر جگہ نظر آتا ہوں۔ جہاں تک مجھ پر الزام ہے کہ میں گذشتہ سات سال سے کوئی فلم نہیں بنا رہا ہوں، مانا کہ میں نے اس عرصے میں کوئی گھونگھٹ، جیوا، ڈاکو رانی، سرگم، سنگم، چوڑیاں، مجاجن کی طرح بڑی فلمیں نہیں بنائیں۔ مگر یہ الزام غلط ہے کہ میں محض اپنے آپ کو خبروں میں زندہ رکھنے کے لیے یہ کرتا ہوں۔ میں اس کی نفی کرتا ہوں۔ فلم انڈسٹری کے حوالے سے ہمارے ملک کی جو حالت ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ جب بول، وار، میں ہوں شاہد آفریدی جیسی فلموں نے کامیابیاں حاصل کیں۔ میں نے سب سے پہلے ان فلموں کو ویلکم کیا اور بڑے فخر سے کہا کہ ان فلموں نے بھارتی فلموں کو شکست دے کر یہ ثابت کر دیا کہ ہماری قوم آج بھی ہماری فلمیں دیکھنے کی خواہش مند ہے۔ اسی اثنا میں میں نے ایک ساتھ تین قومی زبان کی فلمیں شروع کرنے کا صرف اعلان نہیں کیا بلکہ باقاعدہ پلان کیا ہے۔ ان فلموں میں "پرائس آف آنر" "بھائی وانٹڈ" اور "فرسٹ لو" شامل ہیں۔ ان تینوں فلموں کے موضوع ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ جو لوگ مجھ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ سید نور کو خبروں میں زندہ رہنے کے لیے شوشے کا شوق ہے۔ ان لوگوں کو میرا یہ جواب ہے کہ مجھے ان ہتھکنڈوں کی ضرورت نہیں ہے۔ جو لوگ مجھے قریب یا دور سے جانتے ہیں ان کو پتا ہے کہ سید نور ان فضولیات سے بالاتر ہے۔ میں نے 21 سال کی عمر میں جس ماحول میں شب و روز کی جدوجہد کی آج 67 سال کی عمر میں پاکستان فلم انڈسٹری میں عزت شہرت اور دولت مجھے ملی ہے اس کے لیے میں اپنے رب کا شکر بجا لاتا ہوں اور سال رواں میں میری پہلی فلم عاشورہ کے بعد "پرائس آف آنر" ریلیز ہو رہی ہے۔ اگلے سال 2015ء میں مزید دو فلمیں "بھائی وانٹڈ" اور "فرسٹ لو" پیش کر دوں گا۔ آج کل ہماری پاکستانی فلمیں زبردست کامیابی سے ہمکنار ہو رہی ہیں اور میں ایک بار پھر سینما انڈسٹری کی طرح فلم انڈسٹری کی بحالی کے حوالے سے کام کر رہا ہوں۔ میری یہ عملی جدوجہد کچھ حاسدین کو شاید ہضم نہیں ہو رہی ہے۔ اس لیے اس قسم کے الزامات الیکٹرونکس و پرنٹ میڈیا کے علاوہ موبائل SMS کے ذریعے پھیلا رہے ہیں مگر آنے والے وقت میں میرا کام دیکھ کر ان لوگوں کے منہ بند ہو جائیں گے۔"

واضح رہے کہ یہ باتیں، یہ وعدے شاہ جی نے اپنے ایک انٹرویو میں 2014 میں کیے تھے لیکن آج تین سال بعد یعنی 2017ء میں نہ ان کی فلم "پرائس آف آنر" ریلیز ہوئی ہے نہ "بھائی وانٹڈ" البتہ "فرسٹ لو" غالباً "چین آئے نہ" کے نئے نام سے پیش کی جا چکی ہے۔ مذکورہ پہلی دو فلمیں کیوں تاخیر کا شکار ہوئیں؟ کہیں اس کی یہ وجہ تو نہیں، جو ان کے کچھ مخالفین ان پر الزام لگاتے ہیں کہ صائمہ نور کی وجہ سے ان کی فلمی زندگی متاثر ہوئی ہے۔ اگر کچھ لوگ یہ کہیں کہ اس دوران شاہ جی نے اپنی زیر تکمیل فلموں کو مکمل کرنے سے زیادہ دلچسپی اپنی حقیقی ہیروئن کے لیے شیش محل کی تکمیل میں لی۔ کہنے والوں کے منہ کون بند کر سکتا ہے۔ ہم تو شاہ جی کی طرف سے یہی جواب دے سکتے ہیں کہ کچھ فلم میکرز تو ایک فلم بنانے میں تین چار سال لگا دیتے ہیں۔ شاہ جی نے تو ایک فلم ریلیز کر دی ہے اور دو فلمیں 2015ء میں نہ سہی 2017ء میں ریلیز کر دیں گے۔

شاہ جی نے مزید کہا کہ یہ بھی مجھ پر ایک بڑا الزام ہے کہ میں کراچی کی فلموں کو سپورٹ نہیں کرتا۔ جتنا میں اپنی پاکستانی فلموں کو سپورٹ کرتا ہوں شاید ہی کوئی کرتا ہوگا۔ آپ اندازہ لگائیں میں اپنی فلم "بھائی وانٹڈ" کو گذشتہ عید الفطر کے حوالے سے پلان کر چکا تھا۔ مگر کراچی کے اسلم بھٹی اور گل حمید بلوچ نے اپنی ہیوی بجٹ کی قومی زبان کی فلم "سلطنت" کو کنفرم کیا۔ جس کے لیے میں نے اپنی فلم کی نمائش ملتوی کر دی تھی اور اس سال عید الاضحیٰ کے موقع پر دو قومی زبان کی فلموں "021" اور "نامعلوم افراد" کے لیے سینماؤں کے حصول اور دیگر امور کے لیے میں نے اپنے آپ کو مصروف کر رکھا ہے۔ آپ کو معلوم ہے زیبا بختیار کی فلم ایک بھارتی فلموں کے تقسیم کار کے پاس ہے مگر زیبا

بختیار نے کراچی، سندھ میں مانڈوی والا گروپ کے نواب صاحب اور پنجاب سرکٹ کے لیے ہم دونوں کمر بستہ ہیں۔ حالانکہ ہماری دونوں فلموں کے مقابلے میں بھارت کی دو بڑی فلمیں ہیں مگر ہم گھبرانے والوں میں نہیں۔ ہماری فلمیں انشاءاللہ ڈٹ کر ان کا مقابلہ کریں گی۔''

وہ جو کہتے ہیں کہ بات سے بات نکلتی ہے تو صحافی کی بات کا جواب دیتے ہوئے شاہ جی نے جن نواب صاحب کا حوالہ دیا۔ انہی نواب صاحب نے مذکورہ صحافی اور سیدنور کی گفت و شنید سے چندروز پہلے شاہ جی کے اعزاز میں ''ایک شام سیدنور کے نام'' ترتیب دی تھی۔ یہ نواب صاحب کوئی اور نواب نہیں، مانڈوی والا انٹرٹینمنٹ (پرائیویٹ لمیٹڈ) کے ڈائریکٹر ڈسٹری بیوشن ہیں۔ عرصہ پچاس برسوں سے سینما انڈسٹری اور فلم انڈسٹری سے وابستہ ہیں اور ایک مستند تجزیہ نگار کی حیثیت سے تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کے تجزیوں سے قومی اخبارات اور فلمی جرائد کو ایک نئی جہت اور روشنی ملتی ہے۔ سابقہ سینما نشاط اور موجودہ ایٹریم سینما کے حوالے سے زیادہ پہچانے جاتے ہیں۔ سیدنور سے ملنے اور احباب کو ملانے کی اس تقریب کو نام تو ''شام'' کا دیا گیا مگر حقیقتاً یہ عشائیے کی تقریب تھی جو 12 ستمبر 2014ء کی شام سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی میں واقع الحاج بندو خان ریسٹوران کی بالائی منزل میں ایئرکنڈیشنڈ منی ہال میں ترتیب دی۔ سیدنور کی فلم ''پرائس آف آنر'' کراچی اور سندھ سرکٹ کے لیے سائن کی تھی۔ یہ تقریب غالباً اسی خوشی کے اظہار کے طور پر تھی۔ نواب صاحب نے سیدنور کے اعزاز میں ترتیب دی تھی۔

جب مہمان خصوصی سے بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا تو شاہ جی نے بڑے دکھ کے ساتھ ایک ایسے SMS کا تفصیلی ذکر کیا جو انہیں اسی دن 12 ستمبر کو ملا تھا۔ انہوں نے بتایا یہ SMS کچھ یوں تھا، سیدنور نے 1969 میں ایس سلیمان کا اسسٹنٹ بن کر انڈسٹری میں قدم رکھا۔ اب ان کی عمر 70 سال ہے۔ سب سے زیادہ مسلسل 25,20 فلاپ فلمیں دینے والے کو ''شومین'' کا لقب دینے والے سوچ لیں۔ سب سے زیادہ کامیابی کا اسکور پرویز ملک کا ہے۔ جن کی دو فلمیں ناکام اور باقی سب کامیاب ہوئیں۔ جبکہ شباب کیرانوی کی ہر دوسری یا تیسری فلم کامیاب ہوا کرتی تھی۔ شباب کیرانوی نے فلمساز، ہدایت کار، رائٹر اور شاعر اور اسٹوڈیو اونر کے طور پر فلم

کچھ ایسی غلطیاں بھی ہوتی ہیں جن پر برسوں تک یقین رکھا جاتا ہے۔ یعنی وہ غلطیاں بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ اور یہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ کوئی غلطی نہیں ہے۔ ایسی غلطیوں کی تعداد اگرچہ بہت کم ہوتی ہے لیکن یہ غلطیاں بہت عظیم الشان قسم کی ہوا کرتی ہیں۔ اور ایسی غلطیوں میں پوری قوم مبتلا ہوجاتی ہے۔ آئیں ہم آپ کو ایک ایسی ہی غلطی کے بارے میں بتاتے ہیں۔ یہ زمانہ ہے 1553 کا۔ اس وقت اسپین میں فورٹین نام کا ایک آدمی ہوا کرتا تھا۔ وہ ایک ملاح تھا۔ اس نے کوئی جرم کیا تھا جس پر اسے قید کی سزا ہوگئی تھی لیکن وہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ ایک بحری جہاز چرا کر فرار ہوگیا۔

بہت دنوں کے بعد یہ جہاز کیلی فورنیا کے ساحل سے آلگا۔ فورٹن نے سمجھا کہ اس نے کوئی بہت بڑا جزیرہ دریافت کرلیا ہے۔ اپنی اس ''دریافت'' پر فورٹن کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس نے فوری طور پر جزیرہ کیلی فورنیا کا ایک نقشہ بھی تیار کرلیا۔ کچھ دنوں کیلی فورنیا میں گزار کر وہ اسپین واپس آگیا۔

ایک بہت بڑے جزیرے کی دریافت پر نہ صرف اس کی سزا معاف کردی گئی۔ بلکہ اس کی نگرانی میں کیلی فورنیا کے ہزاروں نقشے بھی تیار کروائے گئے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ یہ غلطی پورے دوسو برسوں تک برقرار رہی تھی۔ اس دوران اسپین سے ہزاروں افراد کیلی فورنیا آئے لیکن کسی نے آگے جاکر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ یہ علاقہ مکمل طور پر جنوبی اور شمالی امریکا سے ملا ہوا ہے۔ بہرحال اس غلطی کی اصلاح 1776 میں اس وقت ہوئی جب جوان ڈی انزا نے جاکر اصل صورتحال بتائی اور یہ کہا کہ کیلی فورنیا جزیرہ نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ نقشے واپس لیے گئے جو دوسو برسوں تک رائج رہے تھے۔ دیکھیں تاریخ کی کیسی عظیم الشان غلطی ہے جو دوسو برسوں تک دہرائی جاتی رہی۔

مرسلہ: نگار وسیم، کراچی

کیپٹن جارج کسٹر نے امریکی قبائل پر چڑھائی کا ارادہ کر دیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ ”بہادرو۔ یقین کرو کہ تم ان چند سو لوگ کو برباد کر کے رکھ دو۔ اور امریکہ کی تاریخ میں تمہارا نام ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے گا۔ جارج کسٹر وہ آدمی تھا۔ جسے صرف اس بات سے دلچسپی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کا نام تاریخ میں مشہور ہو جائے۔ وہ جدھر سے گزرے لوگ اشارہ کریں کہ وہ دیکھو امریکا کا بہادر انسان جا رہا ہے۔ ایک شخص نے سوال کیا۔ ”کیپٹن کیا ہمیں قبائیلوں کی تعداد کا علم ہے۔“

”ہاں۔ وہ تین چار سو سے زیادہ نہیں ہیں۔“ کیپٹن نے جواب دیا۔ لہٰذا تین چار سو کے چکر میں وہ لوگ قبائیلوں سے جا ٹکرائے۔

اور جب ادھر ادھر کی جھاڑیوں سے ہزاروں کی تعداد میں قبائلی نکل نکل کر سامنے آنے لگے تو کیپٹن اور اس کے آدمیوں کے ہوش اڑ گئے۔

لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ قبائیلوں نے انہیں چن چن کر مار دیا۔ یہ واقعہ 1876 میں پیش آیا تھا۔

مرسلہ: نعیم الدین، لسبیلہ بلوچستان

سیزر سینیٹ میں جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ یہ کہانی ہے روم کے مشہور کردار جولیس سیزر کی۔ جب وہ دروازے تک پہنچا تو اس کی بیوی اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ ”نہیں سیزر۔ آج تم سینیٹ میں نہیں جاؤ گے۔“

”وہ کیوں؟“ سیزر نے پوچھا۔

”میں نے تمہارے لیے ایک برا خواب دیکھا ہے۔“ اس کی بیوی نے کہا۔

”خواب؟“ سیزر مسکرا دیا۔ ”کیوں ایسے واہموں کو ذہن میں آنے دیتی ہو۔“

”نہیں سیزر۔ بہت ہی بھیانک خواب تھا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگوں نے تم پر حملہ کر دیا ہے۔“

لیکن سیزر نے اس کی بات نہیں مانی اور اس کا مذاق اڑاتا ہوا سینیٹ کے اجلاس میں چلا گیا اور وہاں اسے اپنی اس غلطی کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑ گئی۔ اس پر حملہ ہوا۔ بہت سے لوگوں نے اسے گھیر کر مار دیا۔

مرسلہ: انعام حفیظ، کوئٹہ

انڈسٹری کی بے پناہ خدمت کی۔ پرویز ملک اور شباب کیرانوی کی بجائے سید نور کو ”شومین“ کہنا کہاں کا انصاف ہے۔ سید نور تو فلم آئینہ کو چار سال نمائش پذیر رہنے والی فلم نہیں مانتے۔ صرف ایک صوبے میں کامیاب ہونے والی اپنی فلم ”مجاجن“ کو پاکستان کی سب سے زیادہ چلنے والی فلم قرار دیتے ہیں اور پے در پے 25,20 فلاپ فلمیں دینے والے سید نور کو ”شومین“ کہتے ہیں۔ کیا آئینہ کی بجائے ”مجاجن“ زیادہ چلنے والی فلم ہے؟

عشائیے کے تمام شرکاء نے مکمل کر اس مضحکہ خیز، بھونڈے اور حسد آمیز SMS کی مذمت کی جس کے بعد شاہ جی کا موڈ کسی قدر نارمل ہوا اور انہوں نے اس SMS کے جواب میں انتہائی عاجزی کے ساتھ گفت گو کرتے ہوئے کہا۔ ”پرویز ملک اور شباب کیرانوی تو میرے لیے ولی ہیں۔ میں ان کی خاک پا بھی نہیں۔ پرویز ملک صاحب کی ہلچل آپ دیکھیں۔ ٹھیک ہے میری ناکام فلمیں بھی ہیں میں مانتا ہوں مگر وہ فلمیں جو میری کہانیوں، مکالموں اور اسکرین پلے کی وجہ سے سپرہٹ ہوئیں۔ ان کو یہ لوگ کیوں بھول جاتے ہیں۔ سید سلیمان کا میں نویں اسسٹنٹ سے لے کر سیکنڈ اسسٹنٹ تک تھا۔ محمد جاوید فاضل بھی میرے ساتھ سلیمان صاحب کے چیف اسسٹنٹ ہوا کرتے تھے۔ فاضل صاحب کی صائمہ، دہلیز، لازوال، حساب اور کندن وغیرہ آپ سب کے سامنے ہے۔“

شاہ جی نے اپنی یادوں کی راکھ کریدتے ہوئے کہا۔

”میں جس زمانے میں ”سوسائٹی گرل“ کی کہانی پر کام کر رہا تھا۔ اس وقت میری عمر بیس اکیس سال تھی۔ آغا حسن امتثال صاحب نے محترم حسن طارق کو جا کر بتایا۔ ایک نوجوان جس کا نام سید نور ہے۔ ایسی کہانی لکھ رہا ہے جو آپ کی فلم ”اک گناہ اور سہی“ سے ملتی جلتی ہے بلکہ اس کی کاپی ہے۔ ایک دن ایورنیو اسٹوڈیو کے فوارے پر حسن طارق صاحب مجھے دیکھ کر برس پڑے۔ مجھے مغلظات بھی سنائیں جنہیں میں نے بڑی خندہ پیشانی سے سن لیا۔ حسن طارق صاحب بے حد غصے میں تھے کہ میری فلم کو تم سوسائٹی گرل کے نام سے لکھ رہے ہو۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ اس کے بعد میں سیف الدین سیف صاحب سے ملا ان کو ساری بات بتا کر اپنی کہانی سنائی تو انہوں نے کہا، صرف کچھ کردار عیسائی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ باقی دونوں کہانیاں مختلف ہیں۔ میں نے ان سے عرض کیا۔ حسن طارق صاحب چونکہ

آپ کا بے حد احترام کرتے ہیں لہٰذا آپ سے درخواست ہے آپ ان کی غلط فہمی دور کردیں۔ اس طرح حسن طارق کا غصہ کافور ہوا۔'' یہ واقعہ سنا کر شاہ جی نے ایک لمبی سانس لی پھر بولے۔ ''دوستو اور ساتھیو! میں بے حد صابر و شاکر بندہ ہوں۔ خیر سے 64 برس میری عمر ہوگئی ہے۔ میں کسی کی بات کا برا نہیں مانتا مگر اس SMS سے مجھے دلی دکھ ہوا ہے۔'' پھر انہوں نے پانی کے چند گھونٹ پینے کے بعد کہا۔ جب حسن طارق کی کچھ فلمیں فلاپ ہوئیں تو انہوں نے مجھے اپنی سپر ہٹ فلم ''سنگدل'' کی کہانی مکالمے اور اسکرین پلے لکھنے کے لیے بلایا۔ میں سید نور بن کران کے پاس گیا۔ میں بھول چکا تھا 1971ء کے اوائل میں ہونے والے واقعات کو۔ سنگدل ہٹ بلکہ سپر ہٹ ہوئی۔ کامیابی کی خوشی میں حسن طارق نے چند دوستوں کو ایورنیو اسٹوڈیو میں واقع اپنے آفس میں مدعو کیا۔ مجھے بھی بلایا تھا۔ میں پہنچا تو اٹھ کر گلے لگایا اور برملا کہا۔ ''یہ ہے میری فلم سنگدل کا رائٹر سید نور۔'' اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔

شباب کیرانوی صاحب نے بھی مجھ سے کہانی لکھوانی چاہی اور دس ہزار روپے مجھے ایڈوانس بھی دیے۔ جو میں نے شکریہ کے ساتھ واپس کردیے کہ وہ میرے ولی تھے۔ بزرگ تھے۔ بدقسمتی کہ وہ جلد دنیا چھوڑ گئے۔ آج الحمد للہ میں ان کے شباب اسٹوڈیو کا آخر ہوں جہاں میرا گون فلم اکیڈمی بھی فعال ہے...... SMS جس نے بھی بنایا وہ بھول گئے۔ ''ہم سے ہے زمانہ''۔ ''بوبی''۔ ''مس سنگاپور''۔ ''زنجیر''۔ ''روبی''۔ ''فیصلہ''۔ ''فقیریا''۔ ''بلندی''۔ ''ضد''۔ ''آندھی''۔ ''پھول''۔ ''خنکل'' اور بہت سی فلموں کو کامیابی ملی؟ جن کا مصنف میں ہوں۔

میں غریب گھرانے کا فرد تھا۔ 70 سال کی دہائی میں۔ میں اکثر پیدل اپنے گھر واقع مچلو وارڈ سے اسٹوڈیو جاتا تھا۔ میں خواب بنا کرتا تھا۔ سید سلیمان میرے محسن ہیں۔ ان کے ساتھ 18 فلمیں اسسٹ کیں۔ ایک دفعہ ''تیری صورت میری آنکھیں'' کے سیٹ پر کام ہو رہا تھا۔ مجھے حکم دیا کہ ساتھ والے فلور پر ''تاج محل'' کے سیٹ پر جاکر SWEEPER کو بلا کر لاؤ اس سے فرش کی صفائی کرانی ہے۔ میں فوراً دوڑ کر گیا تو سوئپر وہاں کام میں مصروف تھا۔ اس نے آنے سے انکار کردیا۔ میں واپس آگیا۔ سلیمان صاحب نے پوچھا۔ سوئپر کیوں نہیں آیا؟ جاؤ اسے لے کر آؤ۔ میں پھر تاج محل کے سیٹ پر گیا تو سوئپر نے پھر انکار

دہی: بڑھاپے کا سہارا

زیادہ عمر کے افراد میں ڈیری خوراک کے استعمال پر ہونے والی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ خوراک میں دہی کا زیادہ استعمال بڑھاپے میں کولہے کی ہڈی کو مضبوط بناتا ہے۔ گرنے کی وجہ سے بڑھاپے میں اس ہڈی کے ٹوٹنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اس سے بعض اوقات مستقل معذوری پیدا ہوجاتی ہے۔ دہی کے استعمال سے بڑھاپے میں ہڈیوں کی کمزوری کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ یہ تحقیق آئرلینڈ کے دو تعلیمی اداروں کے اشتراک سے ہوئی ہے۔

مرسلہ: منشی عزیز مٹے۔ لڈن وہاڑی

کردیا۔ سخت سردی کے دن تھے سلیمان صاحب کے پوچھنے سے پہلے اپنا اکلوتا سوئٹر اتارا اور گیلے فرش کی، رگڑ رگڑ کر اس سوئٹر سے صفائی کردی۔ سلیمان صاحب میری اس حرکت پر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور کہا کہ میں نے ایسی deediction کسی اسسٹنٹ میں نہیں دیکھی۔ نور! تم بہت آگے جاؤ گے۔''

اب کوئی بھی کام ہوتا تو وہ مجھے بلالیتے۔ پان کھانے کے وہ شروع سے شوقین تھے۔ پان مجھ سے منگواتے تو فوراً لاکر دیتا۔ ایک دفعہ انہیں پان کی طلب ہوئی۔ مجھ سے کہا کہ پان لاؤ۔ تو میں نے جھٹ جیب سے پان نکال کر پیش کردیا۔

سوسائٹی گرل کے زمانے میں کہانی سنانے طیب حسین زیدی کے گھر گیا تو سنگیتا دروازے کی اوٹ سے لگی کہانی سن رہی تھی۔ زیدی صاحب نے کہا۔ کیوں نہ اس فلم کو جعفر شاہ بخاری سے بنوائیں۔ لہٰذا ایک دن زیدی صاحب مجھے ساتھ لے کر جعفر شاہ بخاری کے گھر پہنچ گئے۔ کہانی انہوں نے سنی تو کہا۔ ''یہ تو بہت bold سبجیکٹ ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ کال گرل پیسے لے کر آجائے اور اس کے ساتھ کچھ ہو بھی نہ۔ ہم بخاری صاحب کے گھر سے واپس آئے تو یہ طے ہوا کہ سنگیتا بیگم سوسائٹی گرل کی ڈائریکشن دیں گی اور میں ان کو اسسٹ کروں گا۔ اور آپ سب نے دیکھا کہ سوسائٹی گرل نے کیا رزلٹ دیا۔ اتفاق سے میری یہ فلم اور حسن طارق کی ''اولاد'' ایک ہی دن ریلیز ہوئیں۔ اولاد فلاپ ثابت ہوئی اور سوسائٹی گرل کو کامیابی

نصیب ہوئی۔ سوسائٹی گرل کے بعد تو اللہ کی کرم نوازی ایسی ہوئی کہ میں نے بیک وقت بیس بیس اسکرپٹوں کو پانگوں کی طرح لکھا۔ بس خیر کی اُمید رکھنی چاہیے کیونکہ کبھی کبھی چونٹی بھی ہاتھی کو کھا جاتی ہے۔

''آپ کو یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا۔'' ذرا توقف کے بعد شاہ جی بولے۔ ''جب حسن طارق صاحب نے مجھے سنگدل کے لیے بلایا تو ان کے کمرے میں جاتے ہی میں نے بے ساختہ رونا شروع کردیا۔ طارق صاحب گھبرا گئے۔

''کیا ہو گیا بھائی؟ کیوں رو رہے ہو؟''

میں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''کچھ نہیں ہوا۔ یہ خوشی کے آنسو ہیں کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ اپنی فلم کے لیے مجھے بلایا۔''

الحاج بندو خان ریسٹورنٹ میں سارے شرکائے عشائیہ ہمہ تن گوش تھے اور شاہ جی گزرے دنوں کی باتیں سنا رہے تھے۔ اچانک انہیں صائمہ کی یاد آگئی اور بولے۔ ''سلطان راہی صاحب دنیا چھوڑ گئے تو لوگوں نے صائمہ کو سلطان راہی کی بیوہ کہنا شروع کردیا۔ ایسے میں میں نے اسے سہارا دیا اور اپنی اردو فلم گھونگھٹ میں ایک مختصر کردار کروایا۔ جس کے بعد ان کا تباہ شدہ فلمی کیئریر دوبارہ بحال ہو گیا اور وہ باضابطگی کے ساتھ میری فلموں میں کام کرنے لگیں۔ میں نے اپنی کسی فلم کی ڈائریکشن دیتے وقت، جب سین سمجھاتے ہوئے صائمہ کا ہاتھ تھاما تو اس نے برجستہ کہا۔ ''شاہ جی! اب یہ ہاتھ نہ چھوڑنا......''

اور پھر میں نے واقعی اس کا ہاتھ اور ساتھ نہیں چھوڑا۔ جنگل کوئین اور مجاجن کے درمیانی عرصے میں ہماری صائمہ سے شادی ہو گئی۔

کسی نے اس موقع پر ان سے یہ نہیں پوچھا کہ اس وقت آپ نے رخسانہ نور کے بارے میں کیوں نہیں سوچا کہ اس طرح ایک اداکارہ کو بیوی بنانے پر ان پر کیا گزرے گی؟ یہاں کا ماحول ذرا مختلف تھا۔ یہ کوئی انٹرویو کا سلسلہ نہیں تھا۔ مہمان خصوصی کے طور پر وہ اپنی یادوں کے دریچے کھول رہے تھے اور سارے حاضرین جن میں ہمارے صحافی بھائیوں کی معقول تعداد بھی تھی اور اس وقت وہ کہیں اور سنا کرے کوئی کا ماحول تھا۔ البتہ جب شاہ جی گویا تھک کر ذرا رکے تو میزبان نواب حسن صدیقی نے ایک واقعہ سنایا۔

''ان دنوں کی بات ہے جب لاہور کے گلستان سینما میں بھارتی فلم ''مغل اعظم'' لگی تھی اور میٹروپول سینما پہ مجاجن کے بڑے بڑے پوسٹرز آویزاں تھے۔ شان پاؤں میں گھنگھرو باندھے اور ڈھولکی تھامے کھڑا تھا (پوسٹر میں) ہم گلستان سینما کے مالک لالہ جی کے ہاں ناشتے پر مدعو تھے۔ دوران ناشتا میں نے کہا۔ ''لالہ جی! میں جب آپ کے پاس آرہا تھا تو میٹروپول پہ مجاجن کی زبردست پبلسٹی نظر آئی اور مجھے سید نور کے تیور ٹھیک نہیں دکھ رہے تھے۔ کیونکہ شان گھنگھرو باندھے اور ڈھولکی تھامے جب عشق میں ڈوب کر گاتا گائے گا...... تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا۔ تو لالہ جی! مجھے نہ جانے کیوں خوف سا محسوس ہو رہا ہے کہ کہیں ''مغل اعظم'' کے شہنشاہ اکبر کا تخت مجاجن نہ الٹ دے۔''

میری بات سن کر لالہ جی پریشان ہو گئے کیونکہ گلستان سینما میں ''مغل اعظم'' لگی تھی اور انہوں نے بڑا ایڈوانس دیا ہوا تھا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ مجاجن نے مغل اعظم کا جینا دوبھر کردیا۔''

حاضرین نے مجاجن کی فتح پر خوشی کا اظہار کیا۔ شاہ جی کے چہرے پر بھی مسرت کا نور صاف نظر آرہا تھا۔

نواب صاحب نے اپنی بات کا ری ایکشن دیکھ کر ایک اور واقعہ سنایا۔

ایک بار کارا فلم فیسٹیول میں شرکت کے لیے مہیش بھٹ کراچی آئے ہوئے تھے۔ اکثر کارا فیسٹیول کی فلمیں نشاط میں دکھائی جاتی تھیں۔ مہیش بھٹ نے مجھ سے کہا ''یار! یہ سید نور کتنا بڑا فلمساز اور ہدایت کار ہے؟'' وہ اسی دن مجاجن دیکھ کر آئے تھے۔ ''یہ سید نور تو مجھ سے بھی بڑا فلمساز و ہدایت کار لگتا ہے۔''

میں نے بھٹ صاحب سے کہا۔ ''آپ کے پاس جو FINANCE ہے وہ نور کو میسر نہیں اور اسے ٹیکنالوجی بھی حاصل نہیں۔ اب ان حالات میں اور اس کم بجٹ میں نور مجاجن جیسی فلمیں بناتا ہے تو میری نظر میں نور محبوب خان اور راج کپور سے کسی طور کم نہیں ہے۔''

نواب صاحب یہ واقعہ بتا کر ذرا رکے۔ پھر گویا ہوئے۔ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ سید نور کو اس قدر کیوں چاہتے ہیں تو میں جواب دیتا ہوں۔ ''دل دیاں لگیاں نوں کون جانداں۔ میں جاندی نے میرا رب جانداں۔''

حاضرین نے کھل کر قہقہہ لگایا اور تقریب کشت زعفران بن گئی۔

سیریل کلر

شیراز خان

ہر معاشرے میں ایسے افراد بھی جنم لیتے ہیں جو صرف ذہنی آسودگی کے لیے انسانی جان لینے سے ہچکتے نہیں ہیں۔ ایک جیتے جاگتے شخص کو موت کی نیند سلا دیتے ہیں کہ انہیں خون بہانے سے لطف ملتا ہے۔ ایسے درندے نما اشخاص ایک دو نہیں، پچاس پچاس اور سو سو انسانوں کو قتل کر دیتے ہیں۔

انسانی شکل میں ایسا کوئی درندہ کہیں آپ کے قریب تو نہیں ہے۔

یہ اصطلاح ان کے لیے استعمال کی جاتی ہے جنہوں نے دو یا زائد انسانوں کا خون کیا ہو۔

پوری دنیا میں ایسے درندوں کا وجود رہا ہے۔ یہ لوگ نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ دنیا میں بہت سے ایسے مشہور لوگ گزرے ہیں جن کا کام ہی خون بہانا تھا۔ ان کا شکار عورتیں، مرد، بچے سب ہوتے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کو خون بہا کر لذت محسوس ہوتی ہے۔ سیریل کلر کی تعریف یوں ہے کہ وہ شخص جو تین یا زائد

افراد کو قتل کرے۔ مختلف حکومتوں نے اس کی تعریف مختلف کی ہے۔ بعض کے نزدیک جو تین افراد کو قتل کردے اسے سیریل کلر کی کیٹیگری میں ڈال دیا جاتا ہے۔ بعض کے یہاں پانچ یا چھ افراد اور بعض کے نزدیک دس افراد لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسے بھی سیریل کلر ہوئے ہیں جنہوں نے سوسو آدمیوں کے خون کیے تھے۔

یہ ایک شدید قسم کی نفسیاتی کیفیت ہے، اس کو نفسیات دان psychopaths کہتے ہیں۔ بظاہر یہ نارمل لوگ ہوتے ہیں لیکن ان کے وجود میں نفرت کی آگ دہکتی رہتی ہے۔ یہ ہر ایک کو مار دینا چاہتے ہیں۔ کسی دشمنی، کسی جواز کے بغیر۔

کچھ عرصہ پہلے ہمارے یہاں بھی ایسا ہی ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ جس کو ہتھوڑا گروپ کا نام دیا گیا تھا۔ یہ گروپ گھروں سے باہر سوئے ہوئے لوگوں کے سروں پر ہتھوڑے مار کر انہیں ہلاک کر دیتا تھا۔

اس سنک کی بے شمار وجوہات ہو سکتی ہیں۔ یہ مذہبی جنونی بھی ہوتے ہیں۔ جنسی جنونی بھی اور خون دیکھ کر لذت حاصل کرنے والے بھی۔ امریکا کے ایک سیریل کلر واکس نے بہت سی عورتوں کو اس لیے قتل کر دیا تھا کہ وہ ان عورتوں میں شیطان کے چہرے دیکھا کرتا تھا اور دنیا کو شیطان سے بچانے کے لیے اس نے عورتوں کا خون بہانا شروع کر دیا تھا۔

رچرڈ چیس اپنے مقتولین کا خون پیتا بھی تھا اور ایک ٹب میں خون جمع کر کے اس میں نہاتا بھی تھا۔

اس قسم کے قاتلوں کے چہروں پر ہرگز لکھا نہیں ہوتا کہ وہ ایک جنونی قاتل ہیں۔ بظاہر وہ عام سے ہوتے ہیں لیکن موقع ملتے ہی ان کے اندر کا درندہ جاگ اٹھتا ہے۔ وہ اپنے شکار کو مارنے لگتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ وہ خود کو گناہ گار بھی نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں جو کچھ ہوا ہے ٹھیک ہی ہوا ہے۔

انسانی خون بہانے کی بے شمار وجوہات ہیں تو اس قسم کے قاتل کا نام بھی الگ الگ ہے۔

assassination۔ یہ وہ قتل ہے جو کسی خاص مقصد سے کیا جاتا ہے۔ چاہے وہ مقصد سیاسی ہو یا پیسوں کے لیے۔ پاکستان میں محترمہ بے نظیر بھٹو کا اساسی نیشن ہوا تھا۔ لیاقت علی خاں کا قتل بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔

cannibalism۔ آدم خوری یا مردم خوری، اس عمل کو کہتے ہیں جس میں ایک انسان دوسرے کا گوشت کھائے۔ کہا جاتا ہے کہ آج سے تقریباً پانچ لاکھ سال سے ساڑھے تین سال پہلے کے انسانوں نے اس عمل کا آغاز کیا۔ دور جدید کے انسانوں میں بھی کئی گروہ ایسے نکلے جنہوں نے اس قبیح عمل کو دہرایا۔ پوری دنیا میں اس عمل کو دہرایا جاتا رہا۔ بلکہ ''فجی'' کو تو کسی زمانے میں آدم خوروں کا جزیرہ کہا جاتا تھا۔

آدم خوری بنیادی طور پر دو طریقوں کی ہوتی ہے۔ اندرونی آدم خوری اور بیرونی آدم خوری۔

اندرونی آدم خوری وہ ہوتی ہے جس میں اپنے ہی قبیلے یا برادری کے انسان کو مار کر کھا لیا جاتا ہے اور بیرونی آدم خوری باہر کے کسی بندے کو پکڑ کر اس کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ اس کی وجوہات میں سے شدید قحط، پاگل پن وغیرہ ہیں۔

child murder۔ بچوں کا قتل، یہ انتہائی گھناؤنا جرم ہے۔ اس میں چھوٹے بچوں کو مار دیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں جیسے کسی سے دشمنی ہو، تو اس کے بچے کو مار کر دشمن کو ساری زندگی کے لیے تڑپایا جاتا ہے۔

آپ نے اس قسم کی خبریں سنی ہوں گی کہ ایک سوکن نے دوسری سوکن کے بچے کا خون کر دیا ہے۔ یا سوتیلی ماں یا باپ نے مار ڈالا۔ یا پھر نام نہاد جادوگر کسی سے بچے کا خون طلب کر لیتے ہیں اور عقل کے اندھے کسی معصوم کا خون کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی مراد پوری ہو جائے گی۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی بچہ یا بچی کسی جرم یا گناہ کا عینی شاہد بن جاتا ہے تو اس کو مار کر خاموش کر دیا جاتا ہے۔

concensual homicide۔ بعض علاقوں میں اس قسم کی موت یا قتل کو قانونی شکل دے دی گئی ہے۔ یہ عام طور پر اس وقت ہوتا ہے جب کوئی مریض کرب کی حالت میں ہو۔ اس وقت وہ التجا کرتا ہے کہ اسے موت دے دی جائے اور ڈاکٹرز کو بھی اس کے زندہ بچنے کی کوئی امید نہ ہو۔ تو اس حالت میں اس کو تکلیف سے بچانے کے لیے اسے مار دیا جاتا ہے۔ (ہمارے یہاں اس کی دوسری شکل سامنے آئی۔ اگر کوئی اپنے کسی پیارے کو مسلسل تکلیف میں دیکھتا ہے تو اس کے لیے دعا کی جاتی ہے کہ خدا اس کی موت آسان کر دے)

کرائے کے قاتل یا کرائے کے قتل۔ اس کا رجحان پوری دنیا میں ہے۔ خود ہمارے یہاں بھی اس کی شکل پائی

جاتی ہے۔

Honor killing۔ غیرت کے نام پر قتل۔ یہ رجحان بھی تقریباً پوری دنیا میں ہے۔ ہر سال دنیا کے تیس سے زائد ممالک میں ہزاروں عورتوں کو ان ہی کے عزیز و اقارب کی جانب سے خاندان کی عزت و آبرو کے تحفظ کے نام پر قتل کردیا جاتا ہے۔ قاتلوں کا خیال ہوتا ہے کہ ان کی عزت اور شہرت خاندان کے نام سے جڑی ہے۔ اسی لیے انہیں جب بھی اپنے خاندان کی بدنامی کا اندیشہ ہونے لگتا ہے تو وہ عزت کے نام پر قتل کرنے لگتے ہیں۔ یہ رسم بھارت، پاکستان اور عرب ممالک میں بہت حد تک پھیلی ہوئی ہے۔

یہ رسم پاکستان میں بلوچستان اور سندھ میں عام ہے۔ رسم و رواج کے مطابق اپنے خاندان کی (ان کے نزدیک) گمراہ عورت اور اس کے شریک جرم کو قتل کرنا جائز ہے اور قاتل سزا سے صاف بچ جاتا ہے۔

سندھ میں اس رسم کو کارو کاری کہتے ہیں۔ پنجاب میں کالا کالی، خیبر پختونخواہ میں طور طورہ اور بلوچستان میں سیاہ کاری۔

اس رسم کا غلط استعمال کچھ یوں تھا کہ اپنے کسی دشمن کو اکیلا دیکھ کر مار دیتے تھے اور اپنے خاندان کی کسی زیادہ عمر کی عورت یا بچی کو مار اس کی لاش دشمن کی لاش کے پاس ڈال کر کہہ دیتے تھے کہ دونوں کو غلط کام کرتے دیکھا تھا اسی لیے مار دیا اور ان کا کچھ بگڑتا بھی نہیں تھا۔

قتل کی ایک اور رسم بھی تھی یا ہے اور ہوسکتا ہے کہ بہت سے ملکوں میں اس قسم کے قتل ہوتے ہوں۔ یہ قتل دیویوں اور دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے ہوا کرتے ہیں جس کو بھینٹ چڑھانا کہتے ہیں۔ عام طور پر بچوں کو اس درندگی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

infanticide۔ شیر خوار کا قتل۔ یہ قتل عام طور پر ہر جگہ ہے۔ ایک گھنٹے سے لے کر چوبیس گھنٹوں تک کے بچوں کو غیرت یا مفلسی کے خوف سے قتل کردیا جاتا ہے یا جنونی کیفیت میں یہ معصوم دنیا سے رخصت کردیے جاتے ہیں۔

mass murder قتل عام۔ ایک مختصر عرصے میں عام طور پر ایک ہی وقت میں بہت سے لوگوں کو قتل کرنے کا عمل ہے۔ اس کی بھی تاریخ بہت پرانی ہے۔ عام طور پر جنگوں میں قتل عام ہوا کرتا تھا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ چنگیز خان اور ہلاکو جیسے لوگوں نے قتل عام کروایا تھا۔ حالیہ دنوں میں برما میں ہونے والے فسادات ہیں جن میں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ اس کے علاوہ (مشرقی پاکستان میں چلنے والی) بنگلہ دیش کی تحریک کے دوران ہزاروں مردوں اور عورتوں کو مار کر پھینک دیا گیا تھا۔ تقسیم ہند کے وقت لاکھوں افراد۔۔۔۔ اس وحشت اور بربریت کا نشانہ بنے تھے۔

بدقسمتی سے ہمارے یہاں جو آرمی پبلک اسکول کا سانحہ ہوا تھا وہ بھی اسی کیٹیگری میں آتا ہے۔ آج بھی ایسی خبریں آیا کرتی ہیں کہ دشمنی کی بنا پر گھر میں گھس کر پورے کے پورے خاندان کو مار دیا گیا۔

ایسے قاتل نفسیاتی طور پر اس درجہ بے حس ہوتے ہیں کہ مقتول کے تڑپنے، مقتول کے جسم سے ابلتے خون کو دیکھ کر لطف محسوس کرتے ہیں۔ خوش ہوتے ہیں اور خود کو نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی چند قاتلوں کا مختصر مختصر تعارف کرادوں۔

Zodiac killer:۔

اس قاتل نے اپنا یہی نام مقرر کیا تھا۔ وہ ہر قتل کے بعد ایک خط پولیس ڈیپارٹمنٹ کو بھیج دیا کرتا تھا۔ جس میں وہ بتاتا تھا کہ اس نے فلاں مقام پر کسی کو مار کر ڈال دیا ہے اس کی لاش جاکر اٹھالو۔

یہ قاتل 1960ء اور 1970ء کے درمیان کیلی فورنیا میں فعال رہا تھا۔ اس کے اپنے بیان کے مطابق اس نے 37 افراد کو قتل کیا تھا۔ وہ اپنے خطوط میں ایک خاص قسم کی علامت بناتا تھا وہ علامت ایک دائرہ ہوتا تھا جس کو کراس کردیا جاتا تھا۔ اس کے بارے میں ابھی تک کچھ پتا نہیں چل سکا کہ اس کی اصل شناخت کیا ہے۔ اس کی حالاتِ زندگی اس لیے دستیاب نہیں ہے کہ یہ شخص کبھی قانون کی گرفت میں نہیں آیا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس کی فائل بند کردی گئی کہ پولیس ڈپارٹمنٹ کو پھر ایک خط موصول ہوگیا اور فائل کھول دی گئی۔ اس کی فائل ابھی تک کھلی ہوئی ہے۔ وہ جو خطوط لکھتا تھا وہ اس قسم کے ہوتے تھے۔ ”میں زوڈیاک ہوں اور یہ اعتراف کررہا ہوں کہ میں نے فلاں شخص کو فلاں مقام پر مار کر ڈال دیا ہے اس کو مارنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک انسان تھا اور مجھے انسانوں سے نفرت ہے۔ کیوں کہ روئے زمین پر انسان سے بری کوئی مخلوق نہیں ہے۔ اس کو مرجانا چاہیے اور میں یہی کام کررہا ہوں۔ یہ عورتیں مرد بچے سب کے سب خبیث ہیں۔ میں ان کا خاتمہ کررہا ہوں۔“

اس نے زیادہ تر نوجوانوں کو مارا تھا۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ ڈیوڈ آرتھر (سترہ برس) اور بٹی لو جنسن (سولہ برس)۔ ان دونوں کو بیس دسمبر 1968ء کو ''لیل ہرمان'' کے پاس گولی مار کر ہلاک کیا گیا۔ مائیکل رینالٹ کو پارکنگ میں گولی ماری گئی۔ پال لی کو سر میں گولی ماری گئی۔ اس قسم کے بیسیوں قاتل ہیں جن کے نام مضمون کی طوالت کی وجہ سے دے نہیں پایا۔ یہ قاتل یا تو اب تک آزاد گھوم رہا ہے یا پھر مر چکا ہے اس بارے میں کسی کو نہیں معلوم۔

گاسکن:۔

یہ نام خوف اور دہشت کی علامت بن گیا تھا۔ اس کے اپنے بیان کے مطابق اس نے اسّی سے نوّے لوگوں کو قتل کیا ہے (سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں یہاں اگر کسی حساس شخص کی کار کے نیچے بلی بھی آکر مر جائے تو اس کا افسوس کرتے رہتے ہیں)۔ ڈونالڈ ہنری گاسکن ایک ایسا شخص تھا جو دیکھنے میں بہت مہذب دکھائی دیتا تھا لیکن کون جانتا تھا کہ اس کے وجود میں کیسا بھیڑیا چھپا ہوا ہے۔ اس کا طریقہ واردات یہ تھا کہ یہ ہائی ویز سے لوگوں کو اغوا کر کے اپنے ساتھ لے جاتا تھا اور انہیں تشدد کے ذریعے مار دیتا تھا۔ اس کا طریقہ بہت بے رحمانہ تھا۔ یہ شخص 1933ء میں ساؤتھ کیرلینا میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی زندگی بہت ستم زدہ گزری ہے۔ جب وہ صرف ایک سال کا تھا تو اس کی ماں نے اس کے باپ کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ہی رہا لیکن اس دوران اس کی ماں شادیاں کرتی رہی اور اس کے ہر نئے شوہر کا رویہ گاسکن کے ساتھ بہت بے رحمانہ ہوتا تھا۔ وہ سب اسے بری طرح پیٹتے تھے۔ جب وہ صرف ایک سال کا تھا تو اس نے ایک بوتل مٹی کا تیل پی لیا تھا جس کے اثرات اس پر عمر بھر رہے۔ وہ بیمار رہنے لگا۔ اس کے علاوہ وہ راتوں کو اٹھ کر چیخنے بھی لگتا تھا۔ اسے بھیانک خواب ستایا کرتے تھے۔ اس کو معاشرے نے ایک عرفیت دی تھی ''پی وی''۔ یہ نام اتنا مقبول ہوا کہ گاسکن کو اپنے اصل نام کا پتا اس وقت چلا جب اسے پہلی بار عدالت میں پیش کیا گیا تھا۔ اس نے اپنا پہلا جرم بارہ تیرہ برس کی عمر میں کیا تھا۔ اس نے کچھ لڑکوں کے ساتھ مل کر چوریاں شروع کر دی تھیں۔ اس کے علاوہ اس نے ایک لڑکی کا ریپ بھی کیا تھا۔ اس کو یہ جرم کرتے ہوئے دیکھ لیا گیا تھا۔ اس کی عمر کو دیکھتے ہوئے اسے اصلاح خانے بھیج دیا گیا۔ ہوتا یہ ہے کہ مغرب میں انسانی ہمدردی اور انسانی حقوق کے نام پر ایسے مجرموں کو سخت سزا نہیں دی جاتی۔ دو تین سال کی سزا ہوتی ہے اور جب وہ باہر آتا ہے تو پہلے سے زیادہ مکروہ بن جاتا ہے۔

جن دنوں وہ اصلاح خانے میں تھا تو وہاں بھی اس کے ساتھ مسلسل زیادتی ہوتی رہی۔ یہ زیادتی اس کے ساتھی کیا کرتے تھے جو اس سے زیادہ طاقت ور تھے شاید ان ہی سب باتوں نے اسے اتنا تلخ کر دیا تھا۔

1951ء میں جب وہ اٹھارہ سال کا تھا تو اس اصلاح خانے سے فرار ہو گیا۔ اسے تمباکو کے کھیتوں میں کام کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہیں اس نے ایک کم عمر لڑکی کو ہتھوڑے مار کر ہلاک کر دیا۔ تفتیش کے دوران اس نے بتایا کہ اس لڑکی نے اس کی توہین کی تھی جو وہ برداشت نہیں کر سکا۔ اسی لیے اس کا خون کر دیا۔ 1953ء میں اسے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اسے چھ سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا جہاں اس نے ایک سرکاری اہل کار کا خون کر دیا۔ اس بار اسے مزید تین سال کی سزا ہو گئی۔

1955ء میں وہ کچرے کے ٹرک میں چھپ کر جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن جلد ہی وہ پھر گرفتار ہو گیا اور پے رول پر رہا ہوا لیکن کچھ عرصے بعد پھر گرفتاری عمل میں آئی۔ اس بار اس کا جرم اور بھیانک تھا۔ اس نے تین قتل کیے تھے۔ انتہائی تشدد کے ساتھ۔ اس پر ایک بڑا الزام یہ بھی تھا کہ وہ اپنے شکار کو مار کر ان کا گوشت کھاتا تھا۔ اس نے خود اعتراف کیا تھا کہ اس نے اسّی سے لے کر نوّے انسانوں کا خون کیا ہے۔ ان میں دو سال کی بچی بھی شامل تھی۔ اس نے ولٹن ارلے نام کے ایک اخباری رپورٹر کو اپنی پوری کہانی سنائی تھی۔

اس کی درندگی پر کئی کہانیاں بھی لکھی گئی ہیں۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ اسے موت کی سزا دے دی گئی۔

سوتو مومیازاکی:۔ Tsutomu Miyazoki

اس کا تعلق جاپان سے تھا اور یہ موجودہ دور کا ایک انتہائی بے رحم سیریل کلر تھا۔ اس کو انسانی ڈریکولا بھی کہا جاتا تھا۔ کیوں کہ یہ اپنے شکار کا خون پیتا تھا اور سب سے ظالمانہ بات یہ تھی کہ صرف چھوٹی چھوٹی بچیوں کا خون کرتا تھا۔

ایسی بچیاں جو دس گیارہ برس سے زائد کی نہیں ہوتی تھیں۔ یہ بے رحم نہ صرف ان کا خون کرتا بلکہ ان کے ساتھ زیادتی بھی کرتا تھا۔ اس نے بھی ایک محروم اور انتشار والی زندگی گزاری تھی۔ اس کی پیدائش 1960ء میں ٹوکیو کے

ایک نواحی علاقے میں ہوئی تھی۔ یہ pre mature پیدائش تھی۔ اس کا ایک ہاتھ مفلوج جیسا تھا۔ اس لیے یہ احساس اس کے ساتھ زندگی بھر رہا تھا۔ پھر گھر کے بگڑے ہوئے حالات نے اسے اور ذہنی طور پر منتشر کر دیا تھا۔ وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ابتداء میں لڑکیوں کے اسکولوں میں تعلیم حاصل کی۔ وہ ایک ذہین طالب علم ثابت ہورہا تھا لیکن پھر اس کی ریٹنگ خراب ہونے لگی۔ اس کو یہی یونیورسٹی میں داخلہ نہیں مل سکا۔ پہلے وہ انگلش پڑھ کر استاد بننا چاہتا تھا لیکن داخلہ نہیں ملا تو اس نے فوٹو میکنگ بننے کے لیے داخلہ لے لیا۔ اس کے باپ کا ایک اخبار تھا۔ مقامی طور پر وہ ایک معروف صحافی تھا لیکن ساتو موکو صحافت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس کے اندر ہر وقت ایک طوفان برپا رہتا تھا۔ ایک بار اس نے اپنی ایک بڑی بہن کو اس وقت دیکھنے کی کوشش کی جب وہ غسل خانے میں تھی۔ بہن نے جب شور مچایا تو سوتو مو نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس کو گھر سے نکال دیا گیا۔ اس کا سب سے بڑا پرابلم احساسِ کمتری تھا۔ وہ عام سی شکل کا آدمی تھا جس کی خواہشات پوری نہیں ہورہی تھیں۔ ایک تو اس کا ہاتھ مفلوج تھا پھر وہ کچلی ہوئی جنسیت کا انسان تھا۔ اسی لیے اس نے محسوس کیا کہ وہ بڑی عورتوں کے لیے نہیں ہے۔ اس نے چھوٹی عمر کی بچیوں میں دلچسپی لینی شروع کر دی اور پھر اس کی درندگی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ہوتا یہی ہے۔ اس قسم کے لوگ عام طور پر ذہنی مریض ہی ہوا کرتے تھے۔ یہ ابنارمیلٹی ان کی شخصیت کا حصہ بن جاتی ہے اور وہ اس قسم کی وارداتیں کرنے لگتے ہیں۔

1988ء سے لے کر 1989ء کے دوران (یعنی صرف ایک سال میں) اس نے چار لڑکیوں کا بہیمانہ خون کیا۔ ان لڑکیوں کی عمریں چار سے نو برس تک تھیں۔ اس نے اپنے ایک شکار کا خون بھی پیا تھا اور اس کا ایک ہاتھ بھی کھا گیا تھا۔

اخبارات چیخ اٹھے تھے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ دن کے وقت اس کے معمولات نارمل ہوا کرتے تھے۔ اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ بظاہر اس بے ضرر نظر آنے والے انسان کے اندر ایک خبیث روح موجود ہے۔

ایک انتہائی بے رحمانہ فعل یہ تھا کہ وہ ہر قتل کے بعد اپنے شکار کے گھر والوں کو ایک خط بھیج دیتا تھا جس میں مزے لے لے کر بتایا کرتا کہ اس نے کس طرح اغوا کیا۔ کس طرح قتل کیا اور کس طرح ان کے ساتھ زیادتی کی۔ جس دن اس کی چھبیسویں سالگرہ تھی اس دن اس نے ایک اور چار سالہ بچی کو اپنی درندگی کا نشانہ بنایا۔ وہ بچی اپنی ایک دوست کے گھر کے باہر کھیل رہی تھی۔ وہ اس کے قریب گیا اور اسے

وادیٔ سندھ کی تہذیب میں بڑے شہر بسانے کا رجحان 2500 ق م میں اپنے عروج کو پہنچ گیا جیسا کہ ہڑپہ اور موئن جو دڑو کی مثالوں سے ظاہر ہے۔ اس تہذیب کی زیادہ معروف اور نمایاں خصوصیات یہ ہیں، شاندار شہری منصوبہ بندی، بڑی بڑی سرکاری عمارتیں اور چھوٹے چھوٹے گھر، وسیع پیمانے پر اجتماعی پیداوار، ثقافتی چیزوں کی بناوٹ کا اعلیٰ معیار، مثلاً بت، مجسمے، مہریں، مٹی کے برتن، دور دراز فاصلوں تک بیرونی تجارت کا اہتمام، معاشرے کی طبقاتی تقسیم اور رسم الخط کی ترقی۔ آب نکاسی کا نظام موجودہ بہترین شہروں کے مقابلے پر تھا۔ چھوٹی چھوٹی نالیاں بڑی نالیوں میں آکر ملتی تھیں۔ ہر نالی پختہ اور اوپر سے اینٹوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ حفظانِ صحت کے اصولوں کا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ ان قدیم کھنڈروں میں موئن جو دڑو کا حمام اور ہڑپہ کا اناج گھر قابلِ ذکر ہیں۔ ہڑپہ اور موئن جو دڑو میں وادی دجلہ و فرات کے سومیری شہر، بابل و نینوا کے محلات کی طرز کے محلات نہیں ملتے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ طرزِ حکومت جمہوری اور عوامی تھا لیکن ان لوگوں کی مذہبی زندگی پر کسی طرح کی روشنی نہیں پڑتی کیونکہ کوئی مندر وغیرہ نہیں ملتا اور نہ قدیم مصر کی طرح یہاں اہرام اور مقبرے تعمیر کیے گئے۔ یہاں گندم اور جو بکثرت ہوتا تھا۔ لوگ گھریلو پالتو جانوروں کے علاوہ دریائی جانور مگرمچھ، مچھلی، کچھوا اور گھنے جنگلوں کے درندے چیتا، گھڑیال، ہاتھی، گینڈا، زیبرا وغیرہ سے واقف تھے کیونکہ مہروں پر یہ تمام جانور نہایت مہارت سے بنائے گئے ہیں۔

مرسلہ: قرۃ العین، اقرا اسٹی، کراچی

لالچ دے کر اپنی گاڑی میں بٹھالیا۔ وہ اسے ایک پل کے پیچھے لے گیا جہاں اس نے بچی کو مارا پھر اس کی لاش کی بے حرمتی کی۔

اس نے اس بچی کے کپڑے اتار کر اپنے پاس رکھ لیے تھے۔ اس نے بچی کی ہڈیوں کا سفوف بنا کر ایک پارسل میں وہ کپڑے اور وہ سفوف اس بچی کے گھر بھیج دیئے۔ اس نے ایک خط بھی لکھا تھا کہ اپنی بچی کی باقیات سنبھال کر رکھ لو۔

اس طرح کی اور بھی وارداتیں وہ کرتا چلا گیا۔ اس نے ایک دہشت پھیلا دی تھی۔ والدین بچوں کو تنہا نہیں جانے دیتے تھے۔ اس کی گرفتاری بھی اتفاق سے ہوئی۔ ایک پارک میں ایک بچی کھیل رہی تھی۔ وہ دوربین سے اس بچی کا جائزہ لے رہا تھا۔ بچی کے والدین نے یہ دیکھ لیا۔ انہوں نے پولیس کو اطلاع دے دی۔ پولیس نے آ کر اسے گرفتار کرلیا۔

وہ کوئی جواز نہیں پیش کرسکا بلکہ الٹے سیدھے بیان دینے لگا۔ پولیس نے اس کے فلیٹ کی تلاشی لی، اس تلاشی میں انہیں اس درندے کے خلاف بہت سے ثبوت مل گئے۔ اس نے جن بچیوں کو ہلاک کیا تھا ان کے کپڑے ویڈیو فلمیں، ہڈیوں کے سفوف اور سب سے بڑھ کر اس قسم کے خطوط جو وہ والدین کو بھیجا کرتا تھا۔ جب تفتیش کی گئی تو اس نے اپنے گناہوں کا اعتراف کرلیا۔

30 مارچ 1990ء کو اس کی ٹرائل شروع ہوئی اور 2001ء میں موت کی سزا سنادی گئی۔

احمد سراجی:۔Ahmed Suradji

ایک انڈونیشی سیریل کلر۔ اس کی پیدائش انڈونیشیا کے علاقے میڈان میں دس جنوری 1949ء کو ہوئی۔ اس کے اپنے بیان کے مطابق اس نے چالیس عورتوں اور لڑکیوں کو قتل کیا تھا۔ جن کی عمریں سترہ سال سے چالیس کے درمیان تھیں۔ یہ بے رحم شخص جادو کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ اسے یہ بتایا گیا تھا کہ وہ اگر ستر عورتوں یا لڑکیوں کو موت کے گھاٹ اتار دے تو اسے بے پناہ قوت حاصل ہو جائے گی۔

اس کے گھر کے پیچھے گنے کا کھیت تھا جہاں وہ لاشوں کو اس اینگل سے دفن کرتا تھا کہ ان کے رخ اس کے گھر کی طرف رہیں۔ اس طرح اس کے خیال کے مطابق جادو کا اثر جلدی ہوسکتا تھا۔

اس نے اپنے اعترافی بیان میں کہا کہ ایک بار اس کے مرحوم باپ کی روح اس کے خواب میں آئی تھی جس نے اسے بتایا تھا کہ وہ اگر ستر عورتوں کو مار کر ان کا خون پی لے تو اس کو بے پناہ طاقت مل جائے گی۔

اس نے کہا کہ تفتیش کے درمیان بتایا کہ وہ جلد از جلد یہ گنتی پوری کرنا چاہتا تھا لیکن صرف چالیس ہی کو مار سکا ہے۔ یہ اس کی ناکامی ہے اگر وہ ستر کی گنتی پوری کر لیتا تو اس کو طاقت مل جاتی پھر پولیس اس کو کبھی گرفتار نہیں کر پاتی۔

24 اپریل 1997ء کو سری دیوی نام کی ایک لڑکی نے ایک رکشا ہائر کیا۔ اس نے رکشا چلانے والے کو اپنی منزل بتائی اور گنے کے کھیتوں کے پاس اتر گئی۔ دو دنوں کے بعد اس کی لاش دریافت ہوئی۔ یہ لاش ایک مقامی شخص نے دیکھی تھی۔ اس نے پولیس کو خبر کردی۔ پولیس نے ثبوت کی تلاش میں چاروں طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ احمد سراجی کا گھر قریب ہی تھا۔ پولیس والے یوں ہی سرسری معلومات کے لیے احمد کے گھر پہنچ گئے۔

پہلے تو وہ انکار کرتا رہا کہ اسے نہیں معلوم کہ کس نے قتل کر کے لاش کھیتوں میں پھینک دی ہے لیکن اتفاق سے تلاشی کے دوران احمد کے گھر سے سری دیوی کا ہینڈ بیگ اور اس کا بریسلٹ دستیاب ہوگیا۔ پولیس نے اسے گرفتار کرلیا۔ ابھی تک یہ صرف شبہ تھا لیکن جب اس نے اپنے جرائم اور قتل کی وارداتوں کے بارے میں بتانا شروع کیا تو پولیس والے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اس نے اسی کھیت میں چالیس لاشوں کو دفنانے کا اعتراف کیا تھا۔ کھدائی کے دوران ان لاشوں کی باقیات مل گئی تھیں۔

اسی اعتراف میں اس نے بتایا تھا کہ اس کے باپ کی روح اس کے خواب میں آکر کہا کرتی ہے کہ بس شاباش۔ تھوڑا خون اور۔ اس کے بعد قوت مل جائے گی۔ اس نے بتایا کہ وہ مارنے کے بعد اپنے باپ کی ہدایت کے مطابق لاش کا خون بھی پیتا تھا۔

جولائی 2008ء میں اس بے رحم شخص کو فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کردیا گیا جہاں درجنوں گولیوں نے اس کو بھون کر رکھ دیا۔

اس قسم کے پاگل اور جنونی بدقسمتی سے ہمارے یہاں بھی ہیں۔ جو دولت کے لیے طاقت کے لیے بچوں کی قربانیاں دیا کرتے ہیں اور وہ یہ سارا فعل باباؤں کے کہنے پر کیا کرتے ہیں۔ اس قسم کے جرائم کی اصل وجہ وہ بابا ہوا

کرتے ہیں۔ خدا جانے ہمارے معاشرے کو ایسے باباؤں سے کب نجات ملے گی؟

لوئیس گراویٹو:

یہ سیریل کلر شاید سب سے بازی لے گیا تھا۔ اس نے اندازاً تین سو بچوں کا خون کیا تھا جب کہ اس نے اپنے اعتراف میں صرف ایک سو چالیس کا ذکر کیا ہے۔

یہ شخص 1957ء میں کولمبیا میں پیدا ہوا تھا۔ یہ اپنے والدین کی ساتویں اولاد تھا۔ اس کا باپ شرابی تھا اور اس درجے کا کہ اسے اپنا کوئی ہوش نہیں رہتا تھا۔

نشے میں وہ لوئیس کو بے تحاشا مارا کرتا اور اس کی ماں بھی اس کا ساتھ نہیں دیتی تھی۔ ان سب باتوں نے اسے گھر سے متنفر کردیا۔ باپ کے خلاف نفرت تو تھی ہی۔ ایک بار وہ اپنے باپ کو زخمی کر کے گھر سے فرار ہوگیا۔ اس وقت اس کی عمر سولہ برس تھی۔

اس کے بعد اس کی زندگی بہت دشوار رہی۔ اس نے چھوٹی موٹی نوکریاں شروع کردیں اور اپنے آپ کو کسی طرح زندہ رکھنے لگا۔

دیکھا یہی گیا ہے کہ اس قسم کے محرکات کی جڑیں بچپن سے جا کر ملتی ہیں۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی شخص جوان ہو کر اچانک ہی اس قسم کا مجرم بن گیا ہو بلکہ اس قسم کے جرائم کے تانے بانے بچپن کی محرومیوں سے جا کر مل جاتے ہیں۔

لوئیس کے جاننے والے اسے ایک ہمدرد اور پُرخلوص انسان سمجھتے تھے۔ یعنی اس کے دو چہرے تھے۔ ایک چہرہ مہربان اور رحم دل تھا جب کہ دوسرا انتہائی بے رحم اور سنگ دل۔ وہ دوستوں کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ ہنستا بولتا، یعنی اس میں کوئی ایسی علامت نہیں پائی جاتی تھی جو اس کے قاتل ہونے کا پتا دے سکے۔ وہ عام انسان کی طرح رہا کرتا تھا۔

لوئیس کا طریقہ واردات کچھ یوں تھا کہ وہ چھ سال سے لے کر سولہ سال تک کے بچوں کو اپنا شکار بنایا کرتا۔ بے گھر بچے، بھٹکے ہوئے بچے۔ اس زمانے میں کولمبیا میں خانہ جنگی چھڑی ہوئی تھی۔ اس لیے بہت سے بچے بے گھر ہوگئے تھے۔

لوئیس ایسے ہی بچوں کو نشانہ بنایا کرتا تھا۔ وہ ان سے ہمدردی کا اظہار کرتا۔ ان کو کھانے پینے کی چیزیں دلواتا، پیسے دیتا اور وہ اسے اپنا ہمدرد سمجھنے لگتے تھے، تو ان کو اپنے ساتھ لے جا کر ان کا خون کردیتا تھا۔

وہ اپنے شکار کو سنسان علاقوں میں لے جاتا اور اس پر

سیلفی لیتے ہوئے ہلاکتیں

ایک رپورٹ کے مطابق دنیا میں سیلفی لیتے ہوئے سب سے زیادہ افراد بھارت میں ہلاک ہوئے۔ موبائل کیمرا ایجاد ہونے کے بعد سیلفی کی وبا نے ہر کسی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ بچہ ہو یا بڑا ہر شخص سیلفی کے نشہ میں مبتلا نظر آتا ہے۔ لیکن دیگر منشیات کی طرح بسا اوقات سیلفی کا نشہ بھی جان لیوا ہوتا ہے۔ خطرناک جگہوں پر سیلفی کی کوشش کے دوران ہزاروں افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور زخمی ہو چکے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق مارچ 2014 سے ستمبر 2016 تک سیلفی لیتے ہوئے 127 افراد ہلاک ہوئے جن میں سے سب سے زیادہ 76 ہلاکتیں بھارت میں ہوئیں۔ امریکی حکومت کے اعداد و شمار کے مطابق 2014 کے دوران ملک بھر میں 33 ہزار افراد ڈرائیونگ کے دوران سیلفی لیتے ہوئے زخمی ہوئے۔ امریکا کی کارنیگی میلن یونیورسٹی اور بھارتی جامعہ اندرا پراستھا انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن دہلی کے محققین نے "می، مائی سیلف اینڈ مائی کل فی" کے نام سے مشترکہ طور پر یہ تحقیق کی ہے۔ جان لیوا سیلفی کو "کل فی" کہا جاتا ہے۔ 2013 میں آکسفورڈ ڈکشنری نے سیلفی کو سال کا لفظ قرار دیا۔ انسان میں مشہور، مقبول اور ہر دل عزیز بننے کا فطری جذبہ موجود ہوتا ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں۔ انہی جذبات کے تحت انٹرنیٹ صارفین اپنی بہترین سے بہترین انفرادی یا اجتماعی تصاویر کھینچ کر فیس بک، ٹوئٹر، انسٹاگرام سمیت سماجی رابطوں کی مختلف ویب سائٹس پر اپ لوڈ کرتے ہیں اور لوگوں سے لائکس اور شیئرز کی شکل میں خوب داد وصول کرتے ہیں۔ نوبت یہاں تک آ چکی ہے کہ لوگ مقدس مقامات پر بھی عبادات میں دل لگانے اور توجہ مرکوز کرنے کی بجائے سیلفی کھینچنے میں مصروف رہتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ لائکس اور شیئرز کے حصول کے لیے خطرناک مقامات پر بھی سیلفی لینے کا رجحان بڑھ رہا ہے جو جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔

مرسلہ: علی سبحانی، ملتان

قابو پاکر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر بے بس کر دیتا تھا۔ منہ میں کپڑا ٹھونس دیتا تھا۔ اس کے بعد اپنا شیطانی کھیل کھیلتا، پھر قتل کر دیا کرتا تھا۔

جائے واردات پر شراب کی خالی بوتلیں بھی پائی گئی ہیں یعنی وہ اذیت دینے سے پہلے شراب نوشی بھی کرتا تھا۔

1992ء کے آغاز میں کولمبیا کی گلیوں سے چھ سے سولہ سال تک کے بچے جب غائب ہونے لگے تو ایک ہنگامہ مچ گیا لیکن اس وقت تک حکام نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ کیوں کہ ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی۔ ان واقعات کو گمشدگی کا کیس سمجھ لیا گیا۔ یہ سلسلہ 1998ء تک چلتا رہا۔ پھر ایک دن ایک پہاڑی کے پاس دو بچوں کی لاشیں برہنہ حالت میں پائی گئیں۔ دونوں کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور انتہائی بے رحمی سے ان کی گردنوں کو کاٹ دیا گیا تھا۔ اب پولیس متوجہ ہوئی۔ ایک ہفتے کے بعد اسی مقام سے کچھ فاصلے پر ایک اور لاش ملی۔ اس کی بھی یہی حالت تھی۔ اس لاش کے پاس ایک نوٹ بک بھی ملی جس پر ایک پتا اور نام درج تھا۔ یہ نام ایک لڑکی کا تھا جو لوئیس کی دوست تھی۔ پولیس فوری طور پر اس پتے پر پہنچ گئی۔ وہ لڑکی مل گئی۔ اس نے بتایا کہ اس نے کئی مہینوں سے لوئیس کو نہیں دیکھا ہے۔

اس لڑکی نے پولیس کو ایک بڑا سا بیگ دیا جو لوئیس اس کی تحویل میں دے گیا تھا۔ لڑکی نے بتایا کہ اس نے اب تک اس بیگ کو کھول کر نہیں دیکھا۔ اس بیگ کو جب کھول کر دیکھا گیا تو اس میں سے لوئیس کے خلاف بے شمار شواہد اور ثبوت مل گئے۔ لڑکوں کی تصویریں۔ ہر خون کے بعد ایک لذت بھرا اعتراف اور بھی بہت کچھ۔ اس نے یہ بھی لکھ رکھا تھا کہ اس نے فلاں لڑکے کو کہاں سے اٹھایا تھا۔ اس کو کہاں لے گیا تھا وغیرہ وغیرہ۔

لڑکی نے لوئیس کا پتا بتا دیا تھا۔ کیوں کہ وہ خود بھی یہ سب دیکھ کر چکرا کر رہ گئی تھی۔ لوئیس کے پتے پر چھاپہ مارا گیا لیکن وہ مکان خالی تھا۔ لوئیس نہیں مل سکا تھا۔ لوئیس کی گرفتاری 22 اپریل 1999ء کو ہوئی۔ اس قسم کے ہر قاتل کی طرح اس نے بھی شروع میں خود کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن جب اس کی ڈائری اسے دکھائی گئی اور اس کی دوست لڑکی نے جب اسے یہ بتایا کہ اس کا بیگ اس نے پولیس کے حوالے کیا تھا تو اس نے اپنے جرائم کا اعتراف کرنا شروع کر دیا۔ اس نے ایک اجتماعی قبر بھی تیار کر رکھی تھی۔ اس میں سے ساٹھ بچوں کی باقیات ملیں۔

کولمبیا میں چونکہ موت کی سزا نہیں ہے اس کے علاوہ تیس سال سے زیادہ کسی کو قید میں بھی رکھا نہیں جا سکتا۔ اسی لیے اسے تیس سال کی انتہائی سزا دی گئی لیکن جب اس کو سزا دی گئی تو اس کے خلاف کولمبیا میں ایک شدید قسم کا احتجاج شروع ہو گیا۔ مطالبہ تھا کہ ایسے بے رحم درندے کے لیے قانون کو بدلا جائے۔ موت کی سزا ہونی چاہیے۔

الیگزنڈر پی چشکن:۔ Alexander Pichushkin

روس کا سیریل کلر۔ اس کی نوعیت ہی سب سے الگ تھی۔ الیگزنڈر شطرنج کا کھلاڑی تھا۔ وہ شطرنج کی بساط سامنے رکھ کر نہ جانے کیا کیا سوچتا رہتا۔ اس کی پیدائش 1974ء میں ماسکو کے نواح میں ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ حیرت انگیز اور غیر معمولی ہے۔ وہ ایک نارمل بچہ تھا جس طرح کے دوسرے بچے ہوا کرتے ہیں۔ ہنستے کھیلتے ہوئے۔ ایک بار وہ ایک پارک میں بچوں کے ساتھ جھولا جھولتے ہوئے منہ کے بل گر پڑا۔ اس کے سر کے اگلے حصے کو چوٹ لگی تھی۔ اسے فوری طور پر اسپتال لے جایا گیا۔ پتا چلا کہ اس کے دماغ کا وہ حصہ متاثر ہو گیا ہے جو ذہنی توازن برقرار رکھتا ہے۔ اس قسم کی چوٹ کے بعد عام طور پر مزاج میں تشدد کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔

وہی ہوا۔ الیگزنڈر کے مزاج میں ضد شامل ہو گئی۔ لڑنا بھڑنا شروع کر دیا۔ گھر والے بھی پریشان ہو گئے تھے۔ اس کے اسکول سے شکایات آیا کرتی تھیں۔ اس کی ماں نے اسے اس اسکول سے ہٹا کر ایک دوسرے اسکول میں داخل کر دیا لیکن اس کے مزاج کی تندی بڑھتی چلی گئی۔

دوسرے اسکول میں اس کے ساتھی بچوں کا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ اسے پاگل پاگل کہہ کر چھیڑا کرتے تھے۔ اس بات نے اس کے اندر ایک درندے کی پرورش شروع کر دی۔ اب وہ بظاہر خاموش ہو گیا تھا لیکن اس کے اندر ایک خونخوار درندہ پروان چڑھنے لگا تھا۔

ماہرین نفسیات نے اس کے باپ کو مشورہ دیا کہ اسے کوئی گیم سکھائیں۔ شاید اس طرح اس کے مزاج کا رخ بدلا جا سکے۔ اس کا باپ شطرنج کھیلا کرتا تھا۔ اس نے الیگزنڈر کو بھی سکھانا شروع کر دیا۔ یہ کھیل الیگزنڈر کو اپنے مزاج کے مطابق معلوم ہوا۔ اس نے دلچسپی لینی شروع کر دی اور اس کے باپ کو محسوس ہوا کہ وہ اچھا خاصا کھیلنے لگا ہے۔

شہر کے ایک پارک میں شطرنج کا مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ اس کے باپ نے اس کو ان مقابلوں میں شریک کرا دیا جہاں اس نے اپنے سے کئی گنا زیادہ عمر کے شاطروں کو شکست دے دی۔ اب اس کے جارحانہ پن کو ایک راستہ مل گیا تھا۔

اسی دوران اس کے دادا کا انتقال ہو گیا۔ الیکو نڈر اپنے دادا سے بہت قریب تھا۔ دادا کی موت نے اس کے ذہن پر برا اثر ڈالا۔ اس نے ووڈ کا پینی شروع کر دی۔ وہ نشے میں رہنے لگا تھا۔ اس کے دو ہی مشاغل تھے۔ شراب نوشی اور شطرنج کھیلنا۔ وہ پارک میں جا کر مقابلہ کیا کرتا۔ اس پارک میں بہت سے شاطر آیا کرتے تھے۔ ایک دن اس پر ایک انکشاف ہوا کہ چھوٹی عمر کے بچے اس کو بہت attract کرتے ہیں۔ اس نے بچوں کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا۔ ان کو لالچ دینے لگا۔ ایک دن وہ ایک کم عمر بچے کو اپنے ساتھ اپنے فلیٹ پر لے گیا۔ اس کا فلیٹ ساتویں منزل پر تھا۔ بچہ اس کے بہکاوے میں آ کر اس کے ساتھ چلا آیا تھا۔ اس نے فلیٹ میں داخل ہوتے ہی بچے کو بے بس کر کے اس کی ٹانگیں باندھ کر اسے کھڑکی سے لٹکا دیا اور دھمکی دی کہ اگر اس نے اس کی بات نہیں مانی تو وہ اسے نیچے گرا دے گا۔ بچہ رونے لگا اور اس کی بات ماننے پر مجبور ہو گیا۔

اس طرح اس کے ایک گھناؤنے مشغلے کا آغاز ہو گیا۔ اس نے پہلا معلوم قتل 1992ء میں کیا تھا۔ یہ سلسلہ 2001ء تک جاری رہا۔

اس کا طریقہ واردات مختلف تھا۔ وہ پارک میں جا کر ایسے بچوں کو تلاش کرتا جو آوارہ گرد یا بھکاری ہوں۔ وہ ان کو ووڈ کا کا لالچ دے کر اپنے فلیٹ میں لے آتا۔ جی بھر کر ووڈ کا پلاتا اور جب وہ نشے میں مدہوش ہو جاتے تو ان کو قتل کر کے ان کی کھوپڑی میں سوراخ کرتا اور ووڈ کا کی بوتل اس شگاف میں ٹھونس دیتا۔

اس کے بیانات بھی بہت عجیب ہیں۔ اس نے کہا کہ جب وہ کسی کو قتل کرتا ہے تو خود کو حاکم محسوس کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ وہ پہلے اپنے شکار کو بے ہوش کرتا ہے اور جب وہ شکار بے بسی کی حالت میں اس کے سامنے پڑا رہتا ہے تو اسے ایسا لگتا ہے جیسے اس شخص پر اس کو مکمل اختیار ہے چاہے تو زندگی بخش دے یا چاہے تو موت کے گھاٹ اتار دے۔

اس وقت وہ اپنے اندر ایک ہیجان، ایک سرشاری سی محسوس کرتا تھا۔ وہ خود کو خدا سمجھنے لگتا تھا کہ زندگی اور موت پر اس کو اختیار ہے۔ اس نے کہا کہ کسی کو مارنا میرے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا تمہارے لیے کھانا اور سانس لینا۔

ماہرین نفسیات نے اس عمل کو اینٹی سوشل پرسنالٹی ڈس آرڈر قرار دیا تھا۔

الیکو نڈر اس وقت گرفتار ہوا جب ایک عورت کی لاش اس پارک میں پائی گئی جہاں وہ وقت گزارا کرتا تھا۔ اس لاش کے پاس ماسکو میٹرو کا ٹکٹ تھا۔ اس کی مدد سے پولیس الیکو نڈر تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکی تھی۔

اس نے پچاس کے قریب قتل کا اعتراف کیا اور اس بات پر افسوس کا اظہار کرتا رہا کہ اسے ٹارگٹ مکمل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس نے بتایا کہ وہ شطرنج کے چونسٹھ خانوں کے حساب سے چونسٹھ قتل کرنا چاہتا تھا۔

چارلس ایڈمنڈ:۔

اس شخص کو قاتل فرشتہ کا نام دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس نے اپنے آپ کو فرشتہ سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ ایسا فرشتہ جو بیمار اور پریشان انسانوں کی مدد کے لیے آسمان سے اتارا گیا ہے۔

چارلس 1960ء میں نیو جرسی میں پیدا ہوا تھا۔ وہ اپنے والدین کی آٹھویں اور آخری اولاد تھا۔ جس وقت وہ پیدا ہوا اس کا باپ ایک بس ڈرائیور تھا اور جب وہ سات مہینوں کا تھا تو اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کی نفسیات کچھ عجیب ہی تھی۔ اس میں بچپن ہی سے خودکشی کا رجحان تھا۔ اس نے پہلی کوشش اس وقت کی جب وہ صرف نو برس کا تھا۔ اس کے بعد وہ جب تک زندہ رہا۔ اس قسم کی کوششیں کرتا رہا تھا۔ اس نے تعلیم حاصل کی اور اسے امریکن نیوی میں ملازمت مل گئی۔ وہ پیٹی آفیسر کے عہدے تک پہنچ گیا۔

اپنی ملازمت کے دوران اس نے سات مرتبہ خودکشی کی کوشش کی تھی۔ بالآخر اسے میڈیکل گراؤنڈ پر 1984ء میں نیوی سے فارغ کر دیا گیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر اس نے نرسنگ کی ٹریننگ حاصل کرنی شروع کر دی۔ اپنی کلاس میں وہ واحد مرد تھا۔ اس کے علاوہ سب عورتیں تھیں۔ اس کی ماں کا بھی ایک حادثے میں انتقال ہو چکا تھا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ بھائی بہن تو تھے لیکن اس کا کسی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کو اپنی زندگی خود ہی گزارنی تھی۔

اس نے نرسنگ کا امتحان پاس کر لیا اس کے بعد ایک اسپتال میں اسے میل نرس کی ملازمت مل گئی اور یہاں سے اس نے اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا۔ نہ جانے ایسے لوگوں کے ذہنوں میں کیا ہوتا ہے۔ یہ خود کو نجات دہندہ سمجھنے لگتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کو دکھوں سے نجات

دلانے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔
چارلس کا خیال تھا کہ قدرت نے اسے ایک خاص مشن پر اسپتال کی ملازمت دلوائی ہے۔ لہٰذا قدرت کی مرضی کو پورا کیا جائے۔ اس نے اپنی بے رحمی کا آغاز اسی اسپتال سے کر دیا۔ اس کا تعلق چونکہ میڈیکل کے شعبے سے تھا۔ اس لیے ہر قسم کی دوائیں وہ حاصل کر لیتا تھا۔
اس نے اپنے مشن کا آغاز ایک بوڑھے مریض سے کیا تھا۔ وہ بے چارہ اسپتال کے بیڈ پر تھا۔ چارلس کی ذمے اس کی دیکھ بھال تھی۔ اس نے اپنے طور پر یہ سوچا کہ یہ مریض اب ٹھیک تو ہونے سے رہا تو کیوں نہ اسے تکلیف سے نجات دلا دی جائے۔ یعنی وہ کام کیا جائے جس کے لیے اسے بھیجا گیا ہے۔ لہٰذا اس نے ایک دن اس بوڑھے کو زہر کا انجکشن لگا دیا۔ بوڑھا کچھ دیر بعد ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ سینٹ بارن باس کے اسپتال میں اس نے اس طرح کئی وارداتیں کیں۔ اس نے ایڈز کے مریضوں کو وقت سے پہلے موت کی نیند سلا دیا۔
اسپتال والوں کو اس کے خلاف شبہہ ہونے لگا تھا۔ کیوں کہ اس کے چارج میں جو دوائیں ہوتی تھیں ان میں کمی آنے لگی تھی۔ اس نے جب محسوس کیا کہ شبہہ یقین میں بدل رہا ہے تو اس نے اسپتال کی ملازمت چھوڑ دی۔
اس نے ایک اور اسپتال میں ملازمت کر لی۔ یہاں بھی اس نے کئی مریضوں کا خاتمہ کیا۔ ایک بار اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ اپنے ساتھ کام کرنے والی ایک نرس کی رہائش گاہ میں رات گئے وقت داخل ہو گیا۔ وہ نرس اور اس کا بیٹا اس وقت سو رہے تھے۔ نرس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کو جاگتا دیکھ کر چارلس فرار ہو گیا۔ نرس نے پولیس میں رپورٹ کر دی۔ چارلس کو گرفتار کر لیا گیا لیکن اس پر کسی کے گھر میں داخل ہونے کا الزام تھا۔ اسی لیے اسے صرف ایک سال کی سزا دی گئی۔
ایک سال قید میں رہنے کے بعد اس نے نیو جرسی کے ایک اور اسپتال میں ملازمت کر لی۔ جس کا نام ''سمرسیٹ میڈیکل سینٹر'' تھا۔ اس کی حرکتیں یہاں بھی جاری رہیں۔ یہاں اس کو پھر شبہہ کا سامنا کرنا پڑا۔ کیوں کہ دوائیں غائب ہونے لگی تھیں۔ اس کے ساتھ کام کرنے والی ایک نرس کو اس پر شبہہ ہو گیا تھا۔ اس نے رپورٹ کر دی۔ چارلس سے انکوائری ہوئی۔ اس نے اقرار کر لیا کہ وہ دوائیں چوری کرتا رہا ہے۔ اس جرم پر اسے اسپتال سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد اس نے ایک جگہ ملازمت کی اور اس وقت پکڑا گیا جب وہ ایک ایسے مریض کے کمرے میں موجود تھا جس کمرے میں اس کی ڈیوٹی نہیں تھی۔ اس کے پاس سے انجکشن برآمد ہوا تو اسے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔
اس کے بعد جو اس نے اپنے کیے ہوئے قتل کی فہرست گنوانی شروع کی ہے تو پولیس والے حیران رہ گئے اس کے مطابق اس نے اپنے سولہ سالہ کیریئر میں تین سو سے زائد افراد کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔
علی اصغر بروجردی:۔
اس ٹھنڈے دل و دماغ کے بے رحم قاتل کا تعلق ایران سے تھا۔ اس کی پیدائش ایران کے شہر بروجرد میں 1893ء میں ہوئی تھی۔ اس کا باپ مرزا ایک رہزن تھا۔ وہ قافلوں کو لوٹتا تھا اور قتل کرتا تھا۔ یعنی علی اصغر کو جرم اس کی وراثت میں ملا تھا۔ اس شخص کے بے رحمانہ کارناموں پر ناولز بھی لکھے گئے ہیں۔ ایران میں بیسویں صدی کا وہ پہلا سیریل کلر تھا۔
اس کے گھر والے عراق منتقل ہو گئے تھے۔ اس نے صرف 14 برس کی عمر سے بچوں کے ساتھ زیادتی کرنے اور انہیں ہلاک کرنے کا آغاز کیا تھا۔ وہ ایسا قاتل تھا جس نے پولیس کو چیلنج دے رکھا تھا کہ اس کے خلاف کوئی ثبوت ہو تو سامنے لائیں۔
وہ بچوں کی لاشوں کو تیزاب میں ڈال کر گلا دیا کرتا تھا۔ مرنے والوں کی باقیات بھی باقی نہیں رہتی تھیں۔ اس کی گرفتاری اس وقت عمل میں آئی جب وہ ایران واپس آ کر اپنے مکروہ فعل میں مشغول تھا۔
اس نے ایک پارک میں ایک بچے کو اپنا نشانہ بنایا اور جب وہ اس کو ہلاک کر رہا تھا تو ایک دوسرے بچے نے یہ سب کچھ دیکھ لیا۔ اس نے جا کر اپنے والدین کو بتا دیا۔ اس کے باپ نے پولیس کو رپورٹ کر دی۔ اصغر کی حرکتیں تو پہلے ہی سے مشکوک تھیں۔ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔
اس نے اپنے جرائم کا اعتراف کر لیا اور پولیس کو وہ جگہیں بھی دکھا دیں جہاں وہ بچی کھچی چیزیں دفن کیا کرتا تھا۔ اس نے ستر بچوں کے قتل کا اعتراف کیا تھا۔ جنوری 1934ء میں اسے موت کی سزا دے دی گئی۔
یہ چند لوگ تھے۔ تاریخ ایسے مکروہ اور بے رحم ناموں سے بھری ہوئی ہے۔ اجتماعی قاتل ہوں یا انفرادی قاتل۔ سب انسان کے دشمن ہوتے ہیں۔ چاہے وہ کسی نام سے ہوں۔

گمشدہ شہزادی

فرزانہ نگہت

یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ وہ جن کے ساتھ رہ رہی تھی ان سے اس کا کوئی رشتہ نہیں اور وہ کوئی معمولی ہستی بھی نہیں ہے۔ اس کا تعلق تو ایک شاہی خاندان سے ہے۔ وہ ایک گمشدہ شہزادی ہے۔

خانہ جنگی سے پیدا ہونے والا ایک دلچسپ واقعہ۔

اپریل 2004ء میں بالآخر سارہ کلیرمن کو وہ کال مل ہی گئی جس کا وہ تیس سال سے انتظار کر رہی تھی۔ اس وقت وہ لاس اینجلز میں اپنی ایک دوست کے ساتھ ایک پُرہجوم ساحلی کیفے میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ وہاں ایسا شور مچا ہوا تھا کہ اسے دوسرے سرے سے بولنے والے کی آواز بمشکل ہی سنائی دے رہی تھی۔ جو گیارہ ہزار کلومیٹر دور افریقا سے بول رہا تھا۔

"یہ تمہارا باپ جوزف کونیا کیا سوواہے۔" اس آواز نے کہا۔

سارا نے اسے ہولڈ آن کرنے کو کہا اور کیفے سے نکل کر پُرہجوم سڑک پر دوڑتی ہوئی کپڑے کے ایک اسٹور میں داخل ہو گئی۔ وہاں نئے اور پرانے کپڑے تختوں پر ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے۔ لیکن شور نہیں تھا اور وہ فون کی آواز صاف سن سکتی تھی۔

"معاف کرنا۔ میں نہ جانتا تھا کہ تمہیں کیسے تلاش

کروں۔'' فون کرنے والے نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''معذرت خواہ ہوں۔ میں تمام عمر آپ سے شاکی رہی لیکن اب ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔'' سارا بولی۔

اٹھائیس سالہ سارا کا اس سے پہلے کبھی اپنے والدین سے رابطہ نہ ہو پایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ جان بوجھ کر اسے تلاش کرنے اور اس سے رابطہ کرنے سے مجتنب تھے۔ امریکا میں اس کے والدین جم اور جوڈی کلبرٹن نے اسے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ اس کا باپ سلیم کالج مغربی ورجینیا یونیورسٹی میں سیرالیون سے تبادل طالب علم کے طور پر پہنچا ہوا تھا۔ وہاں اس کے ایک سفید فام لڑکی سے تعلقات قائم ہو گئے جس کے نتیجے میں وہ حاملہ ہو گئی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد وہ اسے کسی بے اولاد جوڑے کو دے دیں گے۔ اس کے بعد دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ سارا کا باپ اپنے وطن لوٹ گیا۔

اب وہ اپنی بیٹی کو مجبور کر رہا تھا کہ وہ اس کے پاس چلی آئے اور اس سے ملے۔

''ایک شاہی خاندان کے فرد کی حیثیت سے تم ایک نہ ایک دن یہاں کی حکومت سنبھالو گی۔'' اس نے اس سے کہا۔

اس لمحے سارا نے محسوس کیا کہ اس کی زندگی ہمیشہ کے لیے تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کا مہذب دنیا سے کوئی واسطہ نہ رہا تھا۔ وہ اب چھوٹے جنگ زدہ غیر معروف سے گاؤں سے جڑ گئی تھی۔

سارا مغربی ورجینیا میں ایک نارمل امریکی لڑکی کی طرح پلی بڑھی۔ جم، ورجینیا ویسٹ یونیورسٹی کے پروفیسر اور جوڈی خصوصی تعلیم کی ٹیچر نے اس پر محبت اور حوصلہ افزائی کے بھرپور خزانے لٹائے۔ اس کے باوجود وہ اس احساس سے کبھی چھٹکارا نہ پا سکی کہ وہ اپنے خوب صورت بالوں والے خاندان یا کمیونٹی سے ہرگز تعلق نہیں رکھتی تھی۔ بیشتر گود لیے بچوں کی طرح وہ بھی ایک طرح کے احساس عدم تحفظ اور بے چینی میں مبتلا تھی۔ ایسی صورتوں میں یہ ہوتا ہے کہ گود لینے والے والدین میں سے اگر ایک چھوڑ دیتا ہے تو پھر دوسرا ابھی کیوں کر رکھے گا یا وہ سوچا کرتی تھی کہ مجھے زیادہ سے زیادہ اچھی بچی بننے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ وہ مجھے چھوڑنے کا کبھی نہ سوچیں۔

سارا اچھی طالبہ اور بلند پایہ ایتھلیٹ تھی۔ وہ طلبا تنظیم کی صدر بھی تھی اور فلاحی کاموں کی شوقین بھی۔ ''وہ لوگوں کو خوش کرنا جانتی ہے۔'' جوڈی کا کہنا تھا۔ ویسٹ ورجینیا یونیورسٹی میں تھیٹر کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ سان فرانسسکو میں امریکن کنزرویٹری تھیٹر کے گریجویٹ اسکول چلی گئی۔ وہاں 1999ء میں اس نے اپنے اصل والدین کی تلاش کا آغاز کیا۔ اس کے گود لیے جانے والے کاغذات میں اس کے حقیقی والدین کے نام جس طرح درج کیے گئے تھے اس سے ان کا پتا چلانا مشکل تھا لیکن اس نے اس سلسلے میں تلاش و جستجو کی ٹھان لی۔

جب اس نے جوڈی کو بتایا کہ وہ اپنی ماں کو تلاش کرنا چاہتی ہے تو جوڈی نے اسے بتایا کہ جس عورت نے اسے جنم دیا تھا وہ دس سال پہلے انتقال کر چکی تھی۔ اس کے باپ کے بارے میں البتہ وہ کچھ نہ جانتی تھی۔ سارا کو خاصی مایوسی ہوئی اس نے اپنے اصل باپ کی تلاش و جستجو میں اپنے آپ کو تذبذب اور ہچکچاہٹ کا شکار ہوتے محسوس کیا۔

2001ء میں وہ لاس اینجلز پہنچی اور ٹیلی ویژن اور فلموں میں چھوٹے چھوٹے رول ادا کرنے لگی۔ اس دوران اس نے ہائی اسکول کے طلباء کو رقص کی تعلیم دینا بھی جاری رکھا۔ پھر جب وہ بیس سال سے اوپر کی عمر کو پہنچی تو اس پر ایک بے نام سی اداسی اور مایوسی طاری رہنے لگی۔ وہ جب کسی مرد کے قریب ہوتی تھی تو یہ خوف کہ وہ کہیں اسے چھوڑ ہی نہ دے اسے خود اس سے اپنے تعلقات توڑنے پر مجبور کر دیتا تھا۔

2004ء میں سارا نے ایک قیادتی تربیتی کورس میں داخلہ لے لیا۔ ایک سیشن پر انسٹرکٹر نے اس سے پوچھا۔ ''تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ اپنے آگے بیٹھے ہوئے آدمی کو بتاؤ۔'' وہ آدمی اس کا پرانا دوست آرٹ تھا۔ ''میں اپنے حقیقی باپ کی تلاش سے خوف زدہ ہوں۔'' سارا نے اس کے سامنے اعتراف کیا۔

آرٹ نے اسے تسلی دی کہ اس کی تلاش اسے اطمینان و سکون عطا کرے گی۔ آرٹ نے اسے بتایا کہ وہ ایک ایسے سراغرساں سے واقف تھا جو صرف سو ڈالر میں اس کے باپ کو تلاش کر سکتا تھا۔

اس سراغرساں نے صرف تین گھنٹے کی تفتیش و جستجو کے بعد میری لینڈ میں ایک نام جوزف کونیا کپا سووا ڈھونڈ نکالا۔ سارا نے ایک تعارفی نوٹ پر محنت کی اور انتہائی بے چینی اور اضطراب کے عالم میں اسے بھیج دیا۔ جلد ہی اسے ایک عورت کی طرف سے کال موصول ہوئی۔ ''میں ایولین ہوں تمہاری خالہ۔ میں تمہاری پیدائش کے موقع پر موجود تھی۔''

سارا سسکیاں لے کر رونے لگی۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ یہ جوزف دراصل اس کا چچا تھا۔ رابطہ ہونے پر اس نے اسے

فون کیا اور بولا۔ ”کیا تم جانتی ہو کہ تم ایک شہزادی ہو؟“ اس نے اسے بتایا کہ وہ سیرالیون کے جنوب میں مینڈے قبیلے سے تعلق رکھتی ہے۔ براعظم افریقا میں بحراوقیانوس کے کنارے واقع ساٹھ لاکھ کی آبادی کے ملک سیرالیون میں اس کا دادا چھبیس ہزار نفوس پر حکمران تھا جب وہ مرا تو سارا کا باپ اپنے آپ کو اس کا وارث قرار دیتے ہوئے مینڈے قبیلے کا حکمران بن سکتا تھا لیکن اس نے حکمرانی پر ایک مقامی ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹری کی ملازمت کو ترجیح دی اور اس کا بھائی جو اس کا ہم نام تھا۔ قبیلے کا سردار بن گیا۔ یہ قبیلہ جنوبی سیرالیون کے ایک بہت بڑے گاؤں میں آباد تھا جس کا دارالحکومت بمپے تھا۔

ان اطلاعات نے سارا کا دماغ ہلا دیا۔ پھر جب دو ہفتے بعد اس کے باپ نے اس سے رابطہ کیا تو وہ تمام معاملات کو زیادہ صاف اور واضح طور پر سمجھنے لگی۔

جب سارا حصولِ تعلیم پھر ملازمت میں مشغول تھی تو اس عرصے میں جوزف کو نیا کیا سو دا افریقا کی انتہائی خونریز خانہ جنگی میں بقا کی جنگ لڑ رہا تھا۔ 1999ء اور 2002ء کے درمیان انقلابی متحدہ محاذ کے گوریلے جن میں زیادہ تعداد بگڑے ہوئے بچوں اور نوجوانوں کی تھی، نے سیرالیون میں خوف و دہشت کا راج قائم کر رکھا تھا۔ اس خانہ جنگی میں مرنے والوں کی تعداد کا اندازہ پچاس ہزار کے لگ بھگ لگایا جاتا ہے۔

یہ خانہ جنگی چھڑنے سے پہلے جوزف نے ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھی تھی۔ 1994ء میں جب شرپسند بمپے میں داخل ہوئے تو وہ اپنے بیوی بچوں اور مٹھی بھر رشتے داروں کے ساتھ بمپے سے فرار ہو گیا تھا۔ یہ لوگ چار سالوں تک قرب و جوار کے دیہاتوں میں چھپتے، دوسرے مہاجرین کے ساتھ تنگ و تاریک گھروں میں رہتے رہے۔

پھر جب باغی پسپا ہو گئے تو جوزف بمپے واپس آ گیا جو اس وقت مہیب تباہی و بربادی کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ باغیوں نے آدھے سے زیادہ گاؤں جلا کر راکھ کر دیا تھا اور جوزف کی ایک بہن بھی ان کے ہاتھوں ماری گئی تھی۔ بمپے ہائی اسکول کی جست کی چھت باغیوں نے ہتھیار بنانے کے لیے اتار لی تھی اور ڈیسک اور کتابیں چولہے جلانے کے لیے استعمال کر لیے تھے۔ انہوں نے لیبارٹری کا سامان بھی توڑ پھوڑ دیا تھا۔

اس اسکول کی بنیاد 1963ء میں رکھی گئی تھی۔ اس وقت سے وہاں سیرالیون بھر سے اور آس پاس کے ملکوں سے چھ سو کے لگ بھگ طلبا آ کر تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اب یہ ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا۔ جوزف اور اس کے رفقا نے اس کی تعمیرِ نو کا آغاز کیا مگر اس کی رفتار سست تھی۔

جوزف کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ اپنی اس بیٹی سے رابطہ کرے جسے وہ امریکا میں چھوڑ آیا تھا۔ اب اس نے اسے تلاش کر لیا تھا۔ اس نے موبائل پر سارا کو کال کی۔ پھر جب اس نے اس کی ہنسی کی آواز سنی تو اسے بے اختیار وہ عورت یاد آ گئی جس سے اس نے کئی سال پہلے محبت کی تھی۔ اس نے سارا کو بتایا کہ وہ اور اس کی ماں اسے دوسرے لوگوں کے حوالے کر کے کتنے دکھی اور مغموم ہوئے تھے لیکن ان کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار بھی نہیں تھا۔ وہ اسٹوڈنٹ ویزا پر آیا ہوا ایک تہی دست طالب علم تھا اور اس کی ماں ایک چائے خانے میں ملازمہ تھی۔ ان کے لیے اس کی پرورش و پرداخت ممکن نہیں تھی۔

اس نے سارا کو اپنے خاندان کے ساتھ پیش آنے والے حادثات اور مصائب کے بارے میں بتایا اور کہا کہ ان کی بدولت وہ طویل عرصے تک اس سے رابطہ نہ کر پایا تھا۔ جب اس نے کہا کہ وہ مجھ سے ملنے آئے گی تو اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس سے بڑھ کر اہم اور پُرمسرت دن میری زندگی میں کبھی نہ آیا تھا۔ اس نے بعد میں بتایا تھا۔

اس ماہ دسمبر میں سارا اپنے دوست اور کوچ جان ولرے کے ہمراہ سیرالیون کے دارالحکومت فری ٹاؤن کے ایئرپورٹ پر اتری۔ اس کا باپ جس کے بارے میں اس نے تصور کر رکھا تھا کہ وہ ایک دراز قد اور وجیہ شخص ہو گا وہاں اس کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ اس کے تصور کے برعکس وہ ایک کوتاہ قامت معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا۔ اس نے اسے سینے سے لگایا اور آبدیدہ ہوا۔ سارا کے جذبات بھی اس سے مختلف نہ تھے۔ ”وہ مجھے بے حد قابلِ محبت معلوم ہوا تھا۔“ سارا نے بعد میں بتایا تھا۔

پھر جوزف نے سارا کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک طرف کھڑے درجن بھر افرادِ خاندان سے ملوانے لے چلا۔

رات بہت اندھیری تھی۔ شدتِ جذبات نے مغلوب سارا ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے گرد و پیش کے ماحول کی طرف کوئی توجہ نہ دے رہی تھی۔ اگلی صبح وہ ولرے اور اس کا باپ جوزف کی کھٹارا سی لینڈ روور میں سوار ہوئے اس وقت سارا کو گرد و پیش کا ماحول دیکھنے کا موقع ملا۔ شہر کا بیشتر حصہ ابھی تک کھنڈر بنا ہوا تھا۔ عمارات پر گولیوں کے نشانات تھے۔ سڑک کے کنارے چیتھڑوں میں ملبوس بچے مالٹے فروخت کر رہے تھے۔ سڑکیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں۔

پانچ گھنٹوں کی مسافت پر واقع بمپے ڈھلوان چھتوں

والے گھروں پر مشتمل ایک مختصر سی بستی تھی جس کے ارد گرد دور دور تک اروی اور آلوؤں کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ بستی کے باہر بے شمار لوگ ان کی آمد کے منتظر کھڑے تھے۔ انہوں نے لینڈ روور کو گھیر لیا اور اپنی زبان میں بلند آواز سے گیت گانے لگے۔ جوزف نے سارا کو کورس کا ترجمہ سنایا۔ ”خوش آمدید شہزادی۔ خوش آمدید سارا۔ تم اپنے آبائی گھر آ گئی ہو۔ ہم تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ ہم تم سے بہت محبت رکھتے ہیں۔“

سارا اپنے آنسو پونچھتی ہوئی گاڑی سے اتری اور وہاں مجمع عورتوں کی ہمراہی میں ایک بڑی سی سرخ عمارت کی طرف ہولی جو کچی بنی ہوئی تھی جس کے گرد بلند و بالا گھنے درخت اُگے ہوئے تھے۔ وہاں شاندار ضیافت کا انتظام تھا۔ وہ اپنے باپ اور دیگر عمائدین کے ساتھ ایک میز پر جا بیٹھی۔ ضیافت کے اختتام پر رقص و موسیقی کی محفل برپا ہوئی جو غروب آفتاب تک جاری رہی۔

پھیسے میں سترہ دن قیام کے دوران سارا اور جوزف کی بیوی میری کے درمیان گہرے دوستانہ تعلقات استوار ہو گئے۔ سارا کی سوتیلی بہن بیس سالہ حبیبہ اور پندرہ سالہ بھائی ہائیڈو بھی اس سے بے تکلف ہو گئے۔ سارا نے انہیں خاصا ذہین و فہیم اور مہذب و تمیزدار پایا۔ دوسرے رشتے دار بھی اس سے ملنے آتے رہے۔ جب وہ آتے اس کے لیے مرغی ضرور لاتے کیونکہ سارا نے بتایا تھا کہ مرغی اور چاول اس کی پسندیدہ خوراک ہے۔

یہ بات اسے بعد میں معلوم ہوئی کہ وہاں مرغیاں شاذ ہی عام لوگوں کی خوراک میں استعمال ہوتی تھیں۔ انہیں صرف نہایت معزز مہمانوں کے لیے مخصوص سمجھا جاتا تھا۔

”میں نے اپنی زندگی اس احساس کے ساتھ گزاری تھی کہ مجھے کوئی بڑا فائدہ بخش کام کرنا چاہیے۔ جب میں اس گاؤں میں پہنچی تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ جگہ میرے اس مقصد کے لیے بہترین تھی۔“ سارا نے بعد میں کہا تھا۔

سارا کو یہ دیکھ کر افسوس ہوا تھا کہ وہاں ایسے بچے اور بڑی عمر کے لوگ بھی تھے جو باغیوں کے ہاتھوں اپنے مختلف اعضاء سے محروم ہو چکے تھے۔ صاف پانی اور ضروری ادویات بہت کم دستیاب تھیں اور گاؤں کی بیشتر آبادی ملیریا میں مبتلا تھی۔ اس کے باپ کے اسکول کے دو سو طالب علم بغیر چھت کے کمروں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان کے حوصلے بلند تھے۔ وہ زندگی میں اپنا مقام بنانا چاہتے تھے۔ ”یہ لوگ تو جہنم سے گزر کر آئے ہیں۔ پھر بھی یہ کہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں خواہ کتنی ہی قیامتیں ہم پر ٹوٹیں ہم تعلیم سے منہ نہ موڑیں گے۔“ سارا نے انہیں دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

پھر ذمہ داری کے سوالوں سے جنگ کرتی سارا لاس اینجلز لوٹ آئی۔ ”وہ اس ماحول میں اپنا کردار تلاش کر رہی تھی۔“

جان ولرے نے کہا تھا۔ ایک جز وقتی رقص کی تعلیم دینے والی، اپنا مقام بنانے کی جدوجہد میں مصروف اداکارہ ان لوگوں کے لیے کتنی توانائی اور رقم خرچ کر سکتی تھی؟

ولرے نے اس سلسلے میں سارا کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اور سارا نے مل کر پھیسے کے ہائی اسکول کے لیے دو لاکھ ڈالر جمع کرنے کے لیے کپاسودا فاؤنڈیشن قائم کی۔ سارا جس اسکول میں رقص کی تعلیم دیتی تھی۔ وہاں اس نے ایک میلہ منعقد کیا جس سے اسے ساڑھے آٹھ سو ڈالر کی آمدنی ہوئی۔ ایک کنسرٹ کے انعقاد سے اسے سولہ ہزار ڈالر مل گئے۔ اس کے گود لیے والدین بھی مختلف طریقوں سے فنڈز جمع کرنے میں اس کی مدد کرتے رہے۔

مارچ 2007ء میں سارا اور ولرے افریقا پہنچے۔ وہاں انہوں نے ایک این جی او قائم کی جس نے گاؤں والوں کو اس قابل کر دیا کہ وہ اسکول کی تعمیر نو کے لیے کچھ کر سکیں۔ اس وقت تک فاؤنڈیشن کے فنڈ میں چوبیس ہزار ڈالر جمع ہو چکے تھے۔ اس رقم سے اسکول کے کمروں پر چھتیں ڈالی گئیں۔ کھڑکیاں اور دروازے بنوائے گئے۔ کتابیں خریدی گئیں۔ آج وہاں طلبا کی حاضری پینتالیس فی صد سے بھی متجاوز ہے۔

جب سارا نے پھیسے کا دوسرا دورہ کرنے کا ارادہ کیا تو اس نے اپنے اختیاری والدین سے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ ”سارا اپنے دونوں باپوں کو ایک جیسا پسند کرتی ہے اسی لیے اس نے ہماری آپس کی ملاقات کا سوچا۔“ جم کلبرٹن نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

جوزف کپاسودا بھی اس سے متفق تھا۔ ”میں کلبرٹن میاں بیوی کا ممنون احسان ہوں جو کچھ ہوا ہے اسے ایک بڑا... انعام ہی کہنا چاہیے۔“

جہاں تک سارا کا تعلق ہے تو اس نے یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ قدرت اس سے اتنا بڑا کام لے گی کہ اس کے ہاتھوں پسماندہ افریقا کا ایک تباہ شدہ گاؤں تعلیم کی روشنی سے منور ہونے لگے گا۔ وہ کہتی ہے۔ ”میں نہیں جانتی تھی کہ میں یہ سب کچھ کیونکر کر سکوں گی لیکن اب میں جو جانتی ہوں وہ یہ ہے کہ یہ میرا خاندان ہے۔“

شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر وکوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔ لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔

ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ سفر کہانی کا انیسواں حصہ

پری جمال کا رشتہ اس کے پھوپی زاد سے بچپن میں طے پاچکا تھا۔ وہ شروع سے ایک ساتھ پلے بڑھے تھے اور دلوں میں چاہت بھی گھر کر چکی تھی۔ یہ شکل کی بہت اچھی تھی اور پھوپی زاد بھی اس کے جوڑ کا تھا۔ وہ یہیں لاہور میں باپ کے ساتھ کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹاتا تھا اور مالی طور پر ان سے بہتر بھی تھا۔

پری جمال کی والدہ اس رشتے سے خوش نہ تھی لیکن اس کے پاس انکار کرنے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔

پھر کسی دور کے رشتے دار کی شادی میں پری جمال اپنی ماں کے ساتھ شریک ہوئی۔ وہاں ایک اور خاندان بھی شریک تھا جو اپنے امریکا میں مقیم لڑکے کے لیے کسی اچھی

خوب صورت لڑکی کی تلاش میں تھا۔ ان کی تلاش تب ختم ہوئی جب وہاں انہوں نے حسین ترین لڑکی پری جمال کا جمال دیکھا۔ لڑکے کی ماں نے پری جمال کی ماں سے فون نمبر اور گھر کا ایڈریس مانگا۔ اپنا تعارف کروایا اور پری جمال کی ماں کے ذہن میں ایک اور منصوبے نے جنم لیا امریکا میں کسی کا بیٹا ہو تو پاکستان میں اس کی ماں بہنیں اس کی شادی کے لیے پاکستان کی سب سے خوب صورت لڑکی تلاش کرتی ہیں۔ اس طرح سے پری جمال لڑکے کی ماں کی نظروں میں بھا گئی۔

لڑکی کی ماں کے دماغ میں یہ منصوبہ پروان چڑھ رہا تھا کہ اس کی بیٹی کی شادی امریکا میں مقیم لڑکے سے ہو جائے گی تو وہ دو طرح کے ہدف حاصل کر سکے گی ایک تو پری جمال کا رشتہ اس کے پھوپی زاد سے ختم ہو جائے گا اور دوسرا یہ کہ بہن اپنے بھائیوں کو امریکا بلوا لے گی۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہو جائیں گے۔ پری جمال کے والد نے آواز اٹھانے کی کوشش کی مگر اب تو لڑکے بھی اپنی لالچ میں ماں کے ساتھ مل گئے۔ پری جمال کی تو آواز ویسے ہی دب گئی جب والد بھی اپنے ہتھیار پھینک بیٹھا۔

کچھ عرصے بعد اس منصوبے پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ پھوپی زاد کے رشتے کو ٹھکانے لگانے کے لیے دو چار جھگڑے ہی کافی تھے۔ عید، شب برات کے کپڑوں میں نقص نکال کر واپس منہ پر مارنے سے بھی یہ رشتہ کمزور پڑ گیا اور باقی کے دو جھٹکے اس کو دولخت کر گئے۔ اب راستہ صاف تھا۔

لڑکے کو لڑکی کی تصویریں بھیجی گئیں۔ اس نے جھٹ پٹ لڑکی کو پسند کر لیا۔ ادھر لڑکی کی ماں اور بھائیوں نے یہ بھی نہ دیکھا اور نہ معلوم کیا کہ لڑکا امریکا میں کیا کرتا ہے اور اس کی اسٹیٹس کیا ہے۔ فون پر نکاح ہوا اور لڑکی اسکائپ پر رخصت ہو گئی۔ بہت مٹھائیاں بٹیں، لڑکی کی قسمت پر رشک کیا گیا۔ ایک بڑے ہوٹل میں دعوت دی گئی تو لڑکی کی ماں نے جھوم ڈالی کہ ایسی نیک بخت لڑکی اللہ ہر ایک کو دے۔

اب پری جمال اپنے گھر میں امریکا جانے کے لیے سہاگن بنی بیٹھی تھی۔ لڑکے نے بہانہ کیا کہ وہ چھٹی نہ ملنے کی وجہ سے پاکستان نہیں آ سکتا حالانکہ وہ سیاحتی ویزے پر امریکا میں آ کر ٹھہر گیا تھا۔ اس کے پاس امریکا میں کوئی اسٹیٹس نہ تھا۔ وہ امریکا چھوڑتا تو واپس داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ پری جمال کو امریکا بلوا بھی نہیں سکتا تھا۔ لڑکے نے کسی ایجنٹ کو دس لاکھ روپے دیے اور کسی اور کے پاسپورٹ پر فوٹو تبدیل کر کے لڑکی کو کینیڈا پہنچا دیا جہاں کینیڈا پہنچ کر ایک اور ایجنٹ نے دو ہزار ڈالر لے کر پری جمال کو امریکا کی بارڈر پار کروانی تھی مگر سوئی قسمت کہ وہ امریکیوں کے ہاتھ پکڑی گئی۔ انہوں نے اس کی فائل چیک کی تو معلوم ہوا کہ وہ کینیڈا بھی غیر قانونی طور پر غلط طریقے سے آئی ہے۔ انہوں نے اسے کینیڈین امیگریشن کے حوالے کر دیا اور انہوں نے کل اسے ہولڈنگ سینٹر میں بند کر دیا اور آج وہ بیٹھی مجھے اپنی کہانی رو رو کر سنا رہی تھی۔

اس کی کہانی جب ختم ہوئی تو رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ اسی دوران میں نے بریک بھی نہ لی تھی۔ بیوی نے ایک دو بار فون کر کے مجھ سے بریک کا پوچھا مگر میں نے انکار کر دیا۔ پری جمال کو اس کا کھانا کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔

میں نے اس سے کہا کہ تم یہ کھانا کھاؤ اور میں خود بریک روم میں بیٹھا سوچوں میں ڈوبا چائے پی رہا تھا۔ وہ مجھ سے مدد مانگ رہی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس کی مدد کیا یہ نہیں کہ اسے واپس پاکستان بھیج دیا جائے۔ مجھے یہ توقع امید تھی کہ امیگریشن کینیڈا والے بھی اس کے سامنے یہ امر رکھیں گے کہ یا تو وہ ڈی پورٹ ہو جائے یا پھر وکیل کی بھاری فیس ادا کر کے جج کے ہاتھوں ڈی پورٹ ہو۔ میں دل سے چاہتا تھا کہ وہ پھر سے اپنے پھوپی زاد کی ہو جائے۔ امریکا میں اس کا شوہر اسے بلوا نہیں سکتا اور اگر کسی طرح سے بلوا بھی لیا تو ساری عمر اس سے سپر اسٹوروں یا ریسٹورنٹ پر کام کروائے گا۔

میں نے چائے ختم کی اور دوبارہ اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے سامنے یہی تجویز رکھی اور کہا کہ اب بھی وقت ہے اس فراڈ سے باہر آ جاؤ۔ اس سے طلاق تم با آسانی لے سکتی ہو اور اپنی زندگی کو جہنم مت بناؤ۔

میں تو سمجھا تھا کہ اس کو سمجھانے پر مجھے بہت محنت کرنی پڑے گی مگر وہ تو پہلے ہی سے تیار بیٹھی تھی۔ وہ دل سے راضی تھی تو باقی کا کام میرے لیے آسان تھا۔ اس سے کہا کہ یہاں کے امیگریشن آفیسر کو صرف یہ کہنا کہ کسی بھی طرح اسے واپس پاکستان بھیج دیا جائے۔ اس کے علاوہ گھر پاکستان میں فون کر کے یہ بتانا کہ کس فلائٹ سے تم واپس آ رہی ہو۔ میں نے پری جمال کو نصیحت کی کہ گھر پہنچ کر ڈٹ جانا کہ اس سے طلاق لینی ہے یہ بھی اسے بتایا کہ یہ مطالبہ

کرنے سے پہلے اپنے پھوپی زاد سے بات کر لینا۔ ٹکٹ کے پیسے اس کے پاس تھے، مجھے دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس کی آنکھوں میں اب تشکر کے آنسو تھے۔

جب میں ڈیوٹی ختم کر کے واپس جارہا تھا۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور دعائیں دیں۔

اگلے ہفتے ہولڈنگ سینٹر پہنچا تو معلوم ہوا کہ پری جمال پچھلے منگل کو پاکستان واپس چلی گئی ہے۔

بے وفا کے تیور اور کینیڈا کا موسم ایک جیسا ہے۔ دونوں کو... بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ہم بہار کی ہواؤں سے لطف اندوز ہورہے تھے کہ ایک شام بادل گھر آئے۔ آسمان ڈھک گیا اور اندھیرا سا چھا گیا۔ پھر بارش ہوئی اور اگلی صبح تک ہوتی رہی۔ درجہ حرارت گر گیا اور بہار کی آمد ایک بار پھر موقوف ہوتی نظر آنے لگی۔ درجہ حرارت گرا تو دھند کے بادل زمین کی سطح پر اترنے لگے۔ ماحول دھواں دھار ہو گیا اور سرجی دوبارہ جاڑے کی آمد سے جھوم اٹھے۔ اپنی جیکٹس جو تہہ کر کے افسردہ دل سے اپنے بیگ میں رکھ چکے تھے دوبارہ سے نکال لی۔ شہباز پتھرائی نظروں سے سرجی کی حرکات دیکھ رہا تھا اور وہ اپنی جیکٹ کو سونگھ کر ین کو یاد کرتے جارہے تھے۔

شہباز سرجی سے مخاطب تھا۔ ''میری مایا اور تمہاری ین کو ندیم بھائی یا نسرین کی بددعا لگ گئی ہے۔ ورنہ وہ اتنی بے وفا بھی نہ تھیں۔''

سرجی شہباز سے بولے۔ ''بے وفا مایا نہیں بلکہ تم تھے جو اس کے اتنے بر کر کھا کر ڈکار بھی نہ لیتے تھے۔''

یہ صورتِ حال کسی جھگڑے کی جانب جانے ہی والی تھی کہ اچانک برف باری شروع ہو گئی۔ اپریل کی برف باری پر مفتی حیران تھا۔ میں نے حیرانگی کی وجہ پوچھی تو بولا۔ ''اس سال اپریل میں برف باری نہیں ہونی چاہیے تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟''

تو مفتی کی بجائے سرجی بولے۔ ''اپنے بہنوئی سے شرط لگائی ہوگی۔''

مفتی غصے میں آگیا اور اسی حالت میں چائے کا کپ ختم کر گیا اور پھر بولا۔ ''پچھلے سال اپریل میں برف پڑی تھی۔ اگر ایک سال پڑے تو دوسرے سال نہیں پڑتی۔''

سرجی نے مفتی کی بات سنی ان سنی کر دی اور باہر پڑی برف کو دیکھتے رہے۔ جس نے ساری زمین پر چند منٹوں میں ایک سفید چادر سی بچھا دی تھی۔ درخت بھی یہ لباس پہن کر مسکرا رہے تھے۔ عمارتیں سفید برف کی چادر میں کھڑی زیادہ دلفریب نظر آرہی تھیں۔

''کیا موسم ہے یہاں کا؟'' ابھی گرمی محسوس ہورہی تھی۔ اچانک بارش ہوئی تو ساری عمارتیں، سڑکیں اور پارک دھل گئے اور نئے نکور نظر آنے لگے۔ پھر برف باری نے منظر تبدیل کر دیا۔ قدرت نے سب دھو دھلا کر اسے سفید لباس پہنا دیا، ماحول نکھرا نظر آنے لگا۔ سب کو معلوم تھا کہ یہ موسم زیادہ دن رکنے والا نہیں ہے۔ چند دن کا مہمان اگر خوب صورت ہو تو بھلا محسوس ہوتا ہے۔

بدلتے موسم کس طرح سے انسان کے مزاج پر اثر انداز ہوتے ہیں، اس کا اندازہ پہلے بھی کئی بار ہوا تھا اور آج بھی ہو رہا تھا۔ برف کے نئے نظاروں سے بسورتے سرجی چہک رہے تھے اور چہکتا مفتی منہ بسورے بیٹھا تھا۔ برف کی سفید چادر مجھے میرے بچوں کے پاس لے آئی تھی اور شہباز پر نہ موسم اثر کرتا تھا اور نہ کل ورنگ، اس کا مزاج کھانوں کی خوشبو پر خوشگوار ہوتا اور کچن کے برتن دھونے پر سوگوار......

زندگی اپنے حسین اور دلکش پہلو دکھلاتے ہوئے آہستگی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اگر کچھ سخت موڑ بھی آئے تو وہ بھی یادگار لمحات میں بدل گئے۔ دکھوں کی چادر اوڑھے نہیں رکھی بلکہ اسی چادر میں قدرت کے رنگوں کے پھول بھرنے کی کوشش کرتا رہا۔

آج بیوی اور بچے بے انتہا یاد آرہے تھے۔ قندیل میری چار سالہ بیٹی اپنی توتلی آواز میں پوچھتی۔ ''بابا ہمارا ویزا کب آئے گا؟'' یہ الفاظ مجھے بے چین کر دیتے کہ اپنی بیٹی کو اپنے سینے سے لگا کر اس کے سر اور ماتھے کو بوسے دوں۔ اریبہ ابھی چند ماہ کی تھی اور نہ اپنے بابا کو پہچانتی تھی اور نہ بابا اس سے مانوس ہوئے تھے۔ میری شریکِ حیات سمیعہ بھی مجھ سے اس لیے لڑتی کہ میں خود مزے میں ہوں اور بھی مجھ پر ترس کھاتی کہ آپ کی کتنی مشکل زندگی ہے۔ وہ دونوں صورتوں میں مجھے اس لیے قبول تھی کیونکہ میں اسے چند سال پہلے تین بار قبول کر چکا تھا۔ اب وہی میرے لیے سب کچھ تھی۔

بچوں کی یاد نے دل پارہ پارہ کر دیا تھا۔ دل رو رہا تھا جدائی کھل رہی تھی لیکن کوئی چارہ نہیں تھا۔ ابھی اپریل کا مہینا تھا دوستوں کا اندازہ تھا کہ ویزا ملنے میں چھ ماہ لگ جائیں گے مگر مجھے یقین تھا کہ میری فیملی دو تین ماہ کے اندر پہنچ جائے گی۔ یہیں میرے پاس ہوگی۔ ان کا میڈیکل تو

بگ بینگ سے کائنات کیسے وجود میں آئی؟

انسان شاید اس دنیا کی وہ سب سے تجسس مخلوق ہے، جو ہر وقت نہ صرف اپنے ماحول بلکہ اس وسیع کائنات کی ہر شے کو کھوجنے، اس کی حقیقت جاننے کی جستجو میں لگا رہتا ہے۔ یہی کھوج اسے آج چاند ستاروں اور کروڑوں نوری سالوں کے فاصلے پر واقع کہکشاؤں تک لے گئی ہے۔ جو سوال ہمیشہ سے اس کے دماغ میں کلبلاتے رہے ہیں ان میں اول کائنات کے ان سربستہ رازوں کا حصول ہے جن میں سے کچھ سے پردہ اٹھایا جا چکا ہے اور بہت سوں کی کھوج ابھی باقی ہے۔ ہزاروں سال سے جاری سائنسی تحقیق، سوال و جواب اور دریافتوں کا سلسلہ اپنی جگہ، مگر آج سے تقریباً چار سو سال پہلے یورپ میں جو سائنسی انقلاب برپا ہوا، اس کی وجہ سے ہزاروں سال پرانے نظریے اور مفروضے غلط قرار پائے، وقت کے بہتے دھارے کے ساتھ فزکس میں نت نئے اصول وضع کیے گئے، اور ایسے آلات وجود میں آئے جن سے کائنات کی اصلیت اور ابتدا کو کافی حد تک سمجھنے میں مدد ملی۔ انسان آج بھی نت نئے طریقوں سے اس کوشش میں ہے کہ کائنات کی ایک جامع اور واضح تصویر عیاں ہو جائے "بگ بینگ" کا نام تو آپ نے سنا ہوگا، اور ہو سکتا ہے اس حوالے سے تھوڑا بہت پڑھا اور سنا بھی ہو، چلیے آج میں آپ کے سامنے اس کی واضح تصویر کھینچے دیتا ہوں۔ بگ بینگ انگریزی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی بڑے دھماکے کے ہیں۔ بگ بینگ دراصل وہ دھماکا ہے جس سے ہماری یہ کائنات وجود میں آئی ہے۔ اس نظریے کے مطابق کائنات کے وجود میں آنے سے پہلے تمام مادہ ایک سوئی کے ہزارویں حصے کے برابر نہایت خفیف جگہ میں قید تھا۔ اگر مادے میں بہت زیادہ توانائی ہو، دنیا کے کسی بھی ذریعے سے حاصل کردہ توانائی سے زیادہ، تو کشش ثقل یعنی گریویٹی چیزوں کو اپنی جانب کھینچنے کے بجائے ایک دوسرے سے دور دھکیلنے والی قوت بن جاتی ہے۔ چنانچہ سائنس کے مطابق بھی بگ بینگ کا وہ نکتہ آغاز تھا، جب تمام مادہ ایک دھماکے جیسی صورت حال کے بعد انتہائی تیزی سے ایک دوسرے سے دور ہونے لگا اور خلاء میں پھیل گیا۔ اس وقت اس کی رفتار اس قدر زیادہ ہونے کی وجہ سے یہ کائنات تیزی سے پھیلنے لگی۔ آج اس بگ بینگ، یعنی ہماری کائنات کے تشکیلی آغاز کو 13.8 کھرب سال ہو چکے ہیں۔ آپ میں سے اکثر لوگ یہ سوچیں گے کہ بھلا کائنات کی عمر کوئی کیسے بتا سکتا ہے؟ تو اس کا جواب ہمیں "ہبل خلائی دوربین" نے دیا ہے۔ اس دوربین کی مدد سے لی گئی تصاویر میں ہمیں جو سب سے پرانی کہکشاں ملتی ہے، وہ زمین سے 13.4 کھرب نوری سال دور واقع ہے۔ نوری سال 'دراصل وقت کا پیمانہ نہیں ہے بلکہ فاصلے کا پیمانہ ہے اور ایک نوری سال کا فاصلہ تقریباً 10 کھرب کلومیٹر کے برابر ہے۔ یہ فاصلہ روشنی ایک سال میں طے کرتی ہے۔ اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جہاں ایک نوری سال ہی 10 کھرب کلومیٹر کے برابر ہے تو 13.8 کھرب نوری سال کتنے کلومیٹر کے برابر ہوں گے۔ اگر ہم پیمائش کر سکیں کہ کسی دور دراز ستارے یا کہکشاں سے روشنی ہم تک آنے میں کتنے سال لگے ہیں، تو ہم اس طرح قدیم سے قدیم تر کہکشاؤں کا پتا لگا سکتے ہیں۔ اب تک ہم نے جس قدیم ترین کہکشاں کا مشاہدہ کیا ہے، وہ چوں کہ 13.4 کھرب نوری سال کے فاصلے پر واقع ہے، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ کائنات کی عمر اس کے آس پاس ہی ہے۔

سائنس کا کہنا ہے کہ 13.8 کھرب سال پہلے نہ یہ سورج تھا، نہ یہ ستارے، نہ یہ کہکشاں، نہ یہ نظارے، بلکہ صرف

میرے ہی ساتھ ہو گیا تھا۔ تمام کاغذات مکمل تھے ایمبیسی میں پہنچ چکے تھے۔ فیس بھی میں نے جمع کرا دی تھی۔ اب صرف پیپر ملنے تھے اور جیسے ہی پیپرز ملتے، میں ٹکٹ کنفرم کروا دیتا لیکن اس سے پہلے مجھے رہائش کا انتظام کرنا تھا جو ایک مشکل اور تھکا دینے والا مرحلہ تھا۔

یہاں اگر کسی کو کوئی چیز بیچنی ہو یا خریدنی ہو، کرائے پر لینی ہو یا دینی ہو تو وہ ایک کاغذ پر اشتہار بناتا ہے اور اسے مختلف بس اسٹاپ پر لگا دیتا ہے۔ اس اشتہار کے نیچے اپنے فون نمبر کی متعدد اسٹرپ بھی لگا دی جاتی ہیں غرض مند اشتہار دیکھ کر اسٹرپ پھاڑ لیتا ہے اور بعد میں اسی نمبر پر فون کے ذریعے رابطہ کرتا ہے۔ میری تین بجے ہیمو سال سے واپسی ہوئی۔ اپنی جاب سے واپس آتے ہوئے میرے دل میں خیال آیا اور میں اپارٹمنٹ کی بجائے گلائی مارکیٹ میں اتر گیا، مجھے کچھ گروسری کرنی تھی۔ اس دن سردی نے بدحواس کر دیا تھا۔ کبھی میں اپریل کے مہینے کو کوستا جس میں یہ سردی اُمڈ آئی تھی اور کبھی ٹورنٹو سے اپنی ناراضگی کا اظہار کرتا۔ گو میری یہ ساری آہ و بکا رائیگاں تھی مگر اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے میں لگاتار بڑبڑا رہا تھا۔

دھماکے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بڑے بڑے ہائیڈروجن گیس کے بادل تھے۔ خلاء میں موجود ان بادلوں کے جن حصوں میں ہائیڈروجن اور ہیلیئم کی مقدار زیادہ تھی، ان حصوں میں گیسز سکڑنے لگیں اور سکڑتے سکڑتے کئی گرم اجسام کی شکل اختیار کر گئیں جنہیں ہم "ستارے" کہتے ہیں۔ مزید برآں ان ستاروں کے آس پاس جہاں گیسز کی مقدار کم تھی، وہاں بھی گیسز سکڑتی گئیں اور گرم (ستاروں سے کم گرم) اجسام بنے جو ستاروں سے چھوٹے تھے، اور کسی اپنے سے بڑے نزدیکی ستارے کی بہت زیادہ کشش کی وجہ سے اس (ستارے) کے گرد مدار میں چکر لگانے لگے۔ ان اجسام کو ہم "سیارے" کہتے ہیں۔ کئی ستارے آپس کی کشش کی وجہ سے جھرمٹ کی شکل اختیار کر گئے اور اس طرح کہکشائیں وجود میں آ گئیں۔ ہمارا سورج اور زمین جس کہکشاں میں ہے اس کا نام "ملکی وے" ہے۔ اس کا نام ملکی وے اس لیے رکھا گیا ہے کیوں کہ اس کے بہت سے ستارے سفید نظر آتے ہیں، اس کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دودھ کی نہر یا راستہ "ہو "ملکی وے" کا اردو ترجمہ ہے دودھیا راستہ۔ جب زمین بنی تو اپنے محور اور سورج دونوں کے گرد بہت تیزی سے چکر لگا رہی تھی اور آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہوتی چلی گئی۔ زمین کی اپنی پیدائش کے وقت شکل بالکل ایسی تھی جیسے ہر جگہ آتش فشاں پھٹ رہے ہوں۔ لیکن جیسے ہی درجہ حرارت کم ہونے لگا تو زندگی بھی جنم لیتی گئی۔ تب نہ کوئی انسان تھا نہ جانور یہاں تک کہ سب سے چھوٹے جاندار یعنی بیکٹیریا تک کا وجود نہ تھا۔ لیکن تب بھی زمین پر ان سب کو جنم دینے والے عناصر یعنی معدنیات موجود تھے۔ پھر کیمیائی ارتقاء کا آغاز ہوا جس میں ان معدنیات کے چھوٹے خلیے ملے اور مالیکیولز بنے اور پھر ان لاکھوں مالیکیولز کے ملنے سے ایسے خلیے وجود میں آئے جو خود سورج کی روشنی استعمال کر کے اپنی خوراک بنانے کے قابل تھے اور ان میں سے ہر ایک کا ایک بنیادی اصول تھا کہ مرنے سے قبل ہر خلیہ ایک سے دو ہو جاتا، اس طرح ان کی تعداد بڑھتی رہی۔ یہ بیکٹیریا ایسے جاندار تھے جنہیں زندہ رہنے کے لیے آکسیجن کی ضرورت نہیں تھی، البتہ یہ خود آکسیجن پیدا کرتے تھے۔ چوں کہ ان کی تعداد کافی زیادہ تھی اس لیے زمین پر فضا میں آکسیجن کی مقدار بڑھنا شروع ہو گئی۔ فضا میں آکسیجن کی مقدار جیسے جیسے زیادہ ہوتی چلی گئی، ویسے ویسے کیمیائی ارتقاء (یعنی مادے سے خلیے بننے کا عمل) تھمتا گیا، یہی وجہ ہے کہ آج کوئی جاندار بے جان چیزوں سے نہیں بنتا۔ ارتقاء گھنٹوں، دنوں، یا سالوں پر محیط کوئی عمل نہیں ہے بلکہ یہ ایک طویل زنجیر ہے جس کی ایک ایک کڑی کے جڑنے میں صدیاں گزر جاتی ہیں۔ اب کیمیائی ارتقاء کے بعد حیاتیاتی ارتقاء یعنی چھوٹے جانداروں سے دوسرے بڑے جانداروں کے بننے کا عمل شروع ہوا۔ بیکٹیریا سے شروع ہونے والا ارتقائی عمل بہت سے خلیوں پر مشتمل جانداروں کی تشکیل کا سبب بنا، جن میں سب سے پہلے مچھلیاں پیدا ہوئیں، ان کے بعد یعنی خشکی اور تری دونوں میں رہنے والے جاندار (جن میں مینڈک بھی شامل ہے) بنے، پھر یعنی رینگنے والے جانور (جن میں چھپکلیاں، مگرمچھ وغیرہ شامل ہیں)، پھر پرندے، اور سب سے آخر میں ممالیہ جانور (بھیڑ، بکری، گائے، انسان وغیرہ شامل ہیں) بتدریج وجود میں آتے گئے۔ ان بھرپور معلومات اور تیز تر ٹیکنالوجی کے ذرائع میسر ہونے کے باوجود آج بھی انسان کائنات کے سربستہ رازوں کی گتھیاں مکمل طور پر سلجھانے سے قاصر ہے، کیوں کہ اس طویل ترین زنجیر کی کئی کڑیاں اب تک غائب ہیں۔

مرسلہ: ابو وسیم، ملتان

گروسری کرنے کے بعد میں بس اسٹاپ پر آیا تو متعدد خواتین و حضرات کپکپاتے ہوئے ایک دوسرے سے جڑے کھڑے تھے۔ دھند آسمان سے اتر کر میرے سر کے اوپر منڈلا رہی تھی جسم میں سرد لہر دوڑ رہی تھی۔ میں نے ذہن کا رخ موڑنے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا تبھی میری نظر ایک اشتہار پر پڑی جو بس اسٹاپ کے شیشے پر چسپاں تھا۔ کسی نے اپنے گھر کی بیسمنٹ (تہ خانہ) کرائے پر دینے کے لیے یہ اشتہار لگایا تھا۔ میرے سامنے سولہ منزلہ ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ تھی جس کا نام 20-ریڈ گریو تھا۔ اس کے پیچھے مکانات تھے اور وہ بیسمنٹ انہی مکانوں میں سے کسی ایک کی تھی۔ مجھے اپنی فیملی کے لیے رہائش کی ضرورت تھی اور بیسمنٹ کا کرایہ اپارٹمنٹ سے سستا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے میں نے اس اشتہار میں دلچسپی لی اور آگے بڑھ کر فون نمبر کی اسٹرپ پھاڑ لی۔ اس بیسمنٹ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ مڈل تک کا اسکول بالکل ساتھ تھا اور میرے بچے بہ آسانی اسکول آ اور جا سکتے تھے۔ اس وقت میرے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ میں اس بیسمنٹ کی بجائے سامنے 20-ریڈ گریو بلڈنگ کے چودھویں فلور پر

ایک بیڈروم کا اپارٹمنٹ لے لوں گا۔ خیر وہ تو آگے کی کہانی ہے۔ اس وقت تو میں اس بیسمنٹ میں دلچسپی لے رہا تھا۔

یہاں ہر گھر کی ایک بیسمنٹ ہوتی ہے جس کا دروازہ باہر سے بھی کھل سکتا ہے۔ ایک بیڈروم، کچن، ٹی وی، فریج اور باتھ روم کی سہولت ہر ایک میں ہوتی ہے۔ اگر بیسمنٹ راؤنڈ لیول پر ہو تو کوئی نہ کوئی چھوٹی سی کھڑکی باہر کی روشنی کے لیے کھلتی ہے ورنہ تازہ ہوا کی کوئی آمدورفت نہیں ہوتی۔ سردیوں میں زیادہ نمی کی وجہ سے بیسمنٹ سرد رہتی ہے۔ گوکہ ہیٹنگ کا نظام خودکار ہوتا ہے۔ پھر بھی ٹھنڈ جان کا عذاب جسم سے چپکی رہتی ہے بیسمنٹ میں رہنے والے لوگ تازہ ہوا کی نایابی کے باعث ہمیشہ مضمحل رہتے ہیں۔ الرجی کی شکایات بھی بہت ہوتی ہیں مگر کرایہ اپارٹمنٹ سے بہت کم ہوتا ہے تو لوگ شروع میں بیسمنٹ کو ترجیح دیتے ہیں۔

میں تھکا ہوا اور نڈھال سا اسٹرپ ہاتھ میں لیے اپنے اپارٹمنٹ پہنچا تو سرجی نے حسبِ معمول ایک دیگچا چولھے پر چڑھایا ہوا تھا اور اسے للچائی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے جیکٹ اتاری، گروسری سرجی کے حوالے کی اور تھکا ماندہ کارپٹ پر لیٹ گیا پھر سرجی سے بولا۔ ”جو لطف تھکاوٹ کے بعد اپنی جگہ پر لیٹنے میں ہے وہ کسی بڑے ہوٹل کے آرام دہ بستر پر بھی نہیں ہے۔“

سرجی کچن میں گروسری کے تھیلے کے اندر جھانکتے ہوئے بولے۔ ”تھکا ہوا اونٹ سرائے کو دیکھتا ہے۔“

میں نے ملتجیانہ لہجے میں ان سے درخواست کی۔ ”سرجی! قسم سے سر میں بہت سخت درد ہے خدا کے لیے آپ محاوروں کا بوجھ میرے ناتواں کندھوں پر مت پھینکیں۔“

وہ لہک کر بولے۔ ”نسرین سے ملنے جاتے ہو تو نہیں تھکتے اور ہمارے محاورے طبیعت پر گراں گزرتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”شرافت سے آپ کھانا بنائیں۔ پھر باہر کسی کام سے بھی جانا ہوگا۔“

باہر حملہ آور ہوتی سرد ہواؤں کو سرجی نے شیشے کے پار دیکھا پھر بولے۔ ”قسم سے موسم بہت سہانا ہو رہا ہے۔ میرا جی کررہا ہے کہ باہر گھوم آؤں۔“

میں نے حسرت بھری نظروں سے انہیں دیکھا پھر ڈونگا ہوا شاور لینے کے لیے باتھ روم میں داخل ہوگیا۔ پاگل پن کی ہزار ہا قسمیں ہوتی ہیں۔ پتا نہیں سرجی کس قسم کے پاگل پن کو گلے لگائے ہوئے تھے۔

گرم پانی کا شاور لینے سے روم روم میں تازگی بھر آئی تھی۔ باہر نکلا تو بشاشت سے کھلا پڑ رہا تھا جبھی شہباز پر نظر پڑی۔ وہ بھی جاب سے آرہا تھا۔ جب سے اس نے جاب شروع کی تھی اس کا چہرہ مضمحل ہوگیا تھا۔ لیکن ساتھ کپڑوں میں بہتری آگئی تھی۔ بقول سرجی کہ ان اچھے کپڑوں کے پیچھے راز یہ ہے کہ وہاں بہت سی ”مایا“ کام کرتی ہیں۔

میں نے بیسمنٹ کے لیے اسٹرپ پر دیے گئے نمبر پر فون ملایا۔ دوسری جانب افغانستانی لہجے میں آواز آئی۔ ”جی فرمائیں۔“ میں نیسی بول رہا ہوں۔ وہ بھی مجھے میری انگریزی کے لہجے سے پہچان گئے کہ میں پاکستانی ہوں۔ میں نے اپنا مدعا بیان کیا تو انہوں نے نہایت ادب اور خوش اخلاقی سے مجھے گھر آنے کا کہا تاکہ میں تہ خانہ خود دیکھ لوں۔ میں نے کچھ دیر میں آنے کی ہامی بھری اور فون رکھ دیا۔

سرجی تو پہلے سے تیار تھے مگر جب شہباز کو ساتھ چلنے کا کہا تو وہ ٹال مٹول کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بھی میری طرح تھکا ہوا آیا ہے مگر میں یہ چاہتا تھا کہ ایک کی بجائے تین رائے ہوں تو زیادہ مناسب رہے گا۔ میں نے شہباز سے کہا۔ ”تھوڑی دیر میں واپس آجائیں گے۔ تو بس منہ ہاتھ دھو لے۔“

وہ کراہ کر اٹھا اور منمنایا۔ ”کیا سیاپا ہے۔ نہ جاب پر چین اور نہ گھر میں سکون۔“

وہ ابھی مغموم کھڑا تھا کہ سرجی نے اپنا محاورہ پھینکا۔ ”ٹٹو کو کوڑا اور تازی کو اشارہ۔“

بس یہ سننا تھا کہ شہباز کے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی اور وہ سچ مچ کا شہباز نظر آنے لگا۔ اس نے لپک کر سرجی کو گردن سے پکڑ لیا اور بولا۔ ”یہ ٹٹو کون ہے اور تازی کیا ہوتا ہے۔“

اب سرجی کی پھنسی پھنسی آواز نکل رہی تھی اور اپنا مطلب سمجھا رہے تھے۔ ”بے وقوف کو مار مار کر تیار کیا جاتا ہے اور عقل مند کے لیے اشارہ بھی کافی ہے۔“

شہباز کو مطلب سمجھ میں آیا تو اس کی گرفت اور سخت پڑ گئی اور سرجی ہاتھ پاؤں چلانے لگے۔ اب میری مداخلت ضروری ہو چکی تھی۔ میں نے بمشکل سرجی کی گردن آزاد کرائی پھر شہباز کو پندرہ منٹ میں تیار ہونے کا کہا اور میں خود سب کے لیے چائے تیار کرنے لگا۔

ہم باہر نکلے تو سردی میں آرے جیسی کاٹ تھی ہم

جوش میں بغیر مفلر اور کیپ کے نکل آئے تھے گو کہ جیکٹ نے جسم ڈھانپ رکھا تھا پھر بھی میں سرہواؤں کی زد پر تھا۔ میں نے سوچا کہ واپس اپارٹمنٹ جا کر ٹوپیاں لے لی جائیں مگر معلوم نہیں کیا سوچ کر یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ سرجی نے ہلکا سا احتجاج ریکارڈ کروایا مگر شہباز کی ایک ہنکار کے سامنے وہ ڈری ہوئی بلی کی طرح دبک گئے۔ اس پرمستزاد یہ کہ ہم نے فیصلہ یہ کر ڈالا کہ پیدل گلاٹی مارکیٹ تک جاتا ہے جو کہ شاید ایک کلومیٹر سے ذرا ہی کم ہوگا۔ ہمارے پاس بس کا ماہانہ پاس بھی تھا مگر ہمیں اس ٹھنڈ میں بھی اٹھکیلیاں سوجھ رہی تھیں۔ ہم نے ہنستے مسکراتے بس اسٹاپ کو کراس کیا اور ٹورنٹو کے فریزر میں گھس گئے۔ یعنی کہ کھلے علاقے میں آگئے۔ کچھ دیر تو ہنسی مذاق میں معلوم بھی نہ پڑا کہ بلا کی ٹھنڈ ہے مگر جب آدھا راستہ طے کیا تو سر اور ماتھا آہستہ آہستہ ٹھنڈا ہونے لگا جیسے کوئی برف سے ٹکور کر رہا ہو۔ مجھے کچھ محسوس ہوا کہ ایسا کچھ ہو رہا ہے جو ٹھیک نہیں ہے مگر وقت کی ریت مٹھی سے پھسل چکی تھی۔ اب کچھ بھی ہو نہیں سکتا تھا۔ جبکہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دماغ اور ماتھے کے پیچھے جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ جمنے لگا ہے۔ پھر یوں لگا کہ میں چکرا کر گر پڑوں گا۔ یہ ایک واضح موت تھی جس کو ہم نے گلے لگا لیا تھا۔ شہباز اور سرجی جسم میں گرمی لانے کے لیے اچھل رہے تھے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا کہ شاید بھاگ کر بس اسٹاپ تک پہنچ جائیں گے مگر وہ بہت دور نظر آیا۔ گلاٹی والا اسٹاپ دیکھا تو وہ پیچھے والے سے بھی زیادہ دور نظر آیا۔ دائیں ہاتھ پر ایک کھلا پارک تھا جس کے بعد چند مکانات تھے اور پھر گلاٹی کے ساتھ جڑی ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ تھی۔ ہم بیچ منجدھار میں پھنس چکے تھے نہ آگے کے رہے تھے اور نہ پیچھے کے۔ کبھی بھاگنے لگتے اور جب کوئی افاقے کی صورت نہ نکلتی تو رک جاتے اور ہاتھوں سے سر کو ڈھانپنے لگتے۔

میں نے دیکھا، سرجی اور شہباز کی حالت بھی بہت بری ہے دونوں کے رنگ فق ہیں، بلاشبہ میرا بھی یہی حال تھا۔ شہباز کی کراہیں اور سرجی کے محاورے تک جم چکے تھے۔ میں بھی خوف زدہ بکری کی مانند اچھل کود کر رہا تھا۔ تاکہ جسم بھی کچھ گرم ہو جائے ہم سب کو اپنی اپنی جان کی پڑی تھی۔ آتی جاتی گاڑیوں کی توجہ بھی ہماری جانب نہ تھی کہ ذرا رک کر تین معصوم جانیں بچالیں۔ اب اندازہ ہو رہا تھا کہ ڈوبتے وقت ہر ایک کو اپنی جان کی کیسے پڑی ہوئی ہے۔ اب سوچتا ہوں کہ وہ کیسا اپریل تھا جو دسمبر کے کوڑے کی طرح ہم پر برس رہا تھا۔ یہ کیسی بہار تھی جس نے ہمارے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ اب ایک ہی صورت ہمارے سامنے بچی تھی کہ دماغ کو جمنے سے بچانے کے لیے پوری طاقت سے دوڑ لگا دی جائے۔ دماغ کا شور مان لیا۔

شہباز جس کو میں مذاق میں بے ڈول بیل کہا کرتا تھا، اس کی رفتار ہم سب سے تیز تھی۔ وہ آگے آگے دوڑ رہا تھا۔

کچھ چٹکلے کچھ باتیں

غالب کو آم بہت پسند تھے اس ضمن میں ان کی ایک مشہور نظم بھی ہے جو کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے

نامہ نہ کوئی یار کا پیغام بھیجئے
بس اس فصل میں بھیجئے تو آم بھیجئے

اس سے متعلق ایک لطیف زبان زد عام ہے کہ ایک دفعہ غالب مزے لے لے کر آم کھا رہے تھے کہ ایک دوست آ ٹپکا۔ غالب نے کہا حضرت آیئے آم کھایئے۔

دوست نے انکساری سے کہا۔ ”میں آم نہیں کھاتا۔“ اتفاق کی بات کہ سامنے گلی میں آوارہ گدھا فرش پر پڑے آموں کے چھلکوں پر منہ مار رہا تھا۔ کھا نہیں رہا تھا۔ دوست کو مذاق سوجھا تو گدھے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”دیکھئے آم تو گدھے بھی نہیں کھاتے۔“

غالب بلا کے حاضر جواب تھے جواب دیا۔
”واقعی گدھے آم نہیں کھاتے۔“

☆☆

ایک بار غالب کے ایک دوست جو کہیں باہر سے آئے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ غالب کہیں دعوت کھا کر واپس آ رہے تھے کہ ایک تنگ سے کوچے میں قدم رکھا تو گدھا نظر آیا۔ دوست کو مذاق سوجھا تو انہیں مخاطب ہو کر کہا۔ ”مرزا صاحب دلی میں گدھے بہت ہیں۔“

غالب نے برجستہ جواب دیا۔ ”باہر سے آجاتے ہیں۔“

حنیف ادیب۔ لاہور

سرجی بھی جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔ ایک بار تو ہانپتے ہوئے مجھے کراس کر کے آگے نکل گئے۔ یہ آگے پیچھے آگے پیچھے کودتے ہوئے دوڑ نا رنگ لایا اور ہم کسی نہ کسی طرح اس اپارٹمنٹ بلڈنگ پہنچ ہی گئے۔

بلڈنگ کے کوری ڈور میں پہنچتے ہی ایسا لگا جیسے حملہ آور سردی پسپا ہو گئی ہے۔ پھر بھی اس کا اثر باقی تھا۔ جسم کا ہر موئے تن منجمد ہو رہا تھا اسی لیے ہم سب ایک قطار میں فرش پر بیٹھ گئے۔ سب نے اپنا اپنا سر پکڑ رکھا تھا۔ ہمارے دماغوں کی قلفی بنتے بنتے رہ گئی تھی۔

سرجی نے زمین کے ساتھ لگی ڈک سے خارج ہوتی حرارت کے سامنے اپنا ماتھا ٹیک دیا تھا۔ شہباز اور میں اف اف کہتے ہوئے ہتھیلی سے سر رگڑ رہے تھے تا کہ کچھ حرارت کھوپڑی کے اندر پہنچ جائے۔ لابی سے گزرتے لوگوں نے ہمیں حیرت سے دیکھا پھر بغیر کچھ کہے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گئے۔ کسی نے حال تک نہ پوچھا۔

سب سے پہلے سرجی نارمل ہوئے۔ اس کا اندازہ ہمیں اس طرح ہوا کہ ان کے صحیح و سالم دماغ سے ایک محاورہ نکلا۔ ''آج تو تمہاری حالت ایسی ہے کہ جیسے تین ٹانگ کا گدھا اور نوٹن کا بوجھ۔''

میں سمجھ گیا کہ صرف سرجی نارمل ہو گئے ہیں پھر اس کی دیکھا دیکھی شہباز بھی واپس شہباز بن چکا تھا وہ گدھے پر اڑ گیا اور ایک نئی تکرار شروع ہو گئی کہ یہ گدھا کس کو کہا گیا ہے۔

سرجی اپنی اور میری جانب اشارہ کر رہے تھے لیکن جب میں نے گھورا تو شہباز کو بھی اس حلقے میں شامل کر لیا۔ بار بار مطلب پوچھنے پر یہ بتایا کہ اپنی اوقات سے زیادہ مشکل کام میں ہاتھ ڈالنے پر یہ محاورہ بولا جاتا ہے۔

اب سوال یہ تھا کہ باہر کیسے نکلا جائے کیونکہ سڑک پر سردی کا بدمست ہاتھی آوارہ پھر رہا تھا۔ گلائی اسٹور میں سپر مارکیٹ میں آخری شاپ ہائی وے اسٹور کی تھی جہاں سے دو دو ڈالر میں ہر سامان مل جاتا تھا۔ ان کے پاس گرم ٹوپیاں اور مفلر بھی تھے۔ سرجی اور شہباز دونوں نے میرے کھاتے سے یہ اشیا خرید لیں پھر ٹوپیاں مفلر پہن کر شیشے میں خود کو بار بار دیکھا اور مطمئن ہو کر میری جانب دیکھا کہ ادائیگی کر دوں۔ میں اس وقت اپنی خریدی ہوئی کیپ درست کر رہا تھا۔ فوراً جیب سے رقم نکالی اور ادائیگی کر دی پھر مطمئن ہو کر باہر نکل آئے۔

20-ریڈ گریو ڈرائیو کو کراس کر کے اس کی پارکنگ میں آئے۔ اس بلڈنگ کی وسیع پارکنگ کے عقبی حصے میں تھی۔ پارکنگ کو عبور کیا اور کھلے حصے میں آگے اس طرف یہاں سے وہاں تک چھوٹے چھوٹے مکانات تھے جو سڑک کی دونوں جانب دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ لوگ گھروں میں دبکے ہوئے تھے کیونکہ باہر سردی کا تازیانہ لہرا رہا تھا۔ خاموشی چھائی تھی۔ میرے پاس مکان کا نمبر تھا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے آگے بڑھتے ہوئے مجھے دائیں جانب سفید رنگ کا ایک چھوٹا سا گھر نظر آیا جس کے دروازے پر وہ نمبر چسپاں تھا۔ میں نے ڈور بیل پر ہاتھ رکھ کر ہٹایا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک شخص برآمد ہوا۔

درمیانہ قد، کمزور جسم، ہلکے سیاہ بال اور آنکھوں پر نظر کا چشمہ۔ یہ نعیمی صاحب تھے اس گھر کے مالک۔ رنگ ان کا سرخ تھا اور چہرے پر مسکراہٹ، اپنائیت تھی۔ ہمارے چہروں سے سردی کا اثر جھانک رہا تھا۔ شاید اسی لیے انہوں نے فوراً دروازہ کھول کر ہمیں گھر کے اندر آنے کی دعوت دی۔

ہم نے دعوت اس طرح سے قبول کی کہ اگر وہ راستے سے نہ ہٹتے تو ہم انہیں دھکا دے کر گھر میں گھس جاتے ہماری حالت ہی کچھ ایسی تھی کہ ہم سردی کے مارے کسی آرام دہ اور گرم گھر کے متمنی تھے۔

یہ گھر دو منزلہ تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی ہم لیونگ روم میں کھڑے تھے۔ جہاں صوفے رکھے تھے۔ فرش پر افغانی قالین بچھا تھا اور دیوار کے ساتھ ایک بڑا ٹی وی بند پڑا تھا۔ لیونگ روم کے بعد ایک کچن تھا اور ساتھ ایک کمرا نظر آتا تھا۔ سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں اور بقول نعیمی صاحب وہاں تین کمرے اور ایک باتھ روم تھا۔ وہی سیڑھیاں ذرا گھوم کر نیچے بیسمنٹ میں بھی جا رہی تھیں اور ایک بند دروازے پر ان کا اختتام ہو رہا تھا۔ ہمیں صوفوں پر بٹھا کر نعیمی صاحب اپنے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کچن کی جانب نکل گئے۔ اس وقت ہمیں ہر بات ناگوار لگ رہی تھی اسی لیے آنکھیں بند کر کے ہم سب نے صوفے سے سر ٹکا دیا تھا۔ کچھ دیر بعد ہم حواسوں میں آئے تو سر اٹھا کر کبھی چھت کو دیکھتے اور کبھی دیوار پر لگی پینٹنگ کو اور پھر ایک دوسرے کی جانب مطمئن نظروں سے دیکھ کر سر جھکا لیتے۔ کچھ ہی دیر بعد نعیمی صاحب کچن سے برآمد ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں ٹرے تھی اور ٹرے میں گرم چائے سے بھرے بھاپ اڑاتے کپ تھے۔ قریب

پہنچتے ہی انہوں نے ٹرے کو میز پر رکھا، ہمیں مسکراہٹوں سے نوازا اور بدلے میں ہم سب ایک ساتھ مسکرائے۔ ہمارے مسکرانے پر وہ بے تحاشا مسکرائے اور دوبارہ کچن کی طرف چل دیے۔

سرجی نے کپ اٹھایا، گھونٹ بھرا اور ماشاء اللہ کہہ کر کپ دوبارہ میز پر رکھ دیا پھر فرمایا۔ ''لگتا ہے اب کھانا لینے گئے ہیں۔''

شہباز بولا۔ ''یہ کھانے کا وقت نہیں ہے۔ شاید جلیبیاں لے آئیں۔''

''سردیوں میں گرم چائے کے ساتھ ٹھنڈی جلیبیاں خوب مزہ دیتی ہیں۔ دماغ کو طاقت بھی دیتی ہیں۔'' سرجی بولے۔

اتنے میں نعیمی صاحب ایک اور ٹرے اٹھا کر لے آئے جس میں پلیٹیں تھیں اور پلیٹوں میں بسکٹ، کشمش اور قیمے کے کباب تھے۔ کبابوں کی شکل تو ہم نے سالوں سے نہیں دیکھی تھی۔ اسی لیے ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ شہباز تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''سر یہ آپ نے بہت زیادہ تکلف کرلیا ہے۔''

سرجی کشمش کا ایک دانہ منہ میں رکھ کر بولے۔ ''اتنا زیادہ تو ہم کھا بھی نہیں سکتے۔''

''کباب بھابی نے بنائے ہیں؟'' میں نے پوچھا تو مسکراہٹ کو زیادہ پھیلا کر وہ بولے۔

''دراصل بیگم جاب سے ابھی واپس نہیں آئی ہیں اس لیے فریج میں جو کچھ ملا لے آئے۔'' وہ صاف اور شستہ اردو بول رہے تھے کیونکہ کینیڈا آنے سے قبل وہ اسلام آباد میں کئی سال گزار چکے تھے۔

افغانستان میں فارسی بولتے تھے اور یہاں انگریزی۔ اردو سن کر ہم نہال ہو رہے تھے کہ انہوں نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ''دراصل بیگم ایک فیکٹری میں کافی پیک کرنے کی جاب کرتی ہیں۔''

شہباز نے پوچھا۔ ''آپ کیا جاب کرتے ہیں؟'' تو جواب دیا:

''مسز ابھی آتی ہی ہوں گے۔''

سرجی یہ سن کر کشمش کا ایک اور دانہ چباتے چباتے رک سے گئے۔ سوال گندم اور جواب چنا کیا ہوتا ہے وہ آج مجھے معلوم ہو رہا تھا۔ ایک دو بار شہباز نے کباب کھاتے کھاتے دوبارہ کریدا تو وہ جواب دینے سے گریزاں نظر آئے۔ میں نے شہباز کو اشارہ کر کے خاموش کر دیا۔

اتنے میں سرجی نے کباب اٹھایا۔ سونگھا اور پھر کتر کتر کر کھانے لگے۔ تبھی آٹھ سال کی پیاری سی بچی سیڑھیوں پر سے بھاگتی ہوئی نیچے اتری۔ ہمارے پاس آکر سلام کیا۔ ہم نے مسکرا کر جواب دیا۔ شہباز نے ہاتھ ملانے کے لیے اپنا بازو آگے بڑھایا تو بچی خاموش کھڑی رہی۔ شہباز کا ہاتھ فضا میں ہی بلند رہ گیا۔ لڑکی نے کہا کہ میں کسی غیر اور اجنبی سے ہاتھ نہیں ملاتی۔ یہ کہہ کر وہ دوبارہ بھاگتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

شہباز نے اِدھر اُدھر دیکھا اور سب کو متوجہ پایا تو شرمندہ ہو کر زرد تر ہونے لگا۔ میں نے بات کا رخ بدلا اور نعیمی صاحب سے کہا۔ ''آپ نے ہمیں اتنا سارا کھلا دیا ہے۔ اب تو آپ ہمیں بیسمنٹ کا راستہ بھی دکھا دیں۔''

یہ سن کر نعیمی صاحب خوش ہو گئے اور بولے۔ ''ابھی ٹرے کچن میں رکھ کر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ جلدی سے اٹھ گئے۔

میں سمجھ رہا تھا کہ یہاں بھی پاکستان کی طرح کرائے دار کو مالک مکان کی منت سماجت کرنی پڑتی ہوگی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہاں کرائے دار کی وقعت مالک مکان سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ مالک مکان کرائے دار کو اپنے حسن سلوک سے متاثر کرتا رہتا ہے کیونکہ کرائے پر لینے کے لیے کئی اپارٹمنٹ بلڈنگ موجود ہیں۔ دس سے تیس منزلہ بڑی بڑی عمارتوں میں اپارٹمنٹ خالی ہوتے رہتے ہیں۔ کرایہ دار کو کسی مالک مکان کے نخرے اٹھانے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ اگر کوئی کرایہ دار اپارٹمنٹ کا کرایہ برداشت نہ کر سکتا ہو تو وہ بیسمنٹ کا رخ کرتا ہے اور جیسے ہی اس کی جیب اجازت دیتی ہے تو وہ بیسمنٹ چھوڑ کر اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیتا ہے۔ اسی طرح سے مالک مکان کو دوبارہ بیسمنٹ کے لیے نئے کرایہ دار کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ مالک مکان کو ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں کرایہ دار بیسمنٹ چھوڑ کر چلا نہ جائے۔ بیسمنٹ کو کرایہ پر اٹھانا اس لیے بھی ضروری پڑ جاتا ہے کہ برصغیر اور مڈل ایسٹ کے مالک مکان گھر کی سالانہ قسط ادا کرنے کے لیے کرایہ دار پر سارا انحصار رکھتے ہیں جیسے نعیمی صاحب تھے انہوں نے دو لاکھ کا گھر لے لیا تھا جس کی اٹھارہ سو ڈالر ماہانہ قسط تھی۔ وہ آٹھ سو پر بیسمنٹ کرائے پر دے دیتے تھے اس طرح ان کی جیب سے صرف ایک ہزار ڈالر جا رہے تھے۔ بیوی اور وہ کما کر دو ہزار ڈالر لاتے تھے۔ اگر بیسمنٹ کا کرایہ نہ ملے تو گھر کے دیگر

اخراجات پر اثر پڑتا تھا یوں سمجھیں کہ پورا مہینا مشکلات کا شکار ہو جاتا۔

نعیمی صاحب ٹرے رکھ کر فوراً واپس آ گئے۔ ہمیں ایک اعزاز سے اٹھایا اور ہم ان کے پیچھے پیچھے لیونگ روم سے نیچے جاتی ہوئی سیڑھیاں اتر گئے۔ سامنے دروازہ آیا جسے انہوں نے نہایت آہستگی سے کھولا اور ہم ان کے پیچھے بیسمنٹ میں اترے۔

جہاں ہم موجود تھے اس کو لیونگ روم کہا جاتا ہے۔ بیس بائی تیس فٹ چوڑا ایک کمرا تھا جس میں کوئی کھڑکی نہ تھی۔ روشنی اور ہوا کا واحد ذریعہ وہ دروازہ تھا جو کچھ سیڑھیاں چڑھ کر باہر کی جانب کھلتا تھا۔ یہاں سردی کچھ زیادہ تھی۔ دائیں ہاتھ پر ایک چھوٹا سا کچن تھا جس میں اسٹوو، فریج اور مائیکرو ویو موجود تھے۔ ساتھ میں ایک باتھ روم تھا۔ لیونگ روم کے پیچھے ایک کمرا اور تھا جس کو بیڈ روم کہا جا سکتا ہے اس میں ایک عدد الماری تھی۔ بیڈ روم میں ایک ڈبل بیڈ بمع میٹرس پڑا تھا۔

نعیمی صاحب کہہ رہے تھے کہ یہ بھی کرائے میں شامل ہوگا۔ یہ جگہ ایک ایسے مقام پر تھی جہاں سے شمال جنوب اور مشرق مغرب کی بسیں بہ آسانی مل جاتی تھیں۔ ڈاؤن ٹاؤن جانے کے لیے مشرقی سمت کی بس سے ڈیڑھ گھنٹے میں ڈاؤن پہنچا جا سکتا تھا۔ یہ معلومات بھی نعیمی صاحب دے رہے تھے۔

ہم کمرے کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ اوپر کی ڈور بیل بجی اور نعیمی صاحب دروازہ کھولنے اوپر چلے گئے۔ میں نے شہباز اور سرجی کی جانب ان کی رائے جاننے کے لیے دیکھا۔ وہ میری نظروں کا مطلب جان گئے۔ شہباز بولا۔ ”اتنا کھلایا پلایا ہے تو بیسمنٹ لینی ہی پڑے گی۔“

سرجی نے اپنی رائے دی۔ ”کہیں شرم شرم میں کام ہی تمام نہ ہو جائے۔“

میں ان دونوں کی قیمتی رائے سے مستفیض ہونے کے بجائے تلملا اٹھا۔ اس سے پہلے میں کچھ بولتا نعیمی صاحب آ گئے۔

میں نے بیسمنٹ کی تعریف کی اور پھر کرائے کی بابت پوچھا۔ انہوں نے انکساری سے آٹھ سو ڈالر بتایا۔ میرے خیال میں یہ مناسب تھا مگر میں نے فوری طور پر کوئی بھی فیصلہ کرنے سے احتراز کیا۔ نعیمی صاحب سے کہا کہ دو چار دن میں بتا دوں گا۔ وہ کہنے لگے کہ میرے پاس دوسرے لوگ بھی آ رہے ہیں اور جو بھی فیصلہ کرنا ہے آج ہی کر لوں۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بزرگ فرماتے ہیں کہ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔“

اس جواب پر وہ سر ہلا کر رہ گئے۔ میں نے وعدہ کیا کہ دو چار دن میں ضرور بتا دوں گا پھر ہم نے گرم جوشی سے ہاتھ ملائے اور 20-ریڈ گرد یو اپارٹمنٹ بلڈنگ کے سامنے والے بس اسٹاپ پر آ کھڑے ہوئے۔

آتے وقت پیدل چلنے کے تجربے نے جو گت بنائی تھی، واپسی پر ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

موسم ابر آلود تھا دھند نے ریڈ گریو بلڈنگ کا اوپری حصہ اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ فضا نمناک تھی اور ہم جلد از جلد اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچنا چاہتے تھے۔ سرجی کی نظریں 20-ریڈ گریو بلڈنگ کے اوپر دھند پر جمی تھیں۔ کچھ دیکھنے کے بعد سوچ کر بولے۔ ”ہر اپارٹمنٹ کی یہاں بالکونی بھی ہے اور لوگوں نے اپنا سامان بھی رکھا ہوا ہے۔“

میں نے دیکھا کسی بالکونی میں سائیکل کھڑی تھی تو کسی میں کرسیاں پڑی تھیں اور گھریلو سامان رکھا ہوا تھا۔ جیسے گھر کا کوئی اسٹور ہوتا ہے سرجی بولے۔ ”بیسمنٹ لینے سے پہلے یہاں اپارٹمنٹ کا کرایہ بھی معلوم کر لو۔ شاید کرایہ مناسب ہو۔“

بات ان کی ٹھیک تھی۔ اگر اپارٹمنٹ کا کرایہ پچاس یا سو ڈالر زیادہ بھی ہوتا تو بھی مناسب تھا۔ محل وقوع بھی ایک ہی تھا۔ سامنے گلائی اسٹور سڑک کے پار تھا۔ اسکول اور پارک بازو میں تھے۔ اپارٹمنٹ بیسمنٹ سے کافی کشادہ ہوتا ہے۔ سرجی کا مشورہ مناسب تھا۔ ان کے مشورے پر میں اگلے تین سال تک اسی بلڈنگ میں رہا بعد میں سرجی بھی یہاں شفٹ ہو گئے تھے۔

ہم وہاں سے نکلے تو سیدھے اپنے اپارٹمنٹ پہنچے۔ مفتی کے ساتھ خان اور مطیع اللہ بھی موجود تھا۔ جیسے ہی ہم اندر داخل ہوئے مطیع اللہ تکبیر تکبیر کہتا اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ”تم ان دونوں کو لے کر کہاں گئی تھی؟“

خان قیصر بھی پوچھنے لگا کہ سردی میں کہاں مارے مارے پھر رہے ہو۔ ان کو بیسمنٹ کی بابت بتایا تو خان پھر گالیوں پر اتر آیا کہنے لگا۔ ”بچوں کو بیسمنٹ میں رکھو گے، کیا انہیں بیمار کرنے کا ارادہ ہے؟“

وہ کہنا چاہ رہا تھا کہ وہاں تازہ ہوا کی آمد و رفت نہیں ہوتی۔ زیادہ نمی کی وجہ سے جراثیم زیادہ ہوتے ہیں اور ہر

وقت الرجی کی شکایت رہتی ہے۔ مفتی خاموش تھا مگر مطیع اللہ بڑی دانشمندی سے خان کی باتوں پر اپنا سر ہلا رہا تھا۔

شہباز، مطیع اللہ سے پوچھنے لگا۔ ''تم تو ایسے خان کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہو جیسے بیسمنٹ میں رہنے کا بڑا تجربہ ہے۔''

مطیع اللہ نے چہرے پر ایسے سنجیدگی طاری کرلی جس طرح آج کل کسی ٹاک شو میں سیاست دان طاری کر کے بیٹھا ہوتا ہے۔ شہباز کی بات پر بولا۔ ''منطق کے لیے تجربے کی نہیں، عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔''

میں نے ارادہ پختہ کرلیا کہ پہلی فرصت میں اپارٹمنٹ بلڈنگ (20-ریڈ گریو) جا کر معلومات لوں گا۔

باہر سردی بڑھ رہی تھی۔ خان قیصر جب بھی بور ہوتا تو گپ لگانے آجایا کرتا تھا۔ مطیع اللہ بہت دنوں بعد آیا تھا۔ میں پوچھ بیٹھا کہ اتنی سردی میں تم کہاں مارے مارے پھر رہے ہو۔ جواب میں وہ بولا۔ ''یہیں سے گزر رہی تھی تو سوچا کہ چکر لگالوں۔''

میں نے کہا۔ ''خان صاحب! ٹھیک ٹھیک بتاؤ، ماجرا کیا ہے؟'' دراصل میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ کہیں قریب سے گزر رہا تھا اور ہم سے ملنے آگیا۔ یہ کوئی چھوٹا سا شہر نہیں کہ کوئی آپ کے آس پاس ہی رہتا ہو۔ میں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ ہیموسال میں جاب ہوگئی ہے۔''

میرے سوال پر سب کے کان کھڑے ہوگئے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کی جاب ہوگئی ہے اور وہ یہاں شفٹ ہونے کی بات کرنے آیا ہے۔ میرے سوال پر مطیع اللہ مسکرایا اور بولا۔ ''ہاں ان کا کوئی لیٹر وغیرہ تو آیا تھا۔''

وہ اب بھی کھل کر بات نہیں کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''ہیموسال کب جوائن کر رہے ہو؟''

وہ ہنس پڑا اور بولا۔ ''سوچ رہا ہوں کہ اگلے ہفتے جوائن کرلوں۔''

اس بات پر مفتی کے علاوہ سب اسے مبارک باد دینے لگے۔ مفتی فق پڑ چکا تھا۔ اسے صاف نظر آرہا تھا کہ اب مطیع اللہ بھی بوریا بستر لے کر یہاں شفٹ ہوجائے گا۔

مطیع اللہ ہمیشہ بات ادھوری کرتا ہے جسے آپ کو خود مکمل کر کے کوئی نہ کوئی مطلب نکالنا پڑتا ہے۔ مجھے خوشی تھی کہ آخرکار اس کی جاب کسی اچھی جگہ ہوگئی ہے۔ ہم ایک کمرے میں تین بندے تھے۔ اس کی گنجائش بہت کم تھی۔

لیونگ روم میں مفتی کسی اور کو برداشت نہیں کرتا تھا مگر مطیع اللہ کو صاف جواب دینا بھی آسان نہ تھا۔

خان مفتی کو چڑ جانے کے لیے بولا۔ ''یہ بے چارہ دو گھنٹوں کا سفر کر کے ہیموسال تو جا آنہیں سکتا یہیں کہیں کونے میں پڑا رہے گا۔''

مطیع اللہ نے پوری طرح سے اپنے آپ کو مصنوعی سنجیدگی میں جکڑ رکھا تھا، خان کی بات پر اس کی زبان حرکت میں آئی اور بولا۔ ''خان بالکل ٹھیک کہتی ہے۔ ہم تو تکیہ لے کر میز کے نیچے بھی سو جائے گی۔''

خان قہقہہ لگا کر بولا۔ ''خان کہتا ہے، کہتی نہیں ہے۔''

مطیع اللہ بولا۔ ''یہی تو کہہ رہی تھی کہ خان ٹھیک کہتی ہے۔'' اس پر مفتی بھی ہنس پڑا۔

مفتی مجھے، شہباز اور سرجی کو صلاح مشورے کے لیے کمرے میں لے آیا۔ پہلے بغور کمرے کو دیکھا اور پھر بولا۔ ''یہ کمرا تو تین کے لیے بھی کم ہے اور مطیع اللہ کہاں سوئے گا۔''

میرے ذہن میں فوراً ایک جھماکا ہوا۔ میں نے مفتی کی دکھتی رگ پکڑلی تھی کہ وہ لیٹ نائٹ شو دیکھنے کا شوقین ہے اور کبھی کبھار منہ کا اور دماغ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کلب کوک پینے بھی جاتا رہتا ہے۔ میں نے اسی خانے میں مطیع اللہ کو فٹ کرنے کا اچانک سے فیصلہ کرلیا اور مفتی سے بولا۔ ''مطیع اللہ شوقین مزاج پٹھان ہے۔ رات گئے لیٹ نائٹ شو بڑے شوق سے دیکھتا ہے۔ کبھی کبھار دیر سے گھر آتا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے مفتی کے چہرے کا جائزہ لیا تو میری بات میں خاصی دلچسپی لے رہا تھا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی اور بولا۔ ''وہ تو چند گھنٹے ہی سوتا ہوگا۔''

مفتی اب غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے آخری پتا پھینکا۔ ''تم کہتے ہو تو اسے منع کر دیتے ہیں اور ویسے ہم اس کے گناہوں میں کیوں شریک ہوں۔''

شہباز اور سرجی دلچسپی سے میری بات سن رہے تھے۔ شہباز مسکرا رہا تھا اور سرجی بات سمجھنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہے تھے۔ اتنے میں مفتی بولا۔ ''یہ اچھا بھی تو نہیں لگتا کہ اس کو سیدھے منع کر دیں۔ آخر پاکستانی ہے اور ماشاء اللہ مسلمان بھی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مگر اس کی عادات......''

میری بات کاٹ کر مفتی بولا۔ ''آدمی کو اللہ راہ راست پر لے بھی آتا ہے۔'' اور یہ کہتے ہوئے مفتی تیزی

سے باہر نکل گیا۔ مفتی کے جاتے ہی شہباز، سرجی سے بولا۔ ''ندیم بھائی نے اسے یہاں رکھنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

ہم کمرے سے باہر لیونگ روم میں آئے تو مفتی، مطیع اللہ سے کہہ رہا تھا۔ ''آپ کو انکار بھی نہیں کرسکتا بس آپ کو گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانا ہوگا۔''

مطیع اللہ بڑی سنجیدگی اور متانت سے بولا۔ ''گھر کے کام تو میں سب کرلیتی ہوں اور روٹیاں بھی بنالیتی ہوں۔''

میں مطیع اللہ کی سنجیدگی کے پیچھے چھپی چالاکی کو سمجھ رہا تھا۔ مفتی نے بات فائنل کرتے ہوئے کہا۔ ''تو ٹھیک ہے تم کل سے شفٹ ہوجاؤ۔''

مطیع اللہ بولا۔ ''وہ تو میں آج سے ہی ہورہی ہوں۔ سامان کل میں اور آپ اٹھا کرلے آئیں گے۔''

اس بات پر مفتی فق چہرے کے ساتھ مجھے دیکھنے لگا اور میں منہ پھیر کر کھڑا مسکراتا رہا۔

رات میں ٹھیک سے نہ سو سکا کیونکہ اب شہباز کے خراٹے، سرجی کی سیٹیاں اور اس کے ساتھ اب مطیع اللہ کی تمام جانوروں کو ملا کر بنی کسی نامعلوم آواز نے ایک سمفنی جاری کردی تھی۔ میں نے اپنا تکیہ اور کمفرٹر اٹھایا اور باہر لیونگ روم میں آکر لیٹ گیا جہاں مفتی اپنے لیٹ نائٹ شو کے شغل میں مشغول دیدے پھاڑے ٹی وی کو دیکھ رہا تھا۔

ایک دن میں ہیمو سال سے 3 بجے سہ پہر نکلا اور بس سے 20-ریڈ گریو ڈرائیو اپارٹمنٹ کے سامنے کچھ معلومات لینے کے لیے اترا۔ بلڈنگ کے سامنے بہت بڑا لان تھا جو مارٹن گرو روڈ تک پھیلا تھا۔ گو گھاس ابھی تک مرجھائی پڑی سو رہی تھی مگر اندازہ تھا کہ گرمیوں میں یہ لش گرین ہوکر سر اٹھائے گی۔ لان میں سرو کے متعدد پودے اور چیڑ کے درخت ایستادہ تھے۔ یہاں کسی بس یا کار کو ہارن بجانے کی اجازت نہیں اسی لیے شور بلڈنگ تک بالکل نہیں آتا۔ یہاں گاڑیوں کی ہر سال انسپکشن ہوتی ہے کہ آیا کوئی انجن شور تو نہیں کرتا یا دھواں تو نہیں چھوڑتا۔ کسی میں ایسی خامی ہو تو وہ گاڑی بند کردی جاتی ہے۔ اسی لیے کسی گاڑی کا بے تحاشا شور یا دھواں آپ کو کسی روڈ پر نہیں ملے گا۔ ٹورنٹو یا کسی بھی مغربی شہر کی صاف وشفاف آب وہوا کی ساری وجہ بھی یہی ہے کہ علاقے کی فضا کو ہر قسم کی کثافت سے پاک رکھا جاتا ہے۔ میں نے اپارٹمنٹ کا مرکزی دروازہ کھولا اور ایک لابی میں کھڑا تھا جس کے آگے کا دروازہ لاک تھا۔ اندر جاتے لوگ جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولتے اور داخل ہو جاتے میں نے شیر کے آفس کا پوچھا تو ایک دیسی بندے نے کہا کہ پیچھے پارکنگ سے اندر آنے کا دروازہ کھلا ہوگا۔ میں گھوم کر بلڈنگ کے پیچھے اس پارکنگ میں آیا جہاں سے ہم گزر کر نیسی صاحب کے گھر بیسمنٹ دیکھنے کے لیے گئے تھے۔ بلڈنگ کے نیچے ایک چھوٹا دروازہ کھلا تھا اور وہاں سے آمدورفت جاری تھی۔ میں نے کئی پاکستانیوں کو آتے جاتے دیکھے۔ کئی ایک مشرقی یورپ کے بھی تھے۔

اندر داخل ہوا تو الٹے ہاتھ پر قطار سے میل باکس تھے جن پر ہر اپارٹمنٹ کا نمبر لکھا ہوا تھا۔ یقیناً پوسٹ مین اسی باکس میں ڈاک ڈال جاتا ہوگا۔ کرایہ دار چابی سے اپنے باکس کو کھول کر روزانہ کی ڈاک نکالتے ہوں گے۔ سیدھے ہاتھ پر ایک چھوٹا سا آفس تھا جس میں مشرقی یورپ کی عمر رسیدہ خاتون بیٹھی تھی۔ چھوٹے قد کی لڑکی اس بلڈنگ کی شیر یعنی نگراں تھی۔ میں نے ہیلو کہا اور وہ سر اٹھا کر مجھے دیکھنے لگی۔

اس نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا کہا اور میں شکریہ ادا کرکے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ اب سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اپنا مدعا بیان کیا کہ مجھے ایک بیڈ روم کا اپارٹمنٹ چاہیے۔ اس نے میری فیملی کا پوچھا کہ بچے کتنے ہیں۔ میں نے کہا کہ دو بیٹیاں ہیں تو وہ سر جھٹک کر بولی۔ ''پھر تم کو دو بیڈ روم کا اپارٹمنٹ ہی مل سکے گا۔''

میں نے کہا کہ مجھے تو ایک بیڈ روم کا چاہیے تو وہ بولی۔ ''دو بچے ایک بیڈ روم کے اپارٹمنٹ میں نہیں رہ سکتے۔''

دو بیڈ روم کے اپارٹمنٹ کا کرایہ دو سو ڈالرز زیادہ تھا اور مجھے ابھی اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ میں نے وجہ پوچھی تو وہ بولی۔

''ہر اسکول میں بچوں کی مخصوص تعداد ہی داخلہ لے سکتی ہے۔ اگر ہم ایک اپارٹمنٹ میں چار چار بچے رکھ لیں تو اسکول میں بچوں کی تعداد گنجائش سے بڑھ جائے گی۔''

میں نے جب یہ کہا کہ میری ایک بیٹی صرف ایک سال کی ہے تو اس نے زور سے اوکے، اوکے کہا اور بولی۔ ''اب ٹھیک ہے مگر جب وہ چار سال کی ہو تو دو بیڈ روم میں شفٹ ہونا ہوگا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس نے ایک فارم میرے حوالے کیا۔ کہنے لگی کہ اپنے سارے کوائف، جاب کی تفصیل، تنخواہ اور ریفرنس کے ساتھ دو ماہ کا ایڈوانس چیک

لگا کرات دے جاؤں۔ وہ کہنے لگی کہ چودھویں فلور پر ایک بیڈروم اپارٹمنٹ یکم جولائی سے خالی ہو رہا ہے۔ پھر مجھ سے سوال کیا۔ ”تم کو کب شفٹ ہونا ہے۔“

میں نے کچھ سوچا اور اندازہ لگایا کہ جون کے شروع میں میری فیملی کو لینڈنگ پیپر مل جائیں گے اور جولائی کے پہلے ہفتے میں ان کو بلوا لوں گا۔ میں یکم جولائی پر راضی ہو گیا اور فارم لے کر باہر نکل آیا۔ کرایہ آٹھ سو ڈالر ماہانہ تھا۔ جو بیسمنٹ کے برابر تھا اور سہولتیں وہاں سے بہت زیادہ تھیں۔ بیسمنٹ کی وہ پرائیویسی نہیں ہوتی جو اپارٹمنٹ کی ہوتی ہے۔ اپارٹمنٹ کی ایک بڑی بالکونی بھی فری تھی جس کا رخ مارفن گروروڈ کی جانب تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہاں ہیٹنگ اور پاور بلڈنگ کی جانب سے فری تھی۔ وہ تو بیسمنٹ میں بھی تھیں مگر وہاں ان کا بل کم رکھنے کے لیے مالک مکان ہر وقت آپ کو ٹوکتا رہتا ہے۔ انہی بنیادوں پر میں نے اپارٹمنٹ لینے کا فیصلہ کرلیا۔

یہاں اسکولوں کا نظام ایسا ہے کہ ہر اسکول میں بچوں کی تعداد کا اندازہ لگا کر اتنی ہی گنجائش رکھی جاتی ہے یہاں ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ ایک گھر میں دو بچے ہوں اور ساتھ والے میں دس۔ اگر ایسا ہو تو اسکولوں کا حشر پاکستان جیسا ہو جائے۔ اگر کہیں زیادہ بچے ہوں تو سٹی گورنمنٹ آپ کو وارننگ دے دیتی ہے۔ ہم دیسی اور مڈایسٹ کے لوگ اپنے گھروں کی بیسمنٹ کرائے پر غیر قانونی طور پر اٹھا دیتے ہیں۔ اس لیے جس گلی میں سو بچے ہونے چاہئیں۔ وہاں ڈیڑھ سو بچے برآمد ہوتے ہیں۔ اسکول کی گنجائش پانچ سو کی اگر ہے تو وہاں آٹھ سو بچے داخلے کے امیدوار ہوتے ہیں پھر اسکول بچوں کے ایڈریس کے مطابق اپنا ڈیٹا گورنمنٹ کو دیتا ہے اور اسی طرح انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک گھر میں کتنی فیملیز ٹھہری ہوئی ہیں۔ ایسے گھروں کو بھاری جرمانے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

دوسری سب سے اہم اور اچھی بات یہ ہے کہ اسکول اور تعلیم کا نظام سب کے لیے ایک ہی ہے اور بارہویں کلاس تک بالکل فری ہے۔ ایسا نہیں کہ تین تین قسم کے اسکول ایک ساتھ چل رہے ہوں اور سب کا نصاب بھی مختلف ہو۔ بچوں کے والدین کی جو بھی آمدن ہو بھلے امیر ہوں یا متوسط یا غریب۔ ان سب کے بچے ایک ہی اسکول میں جائیں گے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ امیروں کے لیے الگ نظام تعلیم اور غریب کے لیے الگ نظام، تعلیم ہو صحت اور تعلیم کے مواقع سب کے لیے برابر ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن نہیں کہ آپ کا بچہ کسی دوسرے علاقے کے اسکول میں داخلہ لے سکے۔ ہر علاقے کا اپنا اسکول ہوتا ہے۔ بچوں کو صرف اسی اسکول کی جانب رجوع کرنا پڑتا ہے جو سڑک کراس کرنے کے لیے سب سے زیادہ محفوظ ہو۔ کسی بچے کو پیدل سڑک کراس کرنے نہیں دیا جاتا۔ اگر کسی بھی وجہ سے بچے کا گھر مین روڈ کے دوسری جانب ہے تو پھر اسکول اس کو بس مہیا کرتی ہے۔ کسی مخصوص فاصلے کے باہر کسی کا گھر ہے تو بس اسکول کی جانب سے مفت مہیا کی جاتی ہے۔

اس اپارٹمنٹ بلڈنگ کا یہ فائدہ تھا کہ پارکنگ کے عین سامنے اسکول تھا اور ایک ذیلی سڑک کراس کرنی تھی۔ بچے دو منٹ میں پیدل اسکول پہنچ سکتے تھے۔

میں فارم لے کر اپنے اپارٹمنٹ میں ایسے داخل ہوا جیسے میرے پاس الاٹمنٹ لیٹر ہو۔

مطیع اللہ دو دن پہلے شفٹ ہو گیا تھا۔ ابھی اس نے پیو سال جوائن نہیں کی تھی۔ وہ سیکیورٹی کی جاب پر جاتا اور واپس آتا تو مفتی اس کے کانوں کے پاس کچھ نہ کچھ کہتا رہتا اور وہ اپنی نظریں چھت پر جمائے اثبات میں سر ہلاتا رہتا۔ ایک دو بار شہباز مجھ سے بول چکا تھا۔ ”لگتا ہے کہ کوئی نئی کھچڑی پک رہی ہے۔“

سرجی کو اپنی پڑی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ ان کی چھٹی ہو جائے۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسا کچھ نہیں ہونے والا ہے۔ دراصل میں نے جو بیج بویا تھا کہ مطیع اللہ شوقین مزاج اور تلیوں کا رسیا ہے تو تب سے مفتی اس سے کچھ اگلوانا چاہتا تھا یا پھر اپنا ہمنوا بنانا چاہتا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ مطیع اللہ ایسا کوئی شوق نہیں رکھتا تھا مگر اب بات چل پڑی تھی تو میں اس کا انجام خیر دیکھنا چاہتا تھا۔ مفتی بھی کوئی ایسا رنگین مزاج نہ تھا۔ اس کی کیفیت اس بچے جیسی تھی جو قیمتی کھلونے دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے مگر ان سے کھیلنے کی ہمت نہیں رکھتا۔

میں اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو مفتی اور مطیع اللہ کے درمیان بقول شہباز کوئی ”کھچڑی“ پک رہی تھی۔ مفتی اب مطیع اللہ کے کان میں کسی سازشی انداز میں کچھ کہہ رہا تھا اور وہ بے پروا ہو کر ”تم ٹھیک کہتی ہو۔“ کہے جا رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”اپارٹمنٹ میں کوئی نہیں ہے اور پھر سرگوشیاں کیوں ہو رہی ہیں۔“

مطیع اللہ بولا۔ ”سنا نہیں کہ دیواروں کی بھی کان ہوتی ہے۔“

میرے آنے کے بعد مفتی انجان بن کر بیٹھ گیا۔ میرے ہاتھ میں مطیع اللہ نے فارم دیکھا تو اس کی بابت پوچھا۔ میں نے جب اپارٹمنٹ کے بارے میں بتایا کہ ڈھائی ماہ بعد یکم جولائی سے اسے لیز کر رہا ہوں تو مفتی بڑبڑانے لگا۔ ''کیا ضرورت ہے بچوں کو بلانے کی، پہلے یہاں تھوڑی مشکلات ہیں جو ایک اور روگ پال لیں۔''

مفتی دو سال سے اپنی فیملی نہیں بلوا رہا تھا وہ اکیلے رہنے کا عادی تھا۔ اس کی نظر میں یہی بہتر تھا کہ بچے پاکستان میں رہیں اور آپ انہیں ہر ماہ خرچ بھیجتے رہیں۔ وہ میرے ساتھ بھی کئی بار بحث کر چکا تھا۔ میرا نقطہ نظر اس سے مختلف تھا۔ میں اس بات پر قائل تھا کہ بچے اور بیوی آپ کے ساتھ رہنی چاہیے تا آنکہ کوئی بڑی وجہ نہ ہو۔ مطیع اللہ بھی شادی شدہ تھا لیکن بچے نہ تھے۔ وہ بھی مفتی کا ہمنوا تھا اور یہی کہہ کر اپنی جان چھڑوا جاتا تھا کہ کافروں کے ملک میں بچے نہیں لانے چاہئیں۔ (اب مطیع اللہ کے ماشاء اللہ بچے بھی ہیں اور سب مل جل کر کینیڈا میں رہتے ہیں) مفتی پہلے تو مجھے سمجھاتا رہا۔ جب میں اس کی بات نہ سمجھ سکا تو میری بات بغیر کہے ہی سمجھ گیا۔ (اس کے بیوی بچے پہلے ہی کینیڈا آ کر اپنا امیگرینس لے چکے تھے۔ پھر میری فیملی کے آنے کے بعد مفتی نے بھی اپنی فیملی کو بلوا لیا تھا) کچھ دیر بعد شہباز اور سرجی اپنی جابیں ختم کر کے تھکے ہارے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ میں نے ان کے لیے چائے تیار کی۔ وہ بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ مطیع اللہ بولا کہ ندیم بھائی نے اپارٹمنٹ لے لیا ہے۔

شہباز ایک دم زرد پڑ گیا اور سرجی خاموش ہو گئے۔ چائے کے کپ کارپٹ پر رکھے وہ مجھے دیکھنے لگے تھے۔

دراصل پچھلے چھ ماہ میں ہم تینوں نے مشکل وقت ایک ساتھ کاٹا تھا۔ کہیں سے بھی آتے تو واپس آ کر ایک دوسرے کی باتیں سنتے جس میں جدوجہد اور تکلیفیں بھی ہوتیں اور ساتھ ہی ہنسی مذاق کے قصے بھی ہوتے تھے۔ ہمیں ایک دوسرے کی عادت ہو گئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہم چھ ماہ سے نہیں بلکہ مدتوں سے ایک ساتھ رہ رہے ہوں۔ آج جب انہیں میرے جانے کی خبر ملی تو وہ اداس ہو گئے تھے۔ میں خود بھی ان کی کمی کو ابھی سے محسوس کر رہا تھا۔

شہباز بولا۔ ''ندیم بھائی! ہر شام کو آپ کے گھر میں آیا کروں گا۔''

مفتی بولا۔ ''وہ ندیم سے ملنے نہیں بلکہ گھر کی تازہ روٹیاں کھانے جائے گا۔''

سرجی بولے۔ ''میری فیملی بھی جب آئی تو اسی بلڈنگ میں اپارٹمنٹ لوں گا۔ جہاں ندیم بھائی ہوں گے۔''

جب میں یہاں سے شفٹ ہو گیا تو بعد میں یہ لوگ میرے پاس آتے رہے ہم آپس میں بیٹھ کر گپ شپ کرتے۔ اکٹھے سفر بھی بہت کیے۔ رابطہ جو بن گیا تھا وہ تو ابھی تک برقرار ہے۔

اپریل کا مہینا اب ختم ہو رہا تھا۔ سردی کی لہر جو دو ہفتے پہلے اچانک امڈ آئی تھی، وہ ختم ہو گئی تھی۔ برفیں پھر سے پگھل چکی تھیں۔ ڈیڑھ سال میں میری ٹریننگ ختم ہو گئی تھی اور مجھے کراس لائننگ میں میری توقع کے برخلاف رکھ لیا گیا تھا۔ ہر ایک میری قسمت پر رشک کر رہا تھا کہ اتنے ہائی لیول سیکشن میں مجھے کام کرنے اور سیکھنے کا موقع ملے گا۔ ہفتے کے پانچ دن ڈیڑھ سال میں اور ویک اینڈ پر ہولڈنگ سینٹر جاب کے لیے جایا کرتا تھا۔ نسرین سے دو تین بار فون پر بات ہوئی۔ وہ بھی میرے شیڈول کو جاننے لگی تھی۔ اس نے میری بہت ہمت افزائی کی۔ پاکستان اپنے بچوں اور بیوی سے ہر دوسرے تیسرے دن بات کر لیا کرتا تھا۔ ہر ہفتے اسے خط بھی لکھا کرتا تھا۔ اس کے جواب بھی مسلسل آتے تھے۔ وہ میرے پل پل سے واقف تھی اور مجھے اپنے اور بچوں کے بارے میں آگاہ رکھتی تھی۔ قندیل میری بیٹی ہر وقت ایک ہی بات مجھ سے پوچھتی کہ بابا آپ نے گاڑی لے لی ہے۔ اسے ماں نے بتایا تھا کہ جیسے ہی بابا گاڑی لیں گے تو ہمیں بلوا لیں گے۔ اسی لیے وہ ہر بار گاڑی کا پوچھتی تھی اور پھر میری چھوٹی بیٹی ابھی دس ماہ کی ہوئی تھی ایک نظام چل رہا تھا اور ہم اس کے ساتھ بھاگ رہے تھے۔

مفتی کے توقعات تب ٹوٹنا شروع ہوئے جب مطیع اللہ اس کے پسندیدہ لیٹ نائٹ شو سے منہ پھیر کر سونے لگا تھا۔ مفتی کے کان میں یہ میں نے ڈالا تھا کہ مطیع اللہ شوقین اور رنگین مزاج پٹھان ہے۔ اس کے بدلے میں مفتی نے اسے لیونگ روم میں سونے کی اجازت دے دی تھی۔ اسے توقع تھی کہ وہ بھی اسی کی طرح جاگ کر یہ شو دیکھے گا اور پھر رنگین تبصرے بھی کرے گا۔ مگر مطیع اللہ وہ ذوق و شوق نہ رکھتا تھا جو مفتی کے اندر پایا جاتا تھا۔ ایک بار تو مطیع اللہ نے حد کر دی ہم سب نے رات کا کھانا ابھی ختم کیا تھا، سرجی اپنے گرم کپڑے تہہ کر کے دوبارہ اپنے سوٹ کیس میں ٹھونس رہے تھے اور برف باری ختم ہونے پر بہت دکھی بھی تھے۔

شہباز، مطیع اللہ کو اپنی نبض دکھلا رہا تھا کہ اسے کہیں بخار تو نہیں تو مطیع اللہ نے کہا تھا۔ ''لگتا ہے تمہارے اندر دو ہارس پاور کی کوئی مشین چل رہی ہے۔''

اتنے میں مفتی نے مطیع اللہ سے پوچھا۔ ''آج بہت اچھا شو آرہا ہے۔''

اس پر مطیع اللہ نے ہمیشہ کی طرح چھت کو اداسی سے گھورا اور بولا۔ ''یہ خنزیر شو روزانہ لگتے ہیں؟''

مفتی یہ بے ادبی برداشت کرتے کرتے برداشت کر گیا مگر اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اس کے باکمال شوز کو خنزیر کا لقب ملا تو وہ شرم اور غصے میں خود سر جھکا گیا تھا۔ میں نے مفتی کو تسلی دی کہ ہم جس چیز کو معیوب کہتے ہیں تو پٹھان اسے خنزیر کہتے ہیں۔ مفتی نے سر ایسے ہلایا کہ بات اس کی سمجھ میں آگئی ہے مگر شک کی پرچھائیں ابھی بھی اس کے چہرے پر نمایاں تھیں۔

مفتی مطیع اللہ کے کان میں ہر وقت جو سرگوشی کرتا رہتا تھا ایک دن وہ سرگوشیاں آشکارہ ہوگئیں۔ ہوا اس طرح کہ مفتی کچھ اس کے کان میں بولتا اور وہ کہتا۔ ''انشاء اللہ جولائی میں جائے گی۔''

سرجی نے مجھ سے پوچھا۔ ''جولائی میں مطیع اللہ کیا پاکستان جارہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اب چند سالوں تک وہ ہیموسال کے علاوہ کہیں بھی نہیں جائے گا۔''

سرجی بولے۔ ''کیا مطلب؟''

''خود ہی سمجھ جاؤ گے۔''

مجھے شک تھا کہ مفتی اسے کلب چلنے کا کہتا رہتا ہے اور مطیع اللہ کبھی کہتا کہ جون میں جاؤں گا اور کبھی جولائی پر ٹال دیتا۔ مفتی اب عاجز آچکا تھا۔ وہ اب باقاعدہ ناراض ہونے لگا تھا۔ آج جولائی جولائی کررہا تھا تو میں نے سرجی کے سامنے اس سے پوچھ لیا۔ ''یہ جولائی میں کہاں جارہے ہو؟''

مطیع اللہ نے بھی مفتی کے راز عیاں کردیے اور بولا۔

''مفتی ٹورنٹو کے آؤٹ آف باؤنڈ علاقے میں جانے کا بولتی ہے اور میں کہتی ہوں کہ جولائی میں جائے گی۔''

میں نے کہا۔ ''چلو یہ اب بتاؤ کہ جولائی کی کس تاریخ میں جاؤ گے؟''

اب مفتی کو میری شکل میں اپنا حمایتی نظر آیا تو وہ بات میں دلچسپی لینے لگا۔ مطیع اللہ نے سنجیدگی سے میرے سوال کا جواب یہ دیا۔ ''کیا جولائی کی بتیس تاریخ ہوتی ہے۔''

میں اس کے جواب میں چھپی شرارت کو سمجھ گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''جولائی کی بتیس تو نہیں پر سنا ہے تینتیس تاریخ ہوتی ہے۔''

مفتی نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری اور اپنی قسمت آزمائی پر لگا رہا۔

ہیموسال میں جب بھی کسی کی نئی جاب ہوتی ہے تو لنچ روم میں لگے نوٹس بورڈ پر ایک نوٹس لگا کر نئے آنے والے کو خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ میں دوپہر کی شفٹ میں ایک بجے ہیموسال پہنچا تو دیکھا کہ نوٹس بورڈ کے گرد ایک مجمع جمع ہے۔ سب گورے، کالے، اور دیسی کچھ پڑھ رہے ہیں۔ کچھ ہنس رہے ہیں اور کچھ تبصرے کررہے ہیں۔ منظر اور اختر بھی وہاں موجود تھے۔ یہودی فزیکا بھی موٹی عینک کے پیچھے نظریں جھپکا رہا تھا۔ بھیڑ چھٹی تو میں نے منظر سے پوچھا کہ ماجرا کیا ہے؟

وہ بولا۔ ''خود دیکھ لو۔''

وہ مسکرا رہا تھا۔ نوٹس بورڈ پر دیکھا تو لکھا تھا۔ ''ہم مطیع اللہ، مطیع اللہ کو ہیموسال جوائن کرنے پر خوش آمدید کہتے ہیں۔''

اصل ماجرا مجھے معلوم تھا۔ مطیع اللہ جب کینیڈا کی امیگریشن کے لیے فارم بھر رہا تھا تو پہلی لائن میں درج تھا کہ مدعی کا پہلا اور آخری نام کیا ہے۔ اب وہ آخری نام پر اللہ تو نہیں لکھ سکتا تھا پٹھان بھائی پریشان ہوگیا مجھے خط لکھا کہ وہ اس معاملے پر مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ پھر دور صدیق کے گن گانے لگا جب بیٹے اور باپ کے نام کے بیچ ''بن'' لگا دیتے تھے۔ اس طرح مطیع اللہ کا پہلا نام مطیع اللہ اور آخری نام شیر اللہ ہوسکتا تھا۔ میں نے مشورہ دیا کہ نام تبدیل کرے۔ اس نے ایک اور سوات کے دوست سے مشورہ لیا تو اس نے بھی تبدیل کرنے کا مشورہ دیا۔ اس دوسرے پٹھان دوست نے تو ایک قدم بڑھ کر اس پر یہ احسان بھی کردیا کہ اس کا نام تبدیل کرکے مطیع اللہ مطیع اللہ رکھ دیا۔ اب اسے ایک مطیع اللہ کی مصیبت ختم ہوئی اور ہر جگہ اپنا نام تبدیل کرکے کینیڈا میں دو مطیع اللہ لے آیا تھا۔ اب ایک ننھی وجود جس میں ایک مطیع اللہ کی بھی گنجائش نہ تھی اور وہ اس میں دو مطیع اللہ لیے پھرتا تھا۔ یہ وجود دو مطیع اللہ کا بوجھ نہ اٹھا سکتا تھا اور اسی لیے اس نے جہاں کہیں بھی جاب کے لیے درخواست دی تو آگے والوں نے نام دیکھ کر یہ بوجھ اٹھانے سے انکار کردیا تھا۔ اس پر ایک مطیع اللہ سخت

پریشان تھا کہ دوسرے مطیع اللہ سے جان کیسے چھڑوائے۔ اس سے پہلے کہ ایک مطیع اللہ دوسرے مطیع اللہ کا بوجھ اتارنے کے بارے میں کچھ سوچتا کہ اس کی جاب ہیموسال میں ہوگئی اور اسے اس غور وفکر سے نجات ملی۔
اب یہودی فزیکا کو نام کی صورتِ حال سے آگاہ کیا گیا تو وہ بہت متحیر تھا۔
فزیکا کی پیدائشی طور پر دونوں آنکھیں ایک دوسرے سے نہیں ملتی تھیں پھر گہرے شیشوں والی نظر کی عینک بھی لگاتا تھا۔ قد چھوٹا اور جسم موٹا تھا۔ وہ ہمیشہ ہم پاکستانیوں کے درمیان بیٹھتا تھا۔ شکل سے جادوگر نظر آتا تھا۔ جب ہم میں سے کوئی میز پر طبلہ بجاتے ہوئے یہ گانا گاتا۔ ''جادوگر سیاں چھوڑ میری بانہیاں'' تو فزیکا اس کی تال پر ناچنے لگتا تھا۔ اسے معلوم بھی نہ ہوتا کہ وہ جادوگر کے نام سے پکارا جارہا ہے۔ اسے تو بس دھن سے سروکار تھا۔ فزیکا لنچ میں صرف کھیروں کا اچار لاتا اور اسے بڑی رغبت سے کھاتا تھا۔ ایک بار اس کی بیوی اسے لینے آئی، کسی نے دیکھ لیا تو اندر آکر شور مچادیا کہ فزیکا کی بیوی تو بہت ہی خوب صورت ہے پھر سب جلدی جلدی باہر کا ڈریس تبدیل کر کے لائن میں کھڑے ہو کر اس کی بیوی دیکھنے لگے۔ وہ واقعی بہت خوب صورت تھی یا پھر فزیکا کے مدمقابل اس کا حسن زیادہ نکھر آیا تھا۔ سب تعریف کررہے تھے فلپائن کا چھوٹے قد کا گنجا فرڈی تو یہ کہتے پایا گیا کہ یہ فزیکا کی بیٹی ہے۔ میں نے فرڈی سے کہا کہ اپنی زبان کو قابو میں رکھو کہ کہیں فزیکا مرنے مارنے پر نہ اتر آئے۔ مگر دیکھا تو فزیکا خوشی اور عاجزی سے دوہرا ہورہا تھا پھر ہم نے مزے لینا شروع کردیے کوئی کہتا کتنی حسین ہے، کوئی کہتا کہ بہت پُروقار ہے۔ منظر نے تو حد کردی اور بول دیا کہ سیکسی بھی ہے۔ اس پر فزیکا نے منظر کو گلے لگا لیا اور دوسرے دن سب کے لیے کھیروں کے اچار کی پوری بوتل لے آیا۔
کہیں میں نے سنا تھا کہ بہاروں کی خبر ہواؤں سے آتی ہے۔ خوشبو بھری ہوائیں کیسی ہوتی ہیں، اس کی پہلے مجھے خبر نہ تھی۔ کینیڈا میں بہار کی آمد ہواؤں پرندوں اور اپنے اندر کی تبدیلیوں سے ہوتی ہے۔ ایک صبح میں اپارٹمنٹ سے باہر آیا تو پہلی بار یہ ہوائیں مجھے چھو کر گزریں اور میں رک گیا تھا۔ ایک انجانا لمس تھا۔ جس سے میں آشنا ہوا تھا۔ حیرت اور مسرت سے میں وہیں پتھر بن گیا تھا۔ بہار بھی ایسے بھی آتی ہے۔ مجھے یہ اندازہ نہ تھا۔ ایک نتھری ہوئی خوشبوؤں سے بھری اور تازہ ہوا کسی بھی مردہ دل کو زندہ کرسکتی ہے۔
میں تو پھر بھی زندہ آنکھوں سے آسمانوں پر نظریں گاڑے بیٹھا بہار کے دنوں کا منتظر تھا۔ میں اس ہوا کے سحر سے باہر بھی نہ نکلا تھا کہ سامنے درختوں پر دیکھا تو کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ درختوں نے جیسے گلابی چتوں کے ہار پہن لیے تھے۔ آسمان کی جانب دیکھا تو ایسا لگا کہ جیسے نیل گھول دیا گیا ہو۔ کہیں کہیں اجلے بادل جو مستی میں ہواؤں کے زور پر اٹھکیلیاں کرتے پھر رہے تھے۔ سورج ابھی طلوع ہونے کو تھا کیونکہ عمارتوں کے بیچ ایک سرخی چھائی تھی۔ شاید اسی منظر کے لیے تو اقبال نے کہا تھا۔

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

یہ وہ بہار تھی۔ جو آج ٹورنٹو میں اتری تھی۔ اپنے رنگوں اور خوشبوؤں سمیت۔ اس نے مجھے سحر زدہ کردیا تھا۔ میں ہیموسال جارہا تھا مگر پھر پلٹ کر اپارٹمنٹ آیا اور خدائے ذوالجلال کے آگے سجدہ ریز ہوگیا۔ میں سجدے میں تھا اور ڈور وال کے باہر جھاڑیوں میں چھپی چڑیوں نے چہکنا شروع کردیا۔ باہر آیا تو جھاڑیوں سمیت تمام درختوں کے پرندے اپنا اپنا ورد با آوازِ بلند بیاں کرنے لگے۔ بہار ایسے بھی اترتی ہے مجھے اوراک نہ تھا۔ محبتیں ایسے بھی نچھاور ہوتی ہیں میں اس سے آشنا بھی نہ تھا۔ ہوائیں ایسے بھی چھوتی ہیں میں ایسے لمس کا عادی بھی نہ تھا۔ پرندے ایسے بھی چہکتے ہیں میں ایسی اذانوں سے واقف نہ تھا۔ رحمتیں ایسے بھی برستی ہیں میں اس کا شاہد بھی نہ تھا۔ آج سب کچھ مجھ پر اترا تو میں بندے سے بندۂ خدا بنتا چلا گیا۔
چڑیوں کی چہچہاہٹ سنی تو مجھے پاکستان میں اپنے باتھ روم کا روشن دان یاد آگیا۔ جہاں بہار کی آمد کی خبر مجھے ان پرندوں کی بولیوں سے ہوتی جو نئے کھلتے موسموں میں اپنا پہلا گھر بنایا کرتے۔ ان کی تکراریں سنتا۔ مجھے معلوم ہوجاتا کہ بہار آرہی ہے۔ اور پھر میں کمرے سے باہر فزا کو سونگھتا خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکراتی اور مجھے معلوم ہوجاتا کہ بہار آرہی ہے۔ میں بہار کی نویدوں پر پُرمسرت ہوجاتا یہ پرندے میری بہاروں کے پیامبر تھے کیونکہ خود میں بھی ایک پرندہ تھا۔ میرے ٹھکانے مختصر ہوتے تھے۔ میری پرواز کبھی مختصر اور کبھی دراز ہوتی تھی۔ چند لمبے سانس درست کرتا اور پھر اپنی نئی وادیوں کو پرواز کر جاتا تھا۔
ہمارے بس اسٹاپ کے پیچھے ایک پارک تھا میں

اسے برف زدہ موسموں میں بھی آتے جاتے دیکھا کرتا تھا۔ وہ ایک طرح سے میرا ساتھی بن گیا تھا۔ اس کے تلے کی زمین عموماً برف سے دبی رہتی بھی برف پانی بنتی تو مردہ گھانس بھی نظر آتی تھی۔ اس کی ٹہنیاں سوکھی اور بے برگ تھیں وہ پارک کے درمیان بالکل تنہا کھڑا تھا۔ اس درخت کا حسن اس کی تنہائی تھی۔ آس پاس میدان تھے اور شاید کسی کا منتظر تھا مگر آج جب میں اسٹاپ پر آیا تو ایک نیا منظر دیکھا۔ پورے پارک اور فٹ پاتھ کے ساتھ بچھی گھانس پر ہزاروں کی تعداد میں چھوٹے چھوٹے پیلے پھول سر نکالے مسکرا رہے تھے۔ پیلے پھول اور گھانس کا نکھرتا سبز رنگ مل کر ایک عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ میں اس منظر کو کسی بھی چیز سے تشبیہ دینے سے قاصر ہوں۔ میں اسٹاپ پر کھڑا اس منظر کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ یہ قدرت کا ایک انعام تھا جو مجھے وطن سے ہجرت پر ملا تھا۔

میں بس اسٹاپ پر کھڑا ان پھولوں میں کھویا ہوا تھا کہ للی میری جانب چلی آئی۔ للی ایک سیکیورٹی گارڈ تھی۔ اس بس اسٹاپ کی بھی اپنی کہانی تھی۔ کئی کردار مختصر سے اور کئی ایک مستقل۔ ان میں للی مجھے ہر روز ملتی۔ جب میں صبح کی شفٹ میں ہیمو سیال جارہا ہوتا یا اس ٹائم پر کہیں اور جا رہا ہوتا تھا۔ وہ سیاہ فام تھی اپنے مقررہ وقت پر ایک بیگ کاندھے سے لٹکائے اور اپنے آپ کو پوری طرح لپیٹے وہ ہر روز اسی وقت اپنی جاب پر روانہ ہوتی تھی۔ اسٹاپ پر ہر روز ملنے والے ایک دوسرے سے شناسائیوں کی طرح ملتے ہیں اور مل کر اپنے رستے پر چل پڑتے ہیں۔

میں نے للی سے پوچھا۔ ''ان پھولوں کا نام کیا ہے؟''

وہ بولی۔ ''یہ پھول تو نہیں ہیں۔''

اس کی نظر میں پھول وہ ہوتے ہیں جو گملوں یا کیاریوں میں خود لگائے جائیں۔ خود سے اگ جانے والے پھول دراصل پھول نہیں وہ کانٹے ہوتے ہیں۔ جو اکھاڑ کر پھینک دیے جاتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ''اگر یہ پھول نہیں تو یہ اتنے خوشنما کیوں ہیں؟ اگر یہ پھول نہیں تو اتنے شوخ رنگ کے کیوں ہیں؟ اگر یہ پھول نہیں تو اچھے کیوں لگ رہے ہیں؟''

وہ حیران ہو کر میرا منہ دیکھنے لگی۔

پھر دوسرے دن یہ پھول پہلے سے دوگنے ہو گئے تھے۔ وہ زمین سے پھوٹ رہے تھے۔ جیسے مشروم نکلتے

غالب

غالب روزے نہیں رکھتے تھے۔ ایک بار کسی نے کہا۔

''آپ روزے کیوں نہیں رکھتے۔''

جھٹ جواب دیا۔ ''شیطان غالب ہے۔''

حنیف ادیب۔ لاہور

☆☆

غالب کو ایک بار جیل کی ہوا کھانا پڑی جس کے متعلق ان کا کہنا تھا کہ کوتوال شہر کو ان سے دشمنی تھی جس نے جوئے کے الزام میں انہیں جیل بھجوا دیا۔ غالب کا یہ شعر اس دور کی یادگار ہے۔

ہم کہ جس دن سے گرفتار بلا ہیں
جوئیں دامن کے بخیوں سے بھی سوا ہیں

انہیں نوکری سے چڑ تھی اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ غالب کا یہ شعر اسی حقیقت کا عکاس ہے۔

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

☆☆

غالب کے آباؤ اجداد فوج سے وابستہ رہے۔ ان کا آبائی پیشہ سپاہ گری تھا۔ یہ شعر اسی حقیقت کا غماض ہے

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

نہ صرف اردو بلکہ فارسی کے بھی اس قادر الکلام اور سلسلہ بند شاعر کا سورج نصف النہار پر چمکتا رہا اور آخر وہ وقت بھی آ گیا جب اسے آخری وقت نے اپنی گرفت میں لے لیا اور بظاہر حرف ولفظ کا یہ سورج ہمیشہ کے لیے گہنا گیا مگر اس کی چمک دمک تا ابد قائم ودائم رہے گی۔

☆☆

غالب کے بارے میں ایک صاحب نے کیا خوب فقرہ چست کیا کہ ''غالب تھے غالب مگر ساری عمر مغلوب رہے۔'' اور یہ حقیقت بھی ہے کہ وہ ہمیشہ غم و اندوہ کے نرغے میں رہے۔ تمام عمر انہیں آلام و مصائب نے سر نہ اٹھانے دیا۔ دکھ و درد سے نبرد آزما رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تمام کلام رنج و آلام کے بیان سے بھرا پڑا ہے۔ خوشی کی کوئی رمق نظر نہیں آتی۔

حنیف ادیب۔ لاہور

ہیں۔تیسرے دن اور بھی زیادہ تھے۔اب میں بھی عادی ہوگیا تھا۔چوتھے دن دیکھا تو گھاس کاٹنے والی مشین اس پر پھیر کر ان کا صفایا کر دیا گیا تھا۔کیونکہ یہ پھول تو نہ تھے بلکہ کانٹے تھے۔پھول تو وہ ہوتے ہیں جو خود اہتمام سے لگائے جائیں، ان کی آبیاری کی جائے، وہ پھول کہاں ہوتے ہیں جو جھونپڑیوں، ویرانوں یا کسی کی منشاء کے بغیر کھلتے ہیں۔

اس بس اسٹاپ پر مستقل آنے والے ایک مخصوص وقت پر اور تقریباً ایک ہی طرح کے لباس میں ملبوس آپ کو ملتے ہیں۔ایک مخصوص انداز میں ایک دوسرے کو ہیلو کہتے ہیں۔اور اپنی مخصوص جگہ پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ان میں گورے بھی تھے مگر زیادہ تر کالے تھے۔میں جب صبح کی شفٹ میں جاتا تھا تو ایک گوری اور موٹی اپنے آفس ڈریس میں ہماری ساتھ والی بلڈنگ سے آتی دکھائی دیتی تھی۔بس آنے سے تین منٹ پہلے وہ بس اسٹاپ پر موجود ہوتی تھی۔کئی بار میں سوچتا کہ اگر گھڑی کا ٹائم سیٹ کرنا ہو تو بس دیکھ کر کروں یا اس عورت کو سڑک پار کھڑے ہوئے کروں۔

دونوں اپنے وقت کی پابند تھیں۔ایک تیکھے نقش و نین والی چینی لڑکی نظر آتی اور آنے کے ساتھ اس موٹی عورت کے ساتھ کھڑی ہو جاتی۔وہ زیادہ تر ہلکے رنگ کا لمبا کوٹ پہنے ہوئی تھی۔ایک اور کالی دراز قد لڑکی اپنے وقت پر کہیں سے نمودار ہوتی، وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہوتی یا کوئی دعائیہ کلمات ادا کر رہی ہوتی، اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔اس کے ہاتھ میں بائبل ہوتی، پاؤں میں اونچی ہیل والی جوتی ہوتی اور اس کے بوائے کٹ بال تھے، آتے ہی سب کو گڈ مورننگ کہتی اور کیبن کے شیشے سے ٹیک لگا کر اپنے ہونٹ چبانے لگتی۔

اس اسٹاپ کے موسم بھی مختلف تھے۔کبھی برف باری اور کبھی بارش، کبھی برفانی جھکڑ اور کبھی چمکتا ہوا سورج، کبھی دھوپ اور سائے اور کبھی باد بہار۔لباس بھی اسی مناسبت سے بدلتے رہتے تھے۔ایک شام میں اپارٹمنٹ کے لیونگ روم میں کارپیٹ پر نیم دراز ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔سرجی کچن میں چولھے پر پیاز بھون رہے تھے۔شہباز پر اچھے موسم کا اثر نہ ہوتا تھا کیونکہ اس کے اپنے دماغ میں بگولے اٹھتے رہتے تھے۔وہ سفید بنیان پہنے سفید کارپٹ پر لیٹے بھوں بھوں کر رہا تھا۔مفتی کی نظریں تو ٹی وی پر تھیں مگر ماتھے کی شکنیں بتاتی تھیں کہ دماغ کہیں اور الجھا ہوا ہے۔اس پر ان دنوں پریشر بڑھ رہا تھا کہ اپنی فیملی کو جلد از جلد بلوائے۔دوسری جانب مطیع اللہ فریج کا دروازہ کھولے جلیبیوں کے متعدد لفافے دیکھ رہا تھا۔اسے معلوم تھا کہ سرجی جلیبیاں پسند کرتے ہیں مگر اتنی مقدار میں پسند کرتے ہیں وہ اس سے بے خبر تھا۔وہ سرجی سے مخاطب ہوا۔''اگر تمہیں دمہ ہے تو مجھے بتائیں میرے دادا کے پاس کالے یرقان اور دمہ کے بہترین نسخے ہیں۔''

اسی بات پر سرجی نے چولھے کی گیس بند کی اور واویلا کرتے لیونگ روم میں آگئے۔میں نے اپنی کتاب کو سائیڈ پر رکھا شہباز یہ کہتا۔اٹھ بیٹھا۔''اب سیاپا شروع ہوا۔''

مفتی نے ٹی وی کی آواز کم کر دی مطیع اللہ بھی سرجی کے پیچھے پیچھے لیونگ روم میں آگیا۔

اب پھر سے دربار سجا۔مفتی سرپنچ بنا۔سرجی نے اپنا مقدمہ پیش کیا۔مظلومان میں مطیع اللہ کے ساتھ ساتھ خلاف توقع شہباز بھی شامل تھا، وہ کہہ رہے تھے۔''پیاز بھی میں چھیلوں، ٹماٹر بھی میں کاٹوں اور کچھ کام چوروں کی طرح اب مطیع اللہ بھی دانت مجھ پر تیز کرنے لگا ہے۔''

سرجی کام چور کہتے ہوئے کن انکھیوں سے شہباز کو بھی دیکھ رہے تھے۔مفتی نے پوچھا کہ آخر معاملہ کیا ہے؟

سرجی نے کہا۔''مطیع اللہ نے مجھ پر الزام لگایا ہے کہ مجھے کالی کھانسی ہے۔''

مطیع اللہ صفائی پیش کرنے لگا کہ میں نے کالا یرقان کہا تھا اور یہ کہا تھا کہ اس کے دادا کے پاس اس کے علاج کا بہترین نسخہ ہے۔

ادھر شہباز اپنی بولی بول رہا تھا کہ سرجی مجھے کام چور کہہ رہے ہیں۔

سرجی مفتی سے کہہ رہے تھے کہ مطیع اللہ نے کالی کھانسی کے ساتھ ساتھ کالے یرقان کا الزام بھی مجھ پر لگا دیا ہے۔

اب مطیع اللہ گڑبڑا گیا تھا اور وہ اپنی صفائی میں کہہ رہا تھا کہ اس نے تو دمہ کا بولا تھا اب سرجی نے دونوں بیماریوں کے ساتھ ساتھ دمہ بھی اپنے پر لے لیا اور بولے۔''میری جلیبیاں تو ہر ایک کی نظر میں چبھ رہی ہیں اور اپنا نشہ نظر نہیں آتا۔''وہ مطیع اللہ کے نسوار کو اب اپنی زد پر لے رہے تھے۔

اب مطیع اللہ حیران پریشان بیٹھا اعلان کر رہا تھا۔

''یہ تو بہت لڑاکی ہے۔''

اب تو سرجی کا مجھے بھی پتا نہ چلتا تھا کہ واقعی سنجیدہ ہیں یا سنجیدگی دکھا رہے ہیں۔آخر مفتی نے پہلے شہباز کو خاموش

کرایا اور پھر مطیع اللہ سے کہا کہ سرجی نے چھڑی اٹھا رکھی ہے اگر بچنا چاہتے ہو تو سب پر واضح کردو کہ جلیبیاں صحت کے لیے بہت مفید ہیں۔
مطیع اللہ نے کہا۔ ''میں اعلان کرتا ہوں کہ جلیبیاں شادی شدہ لوگوں کے لیے بہت مفید ہیں۔''
سرجی نے یہ سن کر کچھ غور کیا پھر بولے۔ ''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' پھر مسکراتے ہوئے کچن میں گھس گئے۔
مطیع اللہ میرے کان کے قریب آیا اور بولا۔ ''سرجی ہمیشہ ایسے ہی رہتے ہیں؟'' میں جواب دینے ہی والا تھا کہ دیکھا سرجی کچن کی کھڑکی سے ہمیں دیکھ رہے ہیں تو میں اٹھ کر کمرے میں بند ہو گیا۔
میں نے 20۔ ریڈ گریو ڈرائیو وال اپارٹمنٹ بلڈنگ میں اپارٹمنٹ 1408 کے لیے کرایہ نامہ بمعہ دو مہینے کا ایڈوانس اور اپنا جاب لیٹر لگا کر دے دیا تھا۔ یکم جولائی کو اس نے خالی ہونا تھا۔ میرے پاس ڈھائی ماہ پڑے تھے۔ مجھے امید تھی کہ فیملی جولائی کے پہلے ہفتے تک پہنچ جائے گی میرے اپارٹمنٹ لینے سے مفتی، شہباز اور سرجی خفا تو نہیں بلکہ اداس تھے۔ مطیع اللہ بھی کہہ رہا تھا کہ ندیم بھائی کے بغیر پورا ماحول سونا ہو جائے گا۔ ہم کھانا کھا کر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ڈور وال کے باہر اندھیرا چھایا ہوا تھا مگر لیمپ کی دودھیا روشنی نے دن کا سماں باندھ رکھا تھا۔ بہار کھل کر ٹورنٹو میں گھس آئی تھی، درختوں اور کیاریوں میں لگے کونپلیں پھوٹ پڑی تھیں، گرم جیکٹوں سے ہماری جان چھوٹ چکی تھی، ہم نے ڈور وال کی ایک کھڑکی کھول دی تھی تاکہ خوشگوار ہوا کی آمدورفت جاری رہے۔ سرجی نے اس کھڑکی کے ساتھ اپنی جگہ بنائی ہوئی تھی اس پر مستزاد گرم جیکٹ بھی پہنی ہوئی تھی۔ ہم سب اسپرنگ جیکٹ پہنتے تھے۔ یہاں بہار کا مقصد یہ نہیں کہ ہم ایک شرٹ میں گھومتے پھرتے نظر آئیں۔ دن میں اور خاص کر شام میں موسم خنک ہو جاتا ہے۔ کھڑکی کھلی ہو تو کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔
سرجی ٹھنڈی ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں اتارنے کے بعد مفتی سے مخاطب ہوئے۔ ''ہم بھی یہاں سے ندیم بھائی والی بلڈنگ میں شفٹ ہو جاتے ہیں۔'' پھر تائیدی نظروں سے شہباز کی جانب دیکھا۔ شہباز نے بھی ہاں میں ہاں ملائی تو مطیع اللہ نے بھی مدبرانہ انداز سے اثبات میں سر ہلایا۔ میں بہت دلچسپی سے دیکھ اور سن رہا تھا۔ میں نے اس پہلو پر کبھی غور نہیں کیا تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ شفٹ ہو جائیں۔
اب مجھے بھی اشتیاق ہو رہا تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ وہیں چلے آئیں مگر میں اپنا فیصلہ ان پر لادنا نہیں چاہتا تھا۔ میں یہ صرف چاہتا تھا کہ وہ یہ فیصلہ اپنی مرضی سے کریں۔ یہ وہاں پر دو بیڈروم کا اپارٹمنٹ لینا چاہتے تھے کرایہ اس کا زیادہ تھا مگر یہ سب اچھی جاب کرتے تھے تو سو ڈالر زیادہ ادائیگی انہیں گراں نہیں گزرتی رہی تھی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے سب نے یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ کل ہی جا کر اپارٹمنٹ کی بات سپر سے کریں گے۔ مفتی بھی راضی ہو گیا اور سرجی نے خوشی میں شہباز کو بھی ڈال دی۔ میں نے دوستوں کے اس خلوص اور محبت کو تحسین بھری نظروں سے دیکھا۔
دوسرے دن میں شام کی جاب سے واپس پہنچا تو مفتی اور شہباز بارہویں فلور پر یعنی مجھ سے دو فلور نیچے ایک اپارٹمنٹ کی بات کر آئے تھے۔ اور اب بیٹھے فارم بھر رہے تھے۔ سرجی خوشی میں مطیع اللہ کو جلیبیاں کھلا رہے تھے۔ جلیبیاں کھلا کر شہباز سے بولے۔ ''اب ندیدہ پن مت دکھانا کہ ہر روز ندیم بھائی کے گھر کھانا کھانے پہنچ جایا کرو۔''
شہباز ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ''ہم اپنا سالن بھابی کو دے آیا کریں گے اور ان کا کھانا لے آیا کریں گے۔''
اس رات ہم ٹی وی کے آگے خبریں سن رہے تھے۔ یہ خبر اخبار میں بھی پڑھ لی تھی۔ اس خبر نے مفتی کے تن بدن میں کینیڈا کی محبت جگا دی تھی اور پاکستان سے اس کے تقابل کا ایک اور موقع اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ ایک ہیت نامی خاتون جو کینیڈا کی شہری ہیں وہ جب ویت نام گئی تو منشیات کی اسمگلنگ میں دھر لی گئی، مقدمہ چلا اور ویتنامی حکومت نے سزائے موت سنا دی۔ ادھر کینیڈا کی حکومت بپھر گئی کہ یہ ہماری شہری ہے اور اسے غلط طور پر پھنسایا گیا۔ ایک سفارتی جنگ شروع ہوئی جو میڈیا کی زینت بن گئی۔ ویت نام کی حکومت نے اس عورت کو سزائے موت دے دی اور کینیڈا نے اپنا سفیر واپس بلا لیا۔ مفتی بہت خوش تھا کہ کینیڈا کی حکومت اپنے شہریوں کا کس طرح سے خیال رکھتی ہے۔ پاکستان کی مثالیں دیں کہ کس طرح کس کس کو امریکا کے حوالے کیا گیا۔
کہہ تو وہ ٹھیک رہا تھا مگر اس میں ان حکمرانوں کا قصور ہے جو اس میں ملوث تھے۔ پاکستان تو ان حکمرانوں کے ہاتھوں میں ٹینس کی بول بنا رہا، کبھی ایک کے اور کبھی

دوسرے کے چنگل میں رہا۔ مفتی کے ساتھ ساتھ ہم میں سے کوئی بھی کینیڈا کا شہری نہیں تھا مگر ایک تفاخر کے جذبے سے ہم اکڑے بیٹھے تھے۔

شہباز نے آواز لگائی مطیع اللہ بھائی۔ ”اب تم پاکستان سے چرس آسانی سے لاسکتے ہو پکڑے بھی گئے تو کینیڈا تمہیں چھڑوالے گا۔“

مطیع اللہ مطمئن ہو کر بولا۔ ”اس کام پر ضمیر تو نہیں مانتا مگر پھر بھی سوچے گی۔“

سرجی کانوں کو ہاتھ لگا کر بولے۔ ”اللہ غارت کرے میرے چپڑاسی کو اس نے اس چکر میں بیوی سے خاصی جھاڑ کھائی تھی۔“

میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا کہ معاملہ کیا تھا تو سرجی باادب بیٹھ کر بتانے لگا۔ ”میرے چپڑاسی نے پکے سگریٹ کا ایک کش مجھ سے لگوالیا تھا تو میری محترمہ نے بڑی بے عزتی کی تھی۔“

شہباز نے پوچھا۔ ”بھابی کو کیسے معلوم ہوا کہ آپ چڑھائے ہوئے ہیں؟“

سرجی گویا ہوئے۔ ”دراصل میں نے سالن میں نمک کی جگہ چینی ملادی تھی۔“

مطیع اللہ بولا۔ ”قربان جاؤں سرجی تمہاری معصومیت پر۔ پکا سگریٹ پی کر چولہے پر چڑھ بیٹھے۔“

سرجی بولے۔ ”انسان خطا کا پتلا ہے۔ ایک بار غلطی کی مگر پھر کبھی بھی ہانڈی روٹی سے پہلے کش نہیں لگایا۔“

یہ سن کر اپارٹمنٹ نمبر 103 قہقہوں سے گونج اٹھا۔ مجھے اپنی فیملی کے کینیڈا آنے کا بہت انتظار تھا۔ ہم نے اکھٹے پچھلے سال میڈیکل کروالیا تھا جو ایک سال کے لیے درست مانا جاتا ہے اگر 8 جولائی تک میری فیملی کا ویزا نہیں آتا تو انہیں پھر سے میڈیکل کروانا پڑتا۔ مجھے فکر اس لیے تھی کہ ابھی مئی کا دوسرا ہفتہ چل رہا تھا۔ میرے حساب سے ان کو ویزا جون کے شروع میں مل جانا چاہیے اگر وہ دوبارہ سے میڈیکل کرواتے تو بات 6 ماہ آگے بڑھ سکتی تھی۔ میں ادھر ایک ایک دن کا انتظار کررہا تھا اور اپارٹمنٹ بھی لے لیا تھا۔

آج سمیعہ سے فون پر بات کی تو اس نے بھونچال برپا کردیا، وہ بتا رہی تھی کہ کل ایمبیسی والوں کا لیٹر آیا ہے کہ جلد سے جلد اپنا میڈیکل کروا کر انہیں بھیجیں۔ بات صاف تھی کہ وہ اب چھ مہینے سے پہلے ٹورنٹو نہیں آسکتے۔ میں تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ سرجی اور شہباز ہمیشہ کی طرح میرے آس پاس موجود تھے۔ شہباز نے کہا۔ ”یہ تو بہت بڑا سیاپا کھڑا ہوگیا ہے۔“

سرجی گویا ہوئے۔ ”یہ ایمبیسی والے ہمیشہ ٹھنڈی آگ سے جلاتے ہیں۔“

میں نے سرجی سے غصے میں کہا۔ ”ادھر اپنی پریشانیوں پر سوچنے کے لیے دماغ کام نہیں کررہا اور اب آپ کے محاوروں پر کون سر کھپائے۔“

سرجی خفا ہو کر بولے۔ ”میرا مطلب تھا کہ یہ ایمبیسی والے دھوکا دیتے ہیں۔“

شہباز بولا۔ ”کون سا دھوکا دیا ہے۔ کیا رشتہ سے انکار کردیا ہے؟“

سرجی روٹھے ہوئے انداز میں منمنائے۔ ”رشتے سے تو انکار نہیں کیا مگر رخصتی بھی تو نہیں دے رہے۔“

مطیع اللہ بھی کہیں سے آکر ساتھ بیٹھ گیا تھا۔ اس نے صرف رخصتی نہ دینے کی بات سنی تھی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح اپنے ہونٹوں پر ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ سجائی اور سرجی سے بولا۔ ”ہمارے علاقے میں جو رخصتی نہ کرے تو پوری برادری کو بیس دنبوں کی دعوت دیتا ہے۔ اور پھر رخصتی بھی دیتا ہے۔“

میرے لیے اب ان کے بیچ بیٹھنا مشکل ہوگیا اور میں بڑبڑاتا ہوا اٹھ کر کمرے میں آگیا۔

اگلا دن سنیچر کا تھا اور مجھے ہولڈنگ سینٹر بارہ بجے دن میں جاب کے لیے جانا تھا۔ کمرے میں ڈور وال کو ذرا سا کھولا تو بہار کی تازہ اور خوشبو بھری ہوا نے میرا... دل اور دماغ معطر کردیا۔ اس معطر جھونکے نے مجھے اللہ کی یاد دلا دی۔ اسی وقت وضو کیا اور عشاء کی نماز پڑھ کر اسی سے دعا مانگی جس کے اشارے پر ہوائیں چلتی ہیں۔ دل تو سجدے ہی میں مقیم ہوگیا۔ دعا نے میرے دماغ کو دل سے جوڑ دیا۔ دل میں سکون کا دریا موجزن ہوا تو میں نے ہولڈنگ سینٹر جانے کی تیاری شروع کردی۔

ابھی میں جوڑے استری کر ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ مفتی فون کے قریب تھا۔ اس نے ریسیور اٹھالیا۔ ادھر کی بات سنتے ہی اس کے چہرے پر گھبراہٹ چھاگئی اس نے چیخ کر کہا۔ ”ندیم فوراً نسرین کے فلیٹ پر پہنچو سعد کا فون ہے ہری اپ جلدی کرو!“

(جاری ہے)

عکس بند

شکیل صدیقی

فوٹوگرافی ایک فن تھا۔ اچھی تصویر کشی صرف منجھے ہوئے عکاس کر سکتے تھے۔ ایسے افراد جو روشنی، زاویہ وغیرہ کا صحیح اندازہ کر سکتے تھے۔ لیکن اب ایسے خود کار کیمرے آچکے ہیں جن سے ایک بچہ بھی اچھی تصویر اتار سکتا ہے۔

معلومات کے شائقین کے لیے تحفۂ خاص

کیمرا اب بے حد عام سی ایجاد بن گیا ہے۔ اس لیے کہ اب یہ ہر کس و ناکس کی جیب میں پڑا رہتا ہے۔ میرا اشارہ موبائل یا سیل فون کی طرف ہے، جس میں کیمرا بھی ہوتا ہے۔ جیب سے جب جی چاہا، نکالا اور تصویریں کھینچنا شروع کر دیں۔ مگر ایسا بھی تھا جب تصویر کھینچنا ایک فن تھا۔ ہر کس و ناکس تصویر کھینچ نہیں سکتا تھا۔ اس کام کو باضابطہ سیکھنا پڑتا تھا، جنہیں اس کام پر عبور حاصل ہو جاتا وہ کیمرا مین کہلاتے تھے۔ تصویر کھنچوانے والے بن سنور کر کیمرے کے سامنے پوز دیتے تھے اور تصویر کھنچوانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ پھر ان تصاویر کو فریم کر کے کمرے کی دیواروں پر آویزاں کرتے تھے۔

یہ جادوئی ڈبہ کیسے کام کرتا تھا اس پر روشنی ڈالنے سے پہلے بتا دوں کہ ماضی کے کیمرے اور آج کے کیمرے میں بہت فرق ہے۔

پہلے ماضی کے کیمرے کا تعارف کرا دوں۔

ماضی کا کیمرا ایک بند ڈبے کی طرح ہوتا تھا، جس میں کسی طرف سے روشنی داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے سامنے ایک لینز لگا ہوتا تھا اور اندر فلم کا رول پڑا ہوتا تھا۔ جس چیز کی تصویر لینا مقصود ہو، کیمرے کے لینز کا رخ اس طرف کر کے بٹن دبا دیا جاتا۔ تصویر کھنچ جاتی۔ پھر ایسی بہت سی تصویریں کھینچ کر کیمرا اسٹوڈیو میں لے جاتے اور رول نکلوا کر اسٹوڈیو والے کو دے دیتے۔ وہ اس کے پرنٹ نکال کر دو ایک روز بعد حوالے کر دیتا۔ بعض تصویریں اچھی اترتیں اور بعض خراب۔ اس کی بھی

وجہ ہوتی تھی، جو بعد میں بتائی جائے گی۔

کیمرا خواہ کیسا بھی ہو سادہ، رنگین یا مووی، سب کا بنیادی اصول ایک ہی ہے۔ ان کے بنیادی پرزے بھی ایک جیسے ہوتے ہیں، چاہے وہ مہنگے ہوں یا سستے۔ کیمرے کی قیمت کا انحصار اس کے لینز پر ہوتا ہے۔ جتنا اچھا لینز ہوگا تصویر اتنی ہی اچھی اترے گی۔

ماضی کے کیمرے کے آگے لینس کے سامنے کے حصے میں شٹر لگا ہوتا تھا جو بہت کم وقفے کے لیے کھلتا اور روشنی کو کیمرے کے اندر جانے دیتا۔ کیمرے میں فلم رول کے لیے مناسب جگہ ہوتی اور رول کو گھمانے کا انتظام بھی ہوتا۔ ایک چھوٹا سا پرزہ اور ہوتا ہے جسے ویو فائنڈر کہتے تھے۔ جس چیز کی تصویر لینا ہوتی ہے اسے اسی پرزے کی مدد سے دیکھتے تھے۔

ابتدائی کیمرے کی پن کو ہول کیمرا کہا جاتا تھا جو بہت سادہ ہوتا تھا۔ اسے پن ہول کیمرا اس لیے کہتے تھے کہ اس میں لینز کی بجائے ایک سوراخ ہوتا تھا۔ سب سے پہلے 1856ء میں ایسا کیمرا ایجاد ہوا، جس کا موجد ڈیوڈ بریوسٹر تھا۔

پن ہول کیمرے کو گھر بیٹھے بنایا جا سکتا ہے۔ گتے یا لکڑی کا ایک چھوٹا سا ڈبا لے لیں اس کے اندر سیاہ کاغذ لگا دیں تاکہ روشنی بالکل اندر نہ جا سکے۔ احتیاطاً سیاہ رنگ بھی پھیر دیں۔ کیمرے کا سائز اتنا بڑا ہونا چاہیے کہ فلم کا ایک ٹکڑا اس میں لگ سکے۔ فلم کے ٹکڑے کو جہاں لگانا مقصود ہے، اس کے بالکل سامنے ایک چھوٹا سا سوراخ کر کے پٹی چپکا دیں۔ پٹی میں پن سے سوراخ کر کے اسے بھی ٹیپ سے بند کر دیں۔

اب فوٹو گرافر سے فلم کا ایک ٹکڑا لے لیں اور اسے اندھیرے کمرے میں جا کر پٹی کے سوراخ کے سامنے لگا دیں۔ وہ سائڈ سامنے کے رخ پر ہونا چاہیے جس پر مسالا لگا ہوتا ہے۔

جب کسی کا فوٹو لینا مقصود ہو تو کیمرے کو میز پر رکھ دیں تاکہ وہ ہل نہ سکے۔ اس کے بعد اس شخص کو کیمرے کے سامنے بٹھا کر پٹی پر لگا ہوا ٹیپ ہٹا دیں اور پندرہ منٹ تک روشنی اندر جانے دیں۔ اس کے بعد تاریک کمرے میں لے جا کر فلم کا ٹکڑا نکال لیں اور کاغذ میں لپیٹ کر فوٹو گرافر کی دکان پر لے جائیں۔ وہ اسے دھو کر فلم کا پرنٹ نکال دے گا۔ تصویر اچھی اترے گی۔

حقیقت میں کیمرے کا اصول وہی ہے جو ایک ہزار برس پیشتر مشہور سائنس داں ابن الہیثم نے بتایا تھا یعنی یہ کہ جب روشنی کی شعاعیں کسی باریک سوراخ سے گزر کر کسی پردے پر پڑتی ہیں تو اس پردے پر اس جسم کا الٹا عکس ڈالتی ہے جس سے نکل کر وہ آرہی ہے۔ ابن الہیثم نے ایک موم بتی کا الٹا عکس ایک پردے پر ڈال کر اس اصول کا عملی مظاہرہ بھی کیا تھا۔

پن ہول کیمرے سے تصویر اس طرح سے کھنچی جاتی کہ جب پٹی پر لگا ٹیپ ہٹایا جاتا تو روشنی کی کرنیں کیمرے میں داخل ہو جاتیں۔ ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ روشنی خطِ مستقیم میں سفر کرتی ہے۔ سوراخ کے تنگ ہونے کی وجہ سے وہ شخص جو کیمرے کے سامنے بیٹھا ہوا اس کے سر پر سے گزرنے والی روشنی فلم کے نچلے حصے پر پڑتی۔ جب کہ نچلے حصے سے آنے والی روشنی اوپری حصے پر پڑتی۔ اسی طرح سے دائیں طرف سے آنے والی روشنی بائیں اور بائیں طرف سے آنے والی روشنی دائیں طرف پڑتی۔ گویا فلم پر جو عکس بنتا وہ الٹا ہوتا۔ اسے نگیٹو کہتے تھے۔ اس عکس کو فوٹو گرافک پیپر پر نقل کیا جاتا تھا تاکہ نگیٹو کا پازیٹو بن سکے۔

پن ہول کیمرے میں سوراخ چونکہ کافی باریک ہوتا ہے، اس لیے طویل وقفہ دیا جاتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ روشنی اندر داخل ہو۔ اس عمل کو ایکسپوژر کہتے ہیں۔ جس شخص کی تصویر لی جاتی اسے سبجیکٹ کہتے تھے۔ فلم پر روشنی زیادہ ڈالنے کے لیے کافی دیر تک کیمرے اور سبجیکٹ کو سامنے رہنا پڑتا ہے۔ اگر کیمرے کے سوراخ کو کشادہ کر دیا جاتا تو روشنی کی زیادہ مقدار کیمرے میں داخل ہو جاتی اور تصویر دھندلا جاتی کیونکہ شعاعیں آپس میں ٹکرا جاتی تھیں۔

پن ہول کیمرا وقت طلب تھا، اس لیے کہ کیمرے کے سوراخ میں سے زیادہ سے زیادہ روشنی اندر جانے کے لیے ضروری ہوتا تھا سبجیکٹ اور کیمرا دیر تک ساکت رہیں اور ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ کوئی شخص اتنی دیر تک ساکت نہیں بیٹھ سکتا اور جب وہ ہل جائے گا تو تصویر خراب ہو جائے گی۔ ان دشواریوں کے باوجود پن ہول کیمرا کافی عرصے تک استعمال ہوتا رہا۔ جس شخص کو تصویر کھنچوانا ہوتی تھی اسے اپنے چہرے پر گلابی سی کریم مل کر کیمرے کے سامنے ساکت بیٹھنا پڑتا تھا۔

اس دشواری پر قابو پانے کی کوشش کی جاتی رہی کہ روشنی کی زیادہ مقدار لینز سے گزر کر اندر جائے لیکن سبجیکٹ کو زیادہ دیر تک ساکت نہ بیٹھنا پڑے۔ یہ مقصد لینز سے حاصل ہوا۔ لینز شیشے کا بنایا جاتا۔ اسے زیادہ سے زیادہ نفیس بنایا جاتا تاکہ وہ روشنی کی شعاعوں کو تیزی سے گزار دے۔

جب کیمرے کے عدسے سے گزرنے والی روشنی اندر آتی تو سیدھی جا کر فلم کے رول یا ٹکڑے پر پڑتی۔ وہ نقطہ

جہاں پر شعاعیں مرکوز ہوتی ہیں، اس لینز کا فوکل پوائنٹ کہلاتا تھا جس چیز یا شخص کی تصویر لینا مقصود ہوتا ، اسے لازم تھا کہ اس پر روشنی پڑ رہی ہو۔یعنی دن کا وقت ہو۔اگر رات ہو چکی ہے تو روشنی کا انتظام کیمرے میں کرنا پڑتا تھا۔جو ایک لمحے کے لیے سبجیکٹ پر پڑتی اور اسے منور کر دیتی تھی۔اسے فلیش لائٹ کہتے تھے۔

مقصد یہ ہوتا ہے کہ روشنی سبجیکٹ سے منعکس ہو کر لینز میں داخل ہو جائے اور فلم پر مرکوز ہو کر عکس کو اس پر جما دے۔لینز کو سبجیکٹ سے ٹھیک فاصلے پر رکھا جاتا تو داخل ہونے والی شعاعیں سیدھی جا کر فلم پر ہی مرکوز تیں اور تصویر اچھی آتی۔لیکن فاصلہ کم یا زیادہ ہونے سے یا فوکس درست نہیں ہوتا تو کیمرے میں داخل ہونے والی شعاعیں فلم سے پہلے ہی مل جاتیں یا بعد میں یعنی عکس ٹھیک فلم پر نہیں بنتا تو عکس دھندلا ہو جاتا۔

عام طور پر پانچ میٹر کے فاصلے سے تصویر لی جاتی تھی ،لیکن ڈیڑھ میٹر سے تیس میٹر تک بھی اس سے اچھی خاصی تصویر آجاتی تھی۔

اب بھی بہت اچھے کیمروں میں قیمتی لینز لگے ہوتے ہیں اس لینز کو آگے پیچھے حرکت دینے کا انتظام ہوتا ہے۔تاکہ دور اور نزدیک کی چیزوں کو آسانی سے فوکس کیا جا سکے اور عمدہ تصویر بن سکے۔

تصویر لیتے وقت لینز جتنا کھلتا یعنی وہ سوراخ جس میں سے روشنی گزر کر کیمرے میں جاتی ہے لینز کا اپرچر کہلاتا۔اچھے کیمروں میں اپرچر کو چوڑا اور تنگ کرنے کا انتظام ہوتا ہے۔اگر دن کا وقت ہے اور خوب روشنی ہو رہی ہے تو اپرچر کو تنگ کر دیا جاتا ہے تا کہ کم روشنی اندر جائے، جب کہ موسم ابر آلود ہونے پر اپرچر چوڑا کر دیا جاتا تھا۔تاکہ زیادہ روشنی اندر چلی جائے۔

لینز کے بعد کیمرے میں سب سے زیادہ مہنگی چیز اس کا شٹر ہے جو لینز کے پیچھے لگا ہوتا ہے۔اس کے ذریعے لینز کا اپرچر کھولتے اور بند کرتے تھے۔شٹر ایک پرزے کی مدد سے چلتا تھا جو کیمرے پر لگا ہوتا۔شٹر ایک سیکنڈ کے سویں حصے تک کے لیے کھل سکتے ہیں۔ان میں تین سے پانچ تک بلیڈ لگے ہوتے ہیں جو ایک ساتھ کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔ان میں روشنی کا وقفہ ایک سیکنڈ سے ایک سیکنڈ کے تین سویں حصے تک ہو سکتا ہے۔اب بھی اچھے کیمروں میں شٹر کی رفتار اور اپرچر کے درمیان ایک تعلق موجود ہوتا ہے۔

کیمرے کے سامنے کا وہ فاصلہ جس کی وہ صاف تصویر

حافظ محمد یوسف آزاد

اردو اور ہندی کے ممتاز شاعر سکندر راؤ علی گڑھ (یو پی) میں شیخ ظفر الدین کے علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ قبیلہ شیخ القریش کے چشم و چراغ تھے جو قصی بن کلاب اول حاکم مکہ مکرمہ کی نسل مبارک سے ہے۔شاعری میں اپنے تایا اللہ راضی راہبر کے شاگرد ہوئے۔ سلسلہ تلمذ امیر مینائی سے جا ملتا ہے۔آپ عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم گلوکار موسیقار بھی تھے۔ترنم کے ساتھ مشاعروں میں کلام سنایا کرتے تھے اور سحر طاری کر دیتے تھے۔حفظ قرآن آپ نے علامہ سید محمد ابراہیم سے کیا۔ابتدائی دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کاروبار کو ذاتی پیشہ بنا لیا۔ سرکاری ملازمت پسند نہیں کرتے تھے۔تحریک پاکستان میں اہم کردار ادا کیا اور مسلم لیگ کے جلسوں میں اپنی پرسوز نظموں سے مسلمانوں کے دل کو گرماتے تھے۔آپ عربی فارسی اردو ہندی گجراتی پنجابی میں مہارت رکھتے تھے لیکن شاعری اردو اور ہندی میں کرتے تھے۔ کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے۔ 1950ء میں ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور سرگودھا میں مستقل سکونت رکھی۔آپ انجمن ترقی اردو پاکستان کے اہم رکن تھے۔آپ کے ہم عصر شعراء میں حضرت علی سکندر جگر مراد آبادی علامہ عاشق حسین سیماب اکبر آبادی ،سید محمد حسین زیدی قمر جلالوی پروفیسر مولانا سید علی احسن مارہروی، حکیم صغیر حسین زیبا مارہروی تھے۔آپ نے اہم ادبی خدمات انجام دیں۔ 30 دسمبر 1979ء میں سرگودھا میں انتقال کر گئے۔آپ کا اردو شعری مجموعۂ کلام" آئینہ آزاد ہے" آپ کے کافی شاگرد ہیں جو آپ کا مشن جاری وساری رکھے ہوئے ہیں۔

مرسلہ: سید امتیاز حسین بخاری۔ سرگودھا

قدرت کا زندہ معجزہ

زم زم کا چشمہ چار ہزار سال قدیم ہے۔تیرہ فٹ چوڑا اور گیارہ فٹ لمبا ہے۔ایک پاور فل موٹر 8000 لیٹر پر سیکنڈ کے حساب سے اس میں 24 گھنٹے پانی پمپ کرتی رہتی ہے۔اس میں آج تک کائی نہیں لگی ہے اور نہ ہی پانی کا ذائقہ بدلا ہے۔پورا دن پانی پمپ کرنے کے بعد صرف گیارہ منٹ میں پانی اپنے اصل لیول پر آجاتا ہے اسی قدرت کی بناء پر آج تک زم زم خشک نہیں ہوا۔ (سبحان اللہ)

مرسلہ: قرۃ العین، اقراشی، کراچی

لے سکتا ہے اس کے فیلڈ کی گہرائی کہلاتا تھا۔ چھوٹے لینز اور کم اپرچر سے زیادہ فاصلے کی تصویریں بھی آجاتی تھیں، اس لیے کہ دور سے آنے والی شعاعیں متوازی رہتے ہوئے لینز میں داخل ہوتیں۔ بڑے لینز اور زیادہ اپرچر سے فیلڈ کی گہرائی کم ہوجاتی ہے۔

فوٹو کھینچتے وقت تین باتوں کا خیال کرنا ضروری ہے۔ فاصلے کے مطابق لینز کو فوکس کرنا پھر روشنی کا لحاظ کرتے ہوئے لینز کا اپرچر کم یا زیادہ کرنا۔ آخر میں شٹر کی رفتار ایسی کرنا کہ وہ روشنی کو درست وقفے کے لیے گزرنے دے۔

اگر اپرچر بڑا ہے تو ایکسپوژر زیادہ ہونا چاہیے۔ عام طور پر تھوڑا اپرچر اور زیادہ ایکسپوژر اچھا رہتا ہے۔ کیمرا کیسا بھی ہو فلم کے بغیر کوئی تصویر نہیں لی جاسکتی تھی۔ سادہ تصویر جو سفید اور سیاہ رنگوں میں ہوتی ہے حقیقت میں وہ عکس ہوتا ہے جو چاندی پر آتا ہے۔ فلم مسالے کی بنی ہوتی تھی، لیکن اس پر ایک شفاف مادے کی انتہائی پتلی تہ چڑھی ہوتی تھی، جو چاندی کی قلموں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ مادہ بہت حساس ہوتا ہے اس مسالے میں بہت سے رنگ بھی شامل کیے جاتے تھے تاکہ تصویر لیتے وقت مختلف رنگ بھی فلم پر آجائیں۔

جب فلم پر روشنی پڑتی تو چاندی کے مسالے کالے ہوجاتے مگر فلم دھونے کے بعد ظاہر ہوجاتے۔ نیگیٹو میں عکس اور سیاہی سفیدی الٹی آتی تھی مگر جب پرنٹنگ پیپر پر نیگیٹو پر عکس لیا جاتا تھا تو تصویر میں اصل منظر آجاتا۔

عام طور پر کیمرے میں 35 ملی میٹر چوڑی فلم استعمال ہوتی تھی۔ یہ فلم کارٹرج کہلاتی تھی جسے کیمرے میں لگانا نہایت آسان ہوتا تھا۔ کیمرے کو پیچھے سے کھول کر فلم کا رول رکھ دیا جاتا تھا پھر کیمرے کو بند کردیا جاتا تھا۔ کیمرے میں رول یا کارٹرج کو گھمانے اور تصویر کشی کے لیے درست جگہ پر لانے کے لیے کل اور پرزے لگے ہوتے تھے۔ فلم کے رول کے پیچھے ایک لمبا سا کاغذ لگا ہوتا تھا جس پر نمبر پڑے ہوتے تھے۔ یعنی اب تک کتنی تصاویر کھینچ گئیں۔ کیمرے کے عقبی حصے میں ایک چوکور سا سوراخ ہوتا تھا جس کے ذریعے دیکھا جاسکتا تھا کہ اب تک کتنی تصویریں کھینچ گئیں اور کتنی باقی ہیں۔ تصویر کھینچنے کے بعد ہینڈل کو گھما کر پازیٹو کو گھمایا جاسکتا تھا۔ بعض کیمروں میں یہ طریقہ آٹومیٹک ہوتا تھا۔ یعنی جب تصویر اتر جاتی تو اگلا پازیٹو خود بخود آجاتا۔

35 ملی میٹر کے کیمروں میں ایک خالی اسپول بھی لگا ہوتا تھا جس پر کارٹرج کا ابتدائی حصہ پھنسا دیا جاتا تھا اور جب فلم کے کارٹرج کو آگے بڑھانا مقصود ہوتا تو ہینڈل کو گھمایا جاتا تھا۔ جب سارا رول تصویر کشی کے بعد ختم ہوجاتا تو تاریک کمرے میں اس رول کو الٹا چلا کر ابتدائی جگہ پر لے آتے تھے اور اسے کیمرے سے نکال لیتے تھے۔ پھر اس رول یا کارٹرج کو اسٹوڈیو والے کے حوالے کردیتے تاکہ وہ پرنٹس بنادے۔

فلم کے کارٹرج پر جو مسالا لگا ہوتا تھا اس کی بھی بہت سی قسمیں ہوتی تھیں۔ اسے کیمرے میں لگاتے وقت اس کی رفتار کا بھی خیال رکھنا پڑتا تھا۔ وہ رنگوں کو کس حد تک قبول کررہا ہے یہ بھی ذہن میں رکھنا پڑتا تھا۔ ان ساری چیزوں کا دارومدار کارٹرج کے مسالے پر ہوتا تھا۔

وہ کارٹرج جس کی رفتار تیز ہو اور زیادہ حساس ہو وہ دھندلے موسم کے لیے مناسب ہوتیں یا پھر گھر کے اندر تصویر کشی کے لیے استعمال کی جاتیں۔ سست رفتار فلموں سے اچھی تصاویر اتر آتی تھیں۔ فلموں کی رفتار اس پر پڑے ہوئے نمبر سے ظاہر ہوتی۔ نمبر جتنا زیادہ ہوگا رفتار اتنی ہی تیز ہوگی۔ فلم کی رفتار کیمرے کا اپرچر اور ایکسپوژر سیٹ کرتے وقت دھیان میں رکھنا پڑتا تھا۔

چھوٹی تصویروں میں گرین نمایاں نہیں ہوتے تھے، لیکن جب تصویروں کو بڑا کیا جاتا تو گرین یعنی نقطے نمایاں ہوجاتے۔ عام طور پر یہ نقطے تیز رفتار فلموں میں زیادہ نمایاں ہوتے ہیں لیکن سست رفتار فلموں میں زیادہ نمایاں نہیں ہوتے۔

بعض افراد فلم کو دکان پر نہیں دینا چاہتے اور اسے خود ڈیولپ کرنا چاہتے تھے تو فلم کو مخصوص کیمیکل میں ڈبوتے تھے۔ اس محلول میں ڈبونے کے بعد اسے صاف پانی سے اچھی طرح دھولیا جاتا تھا اس کے بعد ایک اور محلول میں ڈالا جاتا تھا جسے فکسچر کہتے تھے۔ یہ محلول فلم پر سے چاندی کے تمام کرسٹل اتار دیتا تھا جو روشنی سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔ فلم پر صرف عکس باقی رہ جاتا تھا۔ اسے دوبارہ دھوکر لٹکا دیا جاتا تھا تاکہ وہ خشک ہوجائے۔ یہ نیگیٹو کہلاتا اور بعد میں اس سے پازیٹو بنانا پڑتا ہے۔

پازیٹو بنانے کے لیے پرنٹ پیپر استعمال کیا جاتا تھا اور جسے فوٹوگرافک پرنٹ کہا جاتا تھا۔ فوٹوگرافک پیپر اسی طرح بنایا جاتا تھا، جس طرح فلم بنائی جاتی تھی۔ اس کا چاندی والا مسالا روشنی کے لیے اتنا حساس نہیں ہوتا جتنا کہ فلم کا ہوتا ہے۔ کاغذ کے ٹکڑے پر نیگیٹو رکھ کر جب روشنی ڈالی جاتی تو کاغذ پر الٹا عکس آجاتا تھا۔ یہ الٹا عکس ہی اصل تصویر ہوتی۔ پرنٹنگ کے وقت اس بات کا خیال رکھا جاتا کہ نیگیٹو کے مسالے والی

سائڈ کاغذ کے مسالے والی سائڈ کی طرف ہو۔اس طرح سے اتنی ہی بڑی تصویر کا پرنٹ حاصل ہوجاتا جتنا کہ فلم کا سائز ہوتا۔مگر بڑی تصویر حاصل کرنے کے لیے انلارجر لگانا پڑتا تھا۔

پرنٹنگ پیپر پر جو عکس بنتا وہ نظر نہیں آتا۔لہٰذا اسے بھی کیمیکل میں ڈبو کر ڈیولپ کیا جاتا تھا،جس طرح فلم کو کیا گیا تھا۔ڈیولپنگ اور پرنٹنگ کے لیے تاریک کمرے یعنی ڈارک روم میں کام کرنا پڑتا تھا تاکہ روشنی میں کام خراب نہ ہوجائے۔لیکن سرخ رنگ کا بلب جلالیا جاتا تو کوئی فرق نہیں پڑتا اور کام کرنے میں دشواری نہیں ہوتی تھی۔

آج کے کیمروں کی قسموں کا انحصار آٹو میٹک اور رفلیکس پر ہوتا ہے۔ان کی نفاست اور قیمت کا انحصار ان کے اپرچر،شٹر، لینز اور رفتار پر ہوتا ہے۔ایک زمانے میں مارکیٹ میں تیز رفتار کیمرے بہت آئے تھے۔ان میں لینز کو فوکس کرنے کا اچھا انتظام ہوتا تھا۔ماہر فوٹوگرافر ان سے فائدہ اٹھاتے تھے۔چاہے موسم اور وقت کیسا ہی ہو وہ اچھی تصویر بنالیتے تھے۔

اب بلیک اینڈ وہائٹ کا زمانہ نہیں رہا۔ہم رنگین تصاویر ہی پسند کرتے ہیں۔اس کی بنیاد یہ ہے کہ سفید روشنی میں وہ سارے رنگ ہوتے ہیں جو ہم قوس قزح میں دیکھتے ہیں۔رنگین فوٹوگرافی میں وہ سب رنگ آجاتے ہیں جو ہم اپنے اطراف میں دیکھتے ہیں۔بہرحال بنیادی رنگ صرف تین ہوتے ہیں۔سرخ،سبز اور نیلا۔انہیں پرائمری رنگ کہا جاتا ہے۔اگر تینوں رنگوں کو ملا کر کسی پردے پر پھینکا جائے تو سفید روشنی ظاہر ہوگی۔اگر اس میں سے نیلی روشنی نکال دی جائے تو زرد روشنی ظاہر ہوگی،اس لیے کہ زرد رنگ نیلے رنگ کو مکمل کرتا ہے۔اگر سفید روشنی میں سے سبز روشنی نکالی جائے تو نیلی اور سرخ روشنیوں کا امتزاج دکھائی دے گا۔اگر سفید روشنی میں سے سرخ روشنی نکالی جائے تو نیلی اور سبز روشنیوں کا مرکب ظاہر ہوگا۔

پرائمری رنگوں کو ملانے سے دوسرے رنگ بن جاتے ہیں۔رنگین فوٹوگرافی کا تعلق پرائمری رنگوں کو آپس میں ملانے سے ہے۔اس فن نے بہت ترقی کی اور رنگین فلمیں آسانی سے دستیاب ہونے لگیں۔ان فلموں پر سارے رنگ اپنی اصلی حالت کے مطابق ظاہر ہوجاتے تھے۔

رنگین فلموں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ایک سے کاغذ پر پرنٹس بنائے جاتے ہیں جنہیں ہم بھی اپنے البم میں لگاتے تھے۔دوسری قسم کلر ٹرانسپرنسی کہلاتی ہے۔جنہیں پردے پر

اسمارٹ فون

اب یہ بات اکثر دیکھنے میں آرہی ہے کہ بچے بہت زیادہ غصے میں نظر آتے ہیں۔مطالبہ پورا نہ ہونے کی صورت میں وہ چیزوں کو ادھر اُدھر پھینکنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ان وجوہ کی بناء پر والدین پریشان دکھائی دیتے ہیں لیکن ایسے تمام پریشان حال والدین کے لیے امریکی اکیڈمی برائے اطفال نے نئے رہنما اصول پیش کیے ہیں جس میں والدین کو اپنے بچوں کو سختی سے اسمارٹ فون دینے سے منع کیا ہے۔امریکا میں واقع یونیورسٹی آف مشی گن کی جانب سے جاری کی گئی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ کچھ وقت ایسے ہوتے ہیں جب والدین اپنے بچوں کو تحمل اور سکون سے بٹھانے کے لیے انہیں اسمارٹ فون دے دیتے ہیں لیکن بچوں کو سکون سے بٹھانے کا یہ طریقہ بالکل غلط اور نقصان دہ ہے۔رپورٹ کے مطابق بچوں کو سکون میں لانے کے لیے اگر اسمارٹ فون استعمال کیے جائیں تو وہ اپنے جذبات اور احساسات کو قابو میں نہیں رکھ سکتے۔ہم سب یہ بات جانتے ہیں کہ بچوں کی نشوونما چھوٹی عمر میں ہی ہوتی ہے۔یہی وہ عمر ہوتی ہے جب بچہ کھیلنا، پڑھنا، اپنے جذبات پر قابو پانا اور لوگوں سے تعلق قائم کرنے کے طریقے سیکھتا ہے لیکن اسمارٹ فون کا زیادہ استعمال بچوں کو ان کی صلاحیتوں پر منفی اثر ڈالتا ہے۔رپورٹ میں شائع کیے جانے والے رہنما اصول میں بتایا گیا ہے کہ دو سے پانچ سال کی عمر کے بچوں کو میڈیا کی کوئی بھی ڈیوائس دن میں ایک گھنٹے سے زیادہ استعمال کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دینی چاہیے۔اگر ایسا نہ کیا گیا تو بچے کی نیند اور اس کی نشوونما اور ذہنی وجسمانی صحت پر غلط اثر پڑتا ہے۔

احسان سحر۔میانوالی

دیکھا جاسکتا ہے یا پھر ویو فائنڈر میں لگا کر دیکھا جاسکتا ہے۔

کلر پرنٹس تیار کرنے کے لیے رنگین نگیٹو درکار ہوتے ہیں۔ رنگین نگیٹو پر تین مسالوں کی تہیں چڑھی ہوتی ہیں۔ ہم جس چیز کی فلم لیتے ہیں اس کا نیلا رنگ سب سے اوپر والی تہ کو متاثر کرتا ہے۔ سبز رنگ درمیانی تہ کو اور سرخ رنگ سب سے نچلی تہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہر تہ میں ایک کیمیکل چھپا ہوا ہوتا ہے جو کپلر کہلاتا ہے۔ جب فلم کو محلول میں ڈالا جاتا ہے تو کیمیائی رد عمل سے دوسرے رنگ بھی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح سے پرنٹنگ پیپر پر بھی تین کیمیائی تہیں چڑھی ہوتی ہیں جن میں سے ہر ایک ایک رنگ کے لیے حساس ہوتی ہے۔ جب کاغذ کو عکس لینے کے بعد دھویا جاتا ہے تو سب رنگ ابھر آتے ہیں اور بعد میں ایک خاص طریقے سے رنگین عکس ابھارے جاتے ہیں۔

جو تصاویر ہم اتارتے ہیں وہ بظاہر تو اچھی ہوتی ہیں، لیکن ان میں بہرحال اصل رنگ نہیں ہوتے جو منظر میں دکھائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر بادل جیسے کہ نظر آتے ہیں ویسے فوٹو میں نہیں آتے۔ اس الجھن پر قابو پانے کے لیے فلٹر ایجاد کیا گیا۔ یہ رنگین شیشے کا ٹکڑا ہوتا ہے جسے کیمرے کے لینز کے سامنے لگا دیا جاتا ہے، یعنی لینز میں سے گزرنے والی ساری روشنی کو پہلے فلٹر میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ فلٹر بعض رنگ جذب کر لیتا اور بعض کو آزادی سے گزر جانے دیتا ہے۔

وہ فلٹر جو سیاہ و سفید فوٹو گرافی میں استعمال کیے جاتے ہیں وہ رنگین فوٹو گرافی میں استعمال نہیں کرنا چاہئیں۔ رنگین فوٹو گرافی کرتے وقت روشنی کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ تصویر آؤٹ ڈور ہے یا ان ڈور اس کا بھی دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ ان سب چیزوں کو ذہن میں رکھ کر ہی فلٹر کا استعمال کیا جاتا ہے۔

کیمرے کے چند آلات اور بھی ہوتے ہیں جن کا تذکرہ ضروری ہے۔ مثلاً ویو فائنڈر جس سے منظر کو دیکھا جاتا ہے۔ جتنا منظر اس سے نظر آتا ہے اتنا ہی فوٹو میں آجاتا ہے۔ چنانچہ ضرورت کے مطابق کیمرے کو آگے پیچھے کر لیا جاتا ہے۔ ویو فائنڈر کی بھی کافی قسمیں بنائی گئیں۔ ایک میں لینز لگا ہوتا ہے اور ایک آئینہ بھی لگا ہوتا ہے جو سامنے والے عکس کو ایک چھوٹے سے پردے پر منتقل کر دیتا ہے۔ بعض کیمروں کے ویو فائنڈر میں چار خطوط کا ایک فریم نظر آتا ہے۔ جتنی تصویر لینا مقصود ہو اسے اس فریم میں بند کر لیتے ہیں۔

اس کے علاوہ رینج فائنڈر بھی ہوتا ہے۔ اس آلے کے ذریعے فاصلہ آسانی سے ناپا جاسکتا ہے۔ تاکہ اندازہ ہو سکے کہ کتنے فاصلے سے تصویر کھینچی جارہی ہے۔ اس آلے میں دو عکس ہوتے ہیں ایک قائم اور دوسرا متحرک۔ دوسرے عکس کو حرکت دے کر پہلے والے عکس پر لایا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تصویر فاصلے کے مطابق درست طریقے سے فوکس ہو چکی ہے۔ بس بٹن دبانے کی دیر ہے۔

فوٹو گرافی کے مزید آلات میں فلیش ایکسپوژر بھی شامل ہے جو لینز میں غیر ضروری روشنی داخل نہیں ہونے دیتا۔

1891ء میں تھامس ایڈیسن کے معاون نے جو اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا تھا اور جس کا نام لاوری ڈکسن تھا، ایک کیمرا متعارف کرایا جسے کائنٹوگرافر نام دیا گیا۔ کیمرے کو طاقت دینے کے لیے بجلی کی موٹر استعمال کی جاتی تھی۔ یہ کیمرا سیکنڈ کے 400ویں حصے میں تصویر کھینچنے پر قادر تھا۔

1923ء میں ایسٹ مین کوڈک نے 16 ملی میٹر کا کیمرا متعارف کرایا جس کی قیمت ایک ڈالر رکھی گئی۔ جب عام لوگوں کو یہ پتا چلا کہ اب وہ خود بھی تصاویر کھینچ سکتے ہیں تو اس پر ٹوٹ پڑے۔

دوڑتی بھاگتی چیزوں کی تصویر لینے کے لیے شٹر کی رفتار زیادہ رکھنا پڑتی ہے۔ روشنی کیسی ہے اس کا بھی دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ اگر روشنی کم ہے تو اپرچر کا کشادہ ہونا ضروری ہے۔ تیز رفتار چیزوں کی تصویر لینے کے لیے آنکھ کو ویو فائنڈر پر رکھتے ہوئے کیمرے کے ذریعے دوڑتی ہوئی چیز کا تعاقب کیا جاتا ہے۔ چاہے وہ ریسنگ کار ہو یا تیز رفتاری سے بھاگتا ہوا درندہ۔ ایسی تصویر لیتے وقت فوٹو گرافر کا تجربہ کام آتا ہے۔

عام کیمرے اور سینما فوٹو گرافی کے لیے استعمال ہونے والے کیمرے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ عام کیمرے سے ایک وقت میں ایک ہی تصویر لی جاسکتی ہے۔ جبکہ سینما فوٹو گرافی کیمرے کے ذریعے یکے بعد دیگرے ایک لمبی فلم پر بہت سی تصاویر اتاری جاتی ہیں۔ اس کیمرے کے برقی نظام کے ذریعے فلم کا رول مطلوبہ رفتار سے چلتا رہتا اور تصویریں تیزی سے اترتی رہتی ہیں۔ کیمرے میں دو اسپول ہوتے ہیں۔ ایک پر سے فلم اترتی رہتی ہے اور دوسرے پر چڑھتی رہتی ہے۔ کیمرے میں دو پلیٹیں بھی ہوتی ہیں جو اسپول کو سیدھا رکھتی ہیں۔ تاکہ فلم ٹھیک سے فوکس ہو سکے۔ جب فلم کیمرے میں چلتی ہے تو ہر فریم علیحدہ عکس لیتا ہے۔ تصویر لیتے وقت کیمرا ہلنا نہیں چاہیے۔ یعنی ہر فریم کی تصویر لیتے وقت اس کا ساکن ہونا ضروری ہے، اسی لیے وہ اسٹینڈ پر رکھا جاتا ہے۔ کیمرے میں دو چار پرزے لگائے جاتے ہیں جو اس کام کو آسان بنا دیتے

ہیں۔فلم کے کنارے پر جو سوراخ ہوتے ہیں وہ بھی اس میں آسانی پیدا کر دیتے ہیں۔ ہر فریم ایک لمحے کے لیے ٹھہر جاتا ہے اور تصویر اتر جاتی ہے۔ایک سیکنڈ میں 24 فریم گزر جاتے ہیں۔مووی کیمرا فرانسس رونالڈس نے 1845ء میں متعارف کرایا تھا۔

جب مووی کیمرا ایجاد ہو گیا تو گھروں میں فلم دیکھنے کے لیے پولینڈ کے ایک سائنسداں نے پروجیکٹر ایجاد کیا۔جس پر پہلے سے کھینچی ہوئی فلم لگا کر چلائی جاتی تھی اور سامنے اسکرین یا پردہ رکھ کر فلم دیکھ لی جاتی تھی۔

اس کے بعد ویڈیو کیمرا (کیمکوڈر) اور ویڈیو ریکارڈر متعارف ہوا جس کی مدد سے آپ اپنے ٹیلی ویژن پر فلمیں دیکھا کرتے تھے۔ یہ چھوٹا ہوتا تھا اور اسے کاندھے پر رکھ کر بھی فوٹوگرافی کی جاسکتی تھی۔اس کی بنیاد مووی کیمرے کی سی تھی۔جسے فلمیں دیکھنے کے علاوہ شادی بیاہ اور دوسری تقریبات میں استعمال کیا جاتا تھا۔اس میں فلم ٹیپ استعمال کیا جاتا تھا۔ویڈیو کیمرے کو ٹیلی ویژن کی براڈکاسٹنگ میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔سب سے پہلے 1983ء میں سونی کمپنی نے عام افراد کے لیے کیمکوڈر بنایا۔اسی سال جے وی سی نے بھی کیمکوڈر متعارف کرایا۔اس کے بعد پیناسونک اور ہٹاچی نے بھی اپنے کیمکوڈر مارکیٹ میں فروخت کے لیے پیش کیے۔

اس کے بعد 2006ء میں اس ٹیکنیک نے ترقی کی اور ڈیجیٹل کیمرا متعارف ہوا۔جس میں ٹیپ کے بجائے کیسٹ استعمال ہونے لگا۔سب سے پہلے ویڈیو کیسٹ ریکارڈر کو جے وی سی اور سونی کمپنی نے بنایا۔جب کہ 1992ء میں امپکس نے بھی یہی چیز متعارف کرائی۔اس میں میموری کارڈ لگائے جاتے تھے، جسے ایکسٹرنل اسٹوریج بھی کہتے ہیں۔

مزید ترقی یہ ہوئی کہ میموری کارڈ کی جگہ بلٹن اسٹوریج نے لے لی۔اس میں یہ سہولت بھی تھی کہ زیادہ تصاویر محفوظ کرنے کے لیے ایکسٹرنل میموری کارڈ بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد تھری ڈی متعارف ہوئی۔اس میں بیک وقت تین کیمرے ریکارڈنگ کرتے تھے۔دائیں بائیں اور سامنے۔ان تینوں کو یکجا کر کے جو فلم بنائی گئی اسے تھری ڈی کہا جاتا ہے۔2010ء میں جیمز کیمرون نے اپنی فلم "اوتار" اسی ٹیکنیک پر بنائی تھی۔ 2011ء میں پیناسونک کمپنی نے ایسا کیمکوڈر متعارف کرایا جو تھری ڈی شوٹنگ کر سکتا ہے۔

بات یہاں ختم نہیں ہوئی۔ٹیکنیک نے مزید ترقی کر لی ہے، اب کسی منظر کو شوٹ کرنے کے لیے چھ کیمرے استعمال ہونے لگے ہیں۔جس سے دیکھنے والا خود کو اس منظر کا حصہ سمجھتا ہے اور اسے قطعی خیال نہیں ہوتا کہ وہ کوئی مصنوعی چیز دیکھ رہا ہے۔سارا منظر مطابق باصل ہوتا ہے۔

موبائل اب اتنا عام ہو چکا ہے کہ اس کے بارے میں سمجھانے کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔مگر اس میں جدت نگاروں نے فوٹوگرافی کے لیے کیمرا بھی منسلک کر دیا اور اسے اپنی جیب میں رکھا جاسکتا ہے۔سب سے پہلا کیمرا فون جاپان میں 2000ء میں فروخت کیا گیا۔یہ ڈیجیٹل کیمرے سے زیادہ سادہ ہوتا ہے اور لینز کی بنا پر کم روشنی میں بھی فوٹو کھینچ لیتا ہے۔اس میں علیحدہ سے فلیش لائٹ نہیں لگی ہوتی ہے بلکہ فلیش اندر ہی ہوتی ہے۔اس میں میموری کارڈ ہوتا ہے جسے حسب منشا نکالا جاسکتا ہے۔اس کے علاوہ اس میں بلیوٹوتھ اور وائی فائی بھی ہوتا ہے۔کیمرے کو آپریٹ کرنے کے لیے اس کا بٹن علیحدہ ہوتا ہے۔کیمرے کی کارکردگی بڑھانے کے لیے باہر سے بیٹری یا فلیش لائٹ لگائی جاسکتی ہے۔اس سے جتنی بھی تصاویر کھینچی جاتی ہیں وہ اندرونی میموری میں درج ہو جاتی ہیں۔اس میں ایکسٹرنل میموری بھی ہوتی ہے اس لیے تصاویر اس میں بھی جمع کی جاسکتی ہیں۔۔۔۔ سے پہلا اسمارٹ فون نوکیا نے مارکیٹ میں متعارف کرایا تھا۔اسی کمپنی نے اب تک دنیا میں سب سے زیادہ کیمرے فروخت کیے، جن کی تعداد تقریباً ایک ارب ہے۔جس میں پاور بہت کم استعمال ہوتا ہے۔آج کل فروخت ہونے والے کیمرا فون میں سی ایم او ایس (CMOS) امیج سنسر ٹیکنالوجی استعمال ہو رہی ہے۔اس کے ذریعے سات منٹ تک کی ویڈیو بھی بنائی جاسکتی ہے۔

وہ تصاویر جو اسمارٹ موبائل فون سے کھینچی جاتی ہیں نہایت آسانی سے کمپیوٹر میں محفوظ کی جاسکتی ہیں۔اس کے علاوہ دوسروں کو بھیجی جاسکتی ہیں، کہ جس میں تار استعمال نہیں ہوتا۔چنانچہ (غیر ملک میں) قانون کے رکھوالوں نے عام افراد کی حوصلہ افزائی کی ہے کہ وہ چھپ چھپا کر ایسے اشخاص کی تصویریں کھینچ سکتے ہیں جو کسی جرم میں ملوث ہیں۔اس کے بعد فوراً ہی ان تصاویر کو پولیس اسٹیشن کی ای میل پر روانہ کر سکتے ہیں۔

اب تک جن کمپنیوں نے موبائل کیمرا فون بنایا ہے، ان میں توشیبا، شارپ، نوکیا، سانیو، سیمسنگ، موٹرولا، ایپل اور ایل جی الیکٹرونکس شامل ہیں۔

قسط نمبر: 10

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

رانا بشیر کی بیوی کا قتل ہوگیا تھا اور الزام آیا تھا احمد حسین پر۔ اس جرم میں اسے پھانسی ہوگئی۔ احمد حسین کا بیٹا نعمان ایڈووکیٹ زنیرہ کے ساتھ مل کر اصل قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران رانا بشیر اپنی بیٹی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ معافی مانگنے آیا تھا کیونکہ اب اسے بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری اڈے کی یونین میں نائب ضلعی صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ اڈا ختم ہو جائے اور اس کی زمین پر عمارت بنا کر فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ تندہی سے کام کر رہے تھے لیکن ان کی چال نعمان انہی پر الٹ دیتا۔ ابھی وہ اس مسئلے پر غور کر ہی رہا تھا کہ رانا بشیر کی بیٹی نے اسے ایک ڈائری دی جو مقتولہ کی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ان دونوں مسئلوں پر کام کر ہی رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی نعیم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا کہ ہم ایک جوان بہن کے بھائی بھی ہیں اس کے لیے کچھ سوچنا چاہیے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہنا کو اکثر رات میں کسی سے فون پر بات کرتے دیکھا ہے۔ باتوں سے لگا کہ وہ کسی کو پسند کرنے لگی ہے۔ نعیم کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرحانہ کا میسج آگیا کہ اسے ڈائری کا پارٹ ٹو مل گیا ہے۔ اگلے دن زنیرہ کے ساتھ میں فرحانہ کے گھر گیا تو ڈائری کے واقعات نے جس نے رفعت قتل کے واقعے کو مزید الجھا دیا تھا۔ اس دن میں اڈے پر بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آگئے۔ ان میں عزیر خان بھی تھا جس کو اختر کی بہن ثوبیہ کی گمشدگی کا ذمے دار سمجھا جا رہا تھا۔ میں نے عزیر خان سے کہا کہ آپ سے مل کر خوشی ہوئی ہے۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ کاروباری حضرات کو بھی سہولت ملے لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ معاہدہ پارٹنرشپ پر ہو لیکن ان لوگوں نے منع کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد میں سستا رہا تھا کہ کالیا کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ عارف پھندر جیل سے فرار ہوتے ہوئے مارا گیا۔ یہ خبر سنتے ہی میں الجھ گیا۔ گڈز ٹرانسپورٹ کی گاڑیاں آنی شروع ہوگئی تھیں۔ سدو بھائی نے اطلاع دی تھی کہ گڈز کی آڑ میں منشیات کا کاروبار ہوتا تھا۔ سدو کو رخصت کر کے میں بیٹھا ہی تھا کہ کالیا آگیا۔ اس نے بتایا کہ میری ضمانت منسوخ ہو چکی ہے اور مجھے گرفتار کرنے کے لیے ایس ایچ او دلاور خان آ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ باہر نکلا اور اس کی بائیک پر بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ کالیا کے اڈے پر پہنچا تھا کہ بہن کا فون آگیا۔ اس نے بتایا کہ پولیس گھر پر آئی تھی اور نعیم کو لے گئی ہے۔ مجبوراً میں نے گرفتاری دے دی۔ وہاں مجھ پر تشدد بھی ہوا۔ میں حوالات میں بیٹھا تھا کہ ایک سپاہی نے آکر ایک اخبار دیا۔ اخبار میں چھپی خبر دیکھ کر میں پریشان ہو اٹھا۔ نعیم کے چھپڑ نے مجھے بکھلا دیا تھا۔ وہ چھپڑ مار کر باہر نکل گیا تھا۔ میں اڈے پر پہنچا تو وہاں صوبیہ کے قتل میں ملوث عزیر نظر آگیا۔ میں اس کے دفتر میں پہنچا اور ان سے صوبیہ کے متعلق پوچھا۔ وہ گھبرا اٹھا۔ میں نے کہا کہ یہ سوال پولیس بھی پوچھے گی اور وہاں سے اٹھ آیا۔ رانا بشیر کے ہاں پہنچا پھر میں نے ٹرک ڈرائیور کی گلوخلاصی کرا دی جس کے ٹرک نے زونیرہ کی کار کو ہٹ کیا تھا۔ گھر آیا تو کاشف ملنے آگیا جو میری بہن کو چاہتا تھا۔ وہ بھی اس کا سن کر پریشان ہوگیا۔ پھر اسی رات کالیا کے ساتھ ہم سیٹھ ستار کے بنگلے میں داخل ہوئے۔ وہاں روزی نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ سیٹھ ستار نے کہا کہ اس نے میری بہن کو ایک جگہ چھپا رکھا ہے ابھی بلواتا ہوں کہہ کر اس نے کسی کو فون کیا کہ لڑکی کو لے کر آ جائے۔ تبھی روزی نے کہا کہ سیٹھ ستار جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے لڑکی کو گلشن حدید میں کہیں اور رکھا ہے پھر اس نے بتایا کہ میں سیٹھ ستار سے اپنی بہن کا بدلہ لینے کے لیے اس کے ساتھ ہوں۔ بعد میں اس کا کہا سچ نکلا۔ اس کے آدمیوں نے مجھے بھی زخمی کر دیا۔ ساتھیوں سے نمٹ کر میں نے سیٹھ سے اگلوالیا کہ عاصمہ کو کہاں رکھا ہے اسے باحفاظت نکال لایا پھر روزی کے اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ یہ اس کی سہیلی کا فلیٹ تھا۔ ہم اس سے بات کر رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر باہر سے آواز آئی۔ ''کیبل والا، بل لے کر آیا ہوں۔'' روزی نے دروازہ کھولا تو کیبل والے کو دھکا دے کر دو مسلح شخص اندر آگئے۔ اس سے نمٹ کر میں نے انسپکٹر کامران کو فون پر کہا کہ روزی کی حفاظت کے لیے دو پولیس والے بھیج دو۔ پھر میں... کالیا کے ساتھ باہر آگیا۔ انسپکٹر کامران کی معرفت کئی ایک کو گرفتار کرایا پھر زنیرہ کے گھر پہنچا۔ کچھ ضروری باتیں کر کے میں باہر نکلا تھا کہ ایک ٹیکسی پر نظر پڑی۔ میں اسے نظرانداز کرتا کہ اس ٹیکسی میں بیٹھا ایک شخص اتر کر زنیرہ کے دروازے پر پہنچا۔ میں ہوشیار ہوگیا اور بھاگتا ہوا زنیرہ کے پڑوس والے گھر میں داخل ہوگیا اور چھت کے ذریعے زنیرہ کے گھر میں اتر گیا۔ ٹھیک اسی وقت نیچے سے گولی چلنے کی آواز آئی اور ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔

(اب آگے پڑھیں)

گولی چلنے کی آواز اور اس کے ساتھ ہی ایک نسوانی چیخ ابھری جسے سن کر میرے تیزی سے دھڑکتے دل میں پہلا ہولناک خیال زنیرہ کے سلسلے میں یہی ابھرا تھا کہ کہیں وہ خدانخواستہ دوسری بار دشمنوں کی سفاکی کا نشانہ نہ بن گئی ہو؟

میں جب تک نیچے صحن میں جانے والی سیڑھیوں کے قریب پہنچ چکا تھا گویا میری ٹانگوں میں جیسے بجلیاں بھر گئی تھیں۔ میں دو، دو، تین، تین قدمچے پھلانگتا ہوا صحن میں تقریباً آگرا تھا اور سنبھلتے سنبھلتے میں نے ایک چونکا دینے والا غیر متوقع منظر دیکھا تھا۔ ایک گٹھیلے جسم کا شخص، جس کے دائیں پہلو سے خون رس رہا تھا، اپنے زخم پر ہاتھ رکھے ہوئے، لڑکھڑاتے قدموں سے نکاسی کے دروازے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ میں ہکابکا سا رہ گیا تھا۔

''رک جاؤ ورنہ دوسری گولی چلا دوں گی۔'' اچانک اسی کمرے سے میں نے ایک اور ناقابلِ یقین منظر دیکھا، وہ زنیرہ تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں اسٹیل کا ایک اعشاریہ ڈبل ٹو بور کا لیڈیز پسٹل تھا۔ اس کے عقب میں خالہ نجو ہراساں

انداز میں چیختی ہوئی لپکی تھیں۔ وہ زنیرہ کو اس اجنبی کے پیچھے جانے سے روکنے کی کوشش میں تھیں۔ گولی چلنے کے بعد وہ نسوانی چیخ شاید خالہ نجو کے ہی حلق سے برآمد ہوئی تھی۔ دونوں خواتین مجھے دیکھ کر چونکی بھی تھیں۔

تب ہی میں پل کے پل میں معاملے کی تہ تک پہنچ گیا، تب ہی میرے دم بہ خود وجود میں جیسے لاوا سا دوڑ گیا۔ وہ آدمی ابھی دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ میں نے اپنی جگہ سے جست بھر کر اسے دبوچ لیا۔ وہ پہلے ہی زنیرہ کی چلائی ہوئی گولی سے بے حال تھا اور تیزی اس کے وجود سے عنقا تھی۔ میں نے اسے دبوچ کر پٹخنی بھی دے ڈالی۔ وہ گھومتا ہوا زنیرہ کے قدموں میں جا گرا۔

زنیرہ کے چہرے کی دلکشی اور صباحت کی جگہ پر غیظ نے لے رکھی تھی۔ اس نے ہنوز اپنے لیڈیز پسٹل کا رخ اسی کی طرف کر رکھا تھا اور وہ اسی لہجے میں حملہ آور کو دھمکاتے ہوئے بولی۔ ”خبردار! اب اگر کوئی حرکت کی تو گولی تمہارے سر میں اتار دوں گی۔“

”زنیرہ! یہ پستول مجھے دو اور تم جلدی سے رسی لے آؤ۔“ میں نے اس سے کہا تو زنیرہ نے فوراً میری ہدایت پر عمل کیا۔ وہ پسٹل مجھے تھما کے اندر سے رسی لے آئی۔ اس آدمی کی حالت پہلے ہی غیر ہو رہی تھی۔ پھر بھی احتیاط کے پیش نظر میں نے صرف اس کی دونوں ٹانگیں ہی جکڑنا ضروری سمجھا تھا۔

”تم پولیس کو فون کرو۔“ میں نے زنیرہ سے کہا۔ اسی وقت باہر سے دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔

”دروازہ کھولو۔ کیا ہو رہا ہے اندر۔“

وہ محلے ہی کے لوگ تھے اور کوئی بعید نہ تھا کہ ان میں وہ پختہ عمر شخص بھی شامل ہو جس کے گھر میں زبردستی گھس کر میں نے ان کے مکان کی چھت ناپی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔

”کیا ہوا ہے بھائی؟ خیریت ہے؟“ کسی نے مجھ سے پوچھا۔ ان سب کی نظروں میں تشکیک کے سائے تھے جبکہ مذکورہ شخص شبے کی کڑوی کسیلی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔

”اندر وکیلہ صاحبہ رہتی ہیں، وہ تو ٹھیک ہے ناں؟ آخر ہوا کیا ہے، یہ گولی چلنے اور چیخوں کی آوازیں کیسی تھیں؟“

”بھائیو! کوئی چور گھسا تھا اندر مگر وکیلہ صاحبہ نے اپنے پستول سے اسے زخمی کر دیا ہے۔“ میں نے انہیں بتایا۔

”بھائی! تم خود کون ہو؟ پہلے بھی تو محلے میں نظر نہیں آئے؟“ ایک نے پوچھا تو وہی پختہ عمر آدمی بولا۔

”یہ بھی چور کا ساتھی ہے۔ اپنے ساتھی کو بچانے کے لیے زبردستی میرے مکان کی چھت پر اور......“

”آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ یہ میرے عزیز ہیں۔ میں انہیں جانتی ہوں۔“ زنیرہ نے کہا۔ باتوں کی آوازیں سن کر وہ بھی دروازے پر آ گئی تھی۔ زنیرہ کی بات سن کر خاموش ہو رہا۔

”ہم نے پولیس کو فون کر دیا ہے، وہ ابھی پہنچنے ہی والی ہے۔“

”میں نے ون فائیو پر اطلاع دے دی ہے۔“ وہی شخص بولا۔

”اچھی بات ہے۔“ زنیرہ نے کہا اور پھر ان کا شکریہ ادا کر کے دروازہ بند کر دیا۔ ہم دونوں واپس ہوئے۔ زخمی حملہ آور صحن کے فرش پر پڑا کراہ رہا تھا۔

باہر ابھی تک لوگوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ انہیں تو تماشا چاہیے باتوں کی بھنبھناہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔

”اسے مرنا نہیں چاہیے۔ ہمیں کم از کم اسے فرسٹ ایڈ تو دے دینی چاہیے۔“ میں نے خاصے تفکر سے کہا۔ مخاطب زنیرہ تھی، وہ جواباً بولی:

”پولیس کے ساتھ میں نے ایمبولینس کو بھی فون کیا ہے۔“

”مددگار“ تھانہ قریب ہی تھا۔ پولیس آن پہنچی، ایمبولینس بھی ساتھ تھی۔ تھانہ انچارج ایک نوجوان سا ایس آئی تھا۔ سینے پر اختر کے نام کا بیج لگا تھا۔ اس نے ہم دونوں سے بیان لیا۔ زنیرہ نے اپنا تعارف جب ہائی کورٹ کی وکیل کی حیثیت سے کروایا تو وہ خاصا مرعوب نظر آنے لگا۔

زنیرہ اور میں نے اسے صرف متعلقہ حالات کے بارے میں مختصراً بتایا اس کے بعد اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”ایڈووکیٹ زنیرہ پر یہ دوسرا قاتلانہ حملہ ہے۔ پہلے والے حملے کے کیس سے متعلق تھانہ ملیر شرقی میں تفتیش جاری ہے۔ یہ اسی سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ ہمارے دشمن کون ہیں یہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں اور بہ احسن خوبی ہم ان تک قانونی تقاضے پورے کرتے ہوئے پہنچنے والے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ خود کو کسی آزمائش میں ڈالے بغیر ہماری گزارش کے ساتھ اس کیس کو انسپکٹر کامران کے سپرد کر دیں گے، جو آل ریڈی اس کیس پر کام کر رہے ہیں۔“

سب انسپکٹر سمجھدار ثابت ہوا، وہ میری بات کا اشارہ سمجھ گیا اور پھر اس نے وہی کیا۔

اگلے چند گھنٹوں بعد ضابطے کی کارروائی مکمل ہو چکی تھی۔ حملہ آور کو پولیس کسٹڈی میں اسپتال لے جایا گیا تھا۔ وہاں سے خبر آئی کہ انسپکٹر کامران نے تین پولیس اہلکاروں کو متعین کردیا ہے۔

"دشمنوں کے جتنے گماشتے پکڑے جائیں گے اتنا ہی ان کے گرد گھیرا تنگ ہو جائے گا۔" زنیرہ نے مجھ سے کہا۔ موجودہ حالات نے اسے کافی نڈر بنا دیا تھا۔ اس کے چہرے سے لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ کچھ دیر پہلے ایک اور قاتلانہ حملے سے بال بال بچی تھی، البتہ خالہ نجو ابھی تک فکرمند اور ہراساں نظر آرہی تھیں۔ پھر بھی انہوں نے چائے کا انتظام کردیا تھا اور ضروری دوڑ دھوپ کے بعد ہم بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

"ہاں!" میں نے جواب میں خالی کپ تپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اسی لیے میں ہر وقت انسپکٹر کامران کے ساتھ رابطے میں رہتا ہوں۔ عزیر خان بھی پولیس کی گرفت میں ہے۔ ثوبیہ کے قتل کا اس پر کیس پکا ہے۔ مہران خان اپنے لاڈلے بیٹے کی ضمانت کے لیے بھاگ دوڑ میں مصروف ہے، سیٹھ ستار کا ثاقب نامی آدمی قابو میں آگیا ہے۔ اسے ذرا دھمکا کر اور کچھ اس کا ضمیر جگا کے اس کی مدد حاصل کی جانے کی اُمید تو ہے مگر بہ قول کالیا ثاقب پر اتنی جلدی بھروسا کرنا خطرناک ہوگا جبکہ روزی کی شکل میں بھی سیٹھ ستار کے گلے کی رسی پہلے ہی تیار ہے۔"

"او اٹس گریٹ۔" زنیرہ متاثر کن انداز میں مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولی۔ "ایک دم فاسٹ جارہے ہو نومی تم! میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔" ایک لمحہ توقف کے بعد وہ دوبارہ بولی۔ "تمہارے بھائی فہیم کی کوئی خبر؟"

بھائی کے ذکر پر میرا چہرہ اداسی کی تصویر بن گیا۔ میں نے فہیم سے متعلق تازہ صورتِ حال سے آگاہ کیا تو پل کے پل اس کے چہرے سے تھوڑی دیر پہلے والی متوقع کامیابی کی خوش اُمیدی عنقا ہونے لگی اور اس کی جگہ فکر و تشویش نے لے لی، پھر وہ اسی لہجے میں بولی۔ "نومی! یہ اچھا نہیں ہوا۔ دشمن ہمارے کامیابی کی طرف بڑھتے سفر کو ناکام بنا سکتے ہیں۔ تم سمجھ رہے ہو ناں میری بات؟"

ایڈووکیٹ زنیرہ کے دل میں بھی وہی خدشہ ابھرنا عین امر تھا جو میرے اندر بھی پل رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"اسی بات کی تو مجھے فکر ہے لیکن ایسا تب ہوگا جب فہیم سیٹھ ستار یا مہران خان کی قید میں ہو۔"

"کیا مطلب؟" زنیرہ نے قدرے چونک کر مجھے ہوئے انداز میں کہا۔ "ان کے علاوہ بھلا اور ایسا کون سا نیا دشمن پیدا ہوگیا؟"

"دشمن تو وہ بھی پرانا ہی ہے میرا۔" میں نے اسرار بھرے انداز میں کہا۔

"کون؟" زنیرہ نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"پردہ نشین۔"

"پردہ نشین؟"

"ہاں۔"

"یہ کون ذات شریف ہیں؟"

"میرا اصل دشمن جس کی مجھے تلاش ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے وہی لوگ جنہوں نے تمہارے والد کو بے گناہ پھانسی کے پھندے پر چڑھایا؟"

"ہاں!"

"کیا تمہارا اس سے کوئی رابطہ ہوا ہے؟"

"تم شاید بھول رہی ہو یا میں تمہیں بتانا بھول گیا۔ ایک شخص کا کچھ روز پہلے فون آیا تھا۔ میں اس وقت اپنی مہران میں تھا اور کالیا بھی میرے ساتھ تھا، پولیس اسٹیشن جارہے تھے کہ راستے میں اس کی میرے موبائل پر کال آئی تھی۔ وہ مجھ سے یہی کہہ رہا تھا کہ 'جو ہوگیا اسے جانے دو اور جو ہو رہا ہے اسے مت روکو ورنہ تمہارا انجام بھی تمہارے باپ سے مختلف نہ ہوگا۔'"

"اوہ۔" زنیرہ کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔

"میں اسی لیے اسے پردہ نشین کہتا ہوں کیونکہ پردے کے پیچھے رہتے ہوئے وہ میری ایک ایک حرکت پر نگاہ رکھے ہوئے ہے اور میں اسے نہیں دیکھ پا رہا ہوں۔"

"لیکن اتنے عرصے بعد اس کا تم سے رابطہ کرنا۔ بتا رہا ہے کہ وہ تمہاری مہم جوئیوں سے پریشان ہوگیا ہے جس کا ثبوت اس کی فون کال ہے۔" زنیرہ نے کہا۔

"درحقیقت وہ پردے کے پیچھے نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "بلکہ اس نے ایک ڈری سہمی بلی کی طرح خود کو تھیلے میں بند رکھا ہوا ہے۔ میری کوششیں اسے باہر نکلنے پر مجبور کردیں گی۔"

زنیرہ میری بات پر پُرخیال انداز میں اپنے سر کو جنبش دینے لگی۔

"میں آج شام رانا بشیر کے ہاں جانے کا ارادہ رکھتا

ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اس معاملے کو جتنی تیزی سے آگے بڑھاؤں گا اتنا ہی وہ پردہ نشیں بے چین ہو کر پردے سے باہر آنے پر مجبور ہو جائے گا۔''

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک میرے سیل کی بیل گنگنائی۔ یہ سدو بھائی کی کال تھی۔

''ہاں! کہو کیا رپورٹ ہے؟'' میں نے دھڑکتے دل مگر گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

''جناب! اس لڑکے کا میں نے پتا لگا لیا ہے۔'' اس نے جواب دیا اور میری ساری حسیات جیسے سمٹ کر کانوں کے پردوں سے چپک گئیں۔ ''اس لڑکے کا نام ثمیر ہے۔ وہ ایک بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ باپ کا نام شاہ میر ہے جو ایک خلیجی ریاست کی بڑی آئل کمپنی کا چیئرمین ہے۔ وہ عموماً ملک سے باہر اور خلیجی ریاستوں کے دورے پر رہتا ہے۔ رہائش ڈیفنس فیز فائیو میں ہے۔ ایک عالیشان کوٹھی ہے۔ جہاں صرف تین افراد مستقل طور پر رہتے ہیں۔ شاہ میر کی بیوی لیلیٰ صماد جو ایک عربی خاتون ہے۔ اس کا جوان بیٹا ثمیر شاہ اور اس سے ایک سال چھوٹی بیٹی کاشفہ۔ شاہ میر مہینے دو مہینے بعد اپنے پرائیویٹ طیارے میں آتا جاتا رہتا ہے۔''

میں نے غور سے سدو بھائی کی ان معلومات کو ذہن نشین کیا اور توصیفی لہجے میں بولا۔ ''گڈ! اب مجھے ذرا رانا بشیر کے بارے میں بتاؤ کہ اس سے متعلق تم نے اب تک کوئی غیر معمولی بات محسوس کی؟''

''جی جناب!'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

''بولتے جاؤ، میں سن رہا ہوں۔''

''جناب! رانا بشیر امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتا ہے۔ شاہراہ فیصل میں اس کا دفتر ہے۔ اس کے پاس کاروباری افراد آتے جاتے رہتے ہیں۔ بڑی مشکلوں سے صرف ایک ہی غیر معمولی بات کا پتا لگا سکا ہوں جناب! وہ بتانے لگا اور لحہ بھر کو سانس لینے کے لیے رکا۔ میں پورے دھیان اور دھڑکتے دل سے اس کی منتظر رہا۔ اگلے لمحے وہ مزید بتانے لگا۔ ''وہ کسی ایسے شخص کی وجہ سے پریشان ہے جو اسے دفتر کے نمبر پر فون کرتا ہے، میرا خیال ہے وہ رانا بشیر کو کسی وجہ سے بلیک میل کر رہا ہے اور اس سے اپنا کوئی مطالبہ منوانا چاہ رہا ہے۔''

''وہ اس سے کیا باتیں کرتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تین بار اس آدمی کی کال آئی تھی۔ پہلی بار کی گفتگو میں نہیں سن سکا تھا، دوسری بار ادھوری سنی تھی البتہ تیسری بار کی گفتگو اگرچہ مختصر تھی اور میرا خیال ہے یہی زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔''

''کس لیے اہمیت کی حامل تھی؟''

''اس شخص نے رانا بشیر کو کل ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے کمرا نمبر 57 میں بلایا ہے، شاید کوئی اہم گفتگو کرنی ہے۔''

''کتنے بجے بلایا ہے؟'' میں نے فوراً پوچھا۔

''نو بجے۔''

''کچھ ساتھ لانے کو کہا تھا رانا بشیر سے؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''جی جناب! کوئی اہم نوعیت کا کاغذ تھا وہ۔ یا پھر شاید کسی معاہدے کا پیپر یا خط وغیرہ۔''

''سدو!''

''جی جناب!''

''اس ہوٹل تک ساتھ رہ سکتے ہو؟''

''بالکل سر! مگر میں دوسرے بھیس میں ہوں گا۔''

''چلے گا۔ ایک بات اور۔'' میں نے کہا۔ ''کوئی ایسا طریقہ سوچ کر رکھو جس سے ہم مذکورہ ہوٹل میں داخل ہو کر آرام سے ان دونوں کی گفتگو سن سکیں۔''

''جناب! آپ اس کے لیے کل ٹھیک آٹھ بجے میرے پاس پہنچ جائیں۔''

''گڈ۔ میں آجاؤں گا۔''

''میں منتظر ہوں اور کوئی طریقہ بھی تیار کیے رکھوں گا۔'' سدو بھائی نے جواب دیا اور میں نے ایک بار پھر اس کے لیے توصیفی انداز میں اختتامی جملہ ادا کیا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔

''کس کی کال تھی؟'' زنیرہ نے پوچھا۔

''میرے ایک مخبر کی۔''

''کوئی خاص بات بتا رہا تھا تمہیں۔'' اس نے کہا۔

''ہاں! باقی کل۔ میں اب چلوں گا۔ اپنا خیال رکھنا۔''

''تھینک یو تومی!'' وہ آخر میں کھڑے ہو کے مجھے رخصت کرتے ہوئے بولی۔

''کس بات کا؟'' میں نے حیران مگر مسکراتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم میری مدد کو پہنچ گئے تھے۔''

''یہ اتفاق ہی تھا کہ مجھے اچانک ان دونوں افراد پر شبہ

ہو گیا تھا، افسوس کہ اس کا دوسرا ساتھی جو باہر ٹیکسی میں بیٹھا تھا، فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔"

"نہیں نومی! یہ اتفاق نہ تھا بلکہ میرے لیے تمہاری غیر معمولی احتیاط کا زیادہ دخل تھا اس میں۔" وہ بولی۔

"اب میں چلوں گا۔ بہنا اکیلی ہے گھر میں۔ کل بہت کچھ واضح ہو جائے گا۔" میں نے ایک دبے دبے جوش تلے کہا اور پھر اسے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔

میں زنیرہ کے گھر سے نکلا تو چند لوگوں کو باہر کھڑے پایا۔ وہ میری جانب عجیب عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگے۔ میں ان کی پروا کیے بغیر اپنی کار میں بیٹھا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ملیر جانے کے لیے میں جیسے ہی شاہراہ فیصل پر آیا تو یہاں ٹریفک کا سیلاب امڈا پڑا تھا۔ ٹریفک کا یہ سیلاب شام چھ بجے کے بعد سے ہی زور پکڑنے لگتا اور رات بارہ بجے تک عروج پر رہتا۔

کراچی میں کل گرمی زوروں پر تھی حبس کی کیفیت سوا تھی۔ میں نے کار کے شیشے چڑھا کر اے سی آن کر لیا تھا کیونکہ ٹریفک سست روی کا شکار تھی بلکہ کہیں پر تو بمپر ٹو بمپر چل رہی تھی، بالکل چیونٹی کی رفتار سے۔ باوجود اس کے میرا ذہن ان گنت سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مافیا کی چیفس دشمنوں (سیٹھ ستار اور حاجی مہران خان وغیرہ) کو چھوڑ کر اب میرا سارا دھیان اپنے اصل دشمن، اس پردہ نشین کی طرف چلا گیا تھا۔ اس کی ایک بار ہی کال آئی تھی اور مجھے اس کا لب ولہجہ، آواز سب اچھی طرح سے ذہن نشین ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی اصل آواز میں ہی مجھ سے بات کر رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ میں جیسے جیسے رفعت خانم مرڈر کیس پر چھائی ہوئی گرد کو تہ در تہ صاف کرنے میں مصروف تھا، اس نے "پردہ نشین" کو گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس سے پہلے یقیناً وہ پردے کے پیچھے خاموش بیٹھا تماشا دیکھ رہا تھا مگر جب اسے میرے کامیابی کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کا اندازہ ہوا تو وہ بلبلا اٹھا اور گمنام کال کے ذریعے مجھے دھمکانے پر اتر آیا۔ یہ کامیابی اپنی جگہ مگر مجھے محض اسی خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہوئے احتیاط کا دامن بھی نہیں چھوڑنا تھا کہ جو شخص بڑی صفائی سے نہ صرف رفعت خانم کا قتل کر سکتا ہے بلکہ خود کو بچا کر کسی بے گناہ کو تختہ دار پر بھی چڑھا سکتا ہے تو وہ کتنا چالاک اور خطرناک مجرم ہوگا۔

اچانک میرے موبائل کی بیل گنگنائی۔ میں نے اسکرین میں دیکھا اور چونک پڑا۔ وہ ثاقب کی کال تھی۔

"ہاں! ہیلو کوئی خاص بات؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"جی نعمان بات کر رہے ہو؟" دوسری جانب سے ثاقب کی آواز ابھری، اس کا لہجہ عجیب سا ہو رہا تھا، کچھ گھٹا گھٹا سا، جیسے آواز دھیمی رکھنے کی کوشش میں ہو۔

"ہاں۔ نعمان ہی بات کر رہا ہوں۔ آگے بولو۔" میں نے فوراً کہا۔

"آپ کہاں ہیں اس وقت؟"

"میں شاہراہ فیصل پر ہوں۔ اصل بات کرو جلدی۔ ہوا کیا ہے آخر؟" میں نے بے چینی سے کہا۔

"یاسر آیا ہوا ہے۔ سیٹھ صاحب کے پاس۔" اس نے جیسے چونکا دینے والا انکشاف کیا۔

"کیا؟ اس وقت۔ کہاں؟ آفس میں؟" میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"جی ہاں، بوٹ بیسن کے بلیو مون ہائٹس آفس میں۔" اس نے بتایا۔ "بڑی مشکلوں سے باہر نکل کر آپ کو فون کر رہا ہوں۔"

میرا ذہن تیزی سے سوچنے لگا اور پھر یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ "میں ابھی پہنچتا ہوں۔"

کہیں پہنچنے کی جلدی ہو تو ٹریفک کا رش اور زیادہ جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیتا ہے۔ شکر تھا کہ سڑک پر موجود، چیونٹی کی رفتار سے رینگتی ہوئی گاڑیوں کے اژدہام میں، میری کار بائیں جانب کے ایک "کٹ" سے گزر رہی تھی۔ یہ ایک ذیلی راستہ تھا جو لال قلعہ ہوٹل اور دیگر راستوں کو "ٹچ" کرتا تھا۔ میں نے فوراً اسٹیئرنگ بائیں جانب گھمالیا اور رفتار بڑھا دی۔ میں تیزی کے ساتھ آگے سے ایک چکر کاٹ کر دوسری شاہراہ پر آ گیا۔ یہاں نسبتاً کم رش تھا۔ تاہم میں "فاسٹ لائن" میں کار دوڑاتا ہوا ڈیفنس اور وہاں سے بوٹ بیسن جا پہنچا۔

میں نے ثاقب کو میسج کر دیا کہ میں آ چکا ہوں اور بلیو مون آفس کے سامنے اپنی کار میں موجود ہوں۔ یاسر جیسے ہی باہر نکلے مجھے اس کے حلیے سمیت اس کی ڈریسنگ کے بارے میں بھی آگاہ کر دے۔

جلد ہی اس کا ریپلائی آ گیا۔ یعنی "اوکے۔"

میں نے اپنی کار بلیو مون ہائٹس کی عمارت کے سامنے ذرا دور دو ٹیکسیوں کے قریب کھڑی کر دی۔ روڈ لائٹس روشن تھیں، گاڑیوں کی گزرتی ہوئی تیز ہیڈ لائٹس نے بھی اس

شاہراہ پر روشنیوں کا سیلاب سا امڈا رکھا تھا۔ اچانک میسج کی ہلکی ٹون بجی۔ میں نے جھپٹ کر برابر کی سیٹ پر رکھا موبائل اٹھالیا۔

"وہ باہر نکل رہا ہے۔ درمیانی جسامت کا ہی آدمی ہے۔ عمر پینتیس چالیس کے درمیان ہے۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی ہے۔"

میں نے فوراً کار اسٹارٹ کی اور عقابی نظروں سے بلیو مون کے شیشے والے دروازوں کی طرف دیکھنے لگا، چند ہی سیکنڈوں بعد مجھے ایک درمیانی جسامت کا شخص جس نے ہلکے نیلے رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی، دروازے سے باہر نکلتا دکھائی دیا۔ میرے اعصاب یکلخت تن گئے۔

میں نے اسے ایک بار بردار سوزوکی "منی ٹرک" میں سوار ہوتے دیکھا جو خالی تھی، میں نے سب سے پہلے نہایت ہوشیاری اور چابک دستی کے ساتھ اپنے کیمرے کے ذریعے اس کی دو تین تصاویر لے لیں۔ جب وہ بلیو مون کے دفتر کے صدر دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔

وہ بار بار اپنی قمیص کی پہلو والی جیب کو تھپتھپا رہا تھا۔ ذرا ہی دیر میں اس نے سوزوکی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھالی۔ میں نے فوراً اپنی کار اس کے تعاقب میں لگالی۔ میرا چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا۔ سیٹھ ستار کے خلاف ایک اور اہم کلیو میرے ہاتھ لگنے والا تھا۔ میں نے احتیاط کے پیش نظر، کالیا کے سیل پر رابطہ کیا مگر اگلے ہی لمحے مجھے چونکنا پڑا۔ اس کا فون بند جا رہا تھا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی، کیونکہ وہ کبھی بھی اپنا سیل فون آف نہیں کرتا تھا۔ ممکن تھا اس کی بیٹری ختم ہوگئی ہو مگر جلد ہی میں نے اپنے اس خیال کو رد کر دیا کیونکہ وہ چارجنگ پر لگا کر بھی بات کر لیتا تھا۔

بہرطور۔ میرے پاس اس وقت زیادہ سوچنے کا وقت نہ تھا، اس وقت میری اٹینشن اسی سوزوکی منی ٹرک پر مرکوز تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ گزری کے علاقے کی طرف مڑ گئی تھی جو وہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یاسر نامی یہ گماشتہ۔ اسی علاقے کا رہائشی تھا۔ ایک اوور ہیڈ برج جو آگے زمزما اور ڈیفنس کی طرف جاتا تھا اس کے نیچے "گزری" کی آبادی تھی۔

سوزوکی ایک گلی میں مڑ گئی۔ سوزوکی منی ٹرک زیادہ بڑا نہیں ہوتا۔ میں نے بھی اپنی مہران کار گلی میں داخل کر دی۔ سوزوکی کچھ آگے جا چکی تھی۔ یہاں زیادہ تر متوسط اور مزدور طبقہ آباد تھا۔ گلی میں عام سے چھوٹے بڑے مکانات نظر آ رہے

شرم

ایک دفعہ ایک خاص عمر کے آدمی کی آنکھوں کا آپریشن ہوا۔ ڈاکٹر نے احتیاط اور پرہیز بتایا اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ نماز میں جھکنے سے گریز کریں اور اشاروں میں نماز پڑھ لیں۔ گھر آجانے کے بعد بزرگ نے کھانا پینا کم کر دیا۔ اس کے گھر والوں کو پریشانی ہونے لگی تو انہوں نے ڈاکٹر سے دوبارہ رجوع کیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ہوسکتا ہے روٹی چبانے یا کھانے سے آنکھوں میں درد ہوتا ہو، اس لیے اسے کھانے کو نرم غذا دیں۔ تین دن گھر والے نرم چیزیں دینے کی کوشش کرتے رہے لیکن بزرگ نے وہ بھی نہ کھائیں۔ کچھ دنوں بعد پریشان ہونے کے بعد گھر والوں نے بزرگ سے پوچھا کہ آپ کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟ ڈاکٹر نے تو سجدہ کرنے سے منع کیا تھا۔ کھانا کھانے سے تو نہیں روکا تھا۔ پھر آپ کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ اس نے کہا کہ جس کا رزق ہے اس کو سجدہ نہیں کرسکتا۔ اس لیے اس کا دیا ہوا رزق کھانے سے شرم آتی ہے۔

مرسلہ: منشی محمد عزیز مئے۔ لڈن وہاڑی

عشق کے درجات

حضرت خواجہ بندہ نوازؒ فرماتے ہیں، عشق کے پانچ درجے بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا درجہ شریعت ہے، جمال محبوب کی صفت سننا تاکہ شوق پیدا ہو، دوسرا درجہ طریقت ہے۔ یعنی محبوب کی تڑپ کرنا اور اس کے بتائے ہوئے صراط مستقیم پر چلنا، تیسرا درجہ حقیقت ہے۔ یعنی ہمیشہ محبوب کے خیال میں گم رہنا اور اس کو خیالوں میں پالینا، چوتھا درجہ معرفت ہے جس سے مراد محبوب کی مراد میں ہر وقت گم رہنا ہے اور پانچواں درجہ وحدت ہے اس میں وہ اپنے فانی وجود کو ظاہر اور باطن میں فنا کر دیتا ہے اور صرف محبوب ہی کو موجود مطلق سمجھتا ہے۔ یہ پانچ مراتب پورے ہونے کے بعد کام ختم ہوجاتا ہے۔ عاشق اور معشوق کی موج بہر عشق میں غرق ہوجاتی ہے۔ چنانچہ کسی بزرگ نے فرمایا ہے کہ وجود اور عشق کے درمیان اول بھی عشق ہے اور آخر بھی عشق ہے کیونکہ ہر وجود موجود ہے وہ عشق سے خالی نہیں ہوتا اور نہ عشق کے بغیر قائم یا باقی رہ سکتا ہے۔ بس ظاہر و باطن جو کچھ بھی ہے عشق ہے۔

مرسلہ: منشی محمد عزیز مئے۔ لڈن وہاڑی

تھے۔ سوزوکی گلی کے چار پانچ مکان چھوڑ کے ایک کے دروازے پر کھڑی ہوگئی۔ میں نے بڑے دھیان اور چابک دستی کے ساتھ اس کی یہاں بھی تصویر اتار لی جب وہ سوزوکی سے اتر کر گھر کے دروازے کے سامنے کھڑا دستک دے رہا تھا۔ اس نے گردن موڑ کر میری کار کی طرف دیکھا بھی تھا۔ میں اس سے دور تھا اور کار میں نے بالکل ہی آہستہ کردی تھی تاکہ یہ اندر چلا جائے۔ قریب سے گزرنے پر وہ میری صورت آشنا ہوسکتا تھا۔

گلی کی زمین ناہموار اور گڑھوں سے اٹی پڑی تھی، میں نے جان بوجھ کر ایک ایسے ہی گڑھے میں کار کا ایک ٹائر پھنسا دیا اور کار کو یونہی ریس دینے لگا۔ مقصد تھوڑا وقت نکالنا تھا۔ پھر جب میں نے ونڈ اسکرین سے پاردزدیدہ نظروں سے سامنے دیکھا تو وہ اندر جاچکا تھا۔ میں نے کار کو فوراً آگے بڑھا دیا۔ مکان اور سوزوکی کا نمبر میں نے نوٹ کرلیا تھا۔

گلی کی دوسری سمت سے نکل کر میں دوبارہ مین شاہراہ پر آگیا اور ایک بار پھر کالیا کے نمبر پر اس سے رابطہ کرنا چاہا مگر جواب ندارد۔ اس کا سیل مسلسل آف جارہا تھا، مجھے اس کی طرف سے تشویش ہونے لگی۔ تب ہی میرے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ استاد بھابھا کے اڈے پر جاکے اس سے مل لوں؟ پھر کچھ سوچ کر اپنا ارادہ ملتوی کرلیا اور گھر کی راہ لی۔ گھر میں عاصمہ بہنا بھی اکیلی تھی۔ میں گھر پہنچا تو میری ہی بے چینی سے منتظر تھی۔

''خیریت تو ہے بہنا! تم پریشان کیوں ہو؟''

''بہت دیر ہوگئی تھی آپ کو آنے میں اسی لیے پریشان ہوگئی تھی ذرا۔'' عاصمہ نے جواب دیا اور میں نے مسکرا کر اسے اپنے قریب کرتے ہوئے محبت سے بولا۔

''بہنا! تیری دعائیں میرے ساتھ ہوتی ہیں۔ تم گھبرایا نہ کرو، مجھے آج کل گھر آنے میں دیر ہوجایا کرے گی۔''

''فہیم بھیا کا کچھ پتا چلا۔ بھائی جان؟'' عاصمہ نے پوچھا۔

''ابھی تو نہیں مگر اُمید ہے جلد اسے بھی ڈھونڈ لیں گے۔'' میں نے اسے دلاسہ دیا جبکہ خود ابھی تک مجھے نہیں معلوم تھا کہ فہیم کہاں اور میرے کس دشمن کے نرغے میں تھا۔

''بھائی جان! کیا کالیا بھائی بھی اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد نہیں کرسکتے؟''

''وہی بے چارہ تو اب تک ہماری مدد کررہا ہے ورنہ اس کے بغیر میں کیا ہوں۔'' میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا تو عاصمہ بولی۔

''نہیں بھائی جان! آپ بھی چھپے رستم ہیں، میں جانتی ہوں کالیا بھائی کے ہر عمل اور منصوبے کے پیچھے آپ ہی کی جامع حکمتِ عملی کارفرماں ہوتی ہے۔ وہ ہاتھوں کا استعمال کرتا ہے اور آپ دماغ کا۔'' کہتے ہوئے وہ ہولے سے مسکرائی اور میں بھی ہنس دیا۔

''کھانا لگاؤں؟''

''نہیں بہنا! بھوک نہیں ہے مجھے میں نے ایڈووکیٹ زنیرہ کے ہاں تھوڑا بہت کھالیا تھا۔''

میں اپنے کمرے میں آگیا اور کالیا کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرا ارادہ کالیا کو یاسر سے متعلق آگاہ کرکے انسپکٹر کامران کو اس کے خلاف فوری کارروائی کے لیے تھا۔

میں بستر پر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا کہ اچانک میرا اسیل فون گنگنایا۔ میں یہی سمجھا تھا کہ کالیا کا فون ہوگا مگر اسکرین پر ایک اجنبی نمبر دیکھ کر میری پیشانی پر الجھن آمیز سلوٹیں نمودار ہوگئیں۔

''ہیلو، کون؟''

''ہاں! نعمان بات کررہے ہو۔'' دوسری جانب سے ایک شناسا اور استفسار طلب آواز ابھری۔ یہ استاد بھابھا تھا۔ اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور کالیا سے متعلق میرا دل جانے کیوں تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''جی جی۔ میں نعمان ہی بات کررہا ہوں بھابھا صاحب!''

''کالیا تمہارے ساتھ ہے؟'' بھابھا نے پوچھا۔

''نہیں تو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس کا فون بھی آف تھا، کئی بار میں نے اسے کال کی تھی مگر۔''

''کب سے تمہارے ساتھ نہیں ہے؟'' استاد بھابھا نے پوچھا۔

''کل صبح سے۔''

''وہ مسلسل غائب ہے۔ اس کا نمبر واقعی بند جارہا ہے، لگتا ہے وہ بے چارہ کسی مشکل میں پھنس گیا ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔'' بھابھا نے کہا اور فوراً رابطہ منقطع کردیا۔

اب تو مجھے کالیا کی طرف سے واقعی تشویش ہونے لگی تھی۔ میں نے اسی وقت اس کے دوست جمشید عرف جمی کو فون کیا، کافی دیر بعد اس نے کال ریسیو کی۔ میں نے اس سے کالیا کے متعلق پوچھا تو وہ خود پریشانی سے بولا۔

''میں تو خود کالیا کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ وہ آج صبح سے ہی

غائب ہے اور اس کا فون بھی آف جارہا ہے۔" اس نے جواب دیا اور لمحہ بھر کے توقف کے بعد مجھ سے مستفسر ہوا۔
"کالیا بھائی تو آپ کے ساتھ ہوتا تھا۔ کیا آپ بھی۔"
"مجھ سے بھی آج صبح کے بعد اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوسکا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور کسی خیال کے تحت پوچھا۔
"سنو! تمہارے پاس جینگو کا نمبر ہے؟"
"ہاں!"
"فوراً مجھے سینڈ کرو۔" میں نے کہا اور رابطہ منقطع کردیا۔ چند سیکنڈوں بعد ہی جمی نے مجھے ایس ایم ایس کے ذریعے جینگو کا نمبر بھیج دیا، میں نے اسی وقت جینگو سے رابطہ کیا مگر دوسری طرف بیل جاتی رہی۔ فون ریسیو نہ ہوا تو میں نے دوبارہ جمی سے رابطہ کر کے اس سے کہا۔
"کیا تم جینگو سے جا کر اس وقت مل سکتے ہو؟"
"مل تو سکتا ہوں نومی بھائی! لیکن لیاری جیسے علاقے میں اس وقت جانا۔" وہ کترانے لگا۔
"میرے پاس آجاؤ۔ دونوں چلتے ہیں۔" میں نے فوراً کہا۔
"ابھی اس علاقے میں جانا مناسب نہ ہوگا لیکن میرا خیال ہے لیاری جانے سے پہلے جینگو سے فون پر رابطہ کرنا ضروری ہوگا۔" اسی وقت کال کے دوران مجھے ہلکی ہلکی بپ کی آواز سنائی دی۔
"میرا خیال ہے کسی کا فون آرہا ہے، ایک منٹ ہولڈ کرنا۔"
میں نے اسے ہولڈ کرانے کے بعد کال ریسیو کی یہ جینگو کی کال تھی۔
"کون؟" دوسری جانب سے اس کی گمبھیر آواز ابھری۔
"جینگو بھائی! یہ میں ہوں نعمان نومی۔ کالیا کا دوست۔ یاد آیا؟"
"اوہ ہاں! پہچان گیا۔ خیریت تو ہے؟ تمہاری کال آرہی تھی میں ذرا باہر دروازے پر کسی کے ساتھ کھڑا باتیں کررہا تھا۔"
میں نے اسے کالیا کے پُراسرار غیاب کے بارے میں بتادیا۔
"استاد بھابھا سے رابطہ نہیں کیا؟"
"کیا تھا۔ وہ خود مجھ سے اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"
"تمہارا کیا خیال ہے، مجھے کالیا کے بارے میں کیا علم ہوسکتا ہے؟" اس نے پوچھا۔
میں نے اپنے ذہن میں آنے والے پہلے خدشے کو رد کرنے کی غرض سے کہا۔
"مجھے شبہ ہورہا ہے کہ اسے کہیں جمن ڈاڈا کے آدمیوں نے نہ اٹھوالیا ہو؟"
"اس شبہے کی کوئی ٹھوس وجہ؟" جینگو کھاگ لہجے میں مستفسر ہوا۔
"جنہوں نے میری بہن کو اغوا کیا تھا، کیا خبر ان لوگوں نے جمن ڈاڈا کو حقیقت بتادی ہو؟"
"مگر وہ تم دونوں سے مطمئن ہوگیا تھا۔" جینگو بولا، تاہم میں نے اس کے لہجے کی لڑکھڑاہٹ کو صاف محسوس کرلیا تھا۔
"ہاں! وہ مطمئن ہوگیا تھا مگر شاید وہ لوگ مطمئن نہیں ہوئے ہوں گے جنہوں نے میری بہن کو اس کے آدمیوں کے ذریعے اغوا کروا کے مجو نامی آدمی کے مکان میں یرغمال بنا رکھا تھا۔"
"میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔" چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد جینگو نے کہا۔ "اگر ایسی بات ہوئی تو ہم بھی متاثر ہوسکتے ہیں۔ ویسے۔" وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔ میں اس کے آگے بولنے کا منتظر رہا تو اس نے جیسے بات ختم کرنے کی غرض سے کہا۔
"ٹھیک ہے میں پھر بھی پتا کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر جب وہ رابطہ منقطع کرنے لگا تو میں اندر سے کھٹکا اور بولا۔
"جینگو بھائی! تم کچھ کہنا چاہتے تھے؟"
میری بات پر دوسری جانب سے اس کے گہرے سانس لینے کی آواز ابھری اور بولا۔
"میں یہی کہہ رہا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے ہی جمن ڈاڈا کا ایک آدمی میرے پاس آیا تھا۔"
"پھر؟" میرا دل اندیشناک وسوسوں تلے تیزی سے دھڑکنے لگا۔
"میں جاؤں گا لیکن میرا نہیں خیال کہ وہی بات ہو۔ کوئی اور بات بھی ہوسکتی ہے۔"
"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" میں نے کہا اور کسی خیال کے تحت مشورہ طلب انداز میں اس سے دوبارہ بولا۔
"جینگو بھائی! ایک بات کی شاید ہم غلطی کر بیٹھے ہیں۔"

"کون سی؟"
"بقول آپ کے بجن ڈاڈا آپ کا دوست تھا تو ہمیں خود کارروائی کی بجائے، اس سے ڈائریکٹ مذاکرات کر لیتے تو زیادہ اچھا تھا۔"
"میں نے کب کہا کہ وہ میرا دوست ہے؟" جینگو بولا۔ "میں نے اس کے لیے حلیف کا لفظ استعمال کیا تھا اور حلیف تب ہی بنتے ہیں جب ان کے مفادات یکساں ہوں جبکہ دوستی بے غرض ہوتی ہے، جیسی میری کالیا کے ساتھ ہے اور کالیا کی تمہارے ساتھ۔ بہرحال تم اس کی فکر نہ کرو اور کالیا کی تلاش جاری رکھو۔" اس نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

یہ شبہہ میرے ذہن میں اچانک ہی ابھرا تھا۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ آخر بجن ڈاڈا ان لوگوں کو جواب دہ ہوگا جنہوں نے عاصمہ کو اغوا کیا تھا۔ ان کی طرف سے مجھے اور کالیا کو دھڑکا تو پہلے ہی لگا ہوا تھا کہ اگر اصل اغوا کنندگان نے بجن ڈاڈا سے، یا بجن ڈاڈا نے خود۔ انہیں بتا دیا ہو کہ یہ "مہم جوئی" کن لوگوں کی ہو سکتی تھی اور ہمارے بارے میں یہ بھی وہ ہماری (میری اور کالیا کی) "چیٹی" اپنے اڈے پر کروا چکا ہے تو سیٹھ ستار نے اسے ہمارے بارے میں بتا دیا ہوگا لیکن اب بھی بات وہی تھی۔ ناکامی کے بعد میں نہیں سمجھتا تھا کہ سیٹھ ستار نے اس معاملے کو پھیلانے کی کوشش کی ہوگی۔ لاڈلہ سائیں کی مدد سے بھی سیٹھ ستار نے یہ کام کروایا بھی ہوگا تو۔ معاملہ اس نے وہیں ختم کر دیا ہوگا۔ اسے گینگ وار کو ہمارے پیچھے لگانے کی ضرورت نہ تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں جینگو نے مجھے فون کر کے بتا دیا کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی اور وہ معاملہ ختم ہو چکا ہے اگر ایسا ہوتا تو کالیا سے پہلے بجن ڈاڈا مجھ (جینگو کو) سے رابطہ کر کے باز پرس کرتا۔

مجھے بھی تسلی ہو گئی۔ میں لیاری گینگ وار سے دور ہی رہنا چاہتا تھا، جس کا مشورہ کالیا نے ہی نہیں بلکہ خود جینگو نے بھی مجھے دیا تھا۔

اب میرے ذہن میں سیٹھ ستار کے سوا اور کسی فرد کا نام نہیں آرہا تھا۔ یہ تصور کرتے ہی اچانک میرا دل ہولنے لگا تھا کہ اگر کالیا سیٹھ ستار کے قبضے میں ہوا تو۔ وہ مردود کالیا کے ہاتھوں اپنی ایک آنکھ ضائع کرنے کا اس سے انتقام نہ لے بیٹھے؟"

میں بری طرح بے چین ہو گیا۔ نیند آنکھوں سے ہوا گئی۔ کالیا خطرے میں تھا اور میں کالیا کے بغیر خود کو اکیلا محسوس کرتا تھا۔ کالیا سے میرا خون سے بھی بڑھ کر رشتہ تھا۔ اس نے کئی مشکل ترین مراحل میں اپنی جان جوکھم میں ڈال کر میری مدد کی تھی اور کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ میری خاطر اس کی کئی بار اپنے استاد بھا بھا سے بھی بدمزگی ہوتی رہی تھی۔ وہ میرے سامنے کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

بڑا ہی عجیب رشتہ تھا میرا اور کالیا کا۔ آج اسی کی وجہ سے ہی میرے بارسوخ اور طاقت ور دشمن، اپنی ہی ذات اور اپنے ہی وجود کو اپنی ناک کا دم بنائے بیٹھے تھے۔ مجھے کالیا کی طرف سے اب سخت قسم کی تشویش دے بے چینی لاحق ہو گئی۔ میں نے اس کے سارے ساتھیوں سے رابطہ کر کے اس کے بارے میں پوچھ لیا تھا، جن جن کے سیل نمبر میرے پاس تھے۔

جمی بے چارہ میری طرح زیادہ پریشان تھا۔ اس کا دوبارہ فون آگیا اور مجھ سے تازہ حالات جاننے کے بعد پُرجوش سے لہجے میں بولا۔
"نعمان بھائی! میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ کو جہاں بھی شبہہ ہو کہ کالیا وہاں مل سکتا ہے، میں آپ کے ساتھ اسی وقت چلنے کے لیے تیار ہوں۔"
"ٹھیک ہے۔" میں نے بھی جوش سے دھڑکتے دل کے ساتھ جواب دیا۔ "میں تمہیں ایک جگہ کا پتا بتا رہا ہوں۔ تم وہاں پہنچو، میں بھی ادھر ہی پہنچتا ہوں۔" میں نے کہا اور پھر میں نے اسے سیٹھ ستار کی کوٹھی کا پتا بتا دیا۔ وہ اسی وقت نکل گیا۔ میں بھی بستر سے اٹھنے لگا اور چاہتا تھا کہ عاصمہ کو مطلع کر کے گھر سے نکلوں کہ فون آگیا۔
"ہیلو۔" میں نے سیل فون کی اسکرین پر نمبر پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے کان سے لگا کر کہا۔ یہ کوئی لینڈ لائن نمبر تھا۔
"ہیلو۔ نعمان احمد بات کر رہے ہیں؟" کسی نے استفسار یہ کہا۔
"جی ہاں! آپ کون؟" میں نے دھک دھک کرتے دل سے جواب دیا۔
"یہ نعیم نامی ایک نوجوان شخص آپ ہی کا بھائی ہے؟" دوسری جانب سے پوچھا گیا اور میرا تیزی سے دھڑکتا دل جیسے رک گیا۔
"ہاں۔ ہاں۔ نعیم میرا ہی بھائی ہے، وہ خیریت سے تو ہے ناں۔ آپ کون ہو بھائی؟"
"میں سول اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ سے بات کر رہا ہوں۔ آپ فوراً چلے آئیے۔" یہ کہتے ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔

مگر وہ بار بار پڑھنا پڑا تھا مجھے۔ وہ کاغذ کا محض ایک ٹکڑا نہیں تھا، بلکہ تیلی تھا اور جلتی پر تیل کا کام کر رہا تھا۔

''ہاں، مسٹر نعمان! ادھورے بھائی کا تحفہ کیسا لگا تمہیں، بہت تلاش تھی ناں تمہیں اپنے چھوٹے بھائی کی۔ تم یقینا میرے احسان مند ہو گے کہ میں نے تمہارے بھائی کی جان نہیں لی۔''

خط پڑھ کر میرا خون کھول اٹھا تھا۔ یہ ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر نہیں تھی۔ ٹائپ شدہ تھی۔ میرا جی چاہا کہ اس کاغذ کی دھجیاں اڑا ڈالوں اور سہیل سے بولا۔

''میرے بھائی! میں قسم کھاتا ہوں جس نے تمہیں اس حال تک پہنچایا ہے، میں اس کا عبرت ناک حشر کروں گا۔ فقط مجھے اتنا بتا دو کہ تمہارے ساتھ کن لوگوں نے یہ ظلم ڈھایا ہے؟ اور کیا تم انہیں پہچان لو گے؟''

میری بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اسی وقت ایک ڈاکٹر جس نے سفید گاؤن پہن رکھا تھا اور گلے میں اسٹیتھو اسکوپ تھا، وہاں آ گیا، اس کے ہمراہ ایک سفید یونیفارم میں نرس بھی تھی جس نے ہاتھوں میں ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ وہ فہیم کے وائٹل لینے میں مصروف ہو گئی۔ میں نے ڈاکٹر کو سلام کیا اور اس سے فہیم کی طبیعت کے بارے میں استفسار کیا۔ اس نے ایک نگاہ جلتے سلگتے چہرے پر ڈالی اور الٹا سوال داغ ڈالا۔

''آپ کا نام؟''

''نعمان۔''

''پیشنٹ کیا لگتے ہیں آپ کے؟''

''میں اس کا بڑا بھائی ہوں۔''

''ہمیں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے، اُمید ہے آپ تعاون کرنے سے نہیں ہچکچائیں گے۔''

''جی بولیے ڈاکٹر صاحب؟'' میں نے کہا۔

''دراصل ہمارے لیے یہ تمیز کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ یہ ایم ایل سی (میڈیکولیگل کیس) کا کیس ہے یا پھر کچھ اور۔'' کہہ کر وہ استفسار طلب نظروں سے میری جانب تکنے لگا۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''ڈاکٹر صاحب! یہ میڈیکولیگل کا ہی کیس ہے، میرے بھائی کے ساتھ کچھ نامعلوم لوگوں نے ایسا بھیانک ظلم کیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ پہلے جا کر متعلقہ تھانے میں این سی یا ایف آئی آر کٹوا کر لے آئیں اور اس کی ایک کاپی مجھے دیں تاکہ میں سرٹیفکیٹ جاری کر سکوں جو آپ کو کورٹ میں کام آ سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ فہیم کا معائنہ کرنے لگا۔

میں نے اسی وقت متعلقہ تھانے جا کر نامعلوم ملزموں کے خلاف ایف آئی آر کٹوا دی اور ایک ٹیم، بہ غرض تفتیش کے لیے اسپتال بھی آئی، انہوں نے فہیم سے بیان لیا جسے میں بھی غور سے سن رہا تھا۔

فہیم مجھ سے ناراض ہو کے جب گھر سے نکلا تھا تو وہ اپنے ایک دوست کے ہاں رہنے لگا تھا جو اس کا آفس کولیگ تو نہ تھا البتہ اس کا کوئی پرانا دوست تھا۔ اس کا نام اس نے خرم بتایا تھا وہ عظیم پورہ میں رہتا تھا مگر فہیم اس کے پاس صرف دو دن ہی ٹھہرا تھا اور پھر اس نے اپنی الگ رہائش کا بندوبست ایک اسٹوڈیو فلیٹ کرائے پر لے کر کر لیا تھا۔ وہیں اسے کچھ نامعلوم لوگوں نے اغوا کر لیا تھا اور اس کی آنکھوں میں پٹی باندھ کر لے گئے تھے۔ نجانے وہ کون سی جگہ تھی اور کس کی تھی جہاں مجھے چند روز قید میں رکھا گیا، کھانے پینے کو بھی پوری طرح نہیں دیا کرتے تھے۔

وہاں میں نے چار افراد کو ہی دیکھا تھا۔ وہ مجھ پر وقفے وقفے سے تشدد بھی کیا کرتے تھے۔ ابتداء میں یہی سمجھا تھا میں کہ یہ مجھے کسی خاص مقصد کے لیے ہراساں کرنا چاہ رہے ہیں۔ پھر ایک روز ان میں سے ایک نے جو فون پر اپنے کسی ''چیف باس'' سے رابطے میں رہا کرتا تھا۔ اس نے فون میرے کان سے لگا کر میری اپنے چیف باس سے بات کروائی۔ بہت ہی سنگ دل اور بھیڑیے جیسی آواز تھی وہ۔ مجھ سے یہی کہا گیا کہ تمہارے بھائی نعمان عرف نومی کو ہم نے ہر طرح سے باز رکھنے کی کوشش چاہی مگر اس نے ہماری نہیں سنی۔ اب مجبوراً اسے (مجھے) سبق سکھانے کے لیے ایسا کرنا پڑ رہا ہے۔ نجانے وہ میرے اوپر اب کون سا عذاب توڑنا چاہتے تھے۔ تاہم میں خوش اور مطمئن تو تھا کہ یہ لوگ مجھے آزاد کرنے والے تھے مگر کیا پتا تھا مجھے کہ اس ''آزادی'' کی مجھے کیا قیمت چکانی پڑتی۔

ایک عجیب سی خودکار مشین جس کا وہ عجیب سا ہی نام لے رہے تھے۔ شاید ''گلوٹین'' اس میں میری دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے اوپر رانوں تک پھنسا دیں اور پھر ایک بغدا گرا کر کاٹ دیں، میں درد و اذیت کے مارے بے ہوش ہو گیا اور شاید کئی دن اسی طرح نڈھال حالت میں رہا، کٹی ہوئی جگہ پر ٹانکے لگا دیے گئے تھے اور کوئی دوا وغیرہ بھی پینے کو دیتے رہے تھے، اس کے بعد وہ مجھے رات کے اس پہر کسی سڑک پر بھکاریوں کی طرح پھینک کر چلے گئے۔''

فہیم نے اپنا دردناک بیان قلم بند کرادیا۔ تفتیشی افسر نے مجھ سے بھی سوالات کیے، میں نے بھی اسے صاف صاف بتادیا کہ معاملہ کیا تھا۔ تفتیشی افسر جس کا نام انسپکٹر شہزاد تھا، بھلا مانس آدمی تھا۔ اس نے مجھے اپنے ایک مشورے سے بھی نوازا کہ میں ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ سے اس کیس (رفعت خانم مرڈر کیس) کو۔ ری اوپن کرنے کے لیے "سوموٹو ایکشن" لینے کی درخواست کروں، وغیرہ۔

جب صبح کی سفیدی دھیرے دھیرے پھیلنے لگی تھی تو میں فہیم کو اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا کر گھر لے آیا۔ میں نے کسی طرح ایک خودکار وہیل چیئر کا بھی بندوبست کرلیا تھا۔ چھوٹے بھائی کی حالتِ زار مجھ سے دیکھی نہیں جارہی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ عاصمہ بے چاری پر کیا بیتے گی جب وہ فہیم کو اس حالتِ زار میں دیکھے گی۔

میں گھر پہنچا۔ وہیل چیئر نیچے اتاری اس کے بعد فہیم کو سہارا دے کر اس پر بٹھایا۔ میرا چہرہ آنسوؤں سے لبریز تھا۔ دل تھا کہ جیسے ابھی تک کسی نے مٹھی میں لے رکھا تھا۔ خود فہیم کی آنکھیں متورم ہورہی تھیں۔ صبح کاذب کا ہی وقت تھا اسی لیے لوگ باگ وہاں کم ہی موجود تھے، جو تھے وہ دور قریب میں تھے۔ کسی نے ہماری طرف نہیں دیکھا تھا ورنہ خیر خیریت پوچھنے کو ضرور لپکتے۔ میں نے دروازے کی کال بیل بجادی۔ عاصمہ نے ہی دروازہ کھولا اور میں اس کے چہرے پر حیرت اور سکتے کی سی کیفیات کو اُمڈتے ہوئے دیکھا، وہیل چیئر کو دھکیلتا اندر لے آیا۔

"بھیا۔ی ی۔یہ کیا۔ ہوا، آپ کو۔" عاصمہ جیسے جی جان سے چلا اٹھی۔ فہیم کی مغموم سی نظریں عاصمہ پر جمی ہوئی تھیں جبکہ عاصمہ نے جیسے اپنا کلیجہ تھامے رکھا تھا۔

"بھھ۔ بھائی جان! آپ ہی بتایئے۔ی ی۔ فہیم بھیا کو کیا ہوا ہے آخر؟ یہ۔ یہ وہیل چیئر پر کیوں ہیں؟"

"حوصلہ رکھو بہنا! خدا کے لیے خود کو سنبھالے رکھو۔" میں نے کہا اور پلٹ کر عقب میں اپنے دروازہ بند کردیا۔ عاصمہ نے اپنا سر تھام لیا تھا، شاید ابھی تک اس پر یہ کربناک انگیز حقیقت آشکارا نہ ہوئی تھی۔ فہیم کو ظالم درندوں نے ہمیشہ کے لیے ٹانگیں کاٹ کر معذور کردیا ہے۔

"بھائی جان! بہنا کو سنبھالیے پلیز۔" اچانک فہیم نے مجھے لرزتی آواز میں پکارا۔ میں نے عاصمہ کی طرف دیکھا، وہ ہنوز پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی فہیم کو اور کبھی سوالیہ نگاہوں سے میری جانب تکنے لگی۔

میں کیا بتاتا اسے؟ میرا اپنا آپ اندر سے تہہ و بالا ہورہا تھا، تب ہی شاید عاصمہ نے میری تھکی تھکی خاموشی اور لرزتے ہونٹوں کا مفہوم اپنے تئیں کچھ یوں لیا کہ بے اختیار وہ آگے بڑھ کر گھٹنوں کے بل فہیم کے ساتھ آن گی۔ وہ اس کی گود میں اپنا سر رکھ کر رونا چاہتی شاید کہ اچانک ہی وہ چونکی، اس کے دونوں ہاتھ غیرارادی طور پر، فہیم کی ٹانگوں والی جگہ کو چھوتے ہوئے اندر کی جانب خلاء میں دھنس گئے اور اگلے ہی لمحے عاصمہ نے ایک چیخ مار کر فہیم کی گود میں دھری چادر کھینچ لی اور وہ ادھ کٹی "ٹنڈی" رانیں گوشت کے لوتھڑوں کی طرح جھول رہی تھیں۔ وہ یک دم دہشت زدہ سی ہوگئی۔ چہرے پر دکھ اور کرب کے ساتھ ہراس بھی پھیل گیا۔

"نن۔نن۔نہیں۔نہیں، ی ی ی۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ مم۔ میرے بھیا کی ٹانگیں۔" وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ مارے صدمے کے غش کھا کر وہیں صحن کے فرش پر لڑھک گئی۔ تب ہی مجھے ہوش آیا اور میں نے عاصمہ کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالا۔ اسے پکارنے لگا۔ ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

"اسے پانی پلاؤ بھائی جان!" فہیم نے دکھ و کرب سے آشتہ لہجے میں مجھ سے کہا۔ میں عاصمہ کو سنبھالے ہوئے صحن میں ہی ایک بچھی چارپائی کے پاس لے آیا اور لٹا دیا، پھر بھاگم بھاگ اندر سے پانی کا گلاس بھر لایا، ٹھنڈے پانی کے چند چھینٹے اس کے چہرے پر مارے، اس کے گال زور زور سے تھپتھپائے اسے پکارا اس کے بعد گلاس اس کے لرزتے لبوں سے لگا دیا۔ کچھ پانی اس کے حلق میں گیا اور کچھ سے زیادہ باہر کو بہہ گیا۔ اس نے بہرحال آنکھیں کھول دیں۔

"حوصلہ کرو۔ عاصمہ! کیا ہوگیا تھا تمہیں؟ کہا تھا نا میں نے کہ خدا کے لیے خود کو سنبھالنا۔" میں نے صدمے سے چور لہجے میں اس سے کہا۔ ایک غبار سا تھا جو بار بار میری آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا۔

"فہیم بھیا کو کیا ہوگیا۔ بھائی جان؟" وہ بھنچی بھنچی آواز میں بولی اور رو پڑی۔ اس میں دوبارہ ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ۔ پلٹ کر چارپائی سے اٹھ کر دوبارہ فہیم کی طرف دیکھتی۔

میں اس کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ دو لمحہ بعد فہیم بھی اپنی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا چارپائی کے قریب آگیا۔ ہم تینوں بہن بھائی، دکھ سکھ کے ساتھی ایک دوسرے کے ساتھ لگے روتے چلے گئے۔ ایسی دردناک گھڑیوں میں مجھے وہ

وحشت ناک منظر یاد آ گیا تھا جب ابا کو بے گناہ پھانسی دی گئی تھی اور صبح صبح ان کی لاش پھانسی گھاٹ سے گھر لائی گئی تھی جبکہ ایک لاش اماں جان کی صورت میں پہلے ہی گھر پر رکھی تھی۔ اس وقت بھی ہم تینوں نصیبوں جلے بہن بھائی اسی طرح ایک دوسرے سے لپٹ کر روئے تھے۔ غم واندوہ کے منظر کیوں تازہ ہونے لگتے ہیں؟ یہ ختم کیوں نہیں ہو جاتے ہمیشہ کے لیے؟ کیا تقدیر کو ان کا اعادہ کرنا ضروری ہوتا ہے؟ تو پھر۔ تو پھر خوشیوں کا منظر دوبارہ کیوں نہیں لوٹتا؟ اور تب ہی بے اختیار مجھے اپنے اس خیال پر زخمی سی ہنسی آ گئی۔ بھلا ہم کم نصیبوں کی زندگیوں میں خوشیاں آئی ہی کب تھیں؟

کچھ دیر بعد غم واندوہ کا غبار چھٹا تو نعیم کو ہم اندر کمرے میں لے آئے۔ عاصمہ اور میں نے اسے سہارا دے کر بستر پر لٹا دیا۔

"بھائی جان! آپ لوگ باتیں کریں۔ میں تب تک ناشتا بنا لیتی ہوں۔" عاصمہ نے کہا تو میں فوراً بولا۔

"نہیں بہنا! آج تم ناشتا نہیں بناؤ گی۔ آج نعیم کی اتنے دنوں بعد واپسی کی خوشی میں باہر سے ناشتا لے آتا ہوں۔ آج حلوا پوری کا ناشتا کریں گے۔"

ایسا میں نے محض غم کی فضا کو کم کرنے کے لیے ہی کہا تھا ورنہ کچھ کھانے پینے کو کسی کا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ تقدیر نے ہمیں خوشی دی بھی تو داغدار کر کے۔ چھوٹے بھائی کی یہ قابلِ رحم حالت نہ مجھ سے دیکھی جاتی تھی نہ ہی عاصمہ سے۔

میں نے دیکھا عاصمہ ایک دم سر جھکائے کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ میں نے بستر پر دراز نعیم کی طرف لرزتی مسکراہٹ سے دیکھا اور وہاں سے دوسرے کمرے میں آ گیا۔ میرا اندازہ درست تھا، وہاں عاصمہ ایک طرف کونے میں کھڑی دوپٹا چہرے پر کیے سسک رہی تھی۔ میں اس کے قریب گیا اور بولا۔

"بہنا! میں جانتا ہوں، اس وقت کھانے کی ہر شے ہمیں زہر لگے گی لیکن۔"

"میں سمجھ گئی ہوں بھائی جان!" عاصمہ نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "آپ حلوا پوری لے آئیں۔ میں تب تک چائے بنا لیتی ہوں۔"

"نہیں، چائے بھی میں باہر سے ہی پارسل کروا کے لے آؤں گا۔" میں نے کہا۔ "تم بس نعیم کے پاس جا کے بیٹھو، اس سے باتیں کرو، دیکھو، اس کے سامنے اب رونا بالکل مت، جو ہو چکا وہ تو ہو چکا، سمجھ رہی ہو ناں۔ پیاری بہنا!"

"جی جی بھائی جان! سمجھ گئی۔" اس نے بھیگتی آنکھوں، چہرہ دوپٹے سے پونچھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"شاباش، میں آتا ہوں۔" میں نے کہا اور گھر سے باہر آ گیا۔ میرا دل و دماغ بری طرح منتشر رہا تھا۔ میں "آپ بیتی" نے اپنی دشمنی کا حق پورا کر دیا تھا۔ جو جانتا تھا میں کہ ایسا میرا (رفعت خانم مرڈر کیس) میں کامیاب پیش رفت سے ہوا ہے اور تب ہی میرے سوچتے ذہن میں اس روز راشد بشیر کے ساتھ میری ہونے والی تلخ کلامی اور جھڑپ یاد آنے لگی۔ اس نے مجھے وہ دونوں ڈائریاں دینے سے صاف انکار کر دیا تھا جبکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ ہم اصل قاتل تک پہنچنے والے تھے اصولاً تو اسے خوش ہونا چاہیے تھا اور مجھ پر اور ایڈووکیٹ زبیر پر بھروسا کرتے ہوئے دونوں ڈائریاں ہمارے حوالے کر دینی چاہیے تھیں لیکن اس کے برعکس وہ ایک دم بھڑک اٹھا تھا۔

میں حلوا پوری کی دکان پر پہنچا۔ اس کے بعد پیسے دے کر واپس لوٹ کر گھر کے دروازے پر پہنچ کر رکا ہی تھا کہ میرے کانوں سے موٹر سائیکل کی آواز ٹکرائی جو بہت قریب سے ابھری تھی، میں پلٹا اور دیکھا، دو دبلے پتلے اور سیاہ رنگت کے اشخاص الگ الگ بائیکس پر سوار تھے۔ وہ میری طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ مجھے ایکا ایکی کسی خطرے کا احساس ہوا اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ پھر اچانک ہی میں چونکا، میں ان میں سے ایک کو پہچان چکا تھا۔ مجھے فوراً یاد آ گیا تھا کہ میں اس لڑکے کو کچھ دن پہلے بجن ڈاڈا کے اڈے میں دیکھ چکا تھا۔ دوسرا ابھی میرے لیے اجنبی ہی تھا۔

بائیکس کو سائیڈ اسٹینڈ میں کھڑا کر کے وہ دونوں میری طرف بڑھے اور اسی نے ہی پہلے مجھ سے سرد لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا، جسے میں پہچان رہا تھا۔

"تم نعمان احمد ہی ہو ناں۔ اس روز بجن ڈاڈا نے تمہیں اور تمہارے ساتھی شیراز کو بلوایا تھا؟"

"ہاں۔ ہاں۔ خیریت؟" میں نے اپنے دل کی تیز دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں بجن ڈاڈا نے دوبارہ بلوایا ہے۔" اس بار دوسرے نے میری جانب گھورنے کے انداز میں کہا۔

"کیوں؟" میں نے بھی جواب میں اس بار کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔

"یہ وہیں چل کر بتائیں گے۔" پہلے والے نے کہا۔

"ٹھیک ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" میں نے

معاملہ فہمی سے کہا۔ ''میں اپنے دوست شیراز (کالیا) کے ساتھ کسی وقت آجاؤں گا۔''

شیراز نے اس وقت جمن ڈاڈا کو اپنا یہی نام بتایا تھا۔

''شیراز کو چھوڑو، تمہیں ابھی ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔'' پہلے والے نے کہا تو میں رکھائی سے بولا۔

''ایک منٹ ٹھہرو۔ میں یہ ناشتا اندر دے کر آتا ہوں۔ پھر تم لوگوں سے بات کرتا ہوں۔'' دونوں نے کوئی جواب نہ دیا اور میں اندر داخل ہوگیا۔

جمن ڈاڈا کے آدمیوں کی اچانک اس طرح اور وہ بھی میرے گھر آمد نے مجھے ایک نئی پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ نجانے کیا بات ہوئی تھی جو اس طرح مجھے دولڑکے بھیج کر جمن ڈاڈا نے بلوایا تھا؟ خدشہ تو تھا کہ کہیں ہمارا اس روز کی مہم جوئی والا بھانڈا نہ پھوٹ جائے، جب میں عاصمہ کو جو کے ٹھکانے سے بازیاب کروا کے لایا تھا۔

''بہنا! تم فہیم کے ساتھ جا کر ناشتا کرو، میرے باہر کچھ دوست آئے ہیں، میں ان سے بات کر کے ابھی آتا ہوں۔'' میں نے عاصمہ کو چیزیں تھماتے ہوئے کہا اور دوبارہ باہر آیا۔ عقب میں گھر کا دروازہ بند کیا اور ان سے سخت لہجے میں بولا۔

''دیکھو۔ میں پہلے بھی اکیلا نہیں آیا تھا۔ شیراز میرا دوست میرے ساتھ تھا، میں اب بھی اس کے ساتھ ہی آؤں گا۔''

میرے مسکت جواب پر وہ دونوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ پھر پہلے والے نے مجھ سے کہا۔ ''شیراز وہاں موجود ہے۔ اب تم چلو۔''

میں اس کی بات پر بری طرح چونکا۔ کالیا تو تقریباً پچھلے چوبیس گھنٹے سے غائب تھا۔ تو کیا ان لوگوں نے اسے اغوا کیا ہوا تھا؟ اگر ایسا تھا تو پھر۔ یہ مجھے یوں ''شریفانہ'' انداز میں کس طرح لینے کے لیے گھر پر پہنچ گئے تھے؟ یہ بات اچنبھے کی تھی۔ تاہم میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں کہا۔

''شیراز تمہارے پاس ہے؟ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ میرے بغیر وہاں کیسے جا پہنچا؟''

''وہ وہاں پہنچا نہیں تھا۔'' دوسرے نے کہا۔ ''اسے وہاں اڈے پر پہنچا دیا گیا ہے اور اب تمہیں بھی اسی طرح وہاں پہنچنا ہوگا۔'' یہ کہتے ہی دونوں نے اپنے نیفوں میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو میرے پورے وجود میں لاتعداد چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ ان کے ہاتھوں میں سیاہ رنگ کے پستول نظر آرہے تھے۔

''اب زیادہ ادی بازی کی تو ادھر ہی گولی ماردی جائے گی۔ چلو۔'' پہلے والے نے خونخوار غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا اور میری پیشانی پر سلوٹیں بکھر گئیں۔ وجود سنسنانے لگا۔ جانا بھی مصیبت تھا اور نہ جانا بھی۔

''اب ہم گولی چلا دیں گے اور کوئی ہماری گرد کو بھی نہ پاسکے گا۔ ادھر تمہارے ساتھی کا بھی یہی حشر ہوگا۔ بہتری اسی میں ہے کہ ساتھ چلے چلو ہمارے؟'' پہلے والے نے کہا۔ میں نے اثبات میں سرہلا دیا۔ کالیا ان کے نرغے میں تھا کیوں؟ اس کا جواب آسان بھی تھا اور الجھن آمیز بھی۔ اگر جمن ڈاڈا کو ہم پر کسی بات کا شبہ ہوا بھی تھا تو وہ اب تک شبہ ہی ہوگا، کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہوسکتا تھا۔ مناسب تھا کہ ان کے ساتھ جا کر حالات کو مذاکرات کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی جاتی مگر بات وہی تھی کہ جانیں ہم دونوں کی خطرے میں تھیں۔

میں ایک کے پیچھے بائیک پر بیٹھ گیا۔ دوسرے نے اپنی بائیک ہمارے پیچھے لگا رکھی تھی اور روانگی کے وقت مجھے یہ دھمکی بھی دے دی گئی تھی کہ اگر میں نے راستے میں کوئی چالاکی چلنے کی کوشش کی تو وہ مجھے بے دریغ گولی ماردیں گے۔

آدھے پونے گھنٹے بعد ہم لیاری پہنچ گئے۔ وہاں سے سیدھا ہمیں جمن ڈاڈا کے اڈے پر پہنچا دیا گیا۔ سچی بات تھی کہ میں اندر سے بری طرح ڈرا ہوا تھا مگر دل میں تسلی بھی تھی کہ اگر ایسا کچھ ہوتا تو ہمارے ساتھ اسی وقت ہوجاتا جب کالیا بھی میرے ساتھ تھا اور ہم جمن ڈاڈا کے روبرو پیش ہوئے تھے لیکن ان کا جارحانہ انداز مجھے تشویش میں مبتلا کررہا تھا۔

جب میں وہاں پہنچا تو جمن ڈاڈا میرا ہی منتظر تھا مگر میں یہ دیکھ کر چونک گیا کہ وہاں جینگو بھی موجود تھا اور کہیں سے بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ بھی میری طرح زبردستی وہاں لایا گیا ہو۔ تاہم مجھے یاد تھا کہ رات کے کسی پہر جب کالیا کی تلاش کے سلسلے میں میری جینگو سے فون پر بات ہوئی تھی تو اس نے مجھے یہ بتایا تھا کہ جمن ڈاڈا نے اسے بلوایا تھا۔

وہ دونوں کرسیوں پر براجمان تھے۔ یاد رہے کہ جینگو وہی آدمی تھا جس نے ہماری عاصمہ کی بازیابی کے سلسلے میں مدد کی تھی۔ اسے وہاں بیٹھا دیکھ کر مجھے تھوڑا حوصلہ ہوا تھا مگر دل اب بھی ایک تشویش آمیز سی بے چینی کا شکار تھا۔ حسب سابق وہاں چند مسلح افراد بھی موجود تھے۔

میں نے مسکراتے ہوئے ان دونوں سے باری باری ہاتھ ملایا۔ مصافحہ کرنے کے دوران میں نے جمن ڈاڈا کے

چہرے کے تاثرات بھی بھانپنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بشرے پر گمبھیرتا طاری تھی۔ اس نے مجھے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کا ایک گال پھولا ہوا تھا اور وہ گٹکا چبا رہا تھا۔

"تم نے ہم سے جھوٹ کیوں بولا تھا؟" میرے کرسی پر بیٹھتے ہی بجن ڈاڈا نے اسی گمبھیرتا سے لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔ میں اس کی بات پر تھوڑا چونکا تھا۔ اس کے سوال پوچھنے کا انداز اور لہجے کا دبدبہ بتاتا تھا کہ اسے بالآخر اپنے باوثوق ذرائع سے حقیقت کا علم ہو چکا تھا جبکہ جینگو کی وہاں موجودگی بھی یہی بتاتی تھی۔ پھر بھی میں نے اس کی طرف دیکھ کر تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"کیسا جھوٹ سائیں؟ میں سمجھا نہیں؟"

"نعمان! مسئلہ یہاں کچھ اور ہو گیا ہے۔" اس بار بجن ڈاڈا کی بجائے جینگو نے میری طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا اور میں الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "نیا مسئلہ کیا ہو سکتا تھا؟" میرے ژولیدہ ذہن میں ابھرا۔ وہ آگے بولنے لگا۔

"میں نے بجن ڈاڈا کو ساری حقیقت خود ہی بتا دی ہے۔ اس لیے جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بہتر ہے جو پوچھا جائے اس کا جواب دیتے جاؤ۔"

"شیراز کدھر ہے؟" میں نے فوراً پوچھا۔

"پہلے میرے سوالات کا جواب دو نعمان!" بجن ڈاڈا نے میری طرف دیکھ کر تیز سے لہجے میں کہا۔

"پوچھو۔" میں نے بھی اسی کی طرف دیکھا۔

"حقیقتِ حال اپنے منہ سے بتا دو تاکہ ہمیں اندازہ ہو سکے کہ تم کتنے سچے ہو۔" بجن ڈاڈا میری طرف دیکھ کر بولا۔

"ڈاڈا سائیں! اگر یہ بات ہے تو پھر سن لو کہ میں ایک شریف اور عزت دار گھرانے کا فرد ہوں، میں نے آپ سے مصلحتاً جھوٹ بولا تھا کہ ہم عورتوں کے سپلائرز ہیں۔ درحقیقت میری جوان بہن عاصمہ کو میرے ایک دشمن سیٹھ ستار نے کسی مجو نامی آدمی کے ذریعے اغوا کر لیا تھا۔ ہمیں پتا چلا کہ وہ لیاری میں ہی مجو کے مکان میں یرغمال بنا کے رکھی گئی ہے۔ میرے دوست شیراز عرف کالیا نے میری مدد کی تھی اور ہماری جینگو بھائی نے۔" آخری جملہ میں نے بجن ڈاڈا کے قریب بیٹھے جینگو کی طرف دیکھ کر ادا کیا تھا۔ لیکن میں نے دیکھا جینگو کے چہرے پر اب ایک عجیب طرح کا اطمینان عود کر آیا تھا، جیسے میرے سب کچھ سچ بتا دینے پر اس نے بھی سکھ کا سانس لیا ہو مگر کیوں؟ میرے الجھے ہوئے ذہن میں سوال ابھرا تھا۔ میری بات پر بجن ڈاڈا نے ایک نظر اپنے قریب بیٹھے جینگو پر ڈالی اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"جہاں تم لوگوں نے کارروائی کی تھی، وہ میرا پاڑہ تھا اور مجو میرا خاص آدمی۔ اس کارروائی میں ہمارا ایک پرویز نامی آدمی تم میں سے کسی ایک کی گولی کا نشانہ بھی بنا تھا۔" وہ اتنا بتا کر ٹھہرا اور مجھے یاد تھا کہ وہ میری ہی گولی کا نشانہ بنا تھا جب میں مطلوبہ مکان کے قریب جینگو کے ایک ساتھی کے ساتھ گھات لگائے بیٹھا تھا تو مجو کے ایک ساتھی نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا اور میں نے اسی کے پستول سے اس پر گولی چلا دی تھی، بعد میں مجو بھی میری چلائی ہوئی گولی سے گھائل ہوا تھا جو اس کی ٹانگ میں لگی تھی۔

میں خاموشی سے بجن ڈاڈا کے چہرے کی طرف تکتا رہا۔ ان سب باتوں کے باوجود مجھے کسی خاص "گرماگری" کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ جس پر اندر سے میں خود بھی متحیر تھا۔ یہ میری خوش فہمی بھی ہو سکتی تھی۔ میں بہر حال بجن ڈاڈا کے آگے بولنے کا منتظر رہا۔

"تمہارے اسی آدمی کی چلائی ہوئی گولی سے بعد میں مجو بھی زخمی ہوا تھا، اس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی لیکن جس کے پہلو میں گولی لگی تھی، وہ مرتے مرتے بچا تھا۔ تم لوگوں نے مجھ سے کسی قسم کا مشورہ کیے بغیر میرے پاڑے میں۔ اتنی بڑی کارروائی کس طرح کر ڈالی تھی؟ کیا سمجھتے تھے کہ مجھے حقیقت کا پتا نہیں چلے گا؟"

میں نے دیکھا بجن ڈاڈا کا لہجہ لحظہ بہ لحظہ گرم ہوتا جا رہا تھا مگر اب بھی اس میں ابال کی وہ کیفیات نہیں تھیں، جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ معاملہ ہنوز درمیان کا کچھ اور ہی تھا۔ لہٰذا میں نے بھی ماحول اور حالات کو محسوس کرتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجہ اپنایا اور کہا۔

"ڈاڈا سائیں! ایک شریف اور غیرت مند بھائی جس کی جوان اور کنواری بہن اغوا کر لی گئی ہو اس کے دماغ میں ایک ہی دھن سوار ہوتی ہے کہ وہ کسی طرح سے اپنی بہن کو اغوا کاروں سے چھڑا کر ہی دم لے تو اس کا دماغ اور کچھ نہیں سوچ سکتا۔ میری اس بات کا احساس وہی کر سکتا ہے جس کی اپنی بھی بہن ہو لیکن بجن ڈاڈا۔ آپ کی بات بھی غلط نہیں ہے۔ آپ سے اپنے دل کی بات کہوں گا ڈاڈا سائیں! ابھی تو تھوڑی دیر پہلے آپ نے یہ کہا کہ ہمیں اس سلسلے میں آپ سے مشورہ کر لینا چاہیے تھا تو اس وقت بھی میرے دل میں یہ بات آئی تھی جب

ہمیں یہ پتا چلا تھا کہ بگو نے یہ حرکت کی ہے اور وہ آپ کا آدمی ہے تو یقیناً آپ ایک بہن کے لیے ایک بھائی کے جذبات کا احساس ضرور کرتے۔ کیونکہ مجھے یقین تھا بگو نے یہ گھٹیا حرکت میرے دشمن کے کہنے پر کی ہوگی آپ کے کہنے پر نہیں۔"

میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا اور اپنی معاملہ فہمی اور زیرک دماغی کی نفسیاتی چوٹ کا اثر بجن ڈاڈا کے چہرے سے مترشح ہوتے دیکھتا رہا۔

درحقیقت درمیان کے حالات اور جیتکو کا وہاں دوستانہ انداز میں موجود ہونا، اشارہ کر رہا تھا کہ کم از کم بجن ڈاڈا کے علم میں لائے بغیر ہی مردود بگو نے سیٹھ ستار کے کہنے پر میری بہن کو اغوا کرنے کی گری ہوئی حرکت کی تھی۔

بجن ڈاڈا کے چہرے کا بڑھتے ہوئے تناؤ کا گراف تیزی سے کرنے لگا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس خارج کر کے اپنے منہ سے گٹکا تھوکا اور پھر سامنے رکھی ٹیڈی پایوں والی چھوٹی سی میز پر سے پانی کی بوتل اٹھا کر منہ سے لگائی، کلی کی اس کے بعد اپنے کرتے کی سائیڈ پاکٹ سے سگریٹ کا ایک پیکٹ نکالا اور ساتھ ہی ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ جھکا اور بجن ڈاڈا نے اس کے کان میں کچھ کہا، پھر خود پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر اپنے ہونٹوں میں دبائی۔

"پیتے ہو؟" اس نے پیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ نہیں میں نے شکریہ کے ساتھ انکار میں سر ہلا دیا۔ وہ لائٹر سے سگریٹ سلگانے لگا اور ایک گہرا کش لے کر کچھ سوچنے لگا۔ میں نے جیتکو کی طرف دزدیدہ سی نظروں سے دیکھا تو وہ میری طرف دیکھ کر ہلکے سے مسکرایا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہی آدمی میرے لیے ایک چائے کا ایک بڑا سا مگ اٹھا لایا اور میرے سامنے ٹیڈی ٹانگوں والی میز پر رکھ کے اپنی سابقہ جگہ پر کھڑا ہو گیا۔

"چائے پیو۔" بجن ڈاڈا نے سگریٹ والے ہاتھ سے مگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کی ایک ٹانگ نیچے تھی اور ایک میز کے کونے پر ٹکی ہوئی تھی۔ میں نے بھی آج اس کا بغور جائزہ لیا تھا جیسا کہ میں پہلے سرسری طور پر اس کے حلیے کے بارے میں بتا چکا ہوں، بجن ڈاڈا میری ہی طرح کا ایک لمبا تڑنگا مگر چھریرے جسم کا نوجوان سا لڑکا تھا رنگت گندمی تھی۔ ہونٹوں پہ گھنی مونچھیں تھیں۔ چہرہ البتہ کچھ لمبوترا اور آنکھیں بڑی بڑی اور روشن تھیں۔ سر کے بال چھوٹے اور "سیجر کٹ" تھے۔

میں مگ اٹھا کے چائے کے گھونٹ بھرنے لگا۔

"مجھے تمہارے بارے میں سب علم ہو چکا ہے۔" اس نے گولڈ لیف کے سگریٹ کا ایک کش لگاتے ہوئے کہا۔ "تمہارے باپ کو بے گناہ پھانسی پر چڑھا دیا گیا تھا۔ سیٹھ ستار سے تمہاری دشمنی اور بھی بہت کچھ۔ لیکن تم مجھے نہیں جانتے شاید کہ میں ایسے لوگوں کو کبھی معاف کرنے کا عادی نہیں ہوں، ہمارے اپنے جھگڑے اپنی جگہ ہیں لیکن باہر کا کوئی آدمی ہمارے علاقے یا پاڑے میں آ کر اس طرح کی کارروائی کرے اور وہ بھی ہمارے ہی حلیف کی مدد سے یہ تو بالکل بھی ہم گوارا نہیں کرتے مگر تمہاری دلیری بھی ہمیں پسند آئی کہ جب بھی ہم نے تمہیں بلایا تم بلاخوف چلے آئے اور آج والی ملاقات میں سچ بول کر ہمارا بھی دل جیت لیا۔ اصل میں یہاں معاملہ کچھ اور ہو گیا ہے۔" وہ اتنا کہہ کر رکا۔ سگریٹ کا کش لیا۔ میری نظریں بدستور اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ آگے بولا۔

"میرے اپنے بھی علم میں یہ بات نہ تھی کہ ہمارے آدمی بگو نے اپنے دو ساتھیوں پرویز اور لالی کی مدد سے کسی شریف لڑکی کو اغوا کر کے ہمارے ہی پاڑے میں یرغمال بنا رکھا ہے کیونکہ میں ایسی حرکت کو خود بھی سخت ناپسند کرتا ہوں۔ بات کھلی تو مجھے پتا چلا کہ اصل معاملہ کیا تھا۔ افسوس کہ بگو سے ہمارا رشتہ صرف ساتھی کا نہیں ہے ورنہ میں خود اسے اس حرکت پر گولی مار دیتا۔ وہ میرا قریبی رشتہ دار بھی ہے اور ہمارا لاڈلہ بھی۔

سیٹھ ستار نے اس سے بھاری معاوضے کے عوض تمہاری بہن کو اغوا کرنے کا کام لیا تھا، جس کی پوری رقم وہ بگو کو کر چکا تھا۔ جب شکار ہاتھ سے نکل گیا تو بگو اس بات کا پابند تھا کہ اب وہ سیٹھ ستار کو اس کی رقم لوٹا دے مگر یہ بگو کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ سیٹھ ستار بھی چھوڑنے والا نہیں تھا۔ ایسا آدمی جو کام سے پہلے پیسے دینا جانتا ہے تو ناکامی کی صورت میں اپنے پورے پیسے واپس لینا بھی جانتا ہے۔ بگو نے سیٹھ ستار کو اس کی رقم لوٹانے سے صاف انکار کر دیا، جس کے جواب میں سیٹھ ستار نے بگو کی ایک دکھتی رگ پر پاؤں رکھ دیا، جس کا تعلق ہم سے بھی بنتا تھا لیکن بگو نے ابھی تک مجھ سے یہ سب چھپا رکھا تھا۔ بگو سیٹھ ستار کے سامنے جھک گیا اور یہ بھی کہہ ڈالا کہ وہ روپے تو خرچ کر بیٹھا ہے اگر وہ کوئی اور اس سے کام لینا چاہے تو وہ کر سکتا ہے، سیٹھ ستار جیسوں کو روپوں کی نہیں اپنے کام اور اپنی تسکین کی فکر ہوتی ہے، لہٰذا بگو کے جھک جانے سے سیٹھ ستار نے اسے بتایا کہ وہ کالیا کو اغوا کر کے اس کے پاس پہنچا

دے تو حساب برابر ہو جائے گا۔ کیونکہ سیٹھ ستار کو پتا تھا کہ اس کارروائی کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہوسکتا تھا۔ مجو نے اس کام کی حامی تو بھرلی لیکن کالیا کو وہ جس طرح تر نوالہ سمجھا تھا ویسا وہ نہیں نکلا۔ نتیجے میں مجو، کالیا کے ہاتھوں مارا گیا۔

جن ڈاڈا اتنا بتا کر خاموش ہوا اور اس کے آخری انکشاف پر مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ ایک بار پھر پریشانی اور تشویش کے سائے مجھ پر حاوی ہونے لگے تھے اور کالیا کی طرف سے فکرو پریشانی سوا ہونے لگی۔ نجانے اب یہ گینگ وار لیڈر اس پاداش میں کالیا کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا تھا کیونکہ مجھے یہاں لانے والوں نے اشارہ دیا تھا کہ کالیا اسی کی گرفت میں تھا۔

''مجو کے مرنے کے بعد لالی اور پرویز نے مجھے اصل بات سے آگاہ کرڈالا۔ مجو کی موت نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا اور میں خود انتقاماً کالیا سے مجو کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے میدان میں اترا اور اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ کالیا کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ بڑی مشکلوں سے اسے قابو کرکے ہم اڈے پر پہنچے۔ اس سارے معاملے میں چوں کہ مجھے جینگو سے بھی شکایت تھی لہٰذا اسے یہاں بلایا، کیونکہ کالیا اس کا بھی یار ہے۔ میں پریشان تھا اور انتقام کی آگ میں جل بھی رہا تھا لیکن بعد میں جینگو کے ساتھ بیٹھ کر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ معاملے کی تہہ تک پہنچا تو مجھے اس میں سارا قصور اپنے ہی ساتھی مجو کا محسوس ہوا کیونکہ پرویز اور لالی نے ڈر کے مارے مجھے اصل معاملے سے ہٹ کر حقیقت بتائی تھی جس سے میں آگ بگولا ہوگیا تھا۔''

''تو کالیا تمہاری قید میں ہے۔ ڈاڈا سائیں؟'' مجھ سے صبر نہ ہوسکا اور فوراً جن ڈاڈا سے پوچھ لیا۔

''ہاں۔'' اس کی بات پر میں نے اندر ہی اندر سکون کی ایک گہری سانس لی تھی۔ پھر بھی مزید تسلی کی خاطر اس سے دوبارہ مستفسر ہوا۔ ''وہ ٹھیک تو ہے ناں؟''

''بالکل ٹھیک ہے وہ۔'' اس نے جواب دیا۔

جن ڈاڈا ایک بڑے گینگ وار کا لیڈر ہونے کے باوجود مجھے سمجھدار اور سلجھا ہوا آدمی محسوس ہوا تھا ورنہ جیسی شہرت میں نے اس طرح کے لیاری گینگ وار لیڈران کے بارے میں سن تھی کہ ان کی خطرناکی کے لیے اتنا ہی کہنا کافی تھا کہ عام لوگ باگ ان کے سائے سے بھی دور بھاگتے تھے۔ کوئی ان سے زبردستی بھڑ بھی جاتا تھا تو دونوں ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھ جاتے تھے لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ یہ لوگ صرف اپنے دشمنوں کے لیے ہی سنگ دلی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ عام لوگوں سے ان کی کوئی لڑائی یا جھگڑا نہیں ہوتا تھا۔ دو، دو، تین تین گروہ آپس میں دوست بن کر بھی اپنے مخالف گروہ پر حملہ بولتے تھے اور اکثر ایک دوسرے کے بھی جانی دشمن بن جاتے تھے جس سے انتقام لینا ہوتا تھا تو اس کا قبر تک پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔ پھر چاہے خود ہی کیوں نہ مر جائیں، پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ یہی ساری حقیقتیں کالیا کو بھی معلوم تھیں۔ غرضیکہ یہ مختلف گروپوں میں بٹے ہوتے تھے مگر مجھے جن ڈاڈا ان میں کچھ مختلف لگا تھا۔

بہر کیف وہ ایک نظر اپنے قریب بیٹھے جینگو کی طرف دیکھتے ہوئے آگے بولا۔

''میں نے کالیا کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کرنا تھا۔ اپنے دشمنوں کا ہم ایسا ہی حشر کرتے ہیں لیکن ساری حقیقت جان لینے اور جینگو سے ملنے کے بعد ہمیں اپنا ارادہ بدلنا پڑا لیکن مجو کے لواحقین نے مجھ سے قصاص (خون بہا) کا تقاضا کیا تو میں نے یہی بات جینگو کے سامنے رکھ دی۔ جینگو نے مجھ سے یہی کہا کہ تمہیں بلا کر بات کی جائے۔'' وہ خاموش ہوگیا اور جینگو کی طرف دوبارہ ایک نظر ڈالی تو جینگو نے اس بار شاید اس کا کوئی اشارہ بھانپ لیا اور مجھ سے مخاطب ہوکر بولا۔

''دیکھو نعمان! میں تمہیں صرف اپنے یار کالیا کے حوالے سے جانتا تھا۔ میرا براہ راست تم سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ شکر کرو کہ جن ڈاڈا ایک سمجھدار آدمی ہے۔ حقیقت جان لینے کے بعد یہ اس کی مہربانی اور کرم احسان ہے کہ اس نے مجھ سمیت تمہیں اور کالیا کو بھی معاف کردیا ہے مگر کالیا کے سلسلے میں معاملہ اس کے ہاتھ میں نہیں رہا ہے۔ اب میری بات ذرا غور سے سنو کیونکہ فیصلہ تمہارے ہی ہاتھ میں ہوگا اب۔''

وہ اتنا کہہ کر رکا اور پھر کہنا شروع ہوا۔ میری بہ غور نظریں اس کے چہرے پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

''دیکھو نعمان! قصہ ادھر ہی ختم ہو رہا ہے۔ مجو کی حیثیت جن ڈاڈا کے گروہ میں ایک وفادار ساتھی سے بھی بڑھ کر کچھ اور تھی۔ وہ اس کا قریبی رشتہ دار بھی لگتا تھا۔ اسی خاندان کے چند لوگ دوسرے گروہ سے بھی تعلق رکھتے ہیں جن کا شمار نہ دوستوں میں ہوتا ہے نہ ہی دشمنوں میں۔ تم سمجھ رہے ہو ناں میری بات؟''

''ہاں ہاں! میں سمجھ رہا ہوں۔ کہتے رہو۔'' میں نے اس کی طرف بدستور تکتے ہوئے جواب دیا۔

''وہ لوگ بدلے کے طور پر کالیا کو ہلاک کرنے کے

در پے تھے۔ بجن ڈاڈا نے میری دوستی کی خاطر اور کچھ حقائق کا جائزہ لینے کے بعد مقتول مجو کے لواحقین کو بڑی مشکلوں سے قصاص و دیت لینے پر رضامند کرلیا ہے ورنہ تم ہی نہیں کالیا بھی جانتا ہے کہ یہ لوگ کس قدر خطرناک ہیں۔ اچھے بھلے مجرم بھی ان سے ٹکر لیتے ہوئے گھبراتے ہیں۔"

میں ان دونوں کی باتیں سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ میں تو سمجھا تھا پریشانی ٹلنے لگی تھی مگر یہاں ایک اور مصیبت گلے کو آپڑی تھی۔ پتا نہیں کتنا زرتاوان و دیت دینا پڑتا؟ مجھے بھلا ان چکروں کا کیا پتا تھا؟ اور پھر کون دیتا؟

"کک۔کتنا دیت دینا پڑے گا؟" بالآخر میں نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

"چالیس لاکھ۔" ٹھینگو کی بجائے بجن ڈاڈا نے جواب دیا۔ چالیس لاکھ کی رقم معمولی نہ تھی۔ اتنی بڑی رقم کا سن کر میرے حلق میں کچھ پھنسنے لگا اور میں نے اسے نگلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"چچ۔چالیس لاکھ! یہ کچھ زیادہ نہیں ہیں؟"

"ایک انسان کی زندگی سے بڑھ کر تو کروڑوں روپے بھی کچھ نہیں ہیں۔ یہ تو معاملے کو رفع دفع کرنے کی نیت سے دیت رکھی جاتی ہے تاکہ دونوں طرف کے فریقین اپنے اپنے طور پر مطمئن ہوجائیں۔" بجن ڈاڈا بولا۔ "اس پر بھی شکر کرو کہ مقتول کے لواحقین نے کسی طرح کالیا کی جان بخشی کر ڈالی۔ وہ پولیس میں بھی تم دونوں کے خلاف رپورٹ کر سکتے تھے۔ دیت تو تمہیں پھر بھی دینا پڑتی مگر پھر پولیس کو بھی دینا دلانا الگ پڑتا۔"

"میں کالیا سے مل سکتا ہوں۔ کیونکہ رقم کا بندوبست اسی نے ہی کرنا ہے۔"

"نہیں۔" بجن ڈاڈا نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔ "اوّل تو کالیا کو وہ لوگ اپنے ساتھ لے جاچکے ہیں۔ دوسرے یہ کہ دیت کے پیسے لیے بغیر وہ کالیا کو نہیں چھوڑیں گے۔"

اس کی بات سن کر مجھے مزید پریشانی نے گھیر لیا اور بے اختیار میں اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ کالیا کے بغیر میں خود کو ادھورا سمجھتا تھا۔ اس کا دنیا میں میرے سوا اور تھا بھی کون؟ استاد بھابھا بھی اسے بچانے کے لیے اتنی بڑی رقم نہیں دے سکتا تھا، تاہم ایک اُمید کے سہارے میں اس سے بات تو کرنے کا فیصلہ کرہی چکا تھا۔ رہا ٹھینگو تو اس نے پہلے ہی اپنی طرف سے اس معاملے کو صاف کردیا تھا، یہی اس کا بڑا احسان تھا اپنی دشمنی کا رسک لیا تھا اس نے۔

آریوں کی آمد

تاریخ انسانی میں "آریہ" سے مراد کاشت کاروں کی وہ قوم ہے جو حضرت عیسیٰ کی ولادت سے ڈھائی ہزار سال پہلے وسط ایشیا کی چراگاہوں سے نکلی اور یورپ، ایشیائے کوچک، ایران اور ہندوستان میں وارد ہوئی۔ ان کی دو بڑی شاخیں تھیں۔ ایک نے یورپ کا رخ کیا اور دوسری ایران کی طرف آئی۔ یورپ کی طرف جانے والے آریہ قبائل کو ہندو یورپی اور ایران کی طرف آنے والوں کو ہند آریہ کہا گیا۔

آریہ کی جو شاخ ایران میں آکر آباد ہوئی، وہ تاریخ میں میڈی کہلاتے ہیں۔ ان کے جانشینوں نے مشہور ہخامنشی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو سائرس اعظم کی تخت نشینی (559 ق م) سے لے کر اسکندر اعظم (331 ق م) کی لائی ہوئی تباہی تک قائم رہی۔ ان آریوں میں سے کچھ کی اولادیں جو پارسی کہلاتی ہیں، آٹھویں صدی عیسوی میں جنوب مغربی ہندوستان میں آکر آباد ہوگئیں۔ ایران میں اچھی طرح اپنا تسلط جمانے کے بعد ان لوگوں نے افغانستان کی طرف رخ کیا اور تقریباً 2500 ق م میں کابل کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے۔

بعض تاریخی شواہد سے پتا چلتا ہے کہ ارض پاکستان میں داخل ہونے والے آریہ آبادکار حضرت نوحؑ کے طوفان کے بعد یہاں پہنچے تھے۔ تاہم آریہ کوہ ہمالیہ اور کوہ ہندوکش کے دروں کو عبور کرکے پنجاب کی سرزمین میں داخل ہوئے۔ دریائے سندھ کی تیز رفتاری کو دیکھ کر انہوں نے اسے سندھو کا نام دیا۔ یہاں پر پہلے سے آباد دراوڑ قوم کو مار بھگایا اور پانچ دریاؤں کے آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ مفتوحہ علاقوں کو "آریہ ورت" کہا جانے لگا۔

مرسلہ: قرۃ العین، اقراثانی، کراچی

مجھے مہلت کے طور پر پندرہ دن دے دیئے گئے تھے۔ کالیا کہاں قید تھا؟ مجھے اس کا علم نہیں تھا، کن کی قید میں تھا، وہ بھی صرف اسی حد تک جانتا تھا کہ بجن ڈاڈا کو ہی اس کا علم تھا۔ شکر تھا کہ وہ زندہ تو تھا۔

بہر طور میں بجن ڈاڈا اور آخر میں جینگو کا شکریہ ادا کر کے واپس لوٹنے ہی لگا تھا کہ اچانک دو آدمی احاطے کے پھاٹک سے دوڑتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ ان دونوں کے چہرے جوشِ غیظ سے تمتمارہے تھے۔ ان میں تو گٹھے ہوئے جسم اور درمیانے قد و قامت کا آدمی تھا، جس کے چہرے سے خوف ناکی جھلک رہی تھی۔ ہاتھ میں اس کے ٹی ٹی پسٹل تھا۔ اس نے ٹائٹ قسم کی بنیان دھاری دھاری شرٹ اور نیلی جینز پہن رکھی تھی جبکہ اس کے دوسرے ساتھی نے شلوار قمیص اور وہ ذرا مضبوط جسم کا لمبا تڑنگا آدمی نظر آتا تھا۔ رنگت سیاہی مائل تھی۔ اس کی آنکھوں سے کچھ زیادہ ہی طیش ناکی اور چہرے سے خونخواری مترشح ہورہی تھی۔ وہ بظاہر خالی ہاتھ نظر آتا تھا بجن ڈاڈا سے غصے میں وہی مخاطب ہوا تھا، جس سے مجھے اس کی حیثیت کا اندازہ ہوتا تھا کیونکہ بجن ڈاڈا جیسے گینگ وار لیڈر کو میں نے اس کے سامنے کچھ دبتے دیکھا تھا جبکہ جینگو کی حالت تو زیادہ ہی پتلی نظر آنے لگی تھی۔ میں کچھ گھبرا سا گیا کہ نجانے اچانک کیا ہو گیا تھا۔

''ڈاڈا! وہ مردود خونی بھاگ گیا ہے اور ہمارے مزید دو آدمیوں کو بھی ہلاک کر ڈالا ہے اس نے۔ اب تو دیت دیت گئی بھاڑ میں۔ اب اس کے ساتھی کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''ہاں، ڈاڈا سائیں! اب خون کا بدل خون ہوگا بس!'' ٹی شرٹ والے نے بھی اسی طرح کے غصے اور برہمی کا اظہار کیا۔

بجن ڈاڈا اور جینگو کو تو خیر اندازہ ہو ہی چکا تھا کہ یہ دونوں کس ''مردود خونی'' کی بات کر رہے تھے لیکن خود مجھے بھی ادراک ہو چلا تھا کہ یہ دونوں کس کی باتیں کر رہے تھے۔ یہی سبب تھا کہ ایکا یکی میری ریڑھ کی ہڈی میں تشویش و خدشات کی سنسنی کسی برچھی کی طرح اترتی چلی گئی۔ کیونکہ ان کا ایک شکار میری صورت میں تو ان کے سامنے ہی موجود تھا، یہ الگ بات تھی کہ ابھی انہیں معلوم نہ تھا۔ بجن ڈاڈا کا پتا نہیں تھا کہ وہ اسی وقت کھڑے کھڑے مجھے ان کے حوالے کر دیتا۔ میں کھڑا رہا مگر اندر سے میرا وجود مرتعش سا ہو رہا تھا۔

''کیا ہوا ہے میرداد؟ خیریت تو ہے؟'' بجن ڈاڈا نے بالآخر اس سے پوچھا۔ ہم کھڑے تھے۔ میرداد یہی قد آور اور کسرتی بدن والا شخص تھا جو اپنے ساتھی کے مقابلے میں زیادہ بپھرا ہوا نظر آرہا تھا۔

''بس، بجن ڈاڈا! بہت ہو گیا۔ اب حساب صاف ہوگا۔ کالیا اور اس کے ساتھی نعمان کا ہمیں اسی وقت پتا دے دو۔ ہم جانیں ہمارا کام جانے۔'' اس کے منہ سے اپنا نام بھی سن کر میری رگ و پے میں پھریری سی دوڑ گئی۔ فکر و تشویش کی ایک سنسناتی ہوئی لہر تھی جو پورے وجود میں برق کی طرح سرایت کر گئی۔ میں ان کے دوسرے شکار کی صورت میں ان کے سامنے کھڑا تھا اور یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اگر بجن ڈاڈا یا جینگو میری طرف ایک ذرا اشارہ بھی کر دیتے تو میرداد نامی یہ بپھرا ہوا شخص اور اس کا ساتھی اسی وقت مجھے گولیوں سے چھلنی کر ڈالتے۔

بجن ڈاڈا اور جینگو نے میری جانب ایک نظر ڈالی بھی تھی، دکھ اور تاسف کے ساتھ میں نے بجن ڈاڈا کے چہرے پر بھی برہمی اور جوش کے تاثرات کی جھلک امڈتے ہوئے دیکھی تھی۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں یہ بھی مجو کی ہلاکت پر طیش و انتقام تلے انہیں میرے بارے میں بھی بتا دے مگر شکر تھا کہ میرے بارے میں بولے کچھ بھی نہیں تھے۔ مجھے حیرت آمیز تشویش تو اس بات سے ہورہی تھی کہ بھلا یہ میرے دشمن کیوں کر بن گئے تھے؟ بجن ڈاڈا ہوتا تو بات سمجھ میں آتی تھی لیکن پھر فوراً ہی خیال آیا کہ کالیا کے ہاتھ مجو کا کام بگڑا تھا اور کالیا کے ساتھ میں بھی تھا۔ بجن ڈاڈا نے جب کالیا کو ان کے حوالے کیا ہوگا تو ساری تفصیل بھی بتائی ہوگی اور اب یہ لوگ مجو کی ہلاکت کو ابتدائی واقعات سے جوڑ رہے تھے۔

''تم بیٹھو تو بابا! مجو کے ہلاک ہونے کی اس خبر نے مجھے بھی دہلا کر رکھ دیا ہے۔'' بجن ڈاڈا نے ان سے کہا۔ جینگو پریشان سا نظر آرہا تھا۔ معاملہ اس کے لیے بھی خراب ہونے لگا تھا۔ میرا تو جی چاہ رہا تھا کہ اسی وقت بھاگ کر احاطے کا پھاٹک پار کر لوں اور اپنی کار میں جا بیٹھوں، پھر گھر ہی جا کر دوسرا سانس لوں مگر میری ہمت جواب دینے لگی تھی۔ وہ ان دونوں نے مجو کی موت اور کالیا کے فرار پر وہاں تھرتھرلا مچا دیا تھا۔ ابھی شاید انہیں ایک اور حقیقت کا پتا نہیں چلا تھا کہ بجن ڈاڈا کے ساتھ موجود جینگو بھی اس میں برابر کا قصوروار تھا۔

''کیا بیٹھ کر کروں میں ڈاڈا!'' میرداد چراغ پا ہو کر بولا۔ ''اب تو میں سب سے مجو کی موت کا بدلہ لوں گا، ان لوگوں سے بھی جنہوں نے باہر کے ان دونوں دشمنوں کو یہاں

کی راہ دکھلائی تھی۔ تم تو مجھے نہیں بتاؤ گے مگر میں اس کا بھی پتا چلا ہی لوں گا۔"

اس کی بات پر میں نے کن انکھیوں سے جینگو کی طرف دیکھا تھا، جو میرداد کی اس خوں ناک دھمکی سے پریشان سا نظر آنے لگا تھا۔

"تم جاؤ بعد میں بات ہوگی تم سے۔" دفعتاً ہی جمن ڈاڈا نے مجھ سے کہا اور میں جیسے اسی بات کا ہی منتظر تھا۔ ساتھ دل ہی دل میں جمن ڈاڈا کا شکریہ بھی ادا کیا اور پھر واپس جانے کے لیے پلٹا تو میرداد نامی اس جلتے سلگتے شخص کو اپنی جانب ایک نظر گھورتے بھی پایا۔ میں ابھی پھاٹک تک پہنچا ہی تھا کہ آٹھ دس مسلح افراد کا مشتعل گروہ ہاتھوں میں اسلحہ تھامے اندر داخل ہونے لگا۔ میں نے جلدی سے گھبرا کر انہیں اندر آنے کی جگہ دی۔ یہ بھی میرداد کے ہی گینگ کے آدمی لگتے تھے۔

ان سب کے پھاٹک سے گزر جانے کے بعد میں جلدی سے آکر کار میں سوار ہوگیا اور اسے اسٹارٹ کیا، شاید گھبراہٹ تھی یا بوکھلاہٹ کہ گاڑی کو صحیح اگنیشن نہیں لگ پا رہا تھا۔ یہاں کے حالات خراب ہونے کے واضح امکانات نظر آرہے تھے۔ پورا لیاری ان کی لپیٹ میں آجاتا تھا۔ اس لیے میں جلد سے جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن نجانے کیا ہوا کہ گاڑی اسٹارٹ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ میں نے اس بار صبر وتحمل کے ساتھ دوبارہ سیلف دیا مگر ندارد ابھی میں کار سے اتر کر بونٹ اٹھانے ہی لگا تھا کہ جمن ڈاڈا کے احاطے کے اندر سے گولیاں چلنے کی سمع خراش تڑتڑاہٹ ابھری۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ باہر موجود دو تین افراد۔ اندر کو بھاگے، ایک نے مجھ سے غصے میں کہا۔

"اڑے بابا! جاؤ بھاگو ناں ادھر سے۔ ہنگامہ ہوگیا ہے، ابھی تمہاری گاڑی کو آگ لگا دیں گے۔" وہ یہ کہہ کر اندر بھاگا۔ پریشانی اور خوف سے میرا پورا وجود سنسنانے لگا۔ میرے خیال میں کالیا نے جلد بازی کا مظاہرہ کرکے سنبھلتے ہوئے حالات کو پہلے سے زیادہ خطرناک بنا ڈالا تھا جبکہ خود میں بھی مصیبت میں پھنس گیا تھا، خیال تو آیا جی میں کہ گاڑی چھوڑ کر ہی بھاگ جاؤں مگر میرے جیسے متوسط آدمی کے لیے گاڑی جیسی سواری کسی نعمت سے کم نہ تھی اور میں اس کے نقصان کا متحمل بھی نہیں ہوسکتا تھا نہ ہی دوبارہ خرید سکتا تھا۔ تاہم جان پر بنتی تو اور بات تھی۔ اندر فائرنگ ہو رہی تھی اور شور شرابے کی بھی آوازیں آرہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے دو فریقوں کے درمیان دو بدو باقاعدہ خطرناک فائرنگ شروع ہوچکی ہو۔

میں نے جلدی سے کار کا بونٹ اٹھا کر دیکھا مگر کوئی خرابی نظر نہ آسکی۔ میں دوبارہ اسٹیئرنگ پر آیا اور اگنیشن میں لگی چابی گھمائی۔ اللہ سے دعا بھی مانگنے لگا کہ اس بار اسٹارٹ ہوجائے اور وہی ہوا شکر تھا کہ وہ اسٹارٹ ہوگئی۔ میں نے جلدی سے گیئر ڈالا اور کار دوڑائے نکل گیا۔

میں گاڑی کو چیل چوک سے نکال کر میرا ناکہ چوک پر لے آیا اور سیدھا دوڑاتا لے گیا۔ لیاری کے علاقے سے نکلنے کے بعد میں نے سکھ کی سانس تو لی تھی مگر آیندہ کے متوقع حالات کا اندازہ کرکے مجھے تشویش کھائے جا رہی تھی۔ جانتا تھا میں کہ آج لیاری کے حالات ہماری ہی وجہ سے خراب ہوئے تھے۔ یہ سوچ سوچ کر ہی میرا دل ہول رہا تھا کہ اب آگے کیا ہونے والا تھا! اور جو ہونے والا تھا وہ۔ کچھ اچھا نہ ہوتا۔ یہ شکر تھا کہ کالیا ان خطرناک لوگوں کی قید سے راہِ فرار اختیار کرچکا تھا، اس بات سے قطع نظر کہ اس نے ان کی قید سے فرار ہوکے غلطی کی تھی یا عقل مندی۔ تاہم میرا خیال تھا کہ اسے بھی اس حقیقت کا علم ہوچکا ہوگا کہ جوکی اس کے ہاتھوں ہلاکت پر اس کے وارثین دیت کے طور پر ایک بڑی رقم کا مطالبہ کررہے تھے۔ ممکن تھا کالیا کو پہلے ہی سے یہ احساس ہونے لگا ہو کہ اس کی تلاش میں مجھے بھی اس حقیقت کا علم ہو چکا ہو اور میں اب اس کے لیے اتنی بڑی رقم کے بندوبست کرنے کے امتحان میں نہ پڑجاؤں اور اس نے میری یہ آزمائش آسان کرڈالی ہو مگر یہ سب آسان کہاں ہوا تھا؟ وہ ان کے دو بندے اور بھی مار کے نکل بھاگا تھا ان کی قید سے کوئی بعید نہ تھا کہ میرداد اور اس کے ساتھی میرے پیچھے بھی لگ سکتے تھے۔ مصیبت نئی تو نہیں تھی لیکن اس کا سلسلہ تعلق میرے پیش آمدہ حالات سے ہی تھا۔

اچانک میرے سیل فون کی بیل گنگنائی اور میرا دل اندیشناک وسوسوں تلے آپوں آپ ہی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جب انسان سنگین تر حالات سے دوچار ہو تو ایسے میں سیل فون کی بیل بھی چونکا دیتی ہے اور دل کسی انجانے خدشات تلے زور زور سے دھڑکنے لگ جاتا۔ تب ہی یہ ایسا پریشان اور ژولیدہ انسان کلپس کر یہ سوچتا ہے کہ "کم بخت یہ موبائل فون ایجاد ہی کیوں ہوا۔"

میں نے کال اٹینڈ کی اور ہیلو کہا۔

"جگری! تو کہاں ہے۔" دوسری جانب سے کالیا کی مخصوص لب ولہجے کی آواز پر میں چونک پڑا۔

"میں راستے میں ہوں اور گھر جا رہا تھا، پر تو بتا تو کدھر

ہے یار؟'' میں نے پریشان زدہ لہجے میں کہا تو وہ بولا۔

''صفورا گوٹھ والی جگہ دیکھی ہے ناں۔ وہی جہاں، عارف مچھندر سے تیری ملاقات کروائی تھی؟''

مجھے یاد آ گیا، تڑنت بولا۔ ''ہاں۔ ہاں۔ آگے بول۔''

''وہیں آ جا، باقی کی تفصیل وہیں آرام سے بیٹھ کر کرتے ہیں۔'' کہتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور میں نے کار کی رفتار مزید بڑھا دی۔

روڈ پر ٹریفک کا رش کم ہونے کی وجہ سے میں آدھے گھنٹے میں ہی صفورا گوٹھ پہنچ گیا اور کار سیدھی لے جا کر وہیں اس کے دروازے کے سامنے روک دی۔ میں نے ایک ہارن دے کر اگنیشن چوک سے چابی نکالی اور دروازہ کھول کر نیچے اترا، جب تک دروازے کے قریب پہنچا، کسی نے میرے دستک دینے سے پہلے ہی کھول دیا۔ سامنے جمی کھڑا تھا۔

''آ جائیں جلدی۔'' اس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے مجھ سے کہا۔

میں اندر داخل ہوا اور مختصر سا صحن پار کرتا ہوا جمی کے ساتھ ایک کمرے میں آ گیا۔ کالیا وہاں پہلے ہی سے کھڑا تھا۔ میں اس سے اور وہ مجھ سے لپٹ گیا۔

آج پہلی بار میں اسے بہت زیادہ پریشان اور تشویش زدہ دیکھ رہا تھا ورنہ تو کہاں وہ مجھے تسلیاں دیا کرتا تھا لیکن آج اس کا چہرہ دیکھ کر لگتا تھا جیسے اسے ڈھارسوں اور تسلیوں کی ضرورت تھی مگر یہ دیتا کون؟ میں تو خود مضطرب الحال کیفیات سے دوچار تھا۔

''یار جگری! یہ سب برا ہو گیا۔ اتنا پریشان تو میں کبھی پولیس کے پیچھے لگنے سے نہیں ہوا ہوں جتنا کہ ان گینگ وار دشمنوں سے ہو کے رہ گیا ہوں۔'' وہ مجھ سے الگ ہو کے بولا۔ مجھے اس کا چہرہ مترشح اور لہجہ لڑکھڑاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا لیکن بعد میں مجھے پتا چلا کہ اس کی تشویش اور پریشانی میرے لیے تھی۔

''جگری! مجھے اس کالیا کی فکر نہیں۔ کیونکہ جب میں نے شرافت اور ''شیراز'' کا لبادہ اتار کر کالیا کا لباس اوڑھا تھا تو یہ جان لیا تھا کہ یہ جان۔ اب موت کے حوالے ہوئی لیکن یار جگری! مجھے تیری فکر ہوگئی ہے کیونکہ تو ابھی کالیا نہیں بنا۔ نہ ہی میں تجھے بننے دوں گا۔ لل۔ لیکن۔'' وہ چپ ہو رہا۔

ایسا ہوتا ہے، جب کوئی مرد یار۔ ڈھنے لگے تو دوسرے کا ہمت و حوصلہ سوا ہونے لگتا ہے، میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ کالیا کو اپنے لیے اس قدر مضمحل اور رنجیدہ خاطر پا کر میرے اپنے اندر ایک نئی ہمت اور جوشِ حوصلگی کا جذبہ اچانک ہی بیدار ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

''کالیا! میرے یار! آرام سے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ فقط اتنا یاد رکھا کر۔ ایک سب سے بڑی ہستی ہے جو اوپر آسمان پر بیٹھی ہے اور سب کی جان اسی قادر المطلق کے ہاتھ میں ہے۔ جب اللہ کا نام دل و دماغ میں جاگزیں ہونے لگتا ہے تو ساری پریشانیاں اور تفکرات ہوا ہونے لگتے ہیں، کیونکہ وہی سب کا پالن ہار اور مددگار ہے۔''

کمرے میں ایک ہی بڑا سا پرانا صوفہ رکھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے دو کرسیاں بے ترتیب پڑی تھیں۔ کالیا نے تو کرسی سنبھال لی جبکہ میں صوفے پر گر گیا۔ جمی اس اثناء میں پانی اور چائے لے آیا تھا۔ ہم نے پانی پیا اور چائے کا کپ سنبھال لیا۔ جمی بھی کالیا اور میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔

''پہلے تو اپنی سنائے گا یا میں سناؤں؟'' میں نے چائے کا ایک گھونٹ بھر کے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ابے لے جگری! تیرے پاس بھی کوئی خبر ہے؟ میں تو سمجھا تھا کہ میں ہی اپنی سنا تا رہوں گا۔''

''تجھے سنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے میرے یار!'' میں نے پھیکی پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔ باتوں کا سلسلہ چلا تو پریشانی اور ژولیدگی کا تکدر کچھ کم ہوا۔

''مجھے تیرے بارے میں سب معلوم ہے، اسی لیے بہتر ہے کہ میں ہی سناتا ہوں۔''

وہ اب حیرت سے آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اسے اب تک کی ساری حالاتِ دگرگوں کی صراحت سے آگاہ کر دیا اور آخر میں یہ غمگسار خبر بھی دی کہ فہیم بھائی کے ساتھ اس ''پردہ نشین'' ظالم درندے نے کیا حشر کیا تھا۔

''اف! میرے خدایا!'' کالیا یہ سب سن کر کرب انگیز لہجے میں بولا اور چائے کا خالی کپ قریب دھری تپائی پر رکھ کے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ گینگ وار گروپ سے دشمنی کی پریشانی اپنی جگہ مگر فہیم کے بارے میں سن کر وہ لرز اٹھا تھا۔

''یار جگری! مجھے یقین نہیں آ رہا۔ کیا واقعی فہیم بھائی کے ساتھ ایسا ظلم ہو چکا ہے؟ بہت برا ہوا یہ۔ بہت برا ہوا یہ۔'' وہ دکھ سے خود کلامیہ بڑبڑانے لگا۔

''اپنے جوان گبرو بھائی کو اس بھری جوانی میں ٹانگوں سے معذور دیکھ کر میں ابھی تک اس صدمے سے سنبھل ہی نہیں

پایا ہوں یار کالیا!" میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔
"یار! شریفوں کی بھی کیا زندگی ہوتی ہے۔ اپنی ہی بے بسی پر بس آنسو ہی بہا کے رہ جاتے ہیں اور دنیا تماشا دیکھتی ہے قہقہے لگاتی ہے۔ کاش کالیا! کاش تو نے مجھے بھی کالیا بننے دیا ہوتا۔ ایک شریف آدمی جب بدمعاش بنتا ہے تو پھر اس سے بڑا بدمعاش اور کوئی نہیں ہوتا۔ دیکھ کالیا! میری بات سن۔ اب میں جو کرنے لگا ہوں تو مجھے اس سے نہیں روکے گا۔ تیرے ساتھ رہتے ہوئے مجھے، چاہے دفاع کی حد تک ہی سہی مار کٹائی کرنا آ ہی گئی۔ اسلحہ بھی چلا لیتا ہوں۔ بلکہ دیکھا جائے تو نئی زمانہ جس کے پاس اسلحہ اور طاقت ہے، وہی سب کچھ ہے۔ مجھے بھی ایک عدد لائسنس یافتہ پستول رکھنا چاہیے۔"

میری باتیں سن کر کالیا اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میرے قریب آکر بولا۔

"ابے لے جگری! بڑی بات کردی۔ تجھے تعمان ہی رہتا ہے اور بس! میں ہوں، یہ کافی ہے۔"

"میرا خیال ہے، ہم اصل موضوع پر گفتگو کرلیں جس کے لیے ہم یہاں اکٹھے ہوئے ہیں، تو زیادہ بہتر رہے گا۔" جمی جو ایک طرف کرسی میں اب تک خاموش بیٹھا تھا، ہماری طرف دیکھ کر بولا اور کالیا سر ہلاتا ہوا دوبارہ اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔

"تو جگری! سب سے پہلا کام تم نے یہ کرنا ہے کہ رانا بشیر والے معاملے کو جلد سے جلد نمٹانے کی کوشش کرو۔" بالآخر کالیا نے کہنا شروع کیا۔ "کیونکہ اس معاملے کو جتنا طول دو گے، پردہ نشین گل کھلاتا رہے گا۔ فہیم بھائی کو دونوں ٹانگوں سے محروم کرنے کا بدلہ تو اس پردہ نشین سے ایسا لیں گے کہ اس کی نسلیں تک یاد رکھیں گی۔ باقی رہا مسئلہ لیاری والا تو اس کے لیے ہمیں پہلے استاد بھابھا کے پاس جانا پڑے گا، یہ بڑا گمبھیر مسئلہ ہے اور وہی کوئی بہتری کی صورت نکال سکتا ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا لیکن۔" کہتے ہوئے میں ذرا پُرسوچ انداز میں رکا پھر بولا۔

"رانا بشیر والا معاملہ پہلے سے زیادہ تیز تر ہو چکا ہے، اسی لیے تو پردہ نشین نے بوکھلا کر اتنی بڑی بزدلی کا مظاہرہ کیا ہے کہ میرے نہتے اور شریف، معصوم بھائی کو معذور کرڈالا مگر یار کالیا! یہ لیاری والا مسئلہ زیادہ حل طلب ہے، اس سنگین مسئلے کی وجہ سے ہم سر چھپاتے رہنے پر مجبور ہوجائیں گے۔ تو باقی معاملات کیسے دیکھیں گے؟"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" جمی نے پھر مداخلت کی۔ "یہ بدروحوں کی طرح ہمارے پیچھے پڑ جائیں گے اور کسی کام کا نہ چھوڑیں گے ہمیں۔ اسے معمولی بات سمجھنا، مستقبل قریب میں بھیانک نتائج کا سبب بن سکتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اسی وقت استاد بھابھا کے اڈے پر چلنا چاہیے۔"

کالیا اور میں نے جمی کی بات پر صاد کرتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑ دی اور کار میں آکر بیٹھ گئے۔ مکان کو تالا لگا کر جمی بھی پچھلی سیٹ پر آن بیٹھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد میری مہران کار ایک بار پھر سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

استاد بھابھا کے اڈے پر پہنچ کر ہم نے لیاری والی گمبھیر صورت حال اس کے سامنے رکھ دی، جسے سن کر چند لمحہ تو استاد بھابھا جیسا آدمی بھی سکتے میں آگیا۔ پھر ہم سے کوئی بات کیے بغیر اس نے فوراً اپنا سیل فون نکالا اور کسی کا نمبر پنچ کرنے کے بعد کان سے لگالیا۔

"ہاں! جمالی کیا حال ہے؟ اللہ کا شکر ہے میں بھی ٹھیک ہوں، پر یار! تیرے سے ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔ ہاں! کچھ ایسا ہی ہے، یار! تھوڑی تکلیف کرسکتا ہے؟ میرے پاس ذرا آجا۔ ایک بڑے نازک اور خطرناک مسئلے پر تیرے سے تفصیلی بات کرنی ہے۔" اتنا کہہ کر استاد بھابھا دوسری طرف سے اس کی سنتا رہا پھر ممنون بھرے لہجے میں بولا۔

"یار فیاض جمالی! بڑی مہربانی تیری۔ بس! چلا آ۔ جلدی، سمجھ لے کہ میں تیرا ہی بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔"

اس کے بعد استاد بھابھا نے رابطہ منقطع کردیا۔ لیاری والے مسئلے کی ساری کتھا کو بھابھا نے بڑی پُرغور خاموشی سے سنا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ہماری طرح وہ بھی پریشان ہوجائے گا لیکن اس کی فراخ پیشانی پر ماسوائے چند انچ کی سلوٹوں کے نمودار ہونے اور ایک گہری پُرسوچ ہنکاری کے۔ کچھ بھی ایسا خاص اظہار نہیں ہوا تھا، جس سے پتا چلتا ہو کہ مسئلے کی نزاکت نے اسے بھی ایک بڑی فکر میں مبتلا کردیا ہو۔ اس کے برعکس وہ ایک مسکراتی ہوئی نظر جمی اور مجھ پر ڈالنے کے بعد کالیا سے مخاطب ہوکر بولا۔

"اوئے کالیے! آج پہلی بار تجھے اس قدر پریشان دیکھ رہا ہوں۔ تو تو بڑا جی دار آدمی تھا میرے گروہ کا۔ لگتا ہے، لوبی کے ساتھ رہ کر تو بھی شریف بن گیا ہے۔"

کالیا کے لیے استاد بھابھا کا یہ تبصرہ بلاشبہ عمومی نوعیت کا نہ تھا جبکہ خود میں بھی کالیا کے متعلق ایسا سوچ چکا تھا اور یہی

بات استاد بھابھا نے بھی محسوس کی تھی لیکن کالیا لیاری والے مسئلے سے کس وجہ سے زیادہ پریشان اور متفکر تھا یہ میں ہی جانتا تھا، آفرین تھا کہ کالیا نے مجھے تو اپنی تشویش کی اصل وجہ (جو میں ہی تھا) لیکن وہ استاد بھابھا کے سامنے چپ رہا، مگر بھابھا بھی کائیاں نکلا۔ ہنستے ہوئے بولا۔

''جانتا ہوں تجھے۔ کالیا! تو تو یاروں کا یار ہے اور تیری پریشانی بھی تیری ذات کے لیے آج تک نہیں دیکھی میں نے۔'' بالآخر استاد بھابھا کے اس اعتراف پر کالیا محض اپنا سر جھٹک کر رہ گیا پھر شاید موضوع بدلنے کی غرض سے بھابھا سے بولا۔

''استاد! یہ فیاض جمالی بھی لیاری کا کوئی گینگ لیڈر ہے کیا؟''

''ہاں! مگر کچھ زیادہ بڑا نہیں ہے۔ اس کا گروپ جیسا کہ بجن ڈاڈا اور بھورل سندھی کا ہے لیکن وہاں اس کی کسی کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے، نہ ہی وہ کسی کا حلیف ہے۔ اس کا اپنا منشیات کا اڈا ہے۔ تاہم اس کی بجن ڈاڈا اور بھورل سندھی سے بیٹھک اچھی ہے۔ یہ آٹھ دس گروپ ہیں، قابل ذکر بجن ڈاڈا اور بھورل سندھی کے دونوں گروپ ہیں اور دونوں ماضی میں ایک دوسرے کے جانی اور خونی دشمن بھی رہ چکے ہیں پھر بعد میں ایک ایم این اے کی مداخلت سے ان کی خوں ریز جنگ صلح کروا کے جنگ بندی کروادی گئی، اب کوئی بھی ایک دوسرے کے معاملے میں دخل نہیں دیتا۔ اب تازہ صورتِ حال کیا رنگ لاتی ہے یہ تو آگے چل کر ہی پتا چلے گا تاہم اگر بڑے گروپ آپس میں بھڑ جاتے ہیں تو چھوٹے گروپ ایک دوسرے کے حریف بن کر اس جنگ میں کود پڑتے ہیں۔ یہی لیاری گینگ وار کو جنم دیتی ہے۔''

استاد بھابھا نے۔ تفصیل بیان کی اور آگے بولا۔''میری بھی ان سے سلام دعا ہے مگر ایک حد تک۔ میں ان کے کام بھی آیا ہوا ہوں۔ فیاض جمالی تو میرے نام کی مالا جپتا ہے۔ مجھے امید ہے وہ کوئی بہتری کی صورت نکال لے گا۔''

استاد بھابھا کی باتوں سے کالیا کو ڈھارس ہوئی نہ ہوئی ہو مگر مجھے ضرور پہنچی تھی۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ لوہے کو لوہا اور زہر کو زہر کاٹتا ہے۔ استاد بھابھا بھی مجھے ان جغادری لیڈروں میں سے ایک محسوس ہو رہا تھا۔

فیاض جمالی ایک بہ مشکل گھنٹے کے اندر ہی آگیا۔ وہ ایک پختہ عمر اور فربہی مائل شخص تھا۔ سر کے آدھے بال اڑ چکے تھے۔ وہ ایک موٹی سی موٹر بائیک میں آیا تھا اور اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکا تھا شاید۔ بائیک بھی لایا تھا چلا کر۔

وہ پہلے استاد بھابھا سے بڑی گرمجوشی کے ساتھ بغل گیر ہوا اس کے بعد ہم سے بھی باری باری دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ ملایا۔ اس کے بعد بھابھا نے اسے اپنے سامنے دبیز قالین پر بیٹھنے کا کہا۔ یاد رہے استاد بھابھا کے اڈے پر کرسی اور بیڈ نہیں ہوتے تھے، ماسوائے فرشی نشست کے۔ جو ایک موٹے دبیز اور قیمتی قالین پر مشتمل تھی۔ مخمل کے کڑاہی والے خوب صورت گاؤ تکیے پڑے ہوتے تھے، باقی اے سی وغیرہ سمیت ضرورت و آسائش کی ہر شے وہاں موجود ہوتی تھی۔

فیاض جمالی بھی ایک ایسے ہی گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں گولڈ لیف کا پیکٹ اور لائٹر تھا۔ موبائل بھی تھا، گٹکے کا ایک پڑا بھی تھا۔ یہ سب چیزیں اس نے اپنے سامنے رکھ دیں۔

''پہلے یہ بتاؤ کیا منگواؤں تمہارے لیے؟ پھر آرام سے باتیں کرتے ہیں۔'' استاد بھابھا نے مسکرا کر اس سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ جس کی ضرورت ہے وہ سب میرے سامنے رکھا ہے۔'' فیاض جمالی نے بھی اسی دوستانہ مسکراہٹ سے اپنے سامنے پڑی چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو استاد بھابھا ہنس پڑا۔

''یہ بھی تم نے خوب کہی جمالی سائیں!'' اس کے بعد اس نے وہاں موجود اپنے ایک ساتھی کو چائے وغیرہ لانے کے لیے بھیج دیا۔

''یار جمالی! تم سے ایک بڑا ضروری کام پڑ گیا ہے۔'' بھابھا ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

''ہاں! تو بول ناں میرے یار! میں اتنی دور سے یہی جاننے کے لیے تو آیا ہوں تیرے پاس؟''

''تیری مہربانی ہے یار!''

''کوئی مہربانی نہیں۔ یہ دوستی کا فرض ہے کہ اسے تکلیف میں دیکھو تو فوراً پہنچ جاؤ، تو نے بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی کیا بھابھا!'' فیاض جمالی بولا۔ اس کے لہجے سے بھابھا کے لیے ممنونیت کے جذبات نمایاں ہوتے تھے۔

استاد بھابھا نے ایک گہرا سانس لیا پھر کالیا اور میری طرف ایک نظر ڈال کر ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے بولا۔

''یار جمالی! ایک نازک اور سنگین مسئلہ آن کھڑا ہوا ہے،

میرا خیال ہے تو ہی ہماری مدد کرسکتا ہے۔"

"ہاں ہاں! بول میرے یار! کیا مسئلہ ہوا ہے؟" جمالی بھی ایک نگاہ ہم دونوں پر ڈالتے ہوئے استاد بھا بھا سے بولا تو بھا بھا اسے ساری رام کہانی سنانے لگا۔ تقریباً نصف گھنٹے تک ساری بات پوری تفصیل کے ساتھ فیاض جمالی کو بتادی، جسے سن کر جمالی کا منہ حیرت و تشویش کے ملے جلے تاثرات تلے کھل کر رہ گیا اور وہ انہی نظروں کے ساتھ گردن ذرا موڑے کالیا اور میری جانب تکنے لگا، پھر بھا بھا کی طرف دیکھ کر بولا۔

"میں سمجھا تو اسی لیے آج لیاری کے حالات اتنے خراب ہوئے اوہ بڑی عجیب سی بات ہوگئی یہ۔"

"اس سے زیادہ سنگین بھی جمالی بھائی! اب مجھے یہ بتاؤ۔ اس کے حل کی کیا صورت حال نظر آتی ہے تمہارے ذہن میں؟" بھا بھا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

اتنے میں چائے اور بسکٹ وغیرہ درمیان میں رکھ دیے گئے۔ بھا بھا نے جمالی کو چائے لینے کا کہا۔ جمالی نے چائے کے کپ میں ایک بسکٹ ڈبو کر کھایا اور پھر ایک کو اٹھا کر ایک گھونٹ بھرا، پھر بولا۔

"معاملہ واقعی خطرناک اور الجھا ہوا ہے بھا بھا! میں تجھے کسی اندھیرے میں رکھنے کی کوشش نہیں کروں گا کیونکہ یہ مسئلہ ہاتھ سے اب نکلا ہوا نظر آتا ہے۔"

"اڑے یار جمالی! تیرے لیے کیا مسئلہ ہے، تو وہیں کا آدمی ہے۔ ان کی بولی جانتا ہے، ان کے درمیان اٹھتا بیٹھتا ہے، پتا ہے مجھے کہ تیری ان سے اچھی دعا سلام بھی ہے۔ مجھے اُمید ہے تو اس مسئلے کو سلجھانے کی اہلیت رکھتا ہے۔" بھا بھا نے بڑے رسان آمیز لہجے میں اس سے کہا تو فیاض جمالی ایک ہلکی سی مسکراہٹ تلے بولا۔

"یار بھا بھا! تو مجھے جانتا ہے اور میں تجھے۔ لیاری میں میری حیثیت ایسے ہی گروپ لیڈر کی سی ہے جو کسی سے پنگاہ لینے سے بھی کتراتی ہے۔ ہاں! کام میں سب کے ہی آتا ہوں اور اسی لیے میری تقریباً سبھی سے بنتی بھی ہے۔"

"یار! اسی لیے تو تجھے چنا ہے کہ تو ایک ٹھنڈے مزاج کا آدمی اور درمیانی راہ پر چلنے والا آدمی ہے۔" بھا بھا نے کہا۔

"ورنہ اگر مجھے جنگ کرنا ہوتی تو میں۔ شاتو کھوجا سے بھی یہ کام لے سکتا تھا، جانتے ہو نا کھوجا کو۔ اچھے بھلے دبنگ گینگ وار لیڈر اس کے آگے پانی بھرتے ہیں حالانکہ وہ کیا چیز ہے! منشیات اور غیر قانونی اسلحے کا اسمگلر ہے مگر اپنی جیب میں سب کی "پڑیا" رکھتا ہے۔"

"اس کے سائے سے بھی دور رہنا بھا بھا استاد!" جمالی نے کان پکڑنے والے انداز میں اس سے کہا۔ "بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ شاتو کھوجا۔ یار مار۔ قسم کا آدمی ہے۔ تیرا کوئی کام کرے گا اور اس کا معاوضہ نہ مانگا تو لے گا ہی مگر بدلے میں تجھ سے بھی کوئی کام پڑا تو۔ وہ تجھے تیری ہی کسی کمزوری پر بلیک میل کر کے اپنا کام بغیر پیسوں کے نکلوا لے گا۔ یہی بلیک میلنگ اس کی وہ پڑیا ہے جو وہ سب کی اپنی جیب میں رکھتا ہے۔" فیاض جمالی نے مختصر مگر جامع لفظوں میں۔ شاتو کھوجا کی اصلیت، استاد بھا بھا کے سامنے گنوادی۔

"کچھ ایسی باتیں تو میں نے بھی اس کے متعلق سن رکھی ہیں مگر تو نے اس کی وضاحت کے ساتھ تصدیق بھی کر ڈالی۔" بھا بھا بولا۔ "اب یہ مجھے بتا کر تو اس معاملے کے بیچ کیا کرسکتا ہے؟"

"کیا نام ہے ان دونوں کا؟" جمالی نے پھر ذرا گردن گھما کر ہماری طرف دیکھا تھا۔

"کالیا اور لومی۔" بھا بھا نے بتایا۔

"دونوں کو کچھ دنوں کے لیے انڈر گراؤنڈ کردو۔ بلکہ آج سے اور اسی وقت یہ دونوں زیر زمین چلے جائیں۔" جمالی نے پہلا مشورہ دیا۔ بھا بھا تو خاموشی سے مستفسرانہ انداز میں اس کا چہرہ تکتا رہا تاہم میں اور کالیا اس کی بات پر پریشان سے ہوگئے۔ ہماری بے چینی اور "کسمساہٹ" کو بھانپتے ہوئے بھا بھا نے بالآخر جمالی سے کہا۔

"یار! کیا یہ ضروری ہے؟"

"ضروری؟" جمالی اپنی بات پر زور دینے کے انداز میں بولا۔ "بہت زیادہ ضروری ہے، نہیں جانتا تو اس وقت۔ میر دادا اور بگو کے رشتے داروں کا بچہ بچہ نیفے میں نہیں، بلکہ بغل میں ٹی ٹی دبائے ان دونوں کو تلاش کررہے ہوں گے۔"

تب ہی پہلی بار میں نے خود فیاض جمالی سے مخاطب ہوکے کہا۔

"جمالی سائیں! ہم دونوں تو انڈر گراؤنڈ چلے جائیں مگر میرا گھر بھی ہے، جہاں میرا ایک معذور بھائی اور جوان بہن رہتی ہے، ان کا واحد کفیل اور دیکھ بھال کرنے والا... صرف میں ہوں۔"

"ان دونوں کو۔ کسی دوسرے شہر رشتے داروں کے ہاں بھیج دو۔ یہ تو کرنا ہی پڑے گا، جب تک ان سے میری بات چیت چلتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی ان دونوں کو گولی ہی نہ ٹھوک دے۔"

جمالی نے مجھ سے کہا اور پھر بھابھا کی طرف دیکھنے لگا۔

"تمہیں اُمید ہے کہ معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹ جائے گا؟ میرا مطلب ہے کتنے دن لگ جائیں گے۔"

"ابھی میں واپس جاؤں گا اور آج ہی حالات کا جائزہ لوں گا۔ جن ڈاڈا سے تو ابھی نہیں ملوں گا ہاں بھورل سندھی سے ملنے کے بعد ہی اس کے مشورے سے کچھ کروں گا۔ تم فکر نہ کرو میں تمہیں آج رات تک کچھ نہ کچھ جواب دے دوں گا۔"

"یارا بڑی مہربانی تیری۔ یہ کام تو نے کرلیا تو سمجھ لے بھابھا کو خرید لیا۔" استاد بھابھا نے یہ کہتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کا بھرپور مصافحہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ دونوں آمنے سامنے اور قریب ہی بیٹھے تھے۔ جمالی نے بھی اسی گرمجوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا اور کہا۔

"خرید تو تم نے ہمیں رکھا ہے اپنی بے لوث دوستی سے بھابھا استاد! اب مجھے اجازت دے تاکہ میں اپنا آج ہی سے کام شروع کردوں۔" کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ آیا ہوا چھوکرا بھی کھڑا ہوگیا۔ وہ اس سے بولا۔

"چل بابا! گاڑی اسٹارٹ کر۔ ماں اچاں تو۔ (گاڑی بائیک) اسٹارٹ کرو میں آتا ہوں۔

اس کے جانے کے بعد۔ استاد بھابھا نے ہم سے کہا۔

"پہلی فرصت میں۔ اپنے بھائی اور بہن کو وہاں سے نکال کر دوسرے شہر بھجوا دو۔ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں اور بری طرح مشتعل بھی، تم دونوں کو نہ پا کر وہ جوشِ انتقام میں سب سے پہلے گھر پر وار کریں گے۔"

کالیا اسی وجہ سے خاصا پریشان تھا جبکہ مجھے تو اس وقت سے ہی فکر لاحق ہوگئی تھی جب فیاض جمالی نے مشورہ دیا تھا۔

"مگر میں ان دونوں کو کہاں اور کس شہر بھیجوں؟ ہمارا ایسا کوئی دور کا بھی رشتہ دار نہیں رہتا؟" میں نے کہا۔

"ایڈووکیٹ زنیرہ کے ہاں بھیج دو!" کالیا نے مجھ سے کہا۔

"نہیں یارا!" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "صرف بہن عاصمہ کی بات ہوتی تو میں یہی کرتا مگر ایک بھائی اور وہ بھی معذور۔ نہیں یارا اتنی بڑی ذمہ داری میں زنیرہ کو نہیں دے سکتا۔"

کالیا سوچ میں پڑ گیا۔ بھابھا بولا۔ "میرے اڈے میں کسی عورت ذات کا وجود نہیں ہے ورنہ عاصمہ بٹی کو میں رکھ لیتا۔"

"اس کا ایک حل میرے ذہن میں آتا ہے استادا!" کالیا اچانک بولا۔

"ایسا کرتے ہیں عاصمہ بہنا کو اس وکیلہ صاحبہ کے پاس چھوڑ آتے ہیں اور فہیم کو ادھر لے آتے ہیں۔"

کالیا کی تجویز معقول تھی۔ ہم اسی وقت نکلنے لگے تو بھابھا نے روک لیا اور بولا۔

"بھول گئے فیاض جمالی کی بات؟ لیاری کا بچہ بچہ بغل میں ٹی ٹی دبائے تم دونوں کے خون کی بو سونگھتا پھر رہا ہوگا۔ اوپر جاؤ۔ میک اپ کرو اور حلیہ بدل کے باہر نکلو۔ پھر بھی محتاط رہنا۔" میں اور کالیا یوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے جیسے پریشانی نے ہماری عقل بھی ماؤف کر ڈالی ہو۔

تھوڑی دیر بعد میں اور کالیا ایک بوڑھے اور بڑھیا کا حلیہ بنائے استاد بھابھا کے اڈے سے نکل رہے تھے۔ کار میں نے اڈے پر ہی چھوڑ دی تھی۔ ہم دونوں بائیک پر تھے۔ بائیک میں چلا رہا تھا اور کالیا بڑھیا کے روپ میں میرے پیچھے عورتوں کی طرح دونوں ٹانگیں ایک طرف ڈالے بیٹھا تھا۔ کالیا نے احتیاطاً ایک بھرا ہوا پسٹل رکھ لیا تھا۔ میں بائیک دوڑاتا ہوا گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔

میں مین روڈ پر بائیک دوڑا رہا تھا اور میرا رخ گھر کی جانب تھا، فیاض جمالی کی باتیں میرے دل و دماغ میں گردش کر رہی تھیں۔ اپنے گھر کی طرف آتے وقت استاد بھابھا کی کہ "تو بھی بہت محتاط ہو کر اپنے گھر کی راہ لینا۔"

یہی وجہ تھی کہ اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے میرا دل انجانے وسوسوں کی زد میں رہا۔ میں اب اپنے گھر کی خیر خیریت کی دعائیں ہی مانگے جا رہا تھا۔ ان اندیشوں تلے میرا دل بار بار ڈوب رہا تھا۔ ابھی تو بھائی کے معذور ہونے والے زخم بھی نہیں بھرے تھے کہ یہ نئی مصیبت گلے پڑ گئی تھی۔

محلے میں داخل ہوا تو پریشان دل کو کچھ تسلی ہوئی۔ اگر خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی ہوتی تو محلے میں کہرام مچا ہوتا۔ دل میں دعائیں پڑھتا ہوا میں اپنے گھر کے قریب پہنچا تو کالیا کے مشورے کے مطابق میں نے فوراً سے اپنے گھر کا رخ نہیں کیا تھا بلکہ پہلے اِدھر اُدھر بائیک کو مختلف چھوٹی بڑی گلیوں میں گھماتا رہا تھا اس کے بعد جب گھر کے اطراف میں دور و نزدیک کوئی ممکنہ خطرہ یا مشکوک افراد کی نقل و حرکت سے مطمئن ہوا تو سیدھا جا کر بائیک دروازے کے بالکل سامنے روک دی اور نیچے اتر آیا۔

میرا حلیہ چوں کہ بدلا ہوا تھا اسی لیے، محلے کا کوئی بھی فرد مجھے پہچاننے سے قاصر تھا۔ کالیا بڑھیا کے بھیس میں سفید

رنگ کے شٹل کاک برقعہ اوڑھے ہوئے تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ میرا دل دھک دھک کررہا تھا۔ نامعلوم کیوں میں اندر سے ایک کھٹک آمیز بے چینی کا بھی شکار ہورہا تھا۔

تھوڑی دیر گزری۔ اندر سے آواز ابھری۔

"کک۔کون ہے؟"

میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجادیا۔ وہ آواز عاصمہ ہی کی تھی لیکن۔ اس کا لہجہ مجھے بدلا ہوا لگا۔ یوں جیسے وہ کسی دبے دبے خوف اور سراسیمگی کی زد میں ہو۔ تب ہی پل کے پل ذہن میں ابھرنے والے ایک فوری اور متوقع خدشے تلے میرے دماغ نے چال چلی۔

"بیٹا! کیا یہ نعمان میاں کا ہی گھر ہے؟"

ممکنہ مگر انجانا سا خطرہ بھانپتے ہی میں نے اپنی اصل آواز کی بجائے بوڑھے ضعیف اور اجنبی کی آواز میں کہا۔

"جج۔ جی ہاں! پر آپ کون؟" اندر سے عاصمہ نے پوچھا۔ اب اس کا لڑکھڑاتا ہوا لہجہ کچھ سنبھلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ لہجے کی اسی لڑکھڑاہٹ نے مجھے شبے میں ڈالا تھا، جس سے سراسیمگی بھی محسوس ہوتی تھی۔

میں نے نیچی آواز میں اپنے بالکل ساتھ کھڑے کالیا سے کہا۔

"مجھے اندر گڑبڑ لگتی ہے۔ لگتا ہے دونوں کو اندر کسی نے گن پوائنٹ پہ لے رکھا ہے۔"

کالیا کے برقعہ پوش وجود میں ذرا سی بھی کوئی غیرارادی حرکت نہ ہوئی کہ وہ اس بات سے چونکا ہو۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ وہ بھی میری طرح اندر سے ضرور بدک گیا ہوگا۔

"مکالمہ جاری رکھو۔ ٹھیک جارہے ہو۔ بروقت عقل مندی دکھائی تم نے جگری! کہ عاصمہ بہن سے اپنے اصلی لہجے میں مخاطب نہیں ہوئے تم۔"

اس نے بھی برقعے کے اندر سے نیچی آواز میں کہا۔

"بیٹا! میں مرزا شکیل ہوں۔ نارتھ ناظم آباد سے آیا ہوں۔ میری گھروالی بھی ساتھ ہے۔ مجھے نعمان میاں سے بات کرنی تھی۔"

"لیکن میں آپ کو نہیں جانتی اور بھائی جان تو اس وقت گھر پر ہیں بھی نہیں۔ آپ پھر کسی وقت آجانا۔" اندر سے عاصمہ نے کہا۔

"ہمیں بہرصورت اندر داخل ہونا ہے۔ اسی حلیے میں۔کوشش جاری رکھو۔" کالیا نے ہولے سے مجھے ہدایت کی۔

"اچھی بات ہے، پر دیکھو بیٹا! ہم بوڑھے ہیں اور دور سے آئے ہیں، ہمیں نعمان میاں سے بہت ضروری ملنا ہے۔ وہ ہمیں پہچانتا ہے۔ ہم اندر بیٹھ کر اس کا انتظار کرسکتے ہیں۔"

میرے یہ کہنے کے بعد اندر تھوڑی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ کسی خیال کے تحت میں تھوڑا اور دروازے کے قریب سرک آیا اور اندر کان لگادیے۔ جبکہ کالیا برقعے کے اندر سے۔ ادھر ادھر قریب نظریں ڈالے ہوئے تھا اور ساتھ ہی مجھ سے بھی مخاطب رہا۔

اندر کی چند ثانیے طاری رہنے والی خاموشی سے صاف محسوس ہورہا تھا جیسے کوئی عاصمہ کو سرگوشیوں اور اشاروں میں ہدایات دے رہا ہو۔ مجھے اندر اب خطرے کا پوری طرح احساس ہونے لگا تھا۔

"مرزا صاحب! گھر میں میرے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ میں بھلا دو انجان افراد کو کس طرح اندر بٹھا سکتی ہوں۔ آپ ضد نہ کریں اور واپس چلے جائیں۔"

"کہو کہ ہم پھر باہر ہی کھڑے ہو کے انتظار کرلیتے ہیں۔" کالیا نے ہلکی سرگوشی میں کہا۔ یہی بات تھی کہ ایسے میں مجھ سے زیادہ کالیا کا دماغ چل رہا تھا۔ جس کا فوراً ہی نتیجہ برآمد ہوگیا جب میں نے عاصمہ سے یہی کہا اور دانستہ اندر سنانے کی خاطر کالیا سے بہ آواز بلند مگر تھکی تھکی آواز میں مخاطب ہو کر بولا۔

"چلو، بانو بیگم! ادھر ہی کھڑے ہو کر نعمان میاں کا انتظار کرلیتے ہیں۔ اب اتنی دور سے آئے ہیں ہم ملے بغیر تو جا نہیں سکتے۔"

میں کالیا کی یہ چالاکی سمجھ گیا تھا، اس طرح اندر متوقع موجود "درانداز" پریشان ہوسکتے تھے کہ انہیں ہمارا یوں دروازے کے باہر کھڑے ہونا گوارا نہ ہوتا، وہ یقینی طور پر میرا ہی انتظار کررہے ہوں گے۔ اس طرح ان کا وہ کھیل بگڑ سکتا تھا جس کے لیے وہ نجانے کس طرح اندر نقب لگا کر داخل ہوچکے تھے۔

"ہم۔ میں دروازہ کھول رہی ہوں۔ مرزا صاحب آپ۔ اندر ہی آجائیں۔ اور اپنی بیگم کو بھی اندر لے آئیں۔"

دفعتاً ہی اندر سے عاصمہ کی آواز ابھری تھی۔ یقیناً دراندازوں کے لیے یہ زیادہ آسان تھا کہ ہم باہر کھڑے رہنے کے بجائے اندر بلا کر قابو میں رکھتے۔

ہم دونوں محتاط ہو گئے اور سب سے پہلے کالیا آگے بڑھا تھا جب میں نے جواب عاصمہ سے یہ کہا۔

''جیتی رہو بٹیا! ہم بہت تھکے ہوئے تھے ورنہ زحمت نہ دیتے۔''

اسی وقت دروازے کا ایک پٹ کھلا۔ خطرہ کسی بھی وقت وار کرنے والا تھا۔ ہم بھی محتاط تھے۔ مجھے سامنے عاصمہ کا چہرہ نظر آیا جہاں میری بھانپتی ہوئی چپلی ہی نگاہ نے۔ سراسیمگی اور خوف کو تاڑ لیا تھا۔

کالیا بوڑھی عورتوں کی طرح سر جھکائے فوراً اندر داخل ہوا تھا اور اس کے پیچھے میں۔ وہی ہوا۔ خطرے کی بو سونگھتے سونگھتے۔ ایک بھیڑیئے جیسی غراہٹ سے مشابہ آواز میرے دائیں جانب سے ابھری تھی۔

''خبردار! آواز نکالی تو گولی ماردوں گا۔'' میں نے چونکنے اور خوف زدہ ہونے کی بھرپور ایکٹنگ کی تھی جبکہ کالیا نے تو اداکاری کی انتہا کردی۔ وہ ایک ہاتھ اپنے متھے پر مار کر غش کھائے گر پڑا۔ دراندازِ، جن کی تعداد دو تھی۔ ان کے ہاتھوں میں ٹی ٹی پسٹلیں نظر آرہی تھیں۔ وہ دائیں بائیں سے اچانک ہی ابھر کر ہمارے سامنے آگئے تھے اور ایک نے پھرتی سے دروازہ بند کردیا تھا۔ میری بھانپتی ہوئی چست نظروں نے پل کے پل ان دونوں کا جائزہ لیا تو ایک نسبتاً پکی عمر والے شخص کو پہچان کر میرے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ میرداد تھا، وہی میرداد جسے آج صبح ہی میں نے ڈاڈا کے اڈے پر آگ بگولا حالت میں دیکھا تھا۔ باقی اس کا ساتھی اور وہ خود اپنے ''ٹیپیکل'' حلیے اور شکل وصورت سے لیاری کے ہی معلوم ہوتے تھے۔ انداز و اطوار میں چھٹے ہوئے اور سفاکی میں بھیڑیئے جیسے دکھتے تھے۔

''اڑے او۔ شکرو! تم اس معیبت کو سنبھالو۔ میں اس بڈھے کو دیکھتا ہوں۔''

میرداد نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''بڈھا'' میں تھا اور ''معیبت'' کا اشارہ کالیا کی طرف تھا جو صحن کے فرش پر شٹل کاک والے برقعے سمیت فرش پر ڈھیر ہوگیا تھا، بہ ظاہر وہ آڑا ترچھا ہی پڑا تھا مگر میں سمجھتا تھا کہ وہ ان دونوں پر بیک وقت حملے کی پوزیشنیں بنا چکا ہوگا۔

''کک۔ کک۔ کیا یہاں ۔ ڈ۔ ڈ۔ ڈکیتی کی واردات ہورہی ہے؟

میں نے ایک عام سے آدمی کے روپ میں ڈرنے اور خوف زدہ ہونے کی پوری ایکٹنگ کی۔

''بکواس بند کرو۔'' بائیں جانب والے نے درشت لہجے میں مجھے جھڑکا جبکہ دائیں جانب والا فوراً ہی آگے بڑھ کر کالیا کو دبوچنے کے لیے لپکا تھا۔ میں نے ساتھ والے کو مزید باتوں میں مشغول رکھنے کے لیے کہا۔

''ارے بھائی! ہم بے قصور ہیں۔ بڈھے ہیں۔ ہمیں جانے دو۔ تم بے شک یہاں۔'' میرا جملہ پورا نہیں ہوا تھا اور مجھے وہ بازو سے پکڑ کر ایک کمرے میں لے آیا، ساتھ ہی اس نے ڈری سہمی کھڑی عاصمہ کو بھی گھورتے ہوئے خونخوار انداز میں اندر کمرے میں چلے آنے کا کہا تھا۔ لہٰذا ہمارے پیچھے عاصمہ اندر چلی آئی تھی اور کمرے کے ایک طرف کونے میں جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس بے چاری کا چہرہ ڈر و دہشت کے مارے پیلا پڑا جارہا تھا اور میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ بہن کو تسلی دیتا۔

''بہنا! فکر مت کر تیرا بھائی آگیا ہے۔'' مگر میں ابھی فہیم یا اس سے ایسا کچھ نہیں کہہ سکتا تھا ورنہ ہمارا بھانڈا پھوٹ جاتا۔

کمرے میں ان کا ایک اور پستول بدست ساتھی بھی پہلے سے موجود تھا۔ وہ فہیم کے بیڈ کے سرہانے ہی اس کی طرف پستول کیے چوکس کھڑا تھا۔ بستر پر دراز فہیم بے چارہ۔ خاصا پریشان اور دہشت زدہ نظر آرہا تھا۔ نقاہت سے پہلے ہی اس کا رنگ پیلا پڑا ہوا تھا خوف نے مزید زرد کرڈالا تھا۔ تاہم ایک اجنبی بوڑھے (مجھے) کو دیکھ کر لمحہ بھر کو اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے تھے۔

''اڑے وادل سائیں! یہ کس بڈھے کو اندر لے آئے ہو؟ یہ ہمارا شکار تھوڑی ہے۔'' اس تیسرے ساتھی نے میرداد سے کہا۔

''شکار تو نہیں ہے پر یہ بڈھا اور بڈھی ہمارا کام بگاڑ سکتے تھے۔'' میرداد نے کہا۔ ''اصل شکار کے آنے تک یہ بھی ادھر ہی بندر ہیں گے۔''

''لیکن ہم کب تک اور کتنے لوگوں کو... یہاں جمع کرتے رہیں گے؟'' اس کے دوسرے ساتھی نے میری طرف تکتے ہوئے اس سے کہا۔

''مجبوری ہے، یہ دونوں ڈھیٹ تھے، اس چھوکری نے بہانہ بھی کیا تھا مگر یہ باہر...''

اس کی آواز حلق میں ہی اٹک گئی۔ کیونکہ اسی وقت باہر صحن میں عجیب سی آواز ابھری تھی، جیسے کوئی اشاخ پٹاخ بج گئی ہو۔ مجھ سمیت یہ دونوں بھی چونکے تھے۔

"اڑے بابن! کیا معاملہ ہے باہر؟ کہیں شنکرو نے اس بڑھیا سے پنگا تو نہیں لے لیا؟" میرداد نے ساتھی سے کہا اور وہ بابن نامی اس کا دوسرا ساتھی پستول لیے کمرے سے نکلتا چلا گیا۔ میں جان چکا تھا کہ کالیا نے بڑھیا کے روپ میں کوئی گل کھلا لیا ہے۔ میرداد نے میرا بازو چھوڑ دیا اور تحکمانہ درشتی سے بولا۔

"ادھر بیٹھا رہ چپ کرکے۔ ذرا بھی آواز نکالی یا کوئی گڑبڑ کی تو۔" ایک بار پھر اس کا جملہ ادھورا رہ گیا مگر مجھے حیرت ہوئی تھی، کیونکہ پہلے کی طرح اس بار باہر صحن میں کوئی ایسی ذرا بھی آواز نہیں ابھری تھی جو اسے چونکانے کا سبب بنتی لیکن۔ یہ کیوں ایک دم خاموش ہوگیا تھا۔

"اڑے کیا ہورہا ہے وہاں؟ تم دونوں ایک دم خاموش کیوں ہوگئے ہو؟" اب میرا دل جیسے سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا۔ لگتا تھا کالیا نے دونوں کو اسی چالاکی اور دھوکے سے باری باری گولی چلانے کا رسک لیے بغیر ہی "انٹاغفیل" کردیا ہے اور اب میرداد کی باری تھی۔

"اوئے۔ خبردار جو ادھر سے ہلے بھی اور تم۔" وہ مجھے تہدید کرنے کے بعد بیڈ پر نیم دراز فہیم کو بھی آخر میں دھمکاتے ہوئے بولا۔ "ہوشیار بننے کی کوشش مت کرنا اور تم بھی یہاں سے مت ہلنا چھوکری!" اس بدبخت نے آخر میں عاصمہ کو بھی دھمکایا۔

میرداد کو یقینی طور پر معلوم ہوگیا تھا کہ فہیم دونوں ٹانگوں سے معذور تھا جبکہ میں تو پہلے ہی "بوڑھا" تھا اور بوڑھا تو ہوتا ہی "کمزور" ہے۔ یہی سوچ کر وہ ہمیں محض دھمکانے سے کام چلا کر باہر کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے کمرے سے نکلتا چلا گیا تو کمرے سے نکلتے ہی میں نے عاصمہ بہنا اور بھائی فہیم سے اپنی اصل آواز اور سرگوشی میں ازراہ تسلی کہا۔

"بہنا! بھائی! یہ میں ہوں، نوی، باہر بڑھیا کے روپ میں میرا ساتھی کالیا ہے، گھبرانے کی ضرورت نہیں انشااللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔" میری بات سن کر اور آواز پہچانتے ہی ان دونوں کے چہروں پہ پہلے حیرت اور پھر خوشی کے آثار ابھرے تھے، ٹھیک اسی وقت ایک بار پھر میری ٹھٹکتی ہوئی سماعتوں میں۔ کھڑبڑ کی بجائے اس بار کسی کی کراہتی آواز ابھری، یہی وہ وقت تھا جب میں پھرتی سے دروازے کی طرف لپکا تھا۔ ایک بظاہر جھکی ہوئی کمر والے ضعیف بڈھے کو اس طرح کی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھ کر بھیا فہیم پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹے ہوں گے، تاہم وہ دونوں شاید ہنوز مجھے پہچاننے

نمکین غزل

سوئی چبھ جائے تو نیزے کی انی کہتے ہیں
اسے محبوب کی نازک بدنی کہتے ہیں
آنکھ میں ان کی جو کنکر بھی پڑ جائے
اپنے اوپر وہ اسے سنگ زنی کہتے ہیں
کوئی کھسیانی ہنسی ہنس کے اگر چپ ہوجائے
ایسی خاموشی کو اب کم سخنی کہتے ہیں
کون شوہر ہے جسے خوف نہ ہو بیوی کا؟
سبھی اس شہد کی مکھی کو ہنی کہتے ہیں!
ڈال کر لوگ یہاں اونٹ کے منہ میں زیرہ
فخر سے خود کو غنی ابن غنی کہتے ہیں!
اُن پہ تنقید اگر ہو تو نہ جانے کیا ہو
رائے دینے کو جو ہمت شکنی کہتے ہیں
لٹنے والے کو کہا جاتا ہے کم عقل یہاں
لوٹنے والے کو قسمت کا دھنی کہتے ہیں!
چھوڑ کر ملک، سیاست کی زباں میں راہی
عیش کرنے کو غریب الوطنی کہتے ہیں!

عظیم راہی

کے سلسلے میں کسی کشمکش کا شکار رہے ہوں گے۔ میں درحقیقت کالیا کی ممکنہ مدد کے لیے ہی باہر صحن کی طرف لپکا تھا۔

کیا دیکھتا ہوں، شنکرو اور بابن نامی دونوں "دراز" صحن کے فرش پر ڈھیر پڑے تھے جبکہ میرداد سے کالیا زور آزمائی میں مصروف تھا۔ پستول ابھی تک میرداد کے ہاتھ میں تھا جبکہ کالیا نے اس کا وہی ہاتھ مروڑ رکھا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ الجھے ہوئے تھے مگر کالیا کی گرفت مجھے کمزور پڑتی نظر آرہی تھی۔ اگلے ہی لمحے میرداد نے وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ ایک جھکائی دی اور کالیا کو دھوبی پٹکے کے انداز کا داؤ لگایا، کالیا اچھل کر دو قدم پیچھے کو لڑکھڑا گیا اور مزید بدقسمتی یہ ہوئی کہ فرش پر انٹاغفیل پڑے اس کے ساتھیوں کے جسم سے اس کے پاؤں ٹکرائے تو وہ سنبھلنے کی کوشش کے باوصف۔ الٹ کر پشت کے بل گر پڑا۔

میرداد کے ہاتھ میں ہنوز پستول نظر آرہا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب وہ مجھ پر یا کالیا پر گولی چلانے کا ارادہ کررہا تھا کہ نجانے میرے اندر یکایک اتنا جوش کہاں سے عود آیا تھا یا پھر "تیار موت" کو سامنے دیکھ کر بقا کا جذبہ ایک انوکھی طاقت بن گیا تھا کہ میں نے اپنی جگہ سے تیزی کے ساتھ حرکت کی اور

اچھل کر اس پر جا پڑا، یوں کہ اس کے پستول والے ہاتھ کی کلائی پر میرا مکہ بڑے زور سے پڑا۔ ڈیل ڈول میں ہم برابر ہی تھے۔ البتہ اس کا جسم میرے مقابلے میں ذرا کسرتی تھا۔ مکے کی ضرب سے پستول تو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا تھا مگر میں اس کے ساتھ لپٹ گیا۔ اس نے غرا کر میرے پیٹ پر لات رسید کردی جو خاصی زور آور ثابت ہوئی۔ میرے حلق سے چیخ سی خارج ہوئی اور میں الٹ کر پیچھے جا گرا، وہ پستول اٹھانے کے لیے تیزی سے آگے بڑھا مگر میں نے بھی اپنے ہوش و حواس مختل نہیں ہونے دیئے تھے اور اپنی ایک ٹانگ اس کی ٹانگوں کے بیچ لے آیا۔ وہ منہ کے بل گرنے لگا مگر کمال مہارت و پھرتی کے ساتھ خود کو بچا گیا اور دوبارہ پستول اٹھانے کے لیے جھکا۔ اسی وقت کالیا نے اس پر چھلانگ لگا دی تھی اور وہ اسے رگیدتا ہوا فرش پر میرے بالکل قریب ہی گرا تھا۔ اس طرح کہ میرداد کا چہرہ بالکل میرے قریب تھا، میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنے سر کی ایک زوردار ٹکر اس کی ناک پر رسید کردی۔ اس کے حلق سے چیخ خارج ہوگئی، میں رکا نہیں اور دوسری ٹکر بھی ماردی۔ ایک جوشِ جنوں جیسی کیفیات طاری ہونے لگی تھیں مجھ میں۔ میرداد نے اپنی ٹانگ کا ایک گھٹنا سیکڑ کر میرے پیٹ میں رسید کرنا چاہا تھا مگر میں پہلے ہی اس کی یہ حرکت بھانپ کر فوراً سے پیشتر پیچھے کی جانب لڑھکنی کھا گیا تھا۔ اس کا وار خالی جانے تک کالیا اس پر حاوی ہوچکا تھا کیونکہ وہ میرداد سے دوبارہ دوبدو بھڑنے کی بجائے اس کے پستول پر قبضہ جما چکا تھا۔

"بس میرداد! کھیل ختم۔ شرافت سے اٹھ کر کھڑے ہوجاؤ۔" اس نے شعلہ اگلتی نظروں سے میرداد کو گھورتے ہوئے پُرغیظ آواز میں کہا اور ساتھ ہی مجھ سے بولا۔

"تو ٹھیک ہے جگری؟"

جواب میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم زندہ نہیں بچ سکتے کالیا! اور نہ ہی تمہارا یہ ساتھی۔" میرداد اٹھتے ہوئے خونخوار لہجے میں کالیا سے بولا تو میں نے دیکھا کالیا اس کی دھمکی سے ذرا بھی خائف ہوئے بغیر اسی لہجے میں بولا۔

"کسی گھمنڈ میں مت رہنا میرداد! تم لوگوں نے خود اس خون ریز جنگ کی ابتدا کی ہے اور ہم نے اب تک جو کیا وہ اپنے دفاع کی حد تک کیا لیکن اب ایسا نہیں ہوگا، اینٹ کا جواب اب پتھر سے دیا جائے گا۔"

"تم بھی کسی بھول میں مت رہنا کالیا!" میرداد غرا کر اس سے بولا۔ "ہمارے تین آدمیوں کو تم مار چکے ہو، کتنوں کو مارو گے تم؟ میرے پیچھے ساتھیوں کی پوری فوج ہے۔" اس کے لہجے میں غرور تھا، وہ گاہے بگاہے میری جانب بھی گھور کر دیکھ لیتا تھا۔ تب ہی میں نے بھی بلاخوف اس سے مخاطب ہو کے کہا۔

"میرداد! ہماری تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ نہ ہی ہم تم لوگوں کو جانتے ہیں لیکن یاد رکھنا، تنہا ہم بھی نہیں مگر ساتھیوں کی فوج پالنے کی بجائے ہم چند ایسے ساتھی ضرور رکھتے ہیں جو دس پر بھاری ہوتے ہیں، رہی بات تمہارے پہلے ساتھی مجو کی ہلاکت کی تو اس نے ایک شرمناک جرم کیا تھا۔ میری بہن کو اغوا کیا تھا اس نے روپوں کے لالچ میں۔ اور ہم نے اس کی گرفت سے بہن کو چھڑا لیا تھا بغیر کسی جان لیے، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم اس کا بدلہ مجو سے لیتے مگر ہم نے بات یہیں ختم کردی۔ لیکن مجو پھر بھی باز نہیں آیا اور جس سے اس نے اس گھٹیا کام کے لیے پیسے لیے تھے وہ خود مجو کی جان کا دشمن بن گیا تھا اور اس نے اپنے روپوں کی واپسی کا تقاضا کیا تو مجو پھنس گیا، آخر اس نے اسی آدمی (سیٹھ ستار) کے کہنے پر میرے ساتھی کالیا کو یرغمال بنانا چاہا تو وہ مارا گیا۔ اب تم خود بتاؤ کہ تمہیں اس سارے معاملے میں کسی دشمنی کا رنگ نظر آتا ہے یا لالچ۔"

میں نے سنجیدہ اور مستحکم لہجے میں اسے حقائق بتا دیئے اور ذرا توقف کے بعد دوبارہ اس سے بولا۔

"ہم خون خرابہ نہیں چاہتے۔ اگر پھر بھی تم ہم پر جنگ مسلط کرنا چاہتے ہو تو، تمہاری مرضی۔ چوڑیاں ہم نے بھی نہیں پہنی ہوئی ہیں۔"

"مجھے علم ہوچکا ہے ان ساری باتوں کا۔" میرداد نے کہا۔ "ایسی بات تھی تو تمہیں ہم سے رابطہ کرنا چاہیے تھا۔" اس کی ڈھٹائی پر مجھے غصہ آ گیا۔ کالیا نے بولنا چاہا تو میں نے اسے خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور اس سے بولا۔

"ہمیں کیا معلوم کہ مجو کون تھا اور اس کے سرپرست کون تھے؟ نہ ہی ہمارا پہلے کبھی اس سے ایسا کوئی واسطہ پڑا تھا۔ صاف اور اصولی بات ہے۔ اس نے ایک جرم کیا اور اس کی اسے سزا مل گئی۔ بس۔ بات سمجھ میں آتی ہے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ ہم بھی میدان میں اترے ہوئے ہیں، ہر چوٹ کا سود کے ساتھ جواب دیں گے ہم بھی۔" میرے خم ٹھونک کر کہنے والے الفاظ نے میرداد کو خاموش رہنے پر مجبور کردیا۔ میں نے کالیا سے کہا۔

"کالیا! ان لوگوں کو جانے دے لیکن اگر انہوں نے پھر کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو ان کے علاقے میں جا کر ان سے بدلہ چکائیں گے۔ جنگ تو جنگ سہی۔ ڈرنے والے ہم بھی نہیں۔"

"ابے لے جگری! یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟" کالیا میری طرف حیرت سے دیکھتا ہوا بولا۔ "انہیں کیسے زندہ چھوڑ دیں۔ انہوں نے ہمارے گھر میں گھس کر ہم پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ ہرگز نہیں۔ میں ان کو......"

"کالیا!" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس سے پہلے ہماری ان سے آمنے سامنے بات نہیں ہوئی تھی مگر آج ہو چکی ہے۔ لیاری میں ہمارے بھی تعلقات ہیں۔ ہم انہی کے ذریعے سے ہی میرداد اور اس کے دونوں ساتھیوں کو حوالے کریں گے۔ اگر اس کے بعد بھی ہمارے ساتھ کچھ برا ہوا تو یہی آدمی سب سے پہلے ہمارا ٹارگٹ ہوگا۔" میں نے میرداد کی طرف اشارہ کیا۔

حالات معمول پر آتے محسوس کر کے عاصمہ بھی ڈرتے ڈرتے کمرے سے باہر نکل آئی تھی مگر میں نے عاصمہ کو اندر جانے کا کہا تو وہ پلٹ گئی۔

کالیا نے سب سے پہلے میرداد کو رسن بستہ کیا اس کے بعد ہم دونوں نے مل کر اس کے دونوں بے سدھ پڑے ساتھیوں کے بھی ہاتھ پاؤں باندھ دیئے اور پھر تینوں کو گھسیٹ کر دوسرے کمرے میں لے گئے اور بند کر دیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر کالیا اور میں نے پہلے اپنا ریڈی میڈ میک اپ صاف کیا تو فہیم اور عاصمہ ہمیں پوری طرح پہچاننے کے قابل ہوئے مگر وہ اس صورت حال سے ابھی تک ڈرے ہوئے تھے، ہم نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ انہوں نے ہمارے ساتھ چلنا ہے۔ وہ دونوں بے چارے مزید خوف زدہ ہو گئے مگر کالیا اور میں نے انہیں تسلیاں دیں کہ بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں وغیرہ۔

اس کے بعد ہم نے وہی کیا جس کی ہم پہلے سے حکمت عملی تیار کر کے آئے تھے۔ یعنی عاصمہ اور فہیم بھائی کو کار میں اپنے ساتھ سوار کرا کے سب سے پہلے ایڈووکیٹ زنیرہ کے ہاں پہنچے، وہ تو گھر پہ نہیں تھی، البتہ خالہ نجو کے پاس ہم نے عاصمہ کو چھوڑ دیا اور واپسی میں فہیم کو لے کر استاد بھابھا کے اڈے پر پہنچے۔ اس دوران میں نے عاصمہ اور فہیم کو موجودہ صورت حال... کی سنگینی کے بارے میں بتا دیا تھا۔

اڈے پر پہنچتے ہی میں نے ایڈووکیٹ زنیرہ سے فون پر رابطہ کر کے اسے بھی مختصراً صورت حال بتائی اور عاصمہ کے بارے میں بتایا کہ وہ اب کچھ روز اسی کے پاس رہے گی۔ زنیرہ کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا مگر وہ بھی اس نئی پریشانی سے فکر مند ہو گئی تھی۔ باقی کی تفصیل بعد میں بتانے کا کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کر دیا اور استاد بھابھا کو ساری بات بتا دی۔

"میں ابھی فیاض جمالی سے بات کرتا ہوں۔" وہ اپنے کرتے کی جیب سے فون نکالتے ہوئے بولا۔

"نہیں استاد!" معاً ہی کالیا نے منع کرتے ہوئے بھابھا سے کہا۔ "فیاض جمالی ابھی تو یہاں سے گیا ہے، اسے ابھی اپنا کام کرنے دیں۔ ہمیں پہلے بجن ڈاڈا سے بات کرنا پڑے گی۔ اس سے بھی ہماری اچھی خاصی سوجھ بوجھ ہو چکی ہے لیکن پہلے جینگو سے بات کرنا ہوگی ہمیں۔ اس سلسلے میں۔"

کالیا کا رائے نما مشورہ ہمیں مناسب لگا تو بھابھا کی اجازت سے اس نے اسی وقت جینگو سے رابطہ کیا اور اسے آج کے تازہ واقعے کے بارے میں بتا ڈالا۔ جینگو نے گویا چھوٹتے ہی کالیا کے اس عمل کی تعریف کر دی اور کہا۔

"یہ تم نے بہت اچھا کیا کہ میرداد وغیرہ کو اس حملے کے باوجود کوئی جسمانی نقصان نہیں پہنچایا۔ صلح کی طرف، یہ بھی تمہارا ایک اچھا اقدام سمجھا جائے گا۔"

"لیکن جینگو! ایسا نہ ہو کہ ہماری صلح کی روش کو وہ لوگ ہماری کوئی کمزوری سمجھ لیں۔" کالیا نے فوراً کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن۔ یہ کر کے دیکھ لو مگر آئندہ ایسی کوئی حرکت ہمارے ساتھ دوبارہ کی گئی تو میں کسی کو نہیں بخشوں گا۔" کالیا کا لہجہ اٹل تھا۔

"تم فکر نہ کرو اور مجھے چند منٹ دو۔" جینگو نے کہا۔ کالیا نے سیل کا وائیڈ اسپیکر آن کر رکھا تھا تاکہ ہم بھی اس کے اور جینگو کے درمیان میں ہونے والی گفتگو کو سن سکیں۔

"ٹھیک ہے بجن ڈاڈا سے ابھی بات کرو۔ وہ اب اس سلسلے میں کیا کہتا ہے، پھر مجھے بتاؤ۔" یہ کہہ کر کالیا نے رابطہ منقطع کر دیا۔

"میرا خیال ہے کہ اب اس تازہ واقعے کے بارے میں فیاض جمالی کو بھی آگاہ کر دیا جائے۔" استاد بھابھا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی کہ اب ہم اس سلسلے میں کیا کرنا چاہتے ہیں۔"

اس کی بات سن کر کالیا نے کچھ سوچ کر اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور بھابھا نے اپنے سیل فون پر بالآخر فیاض جمالی سے رابطہ کر کے آج والے واقعے کے بارے میں اسے بتا دیا۔

حسبِ توقع اس نے بھی اسے اچھی پیش رفت قرار دیا کہ ہم نے ان کے حملے کے باوجود انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور اس کے برعکس انہیں آزاد کرنے کا بھی ارادہ کیے ہوئے ہیں۔
ہم وہیں بیٹھے اسی مسئلے سے متعلق باتیں کرتے رہے تھے کہ تھوڑی دیر بعد کالیا کو جھنگو کی کال موصول ہوئی۔
''بجن ڈاڈا سے میں نے بات کرلی ہے۔ وہ اپنے آدمی بھیج رہا ہے تمہارے گھر مجھے پتا بتادو۔''
''اس نے کہا کیا ہے؟ پہلے یہ تو بتاؤ؟'' کالیا نے فوری طور پر اسے کوئی جواب دینے کے بجائے پوچھا تو جھنگو بولا۔
''اس نے بھی وہی بات کی ہے کہ یہ ہمارا ایک اچھا فیصلہ ہے مگر ابھی سے اس کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ میرداد کا گروپ ایک دم صلح پر آمادہ ہوجائے گا، ہاں البتہ اس طرح صلح کی جانب اچھی پیش رفت کی امید ضرور کی جاسکتی ہے۔''
''وہ ہم سے صلح کریں یا نہ کریں لیکن ایسا پہلی اور آخری بار ہی ہوگا۔ اس کے بعد ہم بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔'' کالیا نے کہا۔
''ہاں ہاں یار کالیا! میں نے بجن ڈاڈا سے ساری بات کھہ ڈالی ہے۔''
''بس تو پھر ٹھیک ہے، بجن ڈاڈا سے کہہ دو، اپنے آدمی بھیج دے میں پتا بتاتا ہوں لیکن ذرا ہولڈ کرو۔''
کالیا نے بھابھا اور مجھ سے مشورہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ میرداد اور اس کے دونوں ساتھیوں کو منورا والے مکان میں لے جاتے ہیں اور وہیں کا پتا بھی بتا دیتے ہیں۔
''نہیں۔'' بھابھا نے کالیا کے مشورے کو رد کرتے ہوئے کہا۔ ''تم ان تینوں کو اِدھر اُدھر لے جانے کا رسک نہ ہی لو تو اچھا ہے۔ یہ معاملہ جلد سے جلد نمٹ جائے اتنا ہی بہتر ہے، جھنگو کو نعمان کے گھر کا ہی پتا بتادو۔''
اس کے بعد کالیا نے میرے گھر کا پتا اسے بتا دیا اور وقت بھی۔
اور پھر۔ استاد بھابھا کے ہی مشورے سے ہمیں جانے کی بجائے۔ اس نے اپنے دو آدمیوں کو میرے گھر روانہ کردیا تاکہ میرداد وغیرہ کو بجن ڈاڈا کے آدمیوں کے حوالے کیا جاسکے۔ میں نے بھابھا کے ان مذکورہ دو آدمیوں کو اپنے گھر کی چابی دے دی۔ وہ روانہ ہوگئے۔
اگلے چند گھنٹوں کے اندر اندر یہ معاملہ بھی بہ خوبی نمٹا دیا گیا اور ہم نے قدرے سکون کی سانس لی تھی۔
''کالیا! مان گئے تجھے۔ تم نے بروقت یہ اچھا فیصلہ کیا تھا ورنہ اگر تم انہیں کوئی جانی نقصان پہنچا دیتے تو دشمنی کی یہ آگ مزید بھڑک سکتی تھی، اب کم از کم اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا کہ اس میں کچھ کمی آجائے گی اور لیاری میں موجود ہمارے بھی خواہ بھی ہمارا اچھا اور خاطر خواہ دفاع کریں گے، ان پر بھی ہمارا اچھا اثر پڑے گا۔'' استاد بھابھا نے جب توصیفی لہجے میں کالیا سے کہا تو وہ معنی خیز انداز میں میری جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
''استاد! یہ میرا کمال نہیں اپنے اس یار دل دار۔ نومی کا کمال ہے ورنہ میں تو ان تینوں سالوں کو اوپر پہنچانے کا پکا ارادہ کرچکا تھا۔ میں دشمنوں کو اسی طرح کا جواب دینے کا قائل ہوں۔ اس طرح کی صلح صفائیوں کو تو میں کمزوری سمجھتا ہوں جس سے دشمن اور اکڑتے ہیں۔''
''اوہ۔ اچھا!'' بھابھا نے حیرت اور متاثر کن انداز میں اپنی بھوئیں اچکا کر میری طرف دیکھا تھا۔ ''پھر مجھے یقین ہے کہ یہ معاملہ آگے نہیں بڑھے گا، اسے ادھر ہی بریک لگ جائے گی۔''
''انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔''
☆......☆
ہم اپنا کام کر چکے تھے، گھر کو خالی چھوڑنا بھی درست نہ تھا۔ میں نے گھر پر ہی رہنے کا ارادہ کیا تھا اور کالیا بھی بصد اصرار میرے ساتھ تھا۔ حالانکہ میں نے اسے منع کیا تھا۔ اس نے یہی کہا تھا کہ جب میں کام پر نکلوں تو وہ بھی اپنے کام سے نکل جایا کرے گا اور پھر میرے لوٹنے پر وہ بھی آجایا کرے گا۔ میں چپ ہورہا تھا۔
میری خواہش کے مطابق کالیا نے میرے لیے آرم لائسنس بننے کے لیے دے دیا تھا۔ میں خود اس کے ساتھ متعلقہ آفس گیا تھا۔
بہرطور میں اب دوسرے معاملات کی طرف متوجہ ہوا اور اڈے کا رخ کیا۔ وہاں چاچا انور شاہ میری وجہ سے فکرمند ہورہا تھا۔ اس نے مجھے ایک چونکا دینے والی اطلاع سنائی۔
''برخوردار نومی! حاجی مہران خان آیا تھا تم سے ملنے کے لیے۔''
لینڈ مافیائی چیفس کے ایک ''بڑے'' کی اڈے پر آمد اور مجھ سے ملنے کی حامی کی یہ اطلاع میرے لیے چونکا دینے والی تھی اور غیر معمولی بھی پل کے پل مجھے ایک اور جنگ کی بو محسوس ہونے لگی تھی۔
(جاری ہے)

(نزاہت اقبال فتح جنگ کا جواب)

شگفتہ پاکیزہ......کراچی

یہ سب دکھاوے کی ہے تیپ ٹاپ اور ٹھاٹ
کریدِ کر تو دیکھو کے کھوکھلا ہوگا

احمد علی......پشاور

یادِ محبوب میں آنکھوں سے ٹپکا ہوا لہو
دل میں ہو سوزش پیہم تو غزل ہوتی ہے

خوش بخت......بکھر

یوں تو جیسی بھی بیا ساکی رہے اتنا خیال
دور سے آئے ہیں سن کے ترے میخانے کا نام

سید حسان......خانیوال

یہ تصویرِ جہاں بے رنگ ہوگی
ہمارا خون اگر شامل نہ ہوگا

(عبدالحکیم قمر کراچی کا جواب)

ناہید سلطانہ......پشاور

یوں ہی کما گئے ہیں ہم دم کبھی ہم قریبِ منزل
کبھی ہم نکل گئے ہیں رہِ عشق میں سنبھل کر

عطا محمد......عمان سعودی عرب

یہ بھی ایک کرشمہ ہے ان حسین یادوں کا
داغِ دل چمکتے ہیں پھر بھی گھپ اندھیرا ہے

محمد اسلام بھٹو......لاڑکانہ

یہ ہی تو فلسفہ ہے ارتقاء کا
حقیقت بن گئی رنگین فسانہ

(رفیق احمد ڈی آئی خان کا جواب)

راحیل پراچہ......کراچی

اک ذرا سی بات پہ میں نے سکھ کا درپن توڑ دیا
اب وہ ذرا سی بات نہ پوچھو چھوٹی بات بڑھائے کون

احمد علی......سانگھڑ

آنکھ سے گر کر اک آنسو نے
جانے کہاں تک بات بڑھا دی

انعم الدین......کراچی

اس کھنڈر میں کہیں کچھ دیے ہیں ٹوٹے ہوئے
انہی سے کام چلاؤ بڑی اداس ہے رات

اکبر حیات......لاہور

اف ری مجبوریاں محبت کی
ہونٹ خنداں ہے آنکھ پُر نم ہے

(رضا احمد اعوان دریا خان کا جواب)

عبدالستار......ساہیوال

وحشت میں ہر ایک نقشہ الٹا نظر آتا ہے
مجنوں نظر آتی ہے لیلا نظر آتا ہے

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

شبیر حسن......سرگودھا

اٹھ گئے غمگسار باکپن سے
رہ گیا صرف چارہ گر تنہا

اختر علی اختر......جہلم

اے جرم ہم غزل ہی کے پردے میں کہہ گئے
ناکام زندگی کی کہانی کبھی کبھی

فیروز احمد......ڈی آئی خان

آہٹوں کا یہ تقاضا ہے کہ جاگیں کچھ اور
سائے ڈھلتے ہیں تو پھر نیند سی آجاتی ہے

(اقرا بانو نا گوری کراچی کا جواب)

عندلیب مظہر......ملتان

اندھیرا ، فاصلے ، تنہائی ، یادیں
کوئی میری طرح جی کر دکھائے

شہناز فرحت......لاہور

آنسوؤں کی چھاؤں میں تم جو مسکرا دیے
شبنمی نگاہ میں صبح کچھ نکھر گئی

ارتضا ملک......لاہور

اب تو آسمان رشک کرتا ہے
اتنا کافر بنا گیا کوئی

(سید امتیاز حسین بخاری سرگودھا کا جواب)

انس فاروقی..........لیہ

آہ اب یہ بھی مجھ کو یاد نہیں
آنکھ کب میری شبنمی نہ رہی

الیاس حسن..........روہڑی

اس شوق جستجو کی ہمیں داد کون دے
آئے ہیں خود کو ڈھونڈنے تیرے دیار میں

اشتیاق احمد..........کراچی

امرت نہیں دیتا جو ہونٹوں سے تو پھر
لا زہر ہی آنکھوں سے پلا دے ساقی

(نائمہ تحریم کراچی کا جواب)

نزہت پروین..........کراچی

یہ دن بھی مبارک ہے ملو آ کے گلے سے
پھر ہم سے کہو ذرا عید مبارک

احمد یار خان..........پشاور

یہ محفل میں تو نے غزل کیسی کہہ دی
کہ دیوار و در کو بھی وجد آیا

انوار حسین..........سرگودھا

یہ کیوں خنداں لبی کے ساتھ میں نے پی لیے آنسو
لبوں پر آ گئی کیوں کر ہنسی کہتے نہیں بنتی

(احمد علی سانگھڑ کا جواب)

شبیر شاہ..........کشمور

نیند تو درد کے بستر پہ بھی آ سکتی ہے
ان کی آغوش میں سر ہو یہ ضروری تو نہیں

(منظر علی لاہور کا جواب)

سعید حسن..........لاہور

نگہہ ناز کے الطاف فراواں تھا
دل کو لیکن گلہ کم نگہی آج بھی ہے

(شہناز فرحت لاہور کا جواب)

عبدالجبار روی..........قصور

فقط گزارش سے کام نہیں چلنے والا
دل حسن محبت ہے ذرا دیکھنے تو دو

(الیاس حسن روہڑی کا جواب)

نزاہت افشاں..........فتح جنگ

چلو اس قدر تو توجہ ہوئی
میرے واسطے زہر لایا گیا

(حکیم سید محمد رضا شاہ میانوالی کا جواب)

اختر شاہ عارب..........جہلم

یوں ہی چپکے چپکے رونا یوں ہی چپکے چپکے باتیں
بڑی کشمکش کے دن ہیں بڑی الجھنوں کی راتیں

(ہادیہ ایمان ماہا ایمان فورٹ عباس کا جواب)

نوشین عابد..........لاہور

اسی ندی کے کنارے تھا ایک بار سنگھار
جہاں ہوا تھا مری زندگی کا پہلا پیار

نوازش علی..........لاہور

اک بار اگر پہنچ جائیں جو وہ کسی محفل میں
رنگ اپنا جما لیں گے دزدیدہ نگاہوں سے

انوشہ نوید..........گجرات

آپ سے اک عنایت کی نظر ہو نہ سکی
میں نے تن من بھی لٹایا تو برا مان گئے

شبیر شاہ..........کشمور

ان کے عارض کی دمک کو استعارے بخش کر
پہلے فن تنویر تندیل حرم تک لے گئے

عشنا عباس..........جہلم

آپ ذرا دیکھتے تو آ کر
کیا کچھ ہے شاداب کے پاس

عارفہ جہانگیر..........پاک پتن

آپ جائیں جو سحر گلشن کو
رنگ اہل چمن نکھر جائے

رفیق احمد ناز..........ڈی جی خان

الوداع رخصت یار کی گھڑی اب الوداع
پیا ملن کی آس تھی بڑی اب الوداع

(منشی عزیز مے لڈن کا جواب)

انتظار مہدی..........نوشہرہ

یہ دکھ نہیں کہ اندھیروں سے صلح کی ہم نے
ملال یہ ہے کہ اب صبح کی طلب بھی نہیں

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

صاحب جی

جناب معراج رسول
سلام تہنیت
زندگی میں پہلی بار کہانی، وہ بھی خود اپنی لکھی ہے۔ اس سے قبل میں صرف پڑھتی رہی ہوں۔ سرگزشت میں چھپنے والی سچ بیانیاں مجھے بہت پسند ہیں گزشتہ مہینے کی ایک سچ بیانی نے مجھے اکسایا کہ میں بھی اپنی روداد حیات لکھوں، سو لکھ لی اب پتا نہیں کہانی کے انداز میں لکھ سکی ہوں یا نہیں۔ اپنی حالات زندگی صرف اس لیے لکھ رہی ہوں کہ لوگ اس سے سبق حاصل کریں۔ خاص کر وہ لڑکیاں جو کسی بھی لڑکے کی مسکراہٹ کو اپنے لیے اس کی پسند سمجھنے لگتی ہیں اور اپنی آنکھوں میں خواب سجانے لگتی ہیں۔میں نے بھی یہی غلطی کی تھی جو کچھ مجھ پر بیتی وہ بیان کر رہی ہوں۔

نعیمہ سلیم
(کراچی)

ماں باپ نے میرا نام نعیمہ رکھا لیکن بچپن سے ہی سب لوگ مجھے نمو کہتے آرہے ہیں اور اب یہی نام میری پہچان بن گیا ہے۔ میں نے ہوش سنبھالتے ہی گھر میں غربت دیکھی۔ ابا کسی ٹھیکے دار کے پاس دہاڑی پر راج مستری کا کام کرتے تھے۔ یہ ہوائی روزی تھی۔ کام مل گیا تو گھر میں چولہا جل جاتا ورنہ کبھی کبھی فاقہ بھی کرنا پڑتا۔ بعض اوقات تو یہ بھی ہوا کہ پندرہ پندرہ دن تک ابا کو کوئی کام نہیں ملا۔ نہ جانے اماں کہاں سے مانگ تانگ کر ہم چھ آدمیوں کے پیٹ کا دوزخ بھرتیں۔ میرے دو بڑے بھائی اور ایک چھوٹی بہن تھی۔ ابا کی بڑی خواہش تھی کہ وہ ہم سب بہن بھائیوں کو تعلیم دلوائیں لیکن ہمارے علاقے میں لڑکے یا لڑکیوں کے لیے کوئی سرکاری اسکول نہیں تھا۔ ابا کی اتنی استطاعت نہیں تھی کہ وہ پرائیویٹ اسکول کی فیس اور دیگر اخراجات برداشت کرسکیں چنانچہ انہوں نے ہم چاروں بہن بھائیوں کو محلے کی مسجد میں قرآن ناظرہ پڑھنے کے لیے بھیجنا شروع کردیا۔ اسی مسجد میں ایک مدرسہ بھی تھا جہاں بچوں کو پانچویں تک مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ صبح کی شفٹ میں لڑکوں اور دوپہر میں لڑکیوں کی کلاس ہوا کرتی تھی۔ اس طرح ہماری پرائمری تعلیم کا بندوبست ہوگیا۔ ابا کا خیال تھا کہ حالات بہتر ہونے پر وہ ہمیں کسی پرائیویٹ اسکول میں داخل کروادیں گے لیکن ان کا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہوا۔

گھر کے حالات بہتر ہونے کی بجائے بگڑتے چلے گئے۔ ابا جس ٹھیکے دار کے پاس کام کرتے تھے وہ دبئی چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ابا کو کام کی تلاش میں مشکل پیش آنے لگی۔ انہوں نے ایک ٹھلے والے سے بات کی جہاں سیمنٹ کے بلاک وغیرہ بنتے تھے۔ اس کے پاس پہلے ہی چار مستری تھے، جب وہ چاروں کام میں مصروف ہوتے تو ابا کا نمبر آتا۔ اس طرح ان کی آمدنی خطرناک حد تک کم ہوگئی۔ مجبوراً اماں کو گھر سے باہر قدم نکالنا پڑا۔ ان کے پاس تعلیم تھی نہ کوئی ہنر۔ لے دے کے ایک ہی صورت تھی کہ وہ کسی بڑے گھر میں ماسی کا کام شروع کردیں۔ ہمارے محلے کی کئی عورتیں اس پیشے سے منسلک تھیں۔ اماں نے ان سے ذکر کیا اور تھوڑی سی کوشش کے بعد انہیں ایک گھر میں کام مل گیا۔

اب وہ صبح آٹھ بجے گھر سے نکل جاتیں اور ان کی واپسی بارہ ایک بجے تک ہوتی۔ ان کے ذمہ کئی کام تھے۔ جن میں گھر کی صفائی جھاڑ پونچھ، آٹا گوندھنا، برتن اور کپڑے دھونا سب کچھ شامل تھا۔ ان تمام کاموں کے عوض انہیں صرف تین ہزار روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی اور کبھی کبھی مالکن رات کا بچا ہوا کھانا بھی دے دیا کرتی۔ وہ مقدار میں اتنا زیادہ ہوتا کہ ہم اسے دو وقت کھاتے اس طرح ابا کا بوجھ کچھ کم ہوگیا۔

وقت گزرتا رہا ہم چاروں بہن بھائی مسجد اور مدرسہ سے فارغ ہوگئے تھے۔ ابا نے بہت چاہا کہ کم از کم دونوں بھائیوں کو ہائی اسکول میں داخل کروادیں لیکن وہ ان کی فیس کا بندوبست نہ کرسکے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں بھائی سارا

سارا دن گلیوں میں آوارہ گردی کرتے۔ کیونکہ انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ اماں اور ابا دونوں ہی گھر سے باہر ہوتے۔ وہ دونوں دیر تک سوتے رہتے پھر ناشتا کر کے گھر سے باہر نکل جاتے۔ امجد نے محلے کے آوارہ لڑکوں میں اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ گلی ڈنڈا، کنچے اور تاش کھیلتا اور اماں کے آنے سے پہلے گھر آجاتا۔ شام کو پھر وہ کھیلنے کے بہانے گھر سے چلا جاتا اور اس کی واپسی مغرب کے بعد ہی ہوتی۔ اکثر یوں بھی ہوتا کہ رات کے کھانے کے بعد اس کا کوئی دوست بلانے آجاتا اور پھر وہ دو تین گھنٹے بعد گھر کا راستہ دیکھتا۔

بری صحبت کا نتیجہ بہت جلد سامنے آگیا۔ امجد کے بارے میں نئی نئی باتیں سننے میں آنے لگیں۔ اس نے آوارہ لڑکوں کے ساتھ مل کر ایک گروپ بنا لیا تھا اور چھوٹے موٹے جرائم کرنے لگا تھا۔ پہلے اس نے ٹھیلوں اور دکانوں سے چیزیں چرانا شروع کر دیں پھر لوٹ مار اور بھتہ خوری شروع کر دی۔ وہ سنسان راستوں پر راہ چلتے لوگوں سے نقد رقم اور موبائل چھین لیتا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک پرانی موٹر سائیکل خرید لی تھی۔

ابا کو جب ان حرکتوں کا علم ہوا تو انہوں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ پہلے پیار سے سمجھایا پھر سختی کرنا چاہی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ پہلے تو اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ کسی نے انہیں غلط خبر دی ہے۔ اس نے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا لیکن جب ابا نے اس کے دو تین کارنامے گنوائے تو وہ ڈھٹائی پر اتر آیا اور بولا۔ ''آپ ہی بتائیں پھر میں کیا کروں۔ آخر مجھے بھی تو گزارہ کرنا ہے۔''

''تم کوئی کام دھندا کیوں نہیں کرتے؟'' ابا نے کہا۔

''کیا کام کروں۔ مجھے آتا ہی کیا ہے۔ اگر میرے پاس تعلیم ہوتی تو کوئی ملازمت ہی کر لیتا۔ جاہل آدمی کو تو کوئی نہیں پوچھتا۔''

''ہم بھی پڑھے لکھے نہیں ہیں لیکن محنت مزدوری کر کے حق حلال کی روزی کما رہے ہیں۔''

''اس محنت مزدوری کے عوض آپ کو کیا ملا۔ میں ایسی زندگی نہیں گزار سکتا۔''

''پھر اپنا ٹھکانہ کہیں اور کر لو۔'' ابا نے غصے سے کہا۔ ''میرے گھر میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔''

''ہاں ہاں چلا جاؤں گا۔ میں خود بھی یہاں نہیں رہنا چاہتا۔ اس گھر میں ہے کیا سوائے غربت اور محرومی کے۔''

اس موقع پر اماں نے مداخلت کی اور ابا سے کہنے لگیں۔ ''کیا ہو گیا ہے تمہیں، جوان اولاد سے اس طرح بات کی جاتی ہے۔''

ابا منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد اماں نے امجد کو آڑے ہاتھوں لیا اور خوب سنائیں۔ وہ ڈھیٹ بنا سنتا رہا جب اماں سانس لینے کے لیے رکیں تو بولا۔ ''تم اور ابا کچھ بھی کہو لیکن میں یہ کام نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے اپنا مستقبل عزیز ہے۔ تھوڑے سے پیسے جمع ہو جائیں تو کوئی چھوٹا موٹا دھندا شروع کر دوں گا۔ پھر تم لوگوں کو کوئی شکایت نہیں رہے گی۔''

اماں سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ انہیں اندازہ ہو گیا کہ پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ امجد اتنا آگے جا چکا ہے کہ اب اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہوگا۔ انہوں نے چھوٹے بیٹے ارشد سے ساری امیدیں وابستہ کر لیں لیکن اس نے دوسرا ہی راستہ اختیار کیا۔ بچپن سے ہی اس کا رجحان مذہب کی جانب بہت زیادہ تھا، اس نے مسجد سے اپنا تعلق برقرار رکھا۔ وہ پانچوں وقت کی نماز باقاعدگی سے باجماعت ادا کرتا۔ رمضان میں پورے روزے رکھتا اور شرعی لباس پہنتا۔ اس نے داڑھی بھی رکھ لی تھی اور ہمہ وقت دینی کتب کا مطالعہ کرتا۔ اس نے تبلیغی اجتماعات میں بھی جانا شروع کر دیا تھا لیکن اسے گھر کی ذمے داریوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ ابا نے بہت چاہا کہ وہ ان کے ساتھ کام پر جایا کرے یا خود اپنے طور پر کوئی کام دھندا شروع کر دے لیکن اسے اپنے کاموں سے ہی فرصت نہ تھی۔ آئے دن وہ سہ روزہ اور چالیس روزہ اجتماعات میں چلا جاتا۔ اب وہ ایک سال کے لیے تبلیغی دورہ پر ملک سے باہر جانے کا پروگرام بنا رہا تھا اس نے اپنا نام لکھوا دیا تھا اور شدت سے انتظار کر رہا تھا کہ اس کا نمبر کب آتا ہے۔

وہ بظاہر پنج وقتہ نمازی اور پرہیز گار تھا لیکن دنیاوی معاملات میں انتہائی متعصب اور تنگ نظر واقع ہوا تھا خصوصاً عورتوں کے معاملے میں اس کا رویہ انتہائی سخت تھا۔ اس کی باتیں اور خیالات سن کر ایسا لگتا کہ سارا اسلام عورتوں پر ہی ختم ہو گیا ہے۔ پہلے پہل اس نے بہنوں پر روک ٹوک کی پھر اماں کو بھی بولنے لگا۔ دلچسپ بات یہ کہ وہ گھر میں کسی کو بھی نماز پڑھنے یا اسلامی شعائر اختیار کرنے کی تلقین نہیں کرتا تھا۔ بلکہ اس کی گفتگو کی تان عورتوں پر آکر ٹوٹتی۔ مثلاً یہ کہ

عورتوں کو گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ شرعی پردہ کرنا چاہیے۔ نامحرموں کے سامنے نہیں آنا چاہیے۔ وہ عورتوں کی تعلیم اور ملازمت کے بھی سخت خلاف تھا لیکن مزے کی بات یہ کہ اس نے کبھی اماں کے کام کرنے پر اعتراض نہیں کیا اس کے علاوہ اگر وہ کہیں باہر جانے کا نام لیتیں تو چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیتا لیکن اماں اس کی باتوں کو بالکل بھی اہمیت نہیں دیتی تھیں۔ ان پر بس نہ چلتا تو وہ بہنوں کے پیچھے لگ جاتا۔ دوپٹا سر پر رکھو، نظریں نیچی رکھو، کسی مرد سے بات کرنے یا اس کے سامنے آنے کی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی ہمارے گھر کون آتا تھا لیکن اگر کبھی بھولے سے کوئی کزن آ گیا تو ہمیں اس کے سامنے آنے کی اجازت نہیں تھی۔

زندگی اسی گھٹن زدہ ماحول میں گزر رہی تھی کہ ایک دن سلمٰی باجی ہمارے گھر آئیں۔ وہ اسی لائن میں دو گھر چھوڑ کر رہتی تھیں اور قریب ہی کسی اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ ویسے تو ہمارا کسی سے ملنا جلنا نہیں تھا لیکن سلمٰی باجی میں ایک خوبی تھی کہ وہ محلے کے تمام گھروں کی خبر گیری کرتی تھیں کیونکہ ان کے مالی حالات بھی بہت اچھے نہیں تھے لیکن وہ اپنی گنجائش کے مطابق لوگوں کی مدد کرتیں اور ویسے بھی ان کے کام آیا کرتیں۔ کسی کو اسکول میں داخلہ کروانا ہو یا ڈاکٹر کے پاس جانا ہو۔ وہ ہر ایک کے ساتھ چل پڑتیں۔ انہی خوبیوں کی وجہ سے محلے کے سب لوگ ان کی عزت کرتے تھے اور وہ بھی ہر ایک کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتیں۔

سلمٰی باجی جب ہمارے گھر آئیں تو اماں گھر پر نہیں تھیں۔ میں نے سبزی کاٹ کر رکھ دی تھی تاکہ اماں آئیں تو انہیں کھانا بنانے میں دیر نہ لگے۔ ابھی مجھے ہانڈی پکانا نہیں آتی تھی لیکن اوپر کے چھوٹے موٹے کام کر لیتی تھی۔ مجھے چائے بنانا بھی آ گئی تھی۔ اس لیے سلمٰی باجی کو دیکھتے ہی چائے کا پانی چولہے پر رکھ دیا۔ وہ میری مستعدی اور سلیقہ سے بہت متاثر ہوئیں اور جب میں چائے لے کر آئی تو خوش ہوتے ہوئے بولیں۔ ''ارے تم نے اتنی جلدی چائے بھی بنا لی۔''

''جی۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''اس میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔''

انہوں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''بہت اچھی چائے بنائی ہے تم نے۔ کچھ پڑھتی وڑھتی بھی ہو یا ابھی سے گھر داری میں لگ گئیں؟''

''بس پانچویں تک پڑھا ہے۔'' میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں کوئی سرکاری اسکول جو نہیں ہے۔''

''اوہ۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا جیسے وہ میری بات کا مطلب سمجھ گئی ہوں پھر وہ بولیں۔ ''تمہیں پڑھنے کا شوق ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تو انہوں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں تمہیں پڑھاؤں گی۔ تم دونوں بہنیں شام کو میرے پاس آ جایا کرو۔''

میں نے کہا۔ ''آپ اماں سے بات کر لیں۔''

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں۔ اماں آ گئیں۔ سلمٰی باجی نے ان سے بات کی تو وہ بے بسی سے بولیں۔ ''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن ان کے باپ اور بھائیوں سے پوچھنا ہوگا۔ اگر انہوں نے اجازت دے دی تو میں کل سے ہی ان دونوں کو تمہارے پاس بھیجنا شروع کر دوں گی۔''

میں جانتی تھی کہ اگر ابا نے اجازت دے دی تب بھی ارشد بھائی کبھی نہیں مانیں گے اور وہی ہوا۔ جب اماں نے ابا سے یہ بات کہی تو وہ خاموش ہو گئے۔ یہ گویا ایک طرح سے نیم رضامندی تھی لیکن ارشد بھائی نے ہنگامہ کھڑا کر دیا اور بولے۔ ''کوئی ضرورت نہیں ہے ان لڑکیوں کو سلمٰی کے پاس بھیجنے کی۔ وہ کون ہوتی ہے ہمارے معاملات میں دخل دینے والی۔ خود تو بے پردہ ساری دنیا میں پھرتی ہے اور ہماری بہنوں کو بھی بگاڑ دے گی اور انہیں ضرورت کیا ہے آگے پڑھنے کی؟ کون سا ہم نے ان سے نوکری کروانی ہے۔ ویسے بھی پڑھ لکھ کر لڑکیاں بگڑ جاتی ہیں۔ ہمیں ایسی تعلیم نہیں چاہیے۔ اسے منع کر دیں۔ وہ ہمارے گھر نہ آیا کرے۔''

اس کی تقریر سن کر ابا کو بھی غصہ آ گیا اور وہ بولے۔ ''یہ جو ہزاروں لاکھوں لڑکیاں پڑھ رہی ہیں۔ ڈگریاں حاصل کر رہی ہیں۔ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں تو کیا یہ سب بگڑ چکی ہیں۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلاتا۔ اب قدرت نے ایک موقع دیا ہے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔''

''ابا، سلمٰی باجی نے کہا ہے کہ وہ ہماری اتنی تیاری کروا دیں گی کہ میٹرک کا امتحان پرائیویٹ دے سکیں۔'' میں نے ارشد بھائی کو سلگانے کے لیے کہا۔

''میٹرک کر کے تم کون سی افسر لگ جاؤ گی۔'' ارشد

بھائی ہاتھ نچاتے ہوئے بولے۔ ''آج کل تو ایم اے پاس جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ تم یہ پڑھائی کا خیال دل سے نکال دو اور گھر کے کاموں پر توجہ دو۔''

ابا نے ارشد بھائی کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اس معاملے میں بولنے کی ضرورت نہیں۔ ابھی میں زندہ ہوں۔ اس گھر میں وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ ''ٹھیک ہے بیٹی تم دونوں بہنیں کل سے سلمٰی کے یہاں پڑھنے جاؤ گی۔ اچھا ہے کچھ پڑھ لکھ لو۔ یہی تمہارے کام آئے گا۔''

اس طرح ہم دونوں بہنوں نے سلمٰی باجی کے یہاں جانا شروع کر دیا۔ مجھ سے چھوٹی نسیمہ کو پڑھائی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن وہ میری دیکھا دیکھی کتابیں کھول کر بیٹھ جاتی۔ سلمٰی باجی کا خیال تھا کہ وہ ہمیں ایک سال میں دو جماعتیں پڑھائیں گی تاکہ ہمارا جو وقت ضائع ہو گیا ہے وہ پورا ہو جائے اگر ہمارا تعلیمی سلسلہ بیچ میں نہ ٹوٹتا تو میں آٹھویں اور نسیمہ چھٹی میں ہوتی۔ سلمٰی باجی ہر جماعت کا کورس ختم ہونے کے بعد ہمارا امتحان لیتیں اور اگر پاس ہو جاتی تو ہمیں اگلے درجے میں ترقی مل جاتی۔

اس طرح خدا خدا کر کے میں نے میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ میں مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن ہمارے گھر میں تو اس کا تذکرہ کرنا ہی بے کار تھا۔ ایک تو ابا کی اتنی استطاعت نہیں تھی کہ وہ میرے کالج کے اخراجات برداشت کرتے۔ دوسرے ارشد بھائی یہ کیسے گوارا کرتے کہ میں کالج میں پڑھوں۔ سلمٰی باجی کے گھر جانے اور کالج کی پڑھائی میں بہت فرق تھا چنانچہ میں دل مسوس کر رہ گئی۔ سلمٰی باجی کی بھی شادی ہو گئی اور وہ رخصت ہو کر دوسرے شہر چلی گئیں۔ جاتے ہوئے انہوں نے سختی سے تاکید کی کہ میں ہر صورت میں نسیمہ کو میٹرک کی تیاری کرواؤں تاکہ اس کی تعلیم ادھوری نہ رہ جائے۔

ایک دن اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن کام پر جانا بھی ضروری تھا کیونکہ مالکن کے یہاں کوئی دعوت تھی اور اس کا سارا انتظام اماں کو ہی کرنا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنی مدد کے لیے ساتھ لیا اور کوٹھی چلی گئیں جو ہمارے گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اماں مجھے اپنے ساتھ کام پر لے کر گئی ہوں۔ اس سے پہلے میں نے صرف کوٹھی کا نام اور وہاں کے قصے سن رکھے تھے کبھی وہاں جانے یا ان لوگوں سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس کوٹھی کو دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا عالیشان گھر نہیں دیکھا تھا۔ خوب صورت سرسبز و شاداب لان جس میں کئی سایہ دار درخت اور رنگ برنگے پھولوں سے لدے ہوئے پودے لہلہا رہے تھے۔ بڑے بڑے کمرے، شاندار وسیع و عریض ڈرائنگ و ڈائننگ روم، جدید طرز کا کچن، قیمتی فرنیچر، قالین اور پردے۔ دنیا کی ہر نعمت اس گھر میں موجود تھی۔

اماں مجھے لے کر گھر میں داخل ہوئی تو مالکن نے مجھے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا نام مسز نقوی تھا لیکن اماں ہمیشہ انہیں مالکن ہی کہا کرتی تھیں۔ اس وقت وہ ایک نوجوان شخص سے بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر میرا دل دھڑکنا بھول گیا وہ اتنا خوب صورت اور اسمارٹ بندہ تھا کہ اس پر کسی ناول کے ہیرو کا گمان ہوتا۔ اس نے سفید قمیص، سیاہ پینٹ اور پیروں میں چپل پہن رکھے تھے۔ اس کے گورے رنگ پر گھنگریالے بال خوب جچ رہے تھے۔ اس نے سرسری انداز میں میری طرف دیکھا اور فوراً ہی میرے چہرے پر سے نظریں ہٹالیں۔

''یہ میری بیٹی ہے نمو۔'' اماں نے کہا۔ ''آج میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔ کام میں میرا ہاتھ بٹائے گی۔''

''اچھا کیا۔'' مسز نقوی خوش ہوتے ہوئے بولیں۔ ''آج کام بھی زیادہ ہے تم واپسی کی فکر مت کرنا۔ اگر دیر ہو گئی تو ڈرائیور تم دونوں کو گھر چھوڑ آئے گا۔''

اماں مجھے لے کر کچن میں آگئیں۔ پہلے انہوں نے چائے بنائی پھر ڈبل روٹی پر مکھن اور جام لگا کر مجھے دیتے ہوئے بولیں۔ ''تو جلدی سے ناشتا کر پھر کمروں کی صفائی بھی کرنی ہے۔ میں جب تک کچن کا کام دیکھ لوں۔''

''مگر اماں میں تو چائے پی کر آئی ہوں۔''

''تو کیا ہوا۔ یہ ناشتا بھی کر کے دیکھ۔ تجھے بھی پتا چل جائے گا کہ اللہ میاں نے دنیا میں کیسی کیسی نعمتیں اتاری ہیں۔ کہے تو آملیٹ بھی بنا دوں۔''

میں کہنا چاہ رہی تھی کہ یہ نعمتیں ہمارے لیے نہیں ہیں لیکن اماں کے سامنے بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر وہ خوش ہو رہی تھیں تو مجھے اعتراض کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے ان کا دل رکھنے کے لیے ایک توس پر مکھن لگایا اور چائے کے ساتھ کھا گئی۔ پھر میں نے جھاڑن اٹھایا اور گھر کی

صفائی کرنے چل دی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ کام بھی برائے نام تھا۔ پہلے ہی پورا گھر صاف ستھرا تھا۔ تمام چیزیں سلیقے سے اپنی جگہ رکھی ہوئی تھیں۔ ہمارے گھر کے برعکس یہاں بالکل بھی بے ترتیبی نہیں تھی۔ اس لیے مجھے بہت زیادہ کام نہیں کرنا پڑا۔ میں نے پہلے تینوں بیڈروم صاف کیے پھر ڈرائنگ روم ڈائننگ روم اور لاؤنج میں ہلکا سا ہاتھ مارا۔ اب ایک کمرا باقی رہ گیا تھا۔ وہاں گئی تو اس کا دروازہ بند تھا یہ ایک غیر معمولی بات تھی کیونکہ بقیہ سب کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ میں نے اس کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ میں نے ہلکی سی دستک دی۔ اسی اسمارٹ شخص نے دروازہ کھولا اور مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''کیا بات ہے؟''

''صاحب جی اس کمرے کی صفائی کرنی ہے۔''

''تمہاری ماں نے یہ نہیں بتایا کہ اس کمرے کی صفائی میں خود کرتا ہوں۔ کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''واہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' میں نے دروازہ کی چوکھٹ پر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے ہوتے ہوئے آپ صفائی کریں۔''

''تم نہیں سمجھو گی۔'' وہ میرے پیچھے آتے ہوئے بولا۔ ''دراصل اس کمرے میں انتہائی قیمتی اور نادر و نایاب کتابیں ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ کسی بے احتیاطی کی وجہ سے انہیں کوئی نقصان پہنچے۔''

وہ اتنی مشکل زبان بول رہا تھا کہ اس کی آدھی بات میری سمجھ میں آئی اور آدھی نہیں۔ میں نے نظریں گھما کر کمرے کا جائزہ لیا۔ چاروں دیواروں پر الماریاں تھیں جن میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ کمرے کے وسط میں ایک درمیانہ سائز کی میز تھی جس پر کمپیوٹر، ٹیبل لیمپ اور کچھ فائلیں رکھی ہوئی تھیں اور ایک جانب کاؤچ رکھی ہوئی تھی۔ مجھے تو ویسے بھی پڑھنے کا شوق تھا۔ دل چاہا کہ میز پر رکھے ہوئے رسالوں پر ایک نظر ڈال لوں لیکن وہ تو مجھے کمرے میں ہی نہیں آنے دے رہا تھا۔ بھلا رسالوں کو ہاتھ لگانے کیوں دیتا۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور بے باکی سے بولی۔ ''اگر یہ کتابیں اتنی ہی قیمتی ہیں تو ان کی حفاظت بھی ضروری ہے لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ ان پر توجہ نہیں دے پا رہے اگر یہی حال رہا تو کچھ دنوں بعد ان میں دیمک لگنا شروع ہوجائے گی۔''

''یہ میرا مسئلہ ہے۔ تمہیں اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''واہ یہ کیا بات ہوئی۔ آپ خود بھی صفائی نہیں کرنے دیتے اور دوسروں کو بھی اس کی اجازت نہیں۔ اس طرح تو آپ خود اپنی چیزوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔''

اس نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا جیسے نگاہوں ہی نگاہوں میں تول رہا ہو۔ اس کے اس طرح دیکھنے پر میں بری طرح شرما گئی۔ آج تک کسی مرد نے مجھے اس طرح نہیں دیکھا تھا۔ اوّل تو میرا واسطہ ہی بہت کم مردوں سے پڑا۔ گھر میں صرف ابا اور بھائی تھے۔ اس کے علاوہ میرا سامنا دودھ والے، سبزی والے، دھوبی اور محلے کے دکان داروں سے ہوتا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا۔ جسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خواب انگڑائیاں لینے لگیں یا دل میں ارمان مچلنے لگیں۔ لے دے کر ایک میرا خالہ زاد بھائی سلیم تھا جو بھی کبھار ہم سے ملنے چلا آتا لیکن اس کا آنا بھی سب کو ناگوار گزرتا اور امی کے علاوہ کوئی بھی اس سے سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ خاص طور پر ارشد کو تو اس سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اگر اس کی موجودگی میں سلیم آجاتا تو ہم دونوں بہنوں کو اس کے سامنے آنے کی اجازت نہیں تھی اگر غلطی سے امی سلیم کے لیے چائے بنانے کا کہہ دیتیں تو اس کے جانے کے بعد ارشد خوب ہنگامہ کرتا۔ ''جس کو دیکھو منہ اٹھائے چلا آتا ہے۔ جیسے ہم نے کوئی ہوٹل کھول رکھا ہے۔ گھر میں تو کچھ نصیب ہوتا نہیں۔ یہاں آکر گل چھرے اڑائے جاتے ہیں۔''

حالانکہ ایسی بات نہیں تھی۔ سلیم تو محبت میں خالہ سے ملنے چلا آتا۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی نگاہوں کا محور میں تھی۔ ان کے گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی اور وہ لوگ ہم سے کہیں زیادہ خوش حال زندگی بسر کر رہے تھے۔ خالو کا اپنا کاروبار تھا اور مکان کا کرایہ بھی آتا تھا۔ اس کے باوجود وہ لوگ ہم سے اچھی طرح ملتے تھے، جب کہ ابا کے بہن بھائیوں نے تقریباً ان سے تعلق ختم کرلیا تھا۔ صرف بڑے تایا اور دونوں پھوپیاں عید بقرعید پر ملنے چلی آتیں لیکن ان کی اولادوں کو کبھی ہمارے گھر آنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ شاید وہ سب لوگ ہمیں اپنے سے کم تر سمجھتے تھے یا پھر انہیں یہ ڈر ہوگا کہ ابا کہیں ان سے کچھ مانگ نہ لیں لیکن میرے خیال میں ارشد کا رویہ انہیں ہمارے گھر آنے سے روکتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ہمارے گھر آئے اور ہم دونوں بہنوں کا تو خاص طور پر کہیں جانے کا سوال ہی پیدا

نہیں ہوتا تھا۔
اب میں بچی نہیں تھی کہ ان نگاہوں کا مفہوم نہ سمجھتی۔ اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی اور اگر جسم کو پوری طرح چادر میں لپیٹ کر نہ رکھتی تو لوگوں کی نگاہوں سے بچنا مشکل ہو جاتا۔ مجھ پر ٹوٹ کر جوانی آئی تھی اور آئینہ گواہی دیتا تھا کہ بنانے والے نے مجھے بڑی فرصت میں بنایا تھا۔ گورا رنگ، لمبے سیاہ بال، نشیلی آنکھیں، ستواں ناک، رسیلے ہونٹ اور بھرا بھرا جسم۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ مجھے مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔ ابھی تک مجھے اس کا نام معلوم نہیں ہوا تھا۔ اس لیے میں اسے صاحب جی ہی کہہ رہی تھی۔ اس وقت مجھے خود بھی اپنا خیال نہیں رہا تھا۔ دوپٹا سر سے ڈھلک کر شانوں پر آ گیا۔ میں نے جلدی سے دوپٹا ٹھیک کیا اور اس کی نگاہوں کی تپش سے بچتے ہوئے بولی۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں صاحب جی۔''

''دیکھ رہا ہوں کہ تم کتنی خوب صورت ہو۔'' وہ میرے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے بولے۔''قدرت کی صناعی کا لاجواب شاہکار۔''

ان کا یہ جملہ بھی میرے پلے نہیں پڑا۔ یہ تو جان گئی تھی کہ وہ میری خوب صورتی کی تعریف کر رہے تھے اور میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اس سے پہلے بھی کسی مرد نے میری تعریف نہیں کی تھی۔ ویسے بھی اب تک میرا واسطہ صرف سلیم سے ہی پڑا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی میرے حسن کی شان میں قصیدہ پڑھنا چاہ رہا ہو لیکن اسے ہمت نہیں ہوئی یا موقع نہیں مل سکا۔

صاحب جی کی زبان سے یہ جملہ سن کر میں گھبرا گئی اور میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور آہستہ سے بولے۔''اگر آپ اس کمرے کی صفائی نہیں کروانا چاہتے تو میں کوئی دوسرا کام کر لیتی ہوں۔''

''نہیں اب تم آ گئی ہو تو صفائی کر کے ہی جاؤ لیکن خیال رکھنا کہ کوئی چیز اِدھر سے اُدھر نہ ہو۔''

''آپ بے فکر رہیں، جہاں سے جو چیز اٹھاؤں گی اسے صاف کرنے کے بعد اسی جگہ رکھ دوں گی۔''

''گڈ گرل۔'' انہوں نے کہا اور کمرے سے باہر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے دوپٹا کمر کے گرد باندھا اور پوری لگن سے کام میں مصروف ہو گئی۔ نہ جانے مجھے کیوں ایسا لگ رہا تھا کہ اپنے گھر کا کام کر رہی ہوں۔

سب سے پہلے میں نے میز کی صفائی کی۔ تمام فائلوں اور کاغذات کو ایک طرف رکھا اور بڑی احتیاط سے پوری میز صاف کر دی۔ کمپیوٹر کے کی بورڈ اور مانیٹر پر گرد جمع تھی۔ اس پر ہلکا سا کپڑا لگایا تو دونوں چیزیں چمک اٹھیں۔ سب سے زیادہ مشکل الماریوں میں پیش آئیں۔ میں نے ایک ایک کتاب اٹھا کر اسے صاف کرنا شروع کیا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ ایک دن میں یہ کام مکمل نہیں ہو سکتا۔ ابھی میں نے ایک ہی الماری صاف کی تھی کہ وہ بھی آ گئے اور گھڑی دیکھتے ہوئے بولے۔''تم ابھی تک یہیں ہو۔ میں تو سمجھا تھا کہ کام ختم ہو گیا ہو گا۔''

''اتنی جلدی کام کیسے ختم ہو سکتا ہے۔'' میں نے تنگ کر کہا۔''آپ نے تو کمرے کا حشر نشر کر رکھا ہے۔''

''اچھا اب کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ تمہاری ماں انتظار کر رہی ہو گی۔ باقی کام کل کر لینا۔''

کسی کام کو ادھورا چھوڑنا میری عادت کے خلاف تھا لیکن جب وہ خود کہہ رہے تھے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں ہاتھ دھو کر کچن میں آ گئی۔ اماں نے میرے سامنے کھانا رکھا اور بولی۔''کیا بات ہے تو نے صفائی میں اتنی دیر لگا دی۔ ابھی اور بھی بہت سے کام پڑے ہوئے ہیں۔''

''باقی کمروں کی صفائی تو جلدی ہو گئی لیکن چھوٹے صاحب کا کتابوں والا کمرا بہت گندا ہے۔ وہاں دیر لگ گئی۔''

''حیرت ہے۔ وہ تو کسی کو اس کمرے میں قدم نہیں رکھنے دیتے۔ تجھے اجازت کیسے مل گئی؟''

''پہلے تو انہوں نے مجھے بھی منع کر دیا تھا لیکن جب میں نے انہیں سمجھایا کہ صرف اوپر اوپر سے کپڑا مار دینا کافی نہیں جب تک ایک ایک کتاب کو باہر نکال کر اسے چاروں طرف سے صاف نہ کیا جائے تب ان کی سمجھ میں یہ بات آئی۔''

''اچھا! ٹھیک ہے تو جلدی سے کھانا کھا لے پھر کام شروع کرتے ہیں۔ ابھی بہت کام باقی ہے۔''

جب اماں کھانے کے برتن سمیٹنے لگیں تو میں نے ان سے پوچھا۔''اماں یہ چھوٹے صاحب کوئی کام نہیں کرتے جو اس وقت گھر میں نظر آ رہے ہیں؟''

''ارے بیٹا! ان لوگوں کو کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک فیکٹری ہے۔ جائیداد سے کرایہ آ جاتا ہے۔ بڑے

صاحب فیکٹری سنبھالتے ہیں۔ یہ آرام سے گھر میں بیٹھ کر ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔''

میں دل ہی دل میں ان پر رشک کرنے لگی۔ واہ اللہ میاں کیا قسمت بنائی ہے۔ ایک ہم ہیں کہ صبح سے شام تک کولہو کے بیل کی طرح کام میں جتے رہتے ہیں اور پھر بھی پیٹ بھر کر دو وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ اس وقت میرے دل میں بڑی شدت سے خیال آیا کہ کاش میری شادی بھی صاحب جی جیسے کسی بندے سے ہو جائے۔ پھر صاحب جی ہی مجھے پسند کرلیں۔ جس طرح وہ مجھے دیکھ رہے تھے۔ اس سے تو یہی لگ رہا تھا کہ میں انہیں بھا گئی ہوں۔ کاش اماں کی طبیعت چند روز مزید خراب رہے اور وہ اسی طرح مجھے اپنے ساتھ کام پر لاتی رہیں۔ یوں مجھے صاحب جی سے قریب ہونے کا موقع مل سکتا ہے۔

میری دعا قبول ہوئی اور اماں کی طبیعت گھر آنے کے بعد مزید خراب ہوگئی۔ اگلے روز انہیں بہت تیز بخار تھا۔ اس کے باوجود وہ کام پر جانے کے لیے تیار ہوگئیں۔ وہ مجھے اکیلا نہیں بھیجنا چاہ رہی تھیں۔ مالکن نے جو ان کی حالت دیکھی تو گھبرا گئیں۔ فوراً ڈرائیور کے ساتھ انہیں ڈاکٹر کے پاس بھیجا اور آرام کرنے کی ہدایت کی۔ اس دن میں نے اکیلے ہی سارے کام نمٹائے۔ صاحب جی سے بھی سامنا ہوا۔ ان کی نگاہوں میں وہی وارفتگی تھی۔ اس روز میں نے پھول دار چست قمیص پہن رکھی تھی جس میں میرا ابھرا ابھرا بدن اور نمایاں ہوگیا تھا۔ انہوں نے ایک بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا اور کمرے سے باہر چلے گئے تاکہ میں اپنا کام کرسکوں۔

ان کے جانے کے بعد میں نے دوپٹا اتار کر کرسی پر رکھا اور جھاڑ پونچھ میں مشغول ہوگئی۔ کام کے دوران میرا دھیان صاحب جی کی جانب لگا رہا۔ دل میں ایک خواہش ابھری کہ کاش وہ آجائیں اور مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کریں۔ خدا جانے انہوں نے ایک ہی دن میں مجھ پر کیا جادو کردیا تھا کہ میں مسلسل انہی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پھر میرے خیالات کی رو بہک گئی اور میں نے کسی اور انداز میں سوچنا شروع کردیا۔ اگر صاحب جی مجھ سے شادی کرلیں تو کتنا مزہ آئے۔ میں ہمیشہ کے لیے غربت کے ماحول سے نکل آؤں گی۔ میرے پاس بہت سا پیسا ہوگا۔ خوب عیش کروں گی۔ بڑے صاحب اور مالکن کا کیا ہے۔ وہ دونوں کتنا عرصہ زندہ رہیں گے۔ ان کے بعد تو سب کچھ میرا ہی ہوگا۔

لیکن صاحب جی مجھ سے کیوں شادی کریں گے۔ انہیں ایک سے ایک امیر اور خوب صورت لڑکی مل سکتی ہے اور کیا پتا ان کی منگنی ہوگئی ہو یا کسی کے ساتھ افیئر چل رہا ہو خیر یہ معلوم کرنا کون سا مشکل کام ہے۔ اگر وہ ابھی تک سنگل ہیں تو انہیں اپنی طرف مائل کرنا کچھ مشکل نہیں۔ مجھ میں کیا کمی ہے۔ لاکھوں سے بہتر ہوں اور مجھے یقین تھا کہ صاحب جی پہلی نظر میں گھائل ہو چکے ہیں۔ ورنہ امیر گھروں کے لڑکے نوکرانیوں کو کہاں منہ لگاتے ہیں اور اگر انہوں نے ابھی تک میرا نوٹس نہیں لیا تو انہیں اپنی طرف مائل کرنے کے لیے مجھے کچھ مخصوص حربے استعمال کرنا ہوں گے۔ ایک دو کوششوں میں ہی پتا چل جائے گا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔

سب سے اوپر والے خانے تک میرا ہاتھ نہیں پہنچ رہا تھا۔ چنانچہ میں اسٹول پر کھڑے ہو کر کتابیں صاف کرنے لگی۔ اچانک میرے کانوں میں ٹپ ٹپ کی آواز آئی۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو بارش ہو رہی تھی۔ میں نے بے اختیار گنگنانا شروع کردیا۔ آئے موسم رنگیلے سہانے۔ جیا نہیں مانے۔ تو چھٹی لے کے آجا بالما۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اسٹول پر کھڑے کھڑے رقص کے انداز میں ہاتھ ہلانا شروع کردیے حالانکہ میں نے کبھی زندگی میں کوئی فلم نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی مجھے اس گانے کی سچویشن کا پتا تھا لیکن جب دل بے ایمان ہو رہا ہو تو انسان سے ایسی ہی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں۔ میں نہ جانے کتنی دیر تک بے خودی کے عالم میں اسٹول پر کھڑے ہو کر رقص کرتی رہی پھر اچانک ہی میرا توازن بگڑ گیا اور اس سے پہلے کہ میں نیچے گرتی۔ دو مضبوط بازوؤں نے آگے بڑھ کر مجھے تھام لیا۔

وہ صاحب جی تھے جو نہ جانے کب سے میرے پیچھے کھڑے ہوئے یہ شو دیکھ رہے تھے۔ اس وقت میری بہت ہی عجیب پوزیشن تھی۔ میں دوپٹے کے بغیر ایک اجنبی کی بانہوں میں اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کررہی تھی۔ وہ مجھ پر جھکے ہوئے تھے اور ہمارے درمیان صرف چند انچ کا فاصلہ تھا۔ میں اس سچویشن سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھی کہ اچانک ہی وہ سنبھل گئے اور انہوں نے مجھے اپنے بازوؤں کی قید سے آزاد کردیا۔ مجھے یوں لگا کہ کسی فلم کے رومانی سین پر سنسر نے قینچی چلادی ہو۔

''یہ کیا کررہی تھیں تم؟'' وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولے۔

''کچھ نہیں۔'' میں نے کرسی پر سے دوپٹا اٹھایا اور

گلے میں ڈالتے ہوئے بولی۔ ’’اچانک ہی بارش ہوگئی تو میں نے بے اختیار ہوکر گنگنانا شروع کردیا۔ بس اتنی سی بات تھی۔‘‘

’’یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔‘‘ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ ’’اگر تم اسٹول سے گر جاتیں تو کولہے کی ہڈی میں فریکچر ہوسکتا تھا۔ اُمید ہے کہ آیندہ تم احتیاط کروگی۔‘‘

’’جی بالکل۔‘‘ میں نے ان کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ ’’آپ کے لیے چائے بناؤں۔‘‘

’’رہنے دو۔ میں خانساماں سے کہہ دوں گا۔‘‘

’’خانساماں آج چھٹی پر ہے۔ چائے بنانے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ میں ابھی لے کر آئی۔‘‘

باورچی خانے میں آکر میں نے چائے کا پانی چولہے پر رکھا اور اس کے ساتھ ہی پکوڑیوں کے لیے بیسن گھولنے بھی بیٹھ گئی۔ میں بہت تیزی سے کام کرتی تھی۔ پندرہ منٹ کے اندر ہی میں نے پکوڑیاں تل کر ٹرے میں رکھیں۔ ساتھ ہی کیچپ کی بوتل لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوگئی۔ وہ گرم گرم پکوڑے دیکھ کر خوش ہوگئے اور بولے۔ ’’واہ تم نے تو برسات کا مزہ دوبالا کردیا۔‘‘

میں دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ’’آپ نے سنا نہیں کہ دل تک پہنچنے کا راستہ معدے سے ہوکر گزرتا ہے۔‘‘

’’واہ۔‘‘ وہ ایک پکوڑی منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔ ’’باتیں تو تم پڑھے لکھوں جیسی کرتی ہو۔ کتنی تعلیم ہے تمہاری؟‘‘

’’مشکل سے دسویں پاس کرسکی ہوں۔‘‘ میں آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے بولی۔ ’’ہمارے یہاں آگے پڑھنے کا رواج نہیں ہے۔‘‘

’’کیوں؟ تعلیم تو ہر شخص کا بنیادی حق ہے اور مجھے لگتا ہے کہ تمہیں پڑھنے کا شوق بھی ہے۔‘‘

’’شوق سے کیا ہوتا ہے جی۔‘‘ میں نے رونی صورت بناتے ہوئے کہا۔ ’’میرے والدین کہتے ہیں کہ لڑکیوں نے پڑھ لکھ کر کیا کرنا ہے انہیں تو ساری عمر ہانڈی روٹی ہی کرنا ہوتی ہے۔‘‘

’’بہت ہی دقیانوسی سوچ ہے۔‘‘ وہ تھوڑا سا ناراض ہوتے ہوئے بولے۔ ’’خیر اگر تم آگے پڑھنا چاہتی ہو تو میں تمہیں پڑھاؤں گا۔‘‘

’’آپ مجھے پڑھائیں گے؟‘‘ میں خوش ہوتے ہوئے بولی۔

’’ہاں اس میں مجھے کون سا ہاتھی بیل جوتنا ہے۔ اگر تم ایک گھنٹا بھی باقاعدگی سے میرے پاس بیٹھ کر پڑھ لو تو آسانی سے پرائیویٹ امتحان دے سکتی ہو۔‘‘

میں نے فوراً ہامی بھر لی۔ صاحب جی سے قریب ہونے کا اس سے اچھا موقع اور کیا ہوسکتا تھا۔ بلکہ مجھے یوں لگا کہ شاید وہ بھی میری قربت کا بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔ ورنہ کون کسی نوکرانی کے لیے اپنا وقت ضائع کرتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں خوشی سے سرشار ہوگئی اور شرماتے ہوئے بولی۔ ’’ٹھیک ہے آپ اماں سے بات کرلیں۔ اگر وہ اجازت دیتی ہیں تو میں کل سے ہی پڑھائی شروع کردوں گی۔‘‘

اس دن میں شام کو کام سے واپس آئی تو سلیم کو اپنا منتظر پایا۔ ارشد بھائی سہ روزہ اجتماع میں گئے ہوئے تھے۔ اس لیے اس نے موقع غنیمت جانا اور ہمارے گھر چلا آیا۔ اماں کا تو ایک بہانہ تھا۔ دراصل وہ میرے دیدار کی آس لے کر آیا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں اسے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھتی لیکن اس روز نہ جانے کیوں مجھے اس کا آنا اچھا نہیں لگا۔ میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ اسے دیکھ کر میں اپنے کمرے میں چلی گئی کیونکہ ہمارے گھر میں دو ہی کمرے تھے۔ ایک میں ابا دونوں بھائیوں کے ساتھ سوتے اور دوسرا کمرا اماں اور ہم دونوں بہنوں کے لیے وقف تھا۔ لہٰذا میں اسی کمرے میں اماں کی پائنتی سے لگ کر بیٹھ گئی۔ مجھ خاموش دیکھ کر اماں نے خود ہی موضوع چھیڑ دیا۔

’’سلیم کی نوکری لگ گئی ہے۔ مٹھائی لے کر آیا ہے۔ میری طبیعت ٹھیک ہو جائے تو جاؤں گی آپی کو مبارک دینے۔‘‘

مجھے معلوم تھا کہ سلیم نے چند ماہ قبل ہی انجینئرنگ میں ڈپلوما کیا تھا اور بڑی شدت سے جاب کی تلاش میں تھا۔ میں نے بے رخی سے کہا۔ ’’مبارک ہو، تنخواہ کتنی ملے گی؟‘‘

اسے شاید اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ وہ تو سمجھ رہا ہوگا کہ میں اس کی جاب کی خبر سن کر خوشی سے اچھل پڑوں گی اور فوراً اس کے لیے چائے کے ساتھ دیگر لوازمات کا اہتمام کروں گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ تب وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ ’’فی الحال پندرہ ہزار ملیں گے لیکن انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ چھ ماہ بعد میری تنخواہ میں اضافہ کردیں گے۔‘‘

’’اونہہ! کس نے دیکھے ہیں چھ مہینے۔ شروع میں

سب ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ بعد میں کسی کو یاد بھی نہیں رہتا۔ بہت ہوا تو سالانہ انکریمنٹ کے نام پر ہزار پانچ سو کا اضافہ ہو جائے گا۔ میری مانو تو سال دو سال بعد باہر چلے جاؤ۔ یہاں تو تم یونہی گھسیٹ کر آگے بڑھتے رہو گے۔"

"جب وقت آئے گا تو اس بارے میں ضرور سوچوں گا۔ فی الحال تو مجھے یہیں رہ کر کچھ تجربہ حاصل کرنا ہے۔" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اب تم جلدی سے اچھی سی چائے پلواؤ پھر میں چلتا ہوں۔"

"ارے تم اتنی دیر سے آئے بیٹھے ہو اور تمہیں کسی نے چائے کو بھی نہیں پوچھا۔"

"خالہ تو کہہ رہی تھیں لیکن میں نے ہی منع کر دیا۔ سوچا کہ تم آ جاؤ پھر چائے پئیں گے۔ میں مٹھائی کے ساتھ سموسے اور جلیبیاں بھی لایا ہوں۔"

میں چائے بنانے گئی تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آ گیا اور بڑے رومانٹک انداز میں بولا۔ "لگتا ہے کہ تمہیں جاب ملنے کی خبر سن کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔"

"اگر تم مطمئن ہو تو۔" میرے خوش ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔" میں نے رکھائی سے جواب دیا۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ پہلے تو تم نے کبھی ایسا رویہ اختیار نہیں کیا۔" وہ مایوس ہوتے ہوئے بولا۔

"پہلے نہ سمجھ تھی۔ اب آہستہ آہستہ بہت سی باتوں کی سمجھ آ رہی ہے۔" میں نے تنک کر کہا۔ "تم اماں کے پاس بیٹھو۔ میں چائے لے کر آتی ہوں۔"

میری بے رخی سے اس کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے جیب سے چوڑیوں کا پیکٹ نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "یہ میں تمہارے لیے لایا تھا۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ میں چوڑیاں نہیں پہنتی لیکن خیر تمہارا دل رکھنے کے لیے پہن لوں گی۔"

"شکریہ۔" وہ خوش ہوتا ہوا چلا گیا اور مجھے اس کی حماقت پر ہنسی آنے لگی۔ بے چارہ مڈل کلاسیا۔ میرے لیے کانچ کی چوڑیاں ہی لا سکتا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ کچھ عرصہ بعد میں سونے کی پہاڑ پر بیٹھنے والی ہوں۔

اس کے جانے کے بعد اماں نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ تیری خالہ بہت جلد سلیم کے لیے تیرا رشتہ مانگنے والی ہیں۔ وہ پہلے بھی مجھ سے اشارتاً یہ بات کہہ چکی ہیں لیکن آج سلیم کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ بھی تجھ میں دلچسپی لے رہا ہے۔"

"اماں! تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ یہ یک طرفہ ٹریفک مجھے قبول نہیں۔ اگر وہ مجھ میں دلچسپی لے رہا ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں بھی اس رشتے کے لیے تیار ہو جاؤں۔"

"کیا مطلب ہے تیرا؟" یہ آج تو کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں اماں۔ میں اس جنجال پورہ میں جا کر اپنی زندگی برباد کرنا نہیں چاہتی۔ گھر دیکھا ہے ان کا۔ دو کمروں کا کابک ہے جس میں چھ افراد پہلے ہی رہ رہے ہیں۔ ساتویں کی جگہ کہاں سے نکالیں گے۔"

"پھر کیا تیرے لیے کوہ قاف سے کوئی شہزادہ آئے گا؟"

"کیا پتا آ ہی جائے۔ آدمی کو ہمیشہ اچھی اُمید رکھنی چاہیے۔ ویسے کوہ قاف جانے کی ضرورت نہیں۔ اس شہر میں بھی بہت سے شہزادے ہیں۔ بس دیکھنے والی نظر ہونی چاہیے۔"

اماں ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولیں۔ "چار جماعتیں پڑھ کر تیرا دماغ بالکل ہی خراب ہو گیا ہے۔ ارشد اسی لیے عورتوں کی تعلیم کے خلاف ہے۔"

"وہ تو پاگل ہے اور چاہتا ہے کہ ساری دنیا اس کی طرح پاگل ہو جائے۔"

اگلے دن کام پر گئی تو صاحب جی میرے لیے فرسٹ ایئر کی کتابوں کا کورس لے آئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے انرولمنٹ فارم بھی بھرایا اور بولے۔ "بس اب تم سنجیدگی سے پڑھائی شروع کر دو۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے اندر کوئی کمی رہ جائے۔"

ان کی یہ بات سن کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کا مطلب ہے کہ انہیں میری غربت کی نہیں بلکہ تعلیم کی فکر تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ان کے شانہ بشانہ چل سکوں۔ میں نے اسی وقت تہیہ کر لیا کہ ان کی خواہش ضرور پوری کروں گی۔ چاہے اس کے لیے مجھے دنیا بھر کی مخالفت مول لینا پڑے۔ سب سے زیادہ خطرہ مجھے ارشد کی طرف سے تھا۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ میں فرسٹ ایئر کے امتحان کی تیاری کر رہی ہوں تو وہ میرا جینا حرام کر دیتا لیکن صاحب جی کی وجہ سے مجھ میں اتنی ہمت آ گئی تھی کہ میں نے اس کا مقابلہ کرنے کا بھی فیصلہ کر لیا۔

صاحب جی نے نہ جانے اپنی ماں کو کیا پٹی پڑھائی کہ انہوں نے بھی میری پڑھائی پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ بخوشی اجازت دے دی۔ البتہ اماں اس کے حق میں نہیں تھیں۔ پہلے تو انہوں نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ لڑکی ذات کو پڑھ لکھ کر کیا کرنا ہے۔ اب تو اسے گھرداری کے کاموں میں دلچسپی لینا چاہیے تاکہ یہی چیز آگے چل کر اس کے کام آئے لیکن صاحب جی نے انہیں بھی کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا۔ البتہ اماں نے سختی سے مجھے تاکید کر دی کہ گھر میں کسی کو اس بات کا پتا نہیں چلنا چاہیے۔ خاص طور پر ارشد کو تو بالکل نہیں، ورنہ وہ میرا گھر سے نکلنا بند کر دے گا۔

اس طرح پڑھائی کے بہانے مجھے صاحب جی سے قریب ہونے کا موقع مل گیا۔ اماں کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی اور انہوں نے کام پر جانا تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ اس طرح مالکن کے گھر کی پوری ذمے داری مجھ پر آ گئی۔ اب مجھے اکیلے کام پر جاتے ہوئے ڈر نہیں لگتا تھا۔ البتہ شام کو اگر دیر ہو جاتی تو بیگم صاحبہ اپنے ڈرائیور کے ساتھ مجھے گھر بھجوا دیتیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میرے دونوں بھائیوں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ اپنی دنیا میں مگن تھے۔ بڑے بھائی امجد نے اب ایک نیا دھندا شروع کیا تھا۔ اس نے چوری چکاری اور بھتہ خوری چھوڑ دی تھی اور کرائے کا سیاسی کارکن بن گیا تھا۔ اس کی وفاداریاں کسی ایک سیاسی جماعت کے ساتھ نہیں تھیں بلکہ وہ معاوضہ لے کر بھی سیاسی پارٹیوں کے لیے کام کیا کرتا۔ جلسے جلوسوں کے لیے پچاس ساٹھ آدمی اکٹھے کرنا، نعرے لگانا اور مخالف پارٹی کے جلسے خراب کرنا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ اس کی وجہ سے اس کی مقامی سطح کے عہدیداروں اور پولیس میں اچھی خاصی جان پہچان ہو گئی تھی اور وہ ان تعلقات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کروا دیتا۔ مثلاً کسی کا مکان یا دکان خالی کروانی ہے، کسی کے بچے کو کالج میں داخلہ کروانا ہے، کسی کا بجلی کا بل زیادہ آ گیا ہے تو اس کی قسطیں کروانی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس کے عوض اسے مٹھائی کے نام پر اچھی خاصی رقم مل جاتی۔ اس کی جیب ہمیشہ نوٹوں سے بھری رہتی لیکن ابا کے نزدیک اس کی یہ کمائی بھی ناجائز تھی۔ اس لیے وہ اس سے کچھ نہیں لیتے تھے اور نہ ہی اسے گھر میں کچھ خرچ کرنے کی اجازت تھی۔

چھوٹے بھائی ارشد کی وہی بے ڈھنگی چال تھی۔ اس نے شاید کوئی کام نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ وہ اپنا بیشتر وقت مسجد اور تبلیغی جماعت کے ساتھ گزارتا۔ حالانکہ وہ سب نیک اور پڑھے لکھے لوگ تھے اور دین کے ساتھ دنیا کے کام بھی کرتے تھے جب کہ ارشد کو لوگوں کی عیب جوئی اور تنقید کرنے سے ہی فرصت نہیں تھی۔ اسے اپنی کمی کبھی نظر نہیں آئی تھی البتہ ان کی برائیوں پر اس کی نظر خود آ جاتی۔ عورتوں کا تو وہ دشمن تھا۔ اس کے خیال میں ساری برائیوں کی جڑ عورت ہی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ لڑکیوں کی پیدائش پر ہی پابندی لگا دیتا لیکن اسے ماں اور بہن کی کمائی کھاتے

ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آتی تھی۔
ایک دن مالکن کی طبیعت خراب تھی لیکن انہیں مہینے کا سودا خریدنے کے لیے سپر اسٹور جانا تھا کیونکہ گھر میں سب چیزیں ختم ہوگئی تھیں۔ انہوں نے صاحب جی کو سامان کی فہرست پکڑائی اور کہا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں کیونکہ میں ہی کچن کا سارا کام کرتی تھی اور مجھے چیزوں کی پہچان تھی۔ اس لیے میں دیکھ بھال کر خریداری کرسکوں گی۔ میں خوشی خوشی صاحب جی کے ساتھ چلی گئی۔ اس سپر اسٹور کو دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہاں دنیا بھر کی چیزیں تھیں۔ میرے بس میں ہوتا تو سب خرید لیتی۔ خیر میری فہرست بھی خاصی طویل تھی۔ ان چیزوں کی خریداری میں دو تین گھنٹے لگ گئے۔ جب ہم وہاں سے چلنے لگے تو صاحب جی نے چاکلیٹ کے کئی پیکٹ خریدے اور مجھے پکڑاتے ہوئے بولے۔ ''یہ تمہارے لیے ہیں۔''
وہ بہت قیمتی چاکلیٹ تھے اور میں انہیں لیتے ہوئے ہچکچا رہی تھی کہ اگر ان کی عادی ہوگئی تو دوبارہ کہاں سے خریدوں گی۔ صاحب جی نے شاید میرے چہرے پر لکھی تحریر پڑھ لی اور بولے۔ ''فکر مت کرو ختم ہوگئے تو اور لا دوں گا۔''
واپسی میں صاحب جی نے ایک ریستوران کے سامنے گاڑی روکی اور بولے۔ ''بہت تھکن ہوگئی ہے کچھ دیر بیٹھ کر ستا لیں۔''
ریستوران کا ماحول بہت رومان پرور اور خوابناک تھا۔ زیادہ تر میزیں خالی پڑی ہوئی تھیں۔ البتہ کہیں کہیں کچھ جوڑے بیٹھے راز و نیاز میں مصروف تھے۔ انہوں نے ایک الگ تھلگ گوشے میں میز منتخب کی اور ویٹر کو اشارہ کرنے سے پہلے بولے۔ ''کیا لوگی؟''
میں پہلی بار اتنے بڑے ریستوران میں آئی تھی۔ اس لیے میرے حواس قابو میں نہ تھے۔ حیرت سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی۔ بمشکل اتنا ہی کہہ سکی۔ ''آپ جو چاہیں منگوا لیں۔''
انہوں نے چائے اور سینڈوچز کا آرڈر دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''تم خوب صورت اور حسین ہونے کے ساتھ سلیقہ مند بھی ہو۔ آج تم نے جس مہارت اور ہوشیاری سے شاپنگ کی ہے۔ اسے دیکھ کر میں بھی تمہاری ذہانت کا قائل ہوگیا۔ تمہیں تو کسی بڑے گھر میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔''
جی میں آیا کہہ دوں کہ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ آپ مجھے بڑے گھر کی بہو بنا لیں پھر میری ذہانت اور سلیقہ مندی دیکھیں لیکن میں اپنے منہ سے یہ بات نہیں کہہ سکتی تھی۔ بس انتظار کرتی رہی کہ وہ کب پہل کرتے ہیں لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ چائے ختم کرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔ ''چلو بھئی بہت دیر ہوگئی۔ مجھے ابھی بہت سا کام کرنا ہے۔''
مجھے ان کی سرد مہری پر بڑا غصہ آیا۔ اتنا اچھا موقع ملا تھا اظہارِ محبت کا جسے انہوں نے گنوا دیا خیر میں بھی دیکھتی ہوں کہ کب تک بچتے ہیں۔ انہیں اپنی محبت کے جال میں پھانس کر ہی دم لوں گی۔ اس دن کے بعد میں ان سے مزید قریب ہونے کے بہانے ڈھونڈنے لگی۔ پڑھائی کے لیے تو دو گھنٹے مخصوص تھے ہی اس کے علاوہ دن میں دس چکر ان کے کمرے کے لگاتی۔ کبھی چائے کبھی پانی کبھی شربت کے بہانے۔ بعض اوقات وہ کھانا بھی اپنے کمرے میں منگوا لیتے۔ اس دوران میں مستقل ان کے پاس بیٹھی رہتی۔ بڑی بیگم صاحبہ زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی تھیں۔ اس لیے انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ میں کیا گل کھلا رہی ہوں۔
صاحب جی کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی تھیں۔ میرا دل چاہتا کہ بس ہر وقت ان کے پاس بیٹھی رہوں اور وہ بھی مجھ سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈتے رہتے۔ انہوں نے گھر میں انٹرکام لگوا لیا تھا۔ جب میں کچن میں ہوتی تو وہ اس کے ذریعے مجھے بلا لیتے۔ انہیں سینکڑوں اشعار یاد تھے۔ بات بات پر شعر پڑھتے۔ ان میں عشقیہ اشعار زیادہ ہوتے۔ بات بات پر میرے حسن کی تعریف کرتے جسے سن کر میں جھوم اٹھتی۔ میں نے بھی انہیں لبھانے اور رجھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ فٹنگ والی قمیصیں پہننا شروع کردیں۔ جن سے میرا انگ انگ نمایاں ہوجاتا۔ اکثر بغیر دوپٹے کے ہی ان کے سامنے چلی جاتی اور ان کی پُرشوق نگاہیں برمے کی طرح میرے جسم کے آر پار ہوتی رہتیں۔
اب مجھے صرف اس دن کا انتظار تھا جب وہ اپنی زبان سے اقرارِ محبت کرلیں۔
ایک دن سلیم، ارشد بھائی کی غیر موجودگی میں ہمارے گھر آیا اور اس نے یہ خبر سنائی کہ مالکوں نے حسب وعدہ اس کی تنخواہ میں پانچ ہزار کا اضافہ کردیا ہے۔ مجھے یہ

بات سن کرہنسی آگئی۔ اتنے پیسوں کی شاپنگ تو صاحب جی ایک دفعہ میں کرلیتے تھے۔ پھر بھی میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے مبارکباد دی اور کہا کہ وہ اس ملازمت پر قناعت نہ کرے اور باہر جانے کے لیے کوشش کرتا رہے۔ آج کل بیس ہزار میں کیا ہوتا ہے۔ اس نے میری بات سنی ان سنی کردی اور بڑے رومانٹک انداز میں بولا۔ ''اماں کو کب بھیجوں؟''

''وہ کس لیے؟'' میں نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے کہا۔

''اپنے اور تمہارے رشتے کی بات پکی کرنے کے لیے۔''

''لیکن میرا تو ابھی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہوں سلیم۔'' میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم ہمارے گھر کے حالات سے اچھی طرح واقف ہو۔ زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے مجھے دوسروں کے گھروں میں کام کرنا پڑ رہا ہے۔ میری کوشش ہے کہ گریجویشن کرلوں تاکہ مجھے کوئی اچھی ملازمت مل جائے۔''

''لیکن تم نے تو میٹرک کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ گریجویشن کیسے کروگی؟''

اب میرے لیے ضروری ہوگیا تھا کہ اسے بھی اس راز میں شریک کرلوں۔ میں نے اسے اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔ ''جس گھر میں کام کرتی ہوں وہ لوگ مجھے پڑھا رہے ہیں۔ دو مہینے بعد انٹر کا امتحان دوں گی۔ اس کے بعد اللہ نے چاہا تو گریجویشن بھی ہوجائے گا لیکن یہ بات صرف اماں کو معلوم ہے اگر ارشد بھائی کو پتا چل گیا تو وہ میرا گھر سے نکلنا بند کردیں گے۔''

''لیکن تم کب تک یہ بوجھ اٹھاؤ گی۔ یہ ذمے داری تو تمہارے بھائیوں کی ہے۔''

''اگر وہ اس قابل ہوتے تو رونا کس بات کا تھا۔ بہرحال تم میرا خیال دل سے نکال دو۔ میں اپنے ماں باپ اور چھوٹی بہن کو بیچ منجدھار میں چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔''

''تم اکیلی نہیں ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ہم مل کر یہ بوجھ بانٹ لیں گے۔''

''جذباتی باتیں مت کرو۔ چار بہنیں ہیں تمہاری۔ ان کی شادیاں کرتے کرتے ہی بوڑھے ہوجاؤ گے میرا بوجھ کس طرح بانٹ سکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں انتظار کروں گا۔ تم نہیں تو کوئی بھی نہیں۔ جب اپنی ذمے داریوں سے فارغ ہوجاؤ تو بتا دینا، میں برات لے کر آجاؤں گا۔''

میں جانتی تھی کہ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ خالہ زیادہ دیر انتظار نہیں کریں گی اور جلد یا بدیر اس کا رشتہ کہیں ہو جائے گا۔ خیر مجھے کیا۔ میں نے تو اپنے خیالوں میں صاحب جی کو بسا رکھا تھا اور شدت سے اس دن کا انتظار کررہی تھی جب وہ مجھ سے اپنے دل کی بات کہیں۔ اشاروں اشاروں میں تو وہ بہت کچھ کہہ چکے تھے لیکن ان کی زبان ابھی تک خاموش تھی۔ ممکن ہے کہ وہ میری پڑھائی ختم ہونے کا انتظار کررہے ہوں۔

ایک دن ڈرائیور چھٹی پر تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ نے صاحب جی سے کہا کہ وہ مجھے گھر چھوڑ آئیں۔ میں یہ سنتے ہی خوشی سے جھوم اٹھی۔ مجھے ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے کا بہت ارمان تھا لیکن اس کا موقع ایک آدھ دفعہ ہی ملا۔ اس کے علاوہ یہ بھی اُمید تھی کہ ہوسکتا ہے۔ صاحب جی تنہائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دل کی بات زبان پر لے آئیں۔ کچھ دور جانے کے بعد انہوں نے گاڑی ایک آئس کریم پارلر کے سامنے روک لی اور بولے۔ ''آئس کریم کھاؤ گی؟''

میں تو ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہ رہی تھی۔ اس لیے فوراً ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔ انہوں نے آئس کریم منگوائی اور بولے۔ ''انٹر کا امتحان دینے کے بعد کیا ارادہ ہے۔''

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور مجھے یقین ہونے لگا کہ جس لمحے کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔ وہ بس آیا ہی چاہتا۔ میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ''میں تو گریجویشن کرنا چاہتی ہوں لیکن پتا نہیں آگے چل کر کیا حالات ہوں۔''

''تمہاری کہیں بات تو طے نہیں ہوئی؟'' وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے تو میرا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا اور میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ یہی کہیں گے اگر میں تمہیں پرپوز کروں۔

اس کے بجائے انہوں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے اگر تم آگے پڑھنا ہی چاہتی ہو تو میں تمہاری پوری مدد کروں گا۔ مجھے اپنی

لڑکیاں اچھی لگتی ہیں جن میں آگے بڑھنے کی لگن ہو۔"

مجھے ان پر شدید غصہ آیا۔ ایک بار پھر انہوں نے اپنی بات کہنے کا موقع گنوا دیا تھا۔ نہ جانے انہیں یہ اندازہ کیوں نہیں تھا کہ میں ان کی زبان سے کیا سننا چاہتی ہوں۔ وہ کون سی مصلحت تھی جس نے انہیں روک رکھا تھا۔ شاید انہیں جلدی نہیں تھی۔ وہ ٹھنڈا کر کے کھانے کے عادی تھے لیکن مجھ سے انتظار نہیں ہو رہا تھا اور میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر انہوں نے منہ نہ کھولا تو میں ہی بے شرم بن کر حرفِ مدعا زبان پر لے آؤں گی۔

لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کچھ دنوں بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ میرے سارے خواب اور ارمان بکھر کر رہ گئے۔ ہوا یوں کہ بڑی بیگم کی بھانجی سعدیہ امریکا سے چھٹیاں گزارنے پاکستان آئی تو اس نے یہیں قیام کیا۔ چند روز بعد اس کے والدین بھی آنے والے تھے لیکن بیٹی کو انہوں نے پہلے ہی بھیج دیا تاکہ اس کی چھٹیاں ضائع نہ ہوں اور وہ اچھی طرح گھوم پھر لے۔ بیگم صاحبہ نے مجھے خاص طور پر اس کا خیال رکھنے کی تاکید کی تھی لیکن وہ مجھے بالکل بھی پسند نہیں آئی۔ دیکھنے میں ہی انتہائی مغرور، نک چڑھی اور بدمزاج معلوم ہوتی تھی۔ وہ مجھ سے بھی انتہائی تحکمانہ انداز میں بات کرتی تھی لیکن میں یہ سوچ کر برداشت کرتی رہی کہ چلو دو مہینے کی تو بات ہے۔ اس کے بعد یہ واپس چلی جائے گی تو میرا ہی اس گھر راج ہوگا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں ایسا خواب دیکھ رہی ہوں جس کی کوئی تعبیر نہیں۔

اس کے آنے کے بعد صاحب جی نے مجھے منہ لگانا چھوڑ دیا تھا۔ اب نہ تو وہ مجھ سے کسی کام کے لیے کہتے اور نہ ہی مجھے پڑھاتے۔ ان کا سارا وقت سعدیہ کے ساتھ ہی گزرتا۔ وہ دونوں دن بھر گھومتے اور رات گئے ان کی واپسی ہوتی۔ یہ صورتِ حال میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ میں سعدیہ کو اپنا رقیب سمجھنے لگی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ جلد از جلد واپس چلی جائے لیکن اس وقت تو اس کے والدین بھی نہیں آئے تھے۔ ان کے آنے کے بعد ہی اس کی واپسی کا پروگرام بنتا۔

ان دنوں بیگم صاحبہ بہت مصروف رہنے لگیں۔ وہ اکثر شاپنگ کے لیے چلی جاتیں اور پھر ان کی واپسی دیر سے ہوتی۔ ایک دن وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئیں اور بولیں۔ "تم بھی اپنے لیے دو جوڑے بنوا لو۔ ورنہ شادی میں کیا پہنو گی۔"

"کس کی شادی ہو رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سعدیہ اور راشد کی۔ تمہیں نہیں معلوم۔ میں تو سمجھی تھی کہ راشد نے تمہیں بتا دیا ہوگا۔ بس سعدیہ کے ماں باپ آ جائیں تو تاریخ طے کر کے ان کا نکاح پڑھوا دیتی ہوں۔"

اس کے آگے مجھ سے کچھ نہیں سنا گیا۔ میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ لگتا تھا کہ میں سننے کی صلاحیت سے محروم ہو چکی ہوں۔ جیسے تیسے کر کے شاپنگ کی اور طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے گھر چلی آئی۔ جی چاہ رہا تھا کہ خوب دھاڑیں مار مار کر روؤں لیکن اس گھر میں تو رونے کے لیے بھی جگہ نہیں تھی۔ رات بھر بستر پر لیٹی اپنی قسمت کا ماتم کرتی رہی۔ مجھے رہ رہ کر راشد پر غصہ آ رہا تھا وہ بھی عام مردوں کی طرح ہرجائی نکلا لیکن اس کا بھی کیا قصور تھا۔ اس نے تو مجھ سے کبھی کوئی وعدہ نہیں کیا۔ ساتھ مرنے اور جینے کی قسمیں نہیں کھائیں۔ کبھی اقرارِ محبت نہیں کیا، پھر میں اسے کیوں کوس رہی تھی۔ اس کا قصور صرف یہ تھا کہ اس نے میرا خیال رکھا۔ میری محرومیاں دور کرنے کی کوشش کی۔ میری پڑھائی میں مدد کی۔ میری شخصیت کو نکھارنا چاہتا تھا۔ اس نے تو کبھی تنہائی میں مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش بھی نہیں کی۔ یہ میں ہی تھی جو پہلی نظر میں اس پر ریجھ گئی۔ اسے اپنا بنانے کے لیے خود کو نمایاں کیا۔ اسے اپنی اداؤں سے رجھانے کی کوشش کرتی رہی۔ میں بڑے گھر کی بہو بننے کا خواب دیکھ رہی تھی جس کی تعبیر اتنی بھیانک نکلی۔

ساری صورتِ حال کا تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ اس میں راشد کا کوئی قصور نہیں تھا بلکہ یہ سب میرا اپنا کیا دھرا تھا۔ میں نے اپنی محرومیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے اونچی چھلانگ لگانے کی کوشش کی اور منہ کے بل آن گری۔ اب مجھے احساس ہو گیا کہ زمین پر رینگنے والے کیڑے کبھی آسمان تک نہیں پہنچ سکتے۔ انہیں زمین ہی پناہ دیتی ہے اور میری پناہ گاہ بھی سلیم کا گھر تھا۔ چنانچہ میں نے صبح اٹھتے ہی اماں سے کہہ دیا کہ وہ خالہ کو رشتے طے کرنے کے لیے بلا لیں کیونکہ صاحب جی نے مجھے میری اوقات یاد دلا دی تھی۔

بہنیں

مدیر اعلیٰ سرگزشت
السلام علیکم
کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جو ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔ رفعت اور نزہت کی زندگی بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ جب سے سنا ہے اسے قلمبند کرنے کو دل مچل رہا ہے۔ مختصر انداز میں ان کے واقعات کو سچ بیانی کے انداز میں لکھ دیا ہے۔ یقیناً آپ کو بھی پسند آئے گی۔

مزمل سلیم
(تاندلیانوالہ ---- فیصل آباد)

''اتنا بڑا گھر؟'' رفعت کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''آؤ اندر آجاؤ رفعت۔'' نزہت نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''یہ دیکھو یہ تمہارا کمرا ہے۔'' نزہت اسے ایک خوب صورت کمرے میں لے آئی۔

''ہائیں اتنا بڑا کمرا؟ باجی اس میں اور کون کون رہے گا؟''

رفعت کا معصوم سوال سن کر نزہت مسکرا دی۔ ''میری جان صرف تمہیں رہنا ہے، یہ صرف تمہارا کمرا ہے اور کون ہے ہمارا جو تمہارے ساتھ رہے گا۔'' آخری بات کرتے ہوئے نزہت افسردہ ہو گئی۔

''اچھا باجی یہ کیا ہے؟''

''یہ لیپ ٹاپ ہے۔''

''ہائیں وہ کیا ہوتا ہے؟'' رفعت نے عادت کے مطابق ''ہائیں'' کو لمبا کیا۔

''کمپیوٹر کا پتا ہے نا؟''

''ہاں وہ چاچے غفور کے بیٹے کے پاس تھا وہاں ہم گانے سنتے تھے۔''

"بس یہ کمپیوٹر کی جدید قسم ہے۔" نزہت نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
"اچھا تو کیا اس پر بھی میں گانے سنوں گی۔"
"ہاں سنا گانے مگر پہلے اسے استعمال کرنا سیکھ لینا۔"
"کون سکھائے گا؟"
"میں سکھاؤں گا جی، غلام حاضر ہے۔" مبشر کی انٹری ٹھیک وقت پر ہوئی تھی۔ رفعت نے اسے دیکھتے ہی جلدی سے دوپٹا ڈال کر دوسری طرف منہ کرلیا۔
"تمہیں کیا ہوا۔ شرما کیوں رہی ہو؟" نزہت نے حیرانگی سے پوچھا۔
"مامی کہتی ہیں غیر مردوں سے پردہ کرتے ہیں۔"
"مبشر غیر نہیں ہیں۔" نزہت نے کہا۔ "یہ مبشر رضا ہیں ہمارے جو چاچو لندن میں رہتے ہیں ان کے اکلوتے سپوت یعنی ہمارے کزن محترم۔"
"اچھا تو پہلے بتانا تھا نا۔" رفعت نے جلدی سے دوپٹا ہٹا کر سلام کیا۔
مبشر نے مسکرا کر سلام کا جواب دیا اور غور سے اس خوب صورت لڑکی کو دیکھا۔ سفید رنگت، گہری سیاہ آنکھیں اور سب سے بڑھ کر چہرے کی جاذبیت وہ معصومیت بھرے حسن کی تصویر تھی۔

☆......☆

نزہت اور رفعت احسان احمد کی بیٹیاں تھیں۔ نزہت آٹھ سال کی تھی جب رفعت پیدا ہوئی۔ رفعت کی پیدائش کے تیسرے دن ہی رضیہ کا انتقال ہوگیا۔ احسان کے لیے یہ غم بہت بڑا تھا۔ رفعت نومولود تھی اسے سنبھالنے کے لیے کسی عورت کی ضرورت تھی اس لیے اسے ماموں ممانی اپنے ساتھ گاؤں لے کر چلے گئے مگر نزہت شہر میں باپ ہی کے پاس رہی۔ احسان احمد کو بزنس سے کبھی مہینوں بعد ٹائم ملتا تو رفعت کو دیکھنے چلے جاتے۔ نزہت چھوٹی بہن کو بہت پیار کرتی تھی مگر ماموں ممانی نے ضد کرکے اسے اپنے پاس رکھا۔ نزہت اٹھائیس سال کی تھی اور ایم بی اے کرکے باپ کا بزنس سنبھال رہی تھی۔ جب احسان صاحب کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ چل بسے تو نزہت نے کمال حوصلے سے یہ غم جھیلا اور باپ کی ہدایت کے مطابق رفعت کو گاؤں سے شہر لے آئی۔ رفعت نے پرائیویٹ میٹرک کیا تھا۔ وہ ساری عمر گاؤں میں رہی تھی اس لیے اسے شہر کی زندگی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ بے حد سادہ طبیعت کی معصوم سی لڑکی تھی۔ جب کہ نزہت شہر کی پروردہ ہی نہیں بلکہ اپنا

بزنس بھی سنبھالتی تھی۔ وہ پوری بزنس میں دلچسپی لیتی بھی اس لیے کہ اس کے چاچو چاہتے تھے کہ اب وہ شادی کرلے مگر وہ یہ کہہ کر ٹال دیتی کہ ابھی نہیں۔ ذرا حالات سنبھل جائیں تب سوچوں گی۔ اب جب حالات معمول پر آگئے تھے تو وہ شادی کی بجائے بہن کو گاؤں سے لے آئی۔
رفعت گاؤں سے آتے ہی ہر چیز کے بارے میں سوال کررہی تھی اور نزہت اس کی حرکتوں اور باتوں پر کبھی ہنس پڑتی کبھی سمجھانے کی کوشش کرتی۔ اس نے آفس سے چھٹی لے رکھی تھی۔ آج وہ رفعت کے ساتھ شاپنگ مال میں آئی تھی۔ رفعت نے اتنی بڑی عمارت دیکھ کر "ہائیں" کی صدا بلند کی۔
نزہت بار بار اس کا دوپٹا منہ سے ہٹاتی مگر وہ جیسے ہی کسی لڑکے کو دیکھتی تو دوپٹا منہ پر ڈال لیتی۔ نزہت نے ایک مہنگا اور خوب صورت ڈریس اس کے لیے پسند کیا۔ رفعت نے پرائس ٹیگ پر جب قیمت دیکھی تو فوراً بولی۔ "باجی نہیں لینا یہ، اتنا مہنگا۔ اتنی قیمت میں تو میرے تین چار اچھے سوٹ آجاتے ہیں۔"
"مگر یہ بہت خوب صورت ہے تم پر بہت جچے گا۔"
"ہاں مگر یہ جو دکاندار ہے اس کی شکل ماموں کے مرغے جیسی ہے، وہ میری مرغیوں کو مارتا تھا مجھے نہیں لینا اس سے۔"
نزہت اس کی بات پر ہنس پڑی اس نے قیمت ادا کرکے ڈریس خرید لیا۔
"باجی اتنی فضول خرچی نہ کریں مجھ پر۔"
"ان پیسوں پر تمہارا بھی حق ہے آئندہ ایسی بات کی تو میں تم سے ناراض ہوجاؤں گی۔"
"اچھا باجی اب نہیں کہوں گی مگر ناراض نہ ہونا، لو کان پکڑ لیے۔" رفعت نے جلدی سے کان پکڑے۔
نزہت کو اس پر بے تحاشا پیار آیا۔ اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور آنکھوں میں آئی نمی صاف کی۔ شاپنگ کے بعد وہ ہوٹل میں آئیں۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ بار بار رفعت کو سمجھاتی رہی۔ واپسی پر کار میں بیٹھتے ہوئے رفعت نے اچانک کہا۔ "باجی پانچ سو روپے دینا۔"
نزہت نے حیران ہوکر اسے دیکھا اور جلدی سے نوٹ نکال کر دے دیے۔ رفعت نے سو سو کے پانچ نوٹ پکڑے اور گاڑی سے اتر کر تھوڑی دور بیٹھے ایک فقیر کو وہ پیسے دیے جب وہ پیسے دے رہی تھی تو اس نے نزہت کی طرف اشارہ کرکے فقیر کو کچھ کہا بھی تھا۔
"ابھی تو مجھے فضول خرچی سے روک رہی تھی اور خود فقیر کو اتنے پیسے دے دیے؟" نزہت نے پوچھا۔

"میں نے اسے پیسے دے کر کہا دعا کرو میری باجی ہمیشہ خوش رہے۔" رفعت نے خوش ہو کر اسے بتایا۔
نزہت حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ گھر واپس آکر اس نے رفعت کو اپنے پاس صوفے پر بٹھایا اور پوچھا۔ "تم ساری زندگی مجھ سے دور رہی ہو پھر بھی اتنا پیار کیوں ہے؟"
"پتا ہے باجی جب آپ گاؤں آتی تھیں اور میں چھوٹی سی تھی آپ میرے لیے ڈھیروں چیزیں لاتی تھیں۔ گاؤں کی دوست پوچھتی تھی، کون لایا ہے تو میں فخر سے بتاتی میری باجی۔ آپ بچپن سے میرا مان ہیں، وہاں ساری بہنیں ایک دوسرے سے لڑتی ہیں پر آپ مجھے بہت پیار کرتی ہیں اس لیے اتنے سالوں کے فاصلے کے باوجود میری محبت آپ سے کم نہیں ہوئی مجھے پتا ہے آپ نے ابو کا بہت ساتھ دیا ہے اور ابو امی کی موت کا صدمہ مجھ سے زیادہ برداشت کیا ہے۔" بات کرتے ہوئے رفعت کے آنسو بہنے لگے اور وہ نزہت سے لپٹ گئی۔ نزہت خود بھی رونے لگی تھی۔
"اوہو یہاں تو بڑا جذباتی سین چل رہا ہے۔" مبشر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ وہ مانچسٹر میں رہتا تھا اور سال میں ایک بار پاکستان آتا تھا۔
"کزن آگئے میں ان کے لیے چائے لاتی ہوں۔" رفعت جلدی سے اٹھی۔
"کزن کچن ادھر ہے جہاں آپ جہاں جارہی ہیں وہاں واش روم ہے۔" مبشر نے کہا تو نزہت ہنس پڑی اور رفعت غصے سے مبشر کی طرف دیکھنے لگی۔
"اب مجھے میرے گھر کا راستہ سمجھائیں گے۔ اللہ کرے مالی بابا کا کتا آپ کو کاٹ لے جس نے مجھے کاٹا تھا اور چودہ انجکشن لگے تھے۔" رفعت کو پرانا دکھ یاد آ گیا۔
"اچھا چائے پلاؤ پھر بات کرتے ہیں مالی بابا کے کتے سے۔" مبشر مسکرا کے بولا۔
"بہت معصوم ہے یہ۔ پتا نہیں کیسے ایڈجسٹ ہوگی یہ اس ماحول میں۔" نزہت نے اس کے جانے کے بعد کہا۔
"ریلیکس وقت لگے گا گر ہوجائے گی۔ ابھی تو اس کی بہن صاحبہ کا مسئلہ ہے جو ہمارے ساتھ ایڈجسٹ نہیں ہو پا رہی ہیں اگر ہوجائیں تو کیا بات ہے۔" مبشر نے شرارتی نظروں سے دیکھا۔
"سوچنا بھی مت۔ جب تک رفعت کا مستقبل محفوظ نہیں ہوجاتا میں شادی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔"
"مگر نزہت تمہاری عمر اب اٹھائیس سال ہے میری بھی اتنی ہی ہے تو کیا ہم بوڑھے ہو کے شادی کریں گے۔" مبشر برسوں سے اُمید لگائے بیٹھا تھا۔
نزہت جانتی تھی بچپن میں احسان صاحب اور اس کے چاچو نے ان کا رشتہ طے کر دیا تھا۔ اسی دوران رفعت چائے لے کر آ گئی۔
"باجی یہ کزن مجھے کمپیوٹر چلانا کب سکھائے گا؟"
"آج سے ہی شروع کرتا ہوں مگر فیس کے طور پر چائے پلانی پڑے گی۔" مبشر نے ہنس کر کہا۔
"توبہ کتنے مطلبی انسان ہیں، اپنی اس معصوم کزن سے بھی چائے بنواؤ گے۔"
"نزہت دیکھ لو اب یہ زبان پکڑ رہی ہے۔" مبشر نے مصنوعی غصے سے کہا۔
رفعت جلدی سے بولی۔ "میں زیادہ نہیں بولتی آپ کی طرح کوئی تین چار گز لمبی زبان نہیں میری۔ پتا نہیں منہ میں پوری کیسے آ گئی۔"
"اللہ نزہت کیا جادو کیا ہے ایک ہفتے میں اتنا اعتماد۔" مبشر حیران ہوا۔ نزہت ان دونوں کی باتوں سے محظوظ ہو رہی تھی۔ وہ دونوں ہنستے بولتے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گئے۔
نزہت غور سے ان دونوں کو دیکھنے لگی۔ اس کے ذہن میں ایک خیال جڑ پکڑنے لگا۔ وہ کچھ سوچ کر مسکرا دی۔
"میں قربانی دوں گی اپنی بہن کی خاطر۔" اس کے ذہن میں یہ خیال پختہ ہو گیا۔

☆......☆

"نزہت تم پاگل ہو یہ کیسے ممکن ہے۔" مبشر اس کی بات سن کر غصے سے اکھڑ گیا۔
"کیوں...... کیوں ممکن نہیں۔" نزہت نے پوچھا۔
"میری اور تمہاری بات بچپن سے پکی ہو چکی ہے پھر رفعت اور میری عمر اور طبیعت میں بہت فرق ہے۔ میں اسے چھوٹی بہن سمجھتا ہوں یہ ممکن ہی نہیں۔"
"ایج کا کوئی مسئلہ نہیں پھر تم میچور ہو اس کے ساتھ ایڈجسٹ کر سکتے ہو، میں جانتی ہوں تم اسے سنبھال سکتے ہو۔"
"مگر نزہت میں تم سے پیار کرتا ہوں تمہارے علاوہ کبھی کسی اور کے بارے میں نہیں سوچا۔" مبشر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔
لمحہ بھر کے لیے نزہت کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ وہ جانتی تھی مبشر اس سے پیار کرتا ہے مگر اس طرح اس نے کبھی

اقرار نہیں کیا تھا مگر یہ لمحے گزر گئے نزہت کی جگہ ایک بڑی بہن کھڑی ہوگئی۔
"اگر تم مجھ سے پیار کرتے ہو تو تمہیں رفعت کو اپنانا ہوگا ورنہ میں سمجھوں گی تمہارا پیار خود غرض تھا۔" نزہت مبشر کو امتحان میں ڈال کر اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ وہ دونوں اس بات سے بے خبر تھے کہ کوئی ان کی ساری باتیں سن رہا تھا۔

☆......☆

آج کافی دنوں بعد مبشر ان کے گھر آیا تھا۔
"تو جناب کزن صاحب اس کمپیوٹر کو صرف آن کرنا ہی سکھانا تھا آگے کے سبق کون دے گا؟" رفعت نے اس کا استقبال کیا۔
"مصروف تھا رفعت۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔
"باجی دیکھیں ان کے کام۔"
"رفعت تم چائے لاؤ۔" مبشر نے سنجیدگی سے کہا۔
"کیا سوچا تم نے؟" اس کے جاتے ہی نزہت نے پوچھا۔
"جو تم نے کہا مجھے منظور ہے۔ میرا پیار خود غرض نہیں اگر تم اس طرح خوش ہو تو ٹھیک۔ ڈیڈی اور مما کو میں منالوں گا۔" وہ روکھے لہجے میں بولا۔
"تھینک یو سو مچ مبشر تم نے میرے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹا دیا۔" نزہت کی آواز میں خوشی تھی۔ مبشر اٹھ کر باہر کی طرف چل دیا۔
"عجیب بندہ ہے یہ بھی۔ میری چائے کیا اتنی خراب ہے جو آرڈر کر کے نہیں پی۔" چائے لے کر آتی رفعت نے اسے باہر جاتا دیکھ کر تبصرہ کیا لیکن مبشر رکا نہیں۔

☆......☆

"کیا بات ہے رفعت تم نے مجھے اور مبشر کو کیوں بلایا ہے۔" نزہت حیران تھی کہ آخر اسے کیا کام ہے جو مبشر اور اسے ایمرجنسی میں بلایا ہے۔ وہ دفتر سے بھاگم بھاگ آئی تھی۔
"مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔"
"کیا!" دونوں ایک ساتھ بولے۔
"آپ دونوں شادی کب کر رہے ہیں؟"
"کیا مطلب؟" نزہت گڑبڑا کے بولی۔
"لو باجی اب میری تو ہوئی نہیں ورنہ شادی کا مطلب بتاتی۔" وہ معصومیت سے بولی۔
مبشر کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
"پاگل میں شادی کیسے کروں گی جب تک تمہاری نہیں ہوگی۔" نزہت ڈانٹتے ہوئے بولی۔
"ہو جائے گی باجی ابھی میری کون سی عمر ہے ابھی تو آگے پڑھنا ہے اور یہ کہاں لکھا ہے کہ پہلے چھوٹی کی شادی ہوگی پھر بڑی کی، آپ کرلیں کہیں اچھا رشتہ ہاتھ سے نہ نکل جائے۔" رفعت نے مسکرا کے مبشر کی طرف دیکھا۔
"تم پاگل ہو۔" نزہت یہ کہہ کر کمرے کی طرف چل دی۔
"تو اس دن جناب نے ہماری ساری باتیں سن لی تھیں۔" مبشر اس کا کان پکڑتے ہوئے بولا۔
"میرا کان چھوڑیں ذرا باجی کو منا کر آئی مجھے ان کی کمزوری کا پتا ہے۔" وہ کان چھڑا کر نزہت کے کمرے کی طرف بھاگی۔ نزہت بیڈ پر چپ چاپ بیٹھی تھی۔
"باجی!" رفعت نے پکارا۔
"کیا مسئلہ ہے رفعت یہ تمہارے سوچنے کی باتیں نہیں۔"
"پر باجی مبشر آپ کو پسند کرتے ہیں اور میں بھی یہ چاہتی ہوں۔"
"مگر رفعت......!"
"اگر مگر کچھ نہیں آپ کو ہاں کرنی ہوگی۔ میں نے کبھی آپ سے کچھ نہیں مانگا۔ آپ نے جو محبتیں دی ہیں خود دی ہیں پہلی اور آخری بار کچھ مانگا ہے، مبشر کو ان کی محبت لوٹا دیں۔"
نزہت چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ "اتنی بڑی کب سے ہوگئیں تم؟"
"جب سے آپ کے پاس آئی ہوں۔" رفعت اس کے ساتھ لپٹ گئی۔
"ٹھیک ہے رفعت اگر تم ایسے خوش ہو تو مجھے منظور ہے۔"
"یاہو!" رفعت نے جلدی سے نزہت کے ہاتھ کو چوما۔ "آپ بہت اچھی ہیں باجی۔ میں ذرا کزن کو بلالوں۔" وہ باہر سے مبشر کو بلا لائی۔
نزہت کے ہونٹوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ تھی۔ اب وہ نزہت احسان سے نزہت مبشر ہوچکی تھی۔
"میں چائے لاتی ہوں۔"
"ادھر واش روم ہے الو!" مبشر نے اسے پکارا۔
"مجھے بے وقوف مت بنائیں۔" رفعت نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ کیسے دیکھتی کبھی کبھی آنسو چھپا کر مسکرانا پڑتا ہے۔ یہی عمر کا روگ تھا۔ وقت کے ساتھ یہ زخم بھرے گا۔ "ہمیشہ نزہت باجی ہی کیوں قربانی دیں ان کا بھی حق ہے خوشیوں پر۔" اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے سوچا۔

لوگ مجھ پر ہنستے ہیں، میرا مذاق اڑاتے ہیں، پھبتیاں کستے ہیں۔ میرے جاننے والوں نے میرا عجیب عجیب نام بھی رکھ چھوڑا ہے، کوئی مجھے آوارہ بڈھا کہتا ہے تو کوئی رنگیلے شاہ کیونکہ میرا ایک ہی شوق ہے۔ ہر ایک دو سال بعد ایک نئی دلہن گھر لانا۔ اس وجہ سے کچھ لوگ میرے راستے میں آنے کی کوشش بھی کرتے ہیں، عین وقت پر جا کر پھڈا بھی ڈال دیتے ہیں مگر مجھے کسی کی پروا نہیں۔ میں ہر دو سال بعد ایک شادی ضرور کرتا ہوں۔ اب آپ یہ نہ سمجھیں

محترم مدیر
السلام علیکم
لوگ کچھ بھی کہیں مگر میں باز آنے والا نہیں۔ کیوں کہ ہر ایک دو سال بعد ایک نئی لڑکی سے شادی کرنا میری مجبوری ہے۔ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں یہ آپ کو میری آپ بیتی بتا دے گی اور آپ بھی میری مجبوری جان کر مجھ سے ہمدردی کریں گے۔

ابرار احمد
(کراچی)

کہ میں بہت امیر کبیر شخص ہوں۔ میرے دو چار تیل کے کنوئیں ہیں۔ میں نوٹوں پر سوتا ہوں۔ اجی جناب میں تو بہت غریب اور مفلوک الحال شخص ہوں۔ اتنا غریب ہوں کہ دلہن کا جوڑا بنوانے کے لیے مجھے اِدھر اُدھر سے مانگنا پڑتا ہے۔ قرض کی مد سے کام چلانا پڑتا ہے۔ قرض دینے والے بھی بغیر بتائے جان جاتے ہیں کہ میں شادی کرنے والا ہوں اور وہ مذاق اڑانا شروع کردیتے ہیں۔ طرح، طرح کے جملے کسنے لگتے ہیں، کبھی، کبھی کوئی سرگوشی میں پوچھ بھی لیتا ہے۔ ”ابرار صاحب آپ کون سا کشتہ استعمال کرتے ہیں۔ کس حکیم سے بنواتے ہیں؟ اب میں انہیں کیسے بتاؤں کہ وہ دن ہوا ہوئے جب خلیل خان فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ اب تو خلیل خاں کے ہاتھ بھی خالی ہوچکے ہیں اور وہ آسمان کی طرف حسرت سے دیکھتے ہیں اور چہچہاتی فاختائیں ہنسی اڑاتی گزر جاتی ہیں۔ خیر میں بتا رہا تھا کہ میں شادی کرنے کے شوق میں مبتلا ہوں۔ اور یہ شادی کا بندھن جو دو روحوں، دو جسموں کو جوڑنے کا سبب ہے، ہمیشہ ڈھیلا ثابت ہوتا ہے۔ اتنا ڈھیلا کہ کبھی ماہ دو ماہ تو کبھی چھ سات ماہ میں کھل جاتا ہے۔ کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے ہیں کہ آنے والی مجھے لات مار کر جانے والیوں کی فہرست میں نام لکھوالیتی ہے۔ تو سن لیں کہ یہ غلط اطلاع ہے۔ انہیں میں خود چلتا کردیتا ہوں۔ مگر کیوں یہ آج سن لیں۔ اس قصے کا آغاز آج سے تقریباً دس سال پہلے ہوا تھا۔ ان دنوں میں پلاسٹک پینٹ بنانے والی فیکٹری میں ملازم تھا۔ تنخواہ معقول تھی۔ گزارہ اچھے انداز میں ہوجاتا تھا۔ گھر میں صرف دو افراد تھے ایک ماں اور ایک میں۔ بھائی، بہن کوئی تھا نہیں۔ والد کا انتقال اس وقت ہوا تھا جب میں صرف بارہ سال کا تھا۔ ماں نے ہی میری پرورش کی تھی۔ وہ پڑھی لکھی تو تھی نہیں۔ اس لیے مزدوری کرتی رہی اور مجھے پڑھاتی رہی۔ ماں کی پریشانیوں کو میں نے محسوس کرلیا تھا اس لیے دل لگا کر پڑھائی کرتا تھا۔ لیکن میٹرک سے آگے پڑھ نہیں سکا اور نوکری کی تلاش میں نکل پڑا۔ اتفاق سے ایک فیکٹری میں جاب خالی تھی۔ مجھے رکھ لیا گیا۔ تنخواہ معقول تھی اس لیے بعد میں ماں کو گھر بٹھالیا۔ اب ماں کا ایک ہی کام تھا۔ آس پڑوس میں گپیں لگانا اور ایک، ایک سے تقاضا کرنا کہ وہ کسی چاند سی لڑکی کو ڈھونڈیں۔ انہوں نے کئی نام پیش بھی کیے۔ میرا محلہ انتہائی غریب لوگوں کا تھا۔ وہاں صرف پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک دوسرے کی جوئیں دیکھنے والیاں ہی نظر آتی تھیں اور ایسی لڑکیاں مجھے کب پسند آتیں۔ میں ایک قلم موقوف رد کرتا رہا۔ پھر پتا نہیں کیسے اماں کو رضیہ نظر آگئی۔ ساٹھ گز کے جھگی نما کوارٹر میں رہتے ہوئے انہوں نے اسی گز والے گھر کی لڑکی تلاش کی تھی۔ گو کہ صورت شکل بس واجبی سی تھی مگر پہننے اوڑھنے کا اسے سلیقہ آتا تھا۔ اور سلیقہ مشین بھی چلالیتی تھی۔ اچھے، اچھے کپڑے بھی سی لیتی تھی۔ یہی خوبی اماں کو سب سے زیادہ پسند آئی تھی اور اماں نے ضد باندھ لی تھی کہ جتنی جلد ممکن ہو سہرا باندھو، اسلم کوچوان کے گھوڑے پر بیٹھو اور اسے بیاہ کر گھر لے آؤ۔ دن رات کی ایک ہی تکرار سے عاجز آکر میں نے سپر ڈال دی اور رضیہ کو دلہن بنا کر گھر لے آیا۔ اس نے آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ گھر کا راج پاٹ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور اماں کو ریٹائر کرکے نماز کی چوکی پر بٹھادیا۔ یہ کام اس نے حسن سلوک کے ہتھیار سے کیا تھا۔ اس لیے اماں نے بھی خوشی، خوشی اکلوتے ٹوٹے ٹرنک کی چابی بھی اسے دے دی تھی اور خود سبکدوشی لے لی۔ ریٹائر آدمی زیادہ نہیں چلتا۔ مشین کے فاضل پرزے زیادہ نہیں چلتے۔ وقت سے پہلے زنگ خوردگی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اماں بھی ایک دن نماز پڑھتے، پڑھتے چوکی سے لڑھک گئیں۔ نیچے گریں تو آواز بھی ہوئی ہوگی مگر رضیہ نے تکلیف کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اپنے کاموں میں لگی رہی۔ جب روٹی سینک کر ڈربے نما کچن سے باہر آئی تو اسے ماں فرش پر محوِ خواب نظر آئیں۔ اس نے کہا۔ ”اماں ابھی تک آپ اٹھی نہیں، چلیے اٹھ کر ہاتھ منہ دھولیں۔ گرما گرم روٹی لاتی ہوں۔“

دو تین بار آواز دینے پر بھی جب وہ نہیں اٹھی تو مجبوراً رضیہ کو اٹھانے کی زحمت کرنا پڑی۔ اس نے جیسے ہی ہاتھ لگایا ان کا جسم لڑھک گیا۔ اس نے چھو کر دیکھا تو ان کا جسم ٹھنڈا پڑا تھا۔ بس اس نے اتنی زور کی چیخ ماری کہ کئی گھر بعد کی عورتیں بھی دوڑ پڑیں۔ اور پھر بین کرنے کا مقابلہ شروع ہوگیا۔ کسی نے میری فیکٹری میں فون کردیا اور میں بھی بھاگتا ہوا پہنچ گیا۔ پھر محلے والوں کی دینداری سے اشتراک کیا اور کفن دفن کا انتظام ہوگیا، ورنہ میری حالت ان دنوں ایسی نہیں تھی کہ میں قبرستان کی فیس، جنازہ گاڑی کا کرایہ، کفن کی قیمت دے سکتا۔

گھر کا نظام پہلے بھی رضیہ کے پاس تھا اماں کے بعد بھی اسی کے پاس رہا۔ سر موقوف فرق محسوس نہیں ہوا۔ اور وقت گزرتا چلا گیا کہ ایک دن وہ مل گئی۔

یہ بات اماں کے انتقال کے پورے ایک سال بعد کی ہے۔ اس روز فیکٹری میں کچھ زیادہ کام تھا اس لیے میں کچھ دیر سے نکلا تھا۔ سڑک ویران نظر آرہی تھی انڈسٹریل زون کی سڑکیں تو صرف ڈیوٹی آور میں ہی تھوڑی دیر کے لیے آباد ہوتی ہیں۔ گھنٹا دو گھنٹا کی چہل پہل ہوتی ہے۔ یعنی جب لوگ ڈیوٹی دینے آرہے ہوں یا جارہے ہوں۔ باقی وقت تو یہاں کی سڑکیں کسی عاشق کے دل کی طرح خالی رہتی ہیں۔ ابھی میں بس اسٹاپ کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ایک ذیلی سڑک سے بھاگتی ہوئی لڑکی نکلی اور مجھ سے ٹکرا گئی۔

یہ ٹکر شدید قسم کی تھی۔ میں لڑکھڑا گیا۔ وہ ایسے بھاگتے ہوئے آئی تھی جیسے اس کے پیچھے کتے لگ گئے ہوں۔ میں نے اسے غصیلی نظروں سے دیکھا تھا مگر اس کے چہرے پر پھیلی گھبراہٹ اور معصومیت نے میرے غصے کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا اور میں ہمدردی کے جذبات سے بھر اٹھا۔ میں نے پوچھا۔ ”بی بی کیا بات ہے تم اس طرح بھاگ کیوں رہی ہو؟ کیا کتے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔“

دوڑنے کی وجہ سے اس کی سانس پھول رہی تھی جو سینے کے زیروبم سے ہویدا تھی۔ نگاہیں بھٹکنے لگی تھیں اور میں ٹھہرا ایک شریف النفس شخص اس لیے نظر چرانے لگا تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کی اداکاری کرنے لگا تھا۔ وہ خوفزدہ ہرنی کی طرح بار، بار مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کا یوں مڑ، مڑ کر دیکھنا خطرے کا الارم تھا۔ ان دنوں جرائم اتنے عام نہیں تھے۔ اور نہ ہر ایرے غیرے کے پاس ٹی ٹی ہوا کرتی تھی۔ مگر غنڈے بدمعاش ہر دور میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے پاس چاقو بھی ہوا کرتا تھا۔ جو بڑی آسانی سے مقابل کے پیٹ میں اتر جاتا تھا۔ اس کے انداز سے میں نے سمجھ لیا کہ وہ کسی غنڈے کے چنگل سے نکل کر بھاگی ہے۔ تبھی کافی دور دو آدمی دوڑتے نظر آئے۔ میں سمجھ گیا کہ اسی کو پکڑنے آرہے ہیں۔ وقت ضائع کرنا عقلمندی نہیں تھی۔ بس میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ بے تکلفی اضطراری طور پر سرزد ہوئی تھی مگر ضروری تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ کو پکڑا اور سامنے کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ میرا ساتھ دینے کے لیے قدم سے قدم ملا کر دوڑ رہی تھی۔ ہم دوڑتے دوڑتے سامنے والی گلی میں آگئے۔

وہ ایک ذیلی سڑک تھی۔ اس سڑک پر قطار میں کئی بنگلے بنے ہوئے تھے۔ ہم دونوں پوری قوت سے.... بھاگ رہے تھے۔ تبھی مجھے خیال آیا کہ وہ مرد ہیں دیکھنے میں بھی قوی ہیں، اگر اسی طرح ہم دوڑتے رہے تو پکڑ لیے جائیں گے۔ اس کا آسان حل یہی ہے کہ ہم کسی بنگلے میں چھپ جائیں۔ اس خیال کے آتے ہی ہم نے سامنے نظر آنے والے کھلے ہوئے گیٹ کی طرف دوڑ لگا دی۔ اندر پہنچ کر دیکھا۔ پھولوں کی خوب صورت کیاریاں تھیں۔ سامنے برآمدا تھا۔ سرخ بجری بچھا روش تھا، ایک طرف گارڈن چیئر بچھے تھے۔ ہم جا کر اس پر ایسے بیٹھ گئے کہ پہلی نظر میں یہی نظر آتا کہ ہم اسی بنگلے کے مکین ہیں۔ اس وقت یہ خیال تک نہیں تھا کہ اگر بنگلے کے مالک نے پوچھ لیا کہ کون ہو، بغیر پوچھے کیوں اندر آگئے تو کیا جواب دوں گا۔ ابھی ہم اکھڑی سانسوں کو درست ہی کر رہے تھے کہ باہر سے آواز آئی ”لڑکی ادھر ہی بھاگتی ہوئی آئی ہے۔“

”اس کے ساتھ ایک لڑکا بھی نظر آیا تھا۔ وہ یہاں کہاں سے ٹپک گیا۔ اتنی دور سے لے کر آئے اور یہاں آکر وہ فرار ہوگئی۔“

”اب یہ سوچو کہ بھائی کو کیا جواب دو گے۔ وہ تو زندہ گاڑ دے گا۔“

”میرا خیال ہے کسی بنگلے میں گھس گئی ہے۔“

”ایک، ایک بنگلے میں گھس کر دیکھنا تو ناممکن سی بات لگتی ہے۔“

”ایسا کرتے ہیں جس بنگلے کا گیٹ کھلا ہوا نظر آئے اس میں دیکھ لیتے ہیں۔ وہ اندر ڈرائینگ روم میں تو جانے سے رہی۔ باہر ہی چھپی کھڑی ہوگی۔“

اتنا سن کر ہی میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ لوگ کسی بھی وقت یہاں جھانک سکتے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور برآمدے کے برابر میں تنگ گلی کی طرف بڑھ گیا۔ چھپنے کے لیے وہ گلی بہت مناسب تھی اس گلی میں ابھی پہنچا ہی تھا کہ باہر سے کسی کی آواز سنائی دی۔

”اے کون ہو کہاں گھسے چلے آرہے ہو؟“

ہم نے پلٹ کر دیکھا مگر کوئی نظر نہیں آیا۔ آواز گیٹ کی طرف سے آرہی تھی۔ ہم ساکت کھڑے ہوگئے تھے کہ دوبارہ آواز آئی۔ یہ آواز کسی دوسرے کی تھی۔ ”ادھر ایک لڑکی اور ایک لڑکا تو نہیں آیا۔ ہم ان دونوں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”ادھر کوئی نہیں آیا۔ بھاگو ورنہ کتا کھولتا ہوں۔“

کتے کا نام سن کر میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی کیونکہ کتا تو ہماری بو فوراً سونگھ لیتا اور شور مچانے لگتا۔ یہ بات

بھی سمجھ میں آچکی تھی کہ لڑکی کا پیچھا کرنے والے دونوں غنڈے اندر آنا چاہ رہے تھے جسے بنگلے والے نے روک دیا ہے۔

''فوراً بھاگو ورنہ پولیس بلالوں گا۔'' اس دھمکی پر شاید وہ لوگ واپس ہوگئے تھے۔ کیونکہ خاموشی کی چادر تن گئی تھی۔ ہم بھی مطمئن ہوگئے تھے اور باہر نکلنے پر غور کررہے تھے کہ آواز آئی۔ ''اب باہر آجاؤ۔''

میں نے مڑ کر دیکھا، ایک یحیم شحیم بندہ ہاتھ میں ڈنڈا لیے کھڑا تھا۔ اس کی لمبی لمبی مونچھیں تھیں۔ وہ حلیے سے مالک تو لگ نہیں رہا تھا یقیناً چوکیدار ہوگا۔ اسے دیکھ کر لڑکی کے چہرے پر زردی پھیل گئی۔ رنگ بالکل فق ہوگیا تھا۔ مجھے بھی اپنے دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس ہورہی تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''ہمارے پیچھے کچھ غنڈے لگ گئے تھے۔''

''یہ سب بعد میں بتانا۔ جلدی ادھر آؤ۔''

''ہم لوگ صرف پناہ کے لیے آئے ہیں، ہماری نیت بری نہیں ہے۔'' میں نے حفظ ماتقدم کے تحت کہا۔

''مجھے پتا ہے، میں نے تم دونوں کو سڑک پر ہی دیکھ لیا تھا۔ جب تم اندر آرہے تھے اس وقت بھی میں کھڑکی پر کھڑا تھا۔'' اس کا انداز دوستانہ تھا۔ اس لیے ہم دونوں آگے بڑھ آئے۔ لڑکی کی نظر اس کے ڈنڈے پر جمی ہوئی تھی۔ شاید اس کے اندر اب بھی خوف بیٹھا ہوا تھا۔ وہ میری آڑ لے کر آگے بڑھ رہی تھی۔

قریب پہنچنے پر اس نے پوچھا۔ ''تم لوگ رہتے کہاں ہو؟''

میں نے اپنے علاقے کا نام بتایا۔

''اچھا چلو گاڑی میں بیٹھو۔'' اس نے روش پر کھڑی سوزوکی کیری کی طرف اشارہ کیا۔ جس پر کافی سارا سامان لدا ہوا تھا۔

''مگر کیوں؟'' میں نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

''تمہارے حق میں یہی بہتر ہے۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''وہ لوگ آس پاس ہی ہوں گے۔ اکیلے نکلو گے تو اس لڑکی کے حق میں بہت برا ہوگا۔''

میں واہموں وسوسوں میں گھرا ہوا تھا مگر بات اس کی صحیح تھی اس لیے میں اس کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میرے برابر میں وہ لڑکی بیٹھ گئی۔ سوزوکی چل پڑی۔ اس سے تیز دماغ دوڑ رہا تھا سوچوں کا ایک گرداب تھا، فکر و پریشانی کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا اور میں تھا۔ سوزوکی میں خاموشی تھی۔ لڑکی خوف سے خاموش تھی اور میں فکر کی وجہ سے۔ ڈرائیور بھی خاموش تھا۔ تبھی میری نظر بیک ویو مرر پر پڑی۔ دو بائیک پیچھے، پیچھے چل رہی تھیں۔ انڈسٹریل ایریا سے نکل کر ہم مرکزی سڑک پر پہنچ گئے تھے مگر وہ بائیک ساتھ، ساتھ تھیں۔ مجھے ڈر لگا کہ یہ بائیک والے وہی دونوں غنڈے ہیں۔ یہاں رونق عروج پر تھی۔ ٹریفک زیادہ تھی۔ ڈرائیور نے سوزوکی سائیڈ میں کرکے روک لی پھر بولا۔ ''چلو اتر جاؤ اور یاد رکھنا، کبھی ویران علاقے میں لڑکی کے ساتھ نہ جانا۔ عزت اور جان دونوں کا خطرہ ہے۔ اسی لیے تمہیں ساتھ لے آیا کہ وہ لوگ تمہیں نقصان نہ پہنچادیں۔''

میں نے بائیک والوں کی طرف دیکھا۔ وہ لوگ بھی ہماری طرف ہی دیکھ رہے تھے، مجھے خوف محسوس ہوا کہ اب یہ لوگ پھر روکنے کی کوشش کریں گے۔

''اب یہاں سے اپنے علاقے کی بس پکڑو اور نو دو گیارہ ہوجاؤ۔''

ہم فوراً اتر گئے۔ اس نے پھر کہا۔ ''ادھر آؤ۔''

میں چکر لگا کر دوسری کھڑکی پر پہنچا مگر میری نظر بائیک والوں پر تھی۔ اطمینان تھا کہ یہاں رونق ہے وہ لوگ کچھ نہیں کریں گے کیونکہ جب ایک آدمی سے ڈر گئے تو اتنے لوگوں کے سامنے ان کی ہمت نہیں ہوگی۔

''ادھر نہیں ادھر دیکھو۔'' اس نے کہا تو میں ڈرائیور کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ''کسی کو بتانا نہیں کہ تم کس بنگلے میں چھپے تھے۔ اب اس بنگلے کو ذہن سے کھرچ دو ورنہ کسی بڑی مصیبت میں پڑجاؤ گے۔''

''جی اچھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''وجہ بھی سن لو۔'' کہہ کر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور باہر نکالا تو اس کی مٹھی میں بہت سے مڑے تڑے نوٹ تھے۔ انداز ایسا تھا جیسے گنے بغیر جیب میں بھرلیا گیا ہو۔ وہ کافی سارے تھے مگر بے ترتیب تھے۔ انہیں اس نے میرے اوپر والی جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا۔ ''رکھ لو بعد میں کام آئے گا اور یہ بھی سن لو، ہم چور ہیں۔ یہ جو سامان لدا ہوا ہے یہ چوری کا ہے۔ بنگلا خالی کرکے آرہے ہیں۔ لڑکی ساتھ ہو تو پولیس والے چیکنگ کے لیے روکتے نہیں ہیں اسی لیے تم دونوں کو بٹھالیا تھا۔'' اپنی بات ختم کرکے اس نے ایکسلیٹر دبادیا۔

ایسا زبردست انکشاف اور اتنے سارے نوٹ میں تو سکتے میں رہ گیا تھا۔ تبھی مجھے بائیک والوں کا خیال آیا۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ دونوں سوزوکی کے پیچھے، پیچھے

جار ہے تھے۔ یقیناً وہ بھی اس کے ساتھی ہوں گے۔

ادھر سے نظریں ہٹا کر میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اب خوف کا سایہ نہیں تھا، اطمینان سا نظر آرہا تھا۔ اسے پرسکون دیکھ کر میں نے پوچھا۔ ''اب یہ بتاؤ تمہیں جانا کہاں ہے؟''

اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔

''تمہارا گھر کہاں ہے؟ اکیلی چلی جاؤ گی ناں۔'' میں نے پھر سوال کیا۔

اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا پھر سر جھکا لیا۔ جیسے جواب دینے سے گریزاں ہو۔ اسے یوں خاموش دیکھ کر میرا پارہ چڑھنے لگا تھا۔ ''بی بی! میں نے پوچھا ہے کہ آپ کو جانا کہاں ہے؟ گھر کہاں ہے؟'' مرا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ پھر بھی اس نے جواب نہیں دیا۔ جواب دینے کی بجائے اس نے میرے بازو کو سختی سے پکڑ لیا تھا جیسے وہ میرا ساتھ چھوڑنا نہیں چاہتی۔ اس طرح بازو پکڑنے کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ میرے ساتھ جانا چاہتی ہے۔

''کیا تمہارا کوئی گھر نہیں ہے۔'' اس بار میں نے جھنجلا کر کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ارے بابا منہ سے بولو۔ ڈھائی من کا سر ہلانے سے بہتر ہے کہ ایک چھٹانک کی زبان ہلا دو۔'' میری آواز تیز ہو گئی تھی۔

اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھ کر اپنا منہ کھول دیا۔ کھلے ہوئے منہ کو دیکھتے ہی میں اندر تک کانپ گیا۔ اس کی آدھی زبان کٹی ہوئی تھی جیسے کسی حادثے میں کٹ گئی ہو۔ وہ سن سکتی تھی۔ اکثر گونگے قوت سماعت سے محروم ہوتے ہیں، یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ یہ لڑکی کسی حادثے میں زبان کھو بیٹھی ہے۔

میں نے ہاتھ اٹھا کر ایک رکشے والے کو اشارہ کیا اور اسے اپنے محلے کا نام بتا کر اندر بیٹھ گیا۔ لڑکی بھی ساتھ بیٹھ گئی۔

گھر پہنچا تو بیوی نے مشکوک نظروں سے خیر مقدم کیا۔ جیسے پوچھنا چاہتی ہو کہ کیا میری سوتن لے کر آئے ہو؟ میں نے اس کی نظروں کی تپش کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''تھکا ہارا آیا ہوں، کم سے کم ایک کپ چائے ہی پلا دو۔''

''یہ ہے کون؟'' اس نے نیچی آواز میں پوچھا۔
''بتاتا ہوں پہلے چھری کے نیچے دم تو لینے دو۔''
''چائے پلائے میری جوتی، پہلے بتاؤ یہ ہے کون جو اس طرح اپنے باپ کا گھر سمجھ کر آرام سے بیٹھی ہے۔''
''بتاتا ہوں ناں، پہلے چائے تو لے آؤ۔''
''چائے کے لیے چینی پتی کا ہونا ضروری ہے۔ گھر میں ایک چٹکی چائے کی پتی نہیں ہے۔ دکان دار نے بھی ادھار دینے سے منع کر دیا ہے۔'' وہ تقریباً سرگوشی میں بولی۔
''یہ لو اور جا کر اس کے منہ پر مارو۔'' کہہ کر میں نے جیب سے نوٹ نکالے، نوٹ دیکھ کر بیوی کی آنکھیں حلقوں سے ابلنے لگیں اور میری سانسیں ڈوبنے لگیں کیونکہ میں نے یہی سمجھا تھا کہ سوزوکی والے نے سو دو سو دیے ہیں مگر اب جو دیکھا تو وہ ہزار، ہزار کے نوٹ تھے۔ بیوی غصہ بھول کر نوٹ کی طرف اس طرح جھپٹی جیسے چیل گوشت پر جھپٹتی ہے۔ سب بیویاں ایک جیسی ہوتی ہیں، پیسوں کی دیوانی، تو نوٹوں میں بیوی کی دلچسپی لڑکی سے چھپی نہ رہ سکی، پتا نہیں اس نے کیا خیال کیا، وہ جو بیوی کے تیور دیکھ کر گھبرا اٹھی تھی، اس نے جلدی سے اپنی کمر سے ایک چھوٹی سی پوٹلی کھولی اور اس میں سے کچھ زیورات نکالے اور اسے بھی بیوی کی طرف بڑھا دیے۔ رضیہ پر تو شادی مرگ جیسی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اتنے سارے نوٹ اور زیورات، وہ تو ہفت اقلیم کی دولت ملنے جیسی کیفیت میں آ گئی تھی۔ وہ تمام چیزیں الماری میں رکھ کر باہر نکل گئی۔ واپس آئی تو سامان سے لدی پھندی تھی۔

اتنے دنوں بعد گھر میں چکن بھی پکا تھا۔ ہم تینوں نے ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ بیوی کا غصہ، شک، شبہ سب ہوا ہو گیا تھا۔ جب کمرے میں پہنچا تو لڑکی کے بارے میں ایک فرضی کہانی سوچ چکا تھا وہی اسے سنا دی کہ اس گونگی کے ماں، باپ مر چکے ہیں، چچا پرورش کر رہا تھا کہ اس کا بھی انتقال ہو گیا اور چچی نے گھر سے نکال دیا ہے۔ اب یہ کہاں جاتی، کسی بھی غلط ہاتھ میں پڑ سکتی ہے اسی لیے لے آیا کہ کسی دارالامان میں داخل کرا دوں گا۔

کچھ بھی ہو بیویاں ہر جھوٹی بچی بات پر آسانی سے یقین کر لیتی ہیں اس نے بھی امنا صدقنا یقین کر لیا۔

اگلے روز جب میں کارخانے پہنچا تو منیجر صاحب کو پریشانی میں پایا۔ میں نے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے؟''
''ارے کہاں بھائی کہاں خیریت، صبح سے دو بار بڑے صاحب کا فون آ چکا ہے، گودام میں باہر سے کیمیکل آ رہا ہے جب کہ گودام کی پوزیشن یہ ہے کہ ایک انچ جگہ خالی نہیں ہے۔'' دراصل پیکنگ کے وقت یا بعد میں ڈبے پچک جاتے ہیں کہیں لیک نہ ہو جائے اس ڈر سے ان ڈبوں کو مسترد کر دیا جاتا ہے۔ کباڑی اسے کوارٹر ریٹ سے بھی کم میں خرید کر لے جاتے ہیں وہ اسے چھوٹے دکانداروں کو بیچ دیتے ہیں۔
''ایک بندہ آتا تو ہے؟'' میں نے کہا۔
''جو بندہ ریجیکٹڈ مال لے جاتا ہے وہ آ نہیں رہا۔ تین ماہ سے زیادہ ہو گیا۔ پتا نہیں وہ کہاں غائب ہے۔ گودام اٹ گیا ہے۔''
''ہاں میں نے دیکھا تو ہے گودام بھر گیا ہے۔''
''تو میاں جا کر تلاش کرو، جو بندہ ملے اسے لے کر آؤ بڑے صاحب بہت ناراض ہو رہے ہیں۔ گودام خالی کرانا ضروری ہے، اگر کوئی نیا بندہ ملتا ہے تو اسی کو لے آؤ۔''
''اس میں نفع کا ریٹ کیا ہے؟''
''مت پوچھو جو مال یہ لوگ دس روپے میں اٹھاتے ہیں وہ دکانوں پر سو کا پہنچاتے ہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ وہ ایک لگا کر سو کماتے ہیں۔''
''کتنے کا مال اسٹاک میں پڑا ہے؟''
''تقریباً ایک لاکھ کا ہو گا۔''
ان کے جواب نے مجھے ایک نئی راہ سجھا دی۔ لڑکی نے جو زیورات دیے ہیں اگر اسے فروخت کیا جائے تو اتنے ہی پیسے ملیں گے۔ کیوں نہ ایک رسک لیا جائے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے کہا۔ ''سر آپ اگر ساتھ دیں تو میں خود اس لائن میں آ جاؤں۔''
''ارے میاں اگر اتنی رقم لگا سکتے ہو تو دیر نہ کرو، یہ بہت اچھا کام ہے۔ اس میں منافع ہی منافع ہے۔'' انہوں نے خوش ہو کر کہا۔
''کل میں رقم کا انتظام کرتا ہوں۔'' کہہ کر میں گھر آ گیا۔ لڑکی کے زیورات کو بیچنے کے بعد مجھے تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار ملے۔ میں رقم لے کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں سے مال اٹھایا اور کئی نئی دکانوں تک پہنچا دیا۔ سارا مال اتنی آسانی سے نکل گیا کہ پتا ہی نہیں چلا۔ تقریباً چار لاکھ روپے ہاتھ آئے، اتنا منافع دیکھ کر میں تو پاگل ہو اٹھا، اتنی بڑی رقم بھی پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اتنی بڑی رقم خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ مگر حقیقت بہار دکھا رہی تھی۔ میں نے بیوی کو

بتایا تو وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔ اس نے پہلا مطالبہ یہ کیا کہ اس گندے علاقے سے نکل کر کسی اچھے علاقے میں گھر لے لیں۔

میں نے وعدہ کیا کہ بہت جلد تمہارا یہ خواب بھی پورا کر دوں گا مگر اس نے تو پیش قدمی کر دی۔ ایک اسٹیٹ ایجنٹ کے پاس پہنچ گئی کہ کسی اچھے علاقے میں مکان چاہیے۔ اچھے علاقے میں اس وقت پندرہ بیس لاکھ سے کم میں گھر نہیں آتا تھا۔ اتنی رقم میرے پاس تھی نہیں، صرف امیدیں تھیں۔ بیوی کا حوصلہ تھا، اس کا کہنا تھا کہ انہی پیسوں سے کام آگے بڑھاتے رہو۔ اب میں اسے کیسے سمجھاتا کہ ریجیکٹڈ مال ہر روز نہیں ملتا۔ اس کے لیے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ سال کے سال مال نکلتا ہے۔ جب یہ بات اسے معلوم ہوئی اس نے کہا۔ "اس شہر میں اور بھی تو کارخانے ہیں وہاں جا کر معلوم کرو۔"

یہ مشورہ معقول تھا، میں نے منیجر صاحب سے ذکر کیا تو انہوں نے بھی اس خیال کو سراہا بلکہ ایک احسان بھی کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہر روز تم ایک گھنٹا پہلے آجاؤ اور دو گھنٹا پہلے نکل جاؤ۔ اس وقفے کا فائدہ اٹھاؤ اور دوسرے کارخانوں میں جا کر پتا کرو۔ جہاں سے جو ملے اسے خرید لو۔

اب تک میں بسوں میں سفر کرتا تھا۔ وقت کی بچت کے لیے میں نے بائیک لے لی اور جی جان سے کام میں لگ گیا۔ قسمت کی دیوی مہربان تھی، ایک کے بعد دوسرا کنٹریکٹ ملنے لگا۔ کہیں سے رنگ کے ڈبے اٹھاتا اور کہیں سے ریجیکٹڈ کپڑوں کے تھان، کسی سے سینڈلوں کا اسٹاک لیتا تو کسی سے کاسمیٹک، جہاں سے جو اٹھاتا دو کوڑیوں کے مول اٹھاتا مگر بکتا تو سونے کے بھاؤ بکتا گویا دولت کی بارش ہو رہی تھی۔ ایسی بارش کہ سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ صرف ایک سال میں حالات اتنے بدل گئے کہ اب لوگ مجھے فخرو کی بجائے فخر الدین صاحب کہنے لگے۔ میں نے رہائش بدلی، بیگم نے حلیہ بدلا۔ اب وہ زیادہ وقت بناؤ سنگھار میں، زیورات کی خریداری میں، ملبوسات کے انتخاب میں صرف کرتی۔ اس کا کہنا تھا کہ اب اسے دوسروں کو خاموش نگاہوں سے بتانا ضروری ہے کہ وہ سیٹھ فخر الدین کی بیوی ہے۔ واقعی اس میں بہت تبدیلی آگئی تھی۔ مگر میں خود کو تبدیل نہیں کر پایا تھا۔ میں اب بھی شلوار سوٹ اور پشاوری چپل میں نظر آتا تھا۔ تبدیلی اس گونگی لڑکی میں بھی نہیں آئی تھی جسے میں خوش بخت کے نام سے پکارتا تھا، اس کے ماضی سے اب تک لاعلم تھا۔ وہ بول نہیں سکتی تھی اس لیے اس نے اپنا نام بتایا نہیں تھا۔ اپنے بارے میں بتا بھی تو نہیں سکتی تھی کہ وہ کون ہے کہاں سے آئی ہے۔ والدین کہاں ہیں؟ کیا کرتے ہیں، اسے پکارنے کے لیے ایک نام کی اشد ضرورت تھی۔ اسی لیے میں نے خود ہی یہ نام رکھ دیا تھا۔ نام انسان کی پہچان ہے۔ اور وہ واقعی ہی اسم بہ اسمی تھی۔ میرے لیے تو خوش قسمتی کی دیوی ثابت ہوئی تھی۔ میرے حالات اس کے آنے کے بعد ہی تو بدلے تھے۔ اس لیے مجھے تجسس بھی نہیں تھا کہ میں معلوم کروں۔ میں چاہتا بھی نہیں تھا کہ وہ یہاں سے، میرے گھر سے جائے، مگر میری بیوی کو چین نہیں تھا۔ خوش بخت اکیلی نوکرانیوں کا کام نمٹاتی تھی۔ اسی وجہ سے بیگم کو وافر مقدار میں خود پر صرف کرنے کو وقت مل رہا تھا پھر بھی اسے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ہر دو چار روز میں وہ گردان ضرور کرتی کہ اس لڑکی کو بھگاؤ۔ دراصل اسے اس کی خوب صورتی سے ڈر لگا رہتا تھا۔ وہ ہمہ وقت ٹوہ میں رہتی کہ میں اس سے کتنی بار ملتا ہوں۔ کیسی اور کیا باتیں کرتا ہوں۔ کئی بار اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں کہا بھی کہ میں اس سے عشق کرنے لگا ہوں۔ اسے میں نے کئی بار سمجھایا بھی کہ اللہ کی بندی، کچھ تو خوف خدا کر۔ وہ ایک بے زبان لڑکی ہے۔ ایسی مخلوق سے پنگا نہ لینا پھر بھی وہ دنگا کرنے پر تیار رہتی تھی۔ کیونکہ جیسے، جیسے خوش حالی آرہی تھی ویسے اس کے دل میں ڈر بیٹھتا جا رہا تھا کہ کہیں میں اسے چلتا نہ کر دوں۔ خوش بخت کو بیوی بنالوں۔

ایک دن میں وقت سے پہلے گھر آگیا۔ نوکری تو کب کا چھوڑ چکا تھا۔ اس لیے وقت اپنا تھا۔ جب چاہتا گھر سے نکلتا اور جب دل کرتا گھر لوٹ آتا۔ اس دن بھی وقت سے پہلے آگیا تھا اسی لیے وہ منظر دیکھ لیا۔ اس منظر نے مجھے اندر تک ہلا دیا تھا۔ میں نے دروازے سے چیخ کر کہا۔ "اری بد بخت یہ تو کیا کر رہی ہے۔ کیوں خوش بخت کو پیٹ رہی ہے۔"

"یہ میرے سینے پر مونگ دلنے آئی ہے۔ میں اسے اپنے گھر میں ایک لمحے کو برداشت نہیں کر سکتی۔"

"ایسا کیا کر دیا اس بیچاری نے۔"

"مسز صدیقی بتا رہی تھیں کہ ان کے بھائی نے بھی ایک لڑکی کو سہارا دیا تھا اور اب وہ لڑکی ان کی بھابی بن کر راج کر رہی ہے۔ میں اس گھر میں ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گی۔" اس نے چیخ کر کہا۔

''ایسی بے وقوفی تمہاری سہیلیاں ہی کرسکتی ہیں جو بے بات کی بات پیدا کررہی ہیں۔ کان کھول کر سن لو، تمہیں اس لڑکی کو برداشت کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ یہ واقعی خوش بخت ہے۔ خوش قسمتی کی جیتی جاگتی دیوی ہے۔ اس کے آنے سے ہی ہمارے گھر میں خوش حالی آئی ہے۔ ورنہ کیا تھا یہاں، مہینے کے آخری دنوں میں قرض پر گزارہ ہوتا تھا۔ خود تمہارے پاس ایک دو ہی اچھے جوڑے تھے۔ ایک چپلی سی چین تک نہیں تھی مگر آج..... آج دیکھو اپنے وارڈ روب کو' کپڑوں سے بھرا ہوا ہے۔ سیف میں زیورات اٹے ہوئے ہیں۔ یہ سب اسی کے قدموں کی برکت ہے۔'' میں نے بھی چیخ کر جواباً کہا۔

''مائی فٹ۔'' آج کل وہ محفلوں میں آنے جانے کے لیے انگلش سیکھ رہی تھی اور رعب ڈالنے کے لیے وقت بے وقت انگلش کے جملے بولتی تھی۔

''مائی فٹ نہیں گرین فٹ..... سبز پیری ہے تو..... کیوں اپنی اوقات دکھارہی ہے۔ تیرے آنے سے مجھے صرف پریشانیاں ملی ہیں۔ جب کہ اس معصوم کے آنے سے خوشیاں ہی خوشیاں ملیں۔''

''ہاں ہاں میں خوب سمجھتی ہوں۔ محنت خود کرتے ہیں اور کریڈیٹ اس کو دیتے ہیں۔''

''ایسا میں کیوں کرنے لگا۔ کیا میں تم سے ڈرتا ہوں جو جھوٹ بولوں گا۔ تم خود دیکھ نہیں رہیں کہ حالات کس تیزی سے بدلے ہیں۔''

''تم مردوں کی چال خوب سمجھتی ہوں۔ اس کی صورت شکل اچھی دیکھ لی تو ایک پلان کے تحت کام کرنا شروع کردیا مگر میں کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔''

یہ جنگ ابھی اور طوالت پکڑتی کہ ڈور بیل بج اٹھی۔ میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور بیوی سے کہا۔ ''تم اپنے کمرے میں جاؤ۔''

وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی مگر دروازے پر پہنچ کر رک گئی۔ پھر بولی ''جا کر دروازہ کھولیں۔ امجد آیا ہوگا۔''

میں نے دروازے پر پہنچ کر لاک کھولا تو سامنے امجد کھڑا تھا۔ وہ رضیہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ موصوف پان کا کیبن چلاتے تھے مگر اب اپنی باجی کی مہربانی سے ایک جنرل اسٹور کے مالک بن چکے تھے۔ میں سب کچھ سمجھتا تھا مگر بولتا نہیں تھا۔ کیونکہ دسترخوان کا بچا ہوا اگر کسی کے کام آجائے تو برا کیا تھا۔ پھر وہ میری شریکِ حیات کا بھائی تھا اگر وہ بہن کی مدد سے اپنی زندگی سنوار رہا تھا تو اس میں برائی کیا تھی۔

موصوف اندر آتے ہی مجھ پر آنکھیں تریرنے لگے۔ انداز تخاطب کی گرمی نے میرا مزاج گرم کردیا۔ پہلے بہن دماغ کی دہی بنا چکی تھی۔ اب یہ آگئے تھے۔ میں نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر کہا۔ ''ہاں ذرا پھر کہنا کیا کہہ رہے تھے۔''

موصوف نے شاید میرے جملے کی کاٹ کو سمجھا نہیں فوراً بولے۔ ''میں کہے دیتا ہوں، میری باجی کو اکیلا مت سمجھیے گا۔ ہم چار بھائی ہیں۔ اسے ذہن میں رکھ کر فیصلہ کیجیے گا۔''

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں جواب گھونسے سے دیتا۔ ایک ہی گھونسے سے اس کے دانت اور اس کی باجی کا سر پھوڑ دیتا۔ مگر یہ بے وقوفی ہوتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ مجھ پر تعزیرات پاکستان کی دفعہ 307 لگتی اور میں حوالات میں پہنچ جاتا۔ دانا کہتے ہیں کھانا ٹھنڈا کرکے کھانے میں مزہ ہے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ موصوف شیر ہوگئے۔ لگے فرمانے۔ ''اس گونگی کو اسی وقت نکال باہر کریں ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔''

میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو رکھا اور اس سے کہا۔ ''ایک کام کرتے ہیں تمہارے ابا کے پاس چلتے ہیں۔ وہیں بیٹھ کر باقی باتیں کرلیتے ہیں۔''

''ہاں، ہاں یہی اچھا ہوگا۔ وہاں چل کر فیصلہ کرلیتے ہیں۔'' وہ اپنے زعم میں آستین اوپر کرتے ہوئے کہتا چلا گیا اور میں غصے میں بھرتا چلا گیا۔

''ابھی چلتے ہیں۔ ذرا ایک دوست کو فون کرلوں۔'' کہہ کر میں فون کی طرف بڑھا اور اپنے ایک دوست کا نمبر ملانے لگا۔ نمبر ملتے ہی اس سے بولا کہ تم ذرا رضیہ کے گھر آجانا ایک ضروری بات کرنی ہے۔ رضیہ کے علم میں یہ بات تھی کہ میں نے جسے فون کیا ہے وہ نادر کا نامی گرامی شخص ہے۔ کہنے کو اس کی ایک بڑی سی دکان تھی اور وہ کپڑوں کا کاروبار کرتا تھا۔ مجھ سے رجیکٹڈ تھان خریدتا تھا۔ کل بھی وہ اسی سلسلے میں آچکا تھا مگر یہ سب دکھاوا تھا۔ وہ بھتہ خور تھا۔ بدمعاشی کے پیسوں پر اس کا گزارہ تھا۔ فون رکھ کر میں نے الماری سے کچھ کاغذات نکالے اور باہر نکل آیا۔ وہ دونوں بھائی، بہن بھی باہر آگئے۔ میں نے ٹیکسی لی اور نادر کی طرف چل پڑا کہ وہیں رضیہ کا گھر تھا۔

وہ دونوں خوش تھے کہ اپنے گھر میں مجھے خوب بے عزت کریں گے۔ اپنی شرائط منوائیں گے۔ مگر ان کے گھر پہنچتے ہی

میں نے پانسہ ہی پلٹ دیا۔ میں نے اس کے ابا سے کہا۔ ”آپ سے ایک ضروری بات کہنی تھی اسی لیے آیا ہوں۔“

”ہاں ہاں کہو۔“ وہ آج کل کچھ زیادہ ہی مہربان تھے ورنہ وہ یہی تھے جو مجھ سے بھاگتے تھے کہ کہیں میں ان سے کوئی سوال نہ کردوں۔ کچھ مانگ نہ لوں لیکن جب سے میرے حالات بدلے تھے جس کا اثر ان کے گھر پر بھی پڑا تھا اب وہ میرے لیے مہربان بن گئے تھے۔ مشورہ بھی کرنے لگے تھے۔ گھر کے مسائل بھی ڈسکس کرتے تھے۔

میں نے رضیہ اور اس کے بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں میری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ”ابھی نوشاد آتا ہی ہوگا۔ اس کے آنے سے پہلے ہی میں اپنی بات ختم کرلینا چاہتا ہوں آپ کو تو معلوم ہی ہے نوشاد کس قماش کا آدمی ہے۔ باقی کی باتیں وہی کرے گا۔ فی الحال تو میں ایک پرانی بات بتادوں۔ آپ کو بھی یاد ہوگا جس دن میری منگنی ہوئی اسی دن میرا شناختی کارڈ اور پانچ سو روپے گر گئے۔ پھر جب شادی ہوئی تو میری نوکری جاتی رہی مگر میں نے حوصلہ نہیں ہارا اور تگ و دو میں لگا رہا۔ پھر ایک دن ایک لڑکی ملی میں اسے انسانیت اور خدا ترسی کے تحت گھر لے آیا۔ اس کے آتے ہی قسمت کے دروازے کھل گئے اور مجھے ماننا پڑا کہ دولت عورت کی قسمت سے آتی ہے۔ وہ عورت واقعی خوش قسمتی کی دیوی ثابت ہوئی مگر آپ کی بیٹی اسے گھر سے نکالنے کی ضد کررہی ہے۔“

”ہاں، ہاں اسے میں ایک لمحے کے لیے بھی گھر میں برداشت نہیں کرسکتی۔“ رضیہ نے چیخ کر کہا۔

”صحیح کہا۔ بدقسمتی، خوش قسمتی کو کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے یہی کہنا ہے کہ میں خوش قسمتی کے آگے بدقسمتی کو برداشت نہیں کرسکتا۔ اس لیے......“

”ہاں، ہاں تم نے تو یہ سارا گھڑاک ہی اسی لیے پھیلایا ہے۔ کان کھول کر سن لو کہ اب میں اس گھر میں تب تک نہیں جاؤں گی جب تک وہ کمینی رہے گی۔“

”ہاں، ہاں میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اب تم یہیں رہو اور اس کے لیے میں تمہیں طلاق دیتا ہوں طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔“

میرے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ نے سب پر سکتہ طاری کردیا تھا۔ میں نے آگے کہا۔ ”باقی کی باتیں نوشاد آکر کرے گا۔ اگر کسی نے چوں بھی کیا تو وہ اس کے ساتھ خود نمٹ لے گا۔“ اتنا کہا ہی تھا کہ دروازے پر نوشاد کی پکار آئی۔

میں نے کہا۔ ”لو نوشاد بھی آگیا۔ وہ تمہیں حق مہر کی رقم دینے نہیں دے گا پھر بھی میں شرافت کے ساتھ حق مہر کی رقم دے رہا ہوں...... یہ رہے پچاس ہزار روپے......“ اتنا کہہ کر میں باہر نکل آیا۔

مجھے پتا تھا کہ اس وقت تو سب نوشاد کے خوف سے خاموش رہ گئے مگر میرے نکلتے ہی جنگ عظیم سوم شروع ہوگئی ہوگی۔ بہن سارا الزام بھائی پر اور بھائی، بہن پر دے رہا ہوگا۔ مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ جو میں کرنا نہیں چاہتا تھا وہ کر آیا تھا۔ صرف امجد کی آنکھیں دکھانے کی وجہ سے۔ اگر وہ مجھے للکارنے کی جسارت نہ کرتا تو میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھاتا۔

نوشاد کے ساتھ دو تین دکانوں کا چکر لگایا اور گھر واپس گھر آگیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ جو ہونا تھا ہوگیا۔ خوش بخت گونگی ہے تو کیا ہوا نک سک سے تو بری نہیں ہے۔ اچھا ہی ہے کہ گونگی ہے۔ کبھی کچھ بولے گی نہیں۔ اس لیے اس کے ساتھ ابھی نکاح پڑھوا لوں گا اور آج ہی ہنی مون ٹریپ پر سوات چل دوں گا۔

دل ہی دل میں پروگرام بناتا ہوا گھر میں داخل ہوا مگر یہ کیا؟ گھر خالی پڑا تھا۔ اکلوتی نوکرانی جو صرف ایک گھنٹے کے لیے برتن دھونے آتی تھی وہ بیٹھی تھی۔ اس نے بتایا کہ خوش بخت اشاروں میں اسے سمجھا گئی ہے کہ وہ میرا گھر ٹوٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی اس لیے جارہی ہے، کہاں یہ خود اسے بھی معلوم نہیں۔

اتنا سنتے ہی میں گھر سے بھاگا اور آس پاس کا تمام علاقہ دیکھ آیا مگر وہ کہیں نہیں ملی۔ کافی عرصہ تک میں اسے ڈھونڈتا رہا مگر وہ نہ ملی۔

وہ کیا گئی میری خوش قسمتی بھی ساتھ لے گئی۔ پے در پے نقصان ہونا شروع ہوگئے۔ رنگ کے کنستر خریدے تو سب کے سب لیک والے نکلے جس میں رنگ پوری طرح جم کر خراب ہوچکا تھا۔ کپڑوں کے تھان خریدے تو ایسڈ والے رنگ کی چھپائی والا نکلا۔ جس کی وجہ سے کپڑے گلے ہوئے تھے۔ اسی طرح کئی ایک سودے میں بھاری نقصان ہوا اور میں دیکھتے ہی دیکھتے قلاش ہوگیا۔ گویا بڑے، بوڑھے صحیح کہتے ہیں کہ دولت عورت کی قسمت سے آتی ہے اسی لیے میں ایک کے بعد ایک شادی کرتا چلا جارہا ہوں کہ کوئی تو خوش قسمت نکلے گی۔
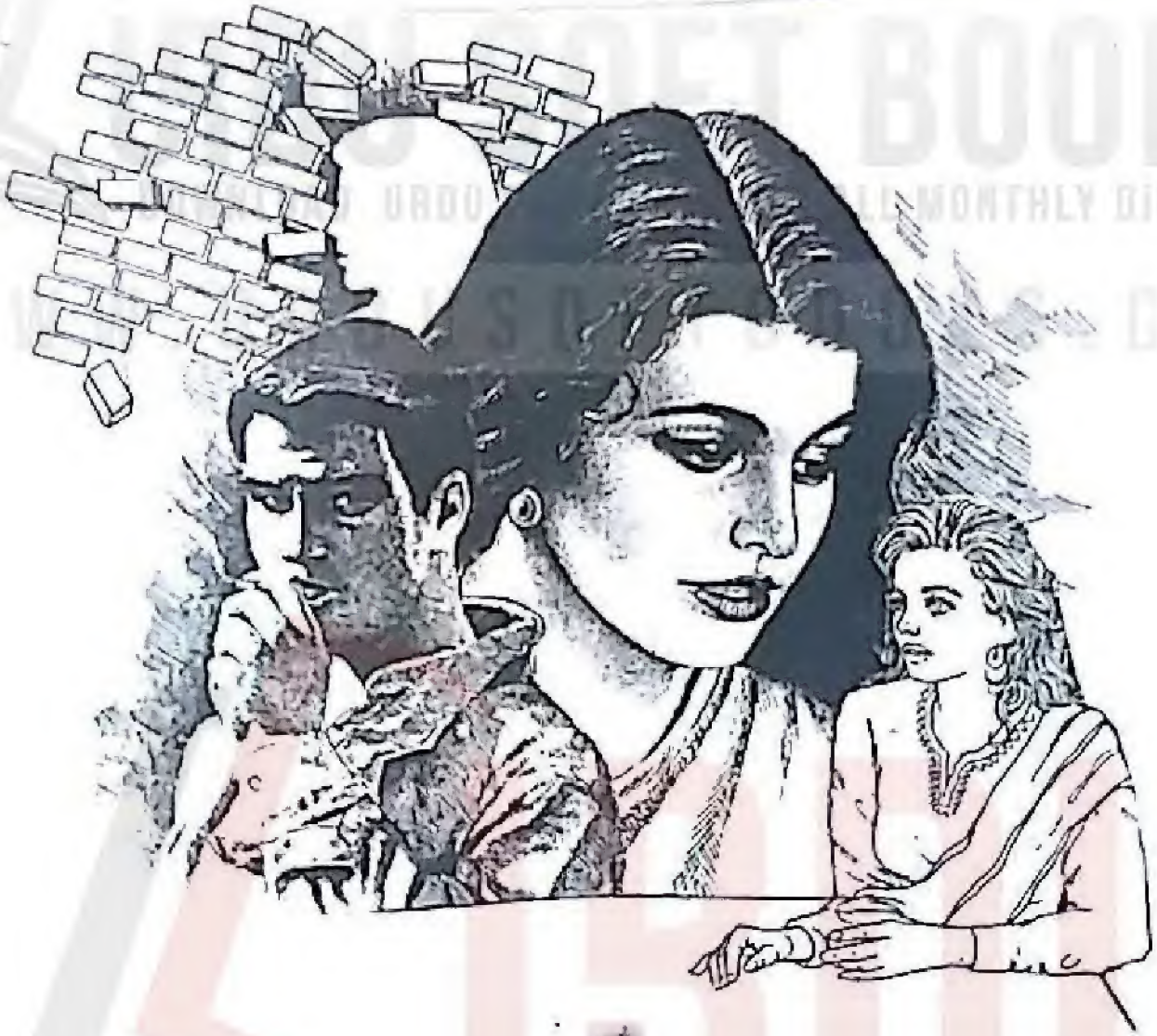
محبت گزیدہ

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
امید قوی ہے کہ میری آپ بیتی آپ کو بھی پسند آئے گی۔
گوکہ اس سچ بیانی کی مرکزی کردار نیلم ہے مگر میرا رول بھی بہت اہم رہا ہے۔ پڑھنے والے خود بھی یہی کہیں گے کہ مرکزی کردار کے ساتھ میرا کردار بھی اہم ہے۔

مونا
(لاہور)

مجھے بچپن سے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ میں نے ڈاکٹر بننے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن انسان کی ہر خواہش کب پوری ہوتی ہے۔ صرف چند نمبروں کی کمی سے میڈیکل میں میرا ایڈمیشن نہیں ہوسکا۔ میں نے دلبرداشتہ ہوکر بی ایس سی میں ایڈمیشن لے لیا۔ بی ایس سی کرنے کے بعد مجھے شہر کی ایک بہت بڑی لیبارٹری میں ملازمت مل گئی۔ یہ کام مجھے پسند آیا اور میں جی جان سے اس میں لگ گئی۔

☆......☆

میں نے بلڈ سیمپل سات کا بلڈ چیکنگ مشین میں بند کیا اور ریڈنگ کے لیے بٹن دبا دیا۔ دوسرے ہی لمحے ریڈنگ اسکرین پر ابھرنے والے بلڈ کمپوزیشن ریڈنگ نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے ٹیسٹ دوبارہ، پھر تیسری مرتبہ کیا۔ ہر مرتبہ ریڈنگ وہی تھی۔ میرا سر بری طرح چکرانے لگا۔ میں بہ مشکل اپنی کرسی تک پہنچی اور اس پر ڈھے گئی۔

میری اسسٹنٹ نورین اپنا کام چھوڑ کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے تشویش سے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے میڈم!''

''پلیز مجھے ایک گلاس پانی پلا دو۔'' میں نے اپنے لرزتے جسم پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

نورین نے مجھے پانی دیا۔ میں نے ایک سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا۔ پھر نورین سے کہا۔ ''نورین! تم ذرا بلڈ سیمپل کی ایک مرتبہ پھر ریڈنگ کرو۔''

نورین میری بات پر چونکی۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ میں خود ٹیسٹ کرنے کے بعد نورین سے دوبارہ ٹیسٹ کرنے کو کہوں۔

اس نے الجھے ہوئے انداز میں مجھے دیکھا اور ریڈنگ لینے چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے وہی رپورٹ میرے سامنے رکھ دی جو میں پہلے خود چیک کر چکی تھی۔

''اوہ نو!'' میں نے بڑبڑا کر کہا۔ ''یہ ریڈنگ تو خاصی ایب نارمل کنڈیشن ظاہر کر رہی ہے۔'' میں نے تشویش سے کہا۔ ''نورین! یہ ناصر ہی کا بلڈ سیمپل ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی میڈم!'' اس نے جواب دیا۔ ''آپ نے خود ہی تو یہ سیمپل لیا تھا۔'' نورین نے کہا۔

''شاید..... شاید کہیں کوئی غلطی ہو رہی ہے۔ تم پلیز، اس بلڈ سیمپل کو ایک مرتبہ پھر چیک کر لو۔

نورین نے مجھے یوں دیکھا جیسے اسے میرے ذہنی توازن پر شبہ ہو۔

مجھے کچھ کہے بغیر وہ دوبارہ ریڈنگ مشین کی طرف بڑھ گئی اور دوبارہ رزلٹ لے کر آئی تو ریڈنگ وہی تھی۔

میں نے سر پکڑ لیا اور کہا۔ ''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

''ایکسکیوزمی میڈم!'' نورین نے کہا۔ ''آپ اتنی پریشان کیوں ہیں۔ یہ ناصر صاحب آپ کے کوئی رشتے دار یا عزیز ہیں؟''

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ناصر سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن وہ میری ایک بہت اچھی اور پیاری دوست نیلم کا منگیتر ہے۔''

''اچھا اچھا، آپ کی وہ دوست جو یہاں ایڈمنسٹریشن میں ہوتی ہیں۔''

''ہاں وہی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس معصوم اور مخلص لڑکی کا دل تو ریزہ ریزہ ہو جائے گا نورین۔ میں کس طرح اسے بتاؤں کہ.....؟''

''تو کیا نیلم! اپنے منگیتر کو خود یہاں لائی تھی؟'' نورین نے پوچھا۔

''ناصر کو تو وہ ڈاکٹر ابرار کے پاس لائی تھی۔ اسے کئی دن سے بخار آ رہا تھا۔ پہلے تو وہ اپنے محلے ہی کے ایک ڈاکٹر سے علاج کرتا رہا جب افاقہ نہ ہوا تو نیلم اسے ڈاکٹر ابرار کے پاس لے آئی۔''

ڈاکٹر ابرار نے اس کے کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیے تھے۔ نیلم کے کہنے پر میں نے وہ ٹیسٹ یہاں کر دیے لیکن اس کی بلڈ ریڈنگ نے تو مجھے شدید تشویش میں مبتلا کر دیا ہے نورین۔ اللہ کرے وہ کچھ نہ ہو جو میں سمجھ رہی ہوں۔''

نورین خاموشی سے میری بات سنتی رہی۔

''نورین پلیز تم ذرا باقی کام نمٹا دو۔ مجھے تو اس رپورٹس نے لرزا کر رکھ دیا ہے۔ اب مجھ سے کوئی کام بھی ڈھنگ سے نہیں ہوگا۔''

میں نورین کو ہدایات دے کر دوسرے روم میں جا کر بیٹھ گئی تاکہ کچھ آرام کر سکوں۔

میں کوئی کمزور دل لڑکی نہیں تھی کہ یہ ریڈنگ دیکھ کر پریشان ہو جاتی۔ مجھے اسپتال میں موجود اس لیبارٹری سے منسلک ہوئے پانچ سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ میں نے اس دوران میں بے شمار تڑپتے سسکتے مریض دیکھے تھے۔ بہت سے جلے کٹے مریضوں کا انتہائی بری حالت میں خون ٹیسٹ کیا تھا۔ میں اس کام میں اتنی ماہر اور ایکٹو تھی کہ ڈاکٹرز سمیت تمام عملہ میری عزت کرتا اور مجھے اپنے کام میں قابل تصور کرتا تھا۔ جبھی اتنی بڑی پیتھالوجیکل لیب کا انچارج بنایا ہوا تھا مگر اس وقت میں تنہا کمرے میں بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ اندیشے میں گھری سوچوں کی وادی میں گم تھی۔

نیلم سے میری دوستی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ ہم کالج کے زمانے سے ایک دوسرے کے دوست، غم خوار اور رازدار تھے، ہم نے ساتھ انٹر کیا، پھر اس نے میری

طرح بی ایس سی کی بجائے بی اے کو ترجیح دی لیکن ایک ہی کالج میں رہے۔ ہمارے گھر بھی قریب قریب تھے۔

ہماری اتنی اچھی دوستی کا مطلب یہ نہ تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے ہم مزاج تھے، ہمارے مزاجوں میں بہت فرق تھا۔ نیلم بہت نرم دل، حساس، خوابوں خیالوں میں رہنے والی، حسن پرست، دھنک، خوشبو، برسات کی دلدادہ اور دل میں لوگوں کے لیے محبت ہمدردی رکھنے والی بہت سادہ مزاج لڑکی جو لوگوں پر جلد اعتبار کرلیتی تھی۔ اس سے کبھی مجھے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا لیکن اس کی بے ضرر طبیعت سادگی اور محبت نے مجھے مائل کررکھا تھا۔

وہ مجھ سے دل کی ہر بات کہہ دیتی تھی۔ میں حیران ہوتی، اسے سمجھاتی کہ دیکھو! میری طرح سب دوسروں کے معمولات چھپانے والے نہیں ہوتے۔ اس لیے آئندہ ایسی باتیں کسی سے نہ کرنا اور چاہو تو مجھ سے بھی چھپانا۔ میرا ایسی محبت بھرا انداز اس کے دل میں میرے لیے اور اعتماد بڑھا دیتا۔

میں نے بی ایس سی کے بعد اس اسپتال کی لیب جوائن کرلی اور دو سال ہی میں میری مہارت اور قابلیت دیکھتے ہوئے انتظامیہ نے مجھے اس لیب کا انچارج مقرر کردیا۔ میرا مزاج پریکٹیکل تھا۔ نیلم کے مزاج میں آئیڈیل پسندی اور رومانس تھا۔ تذبذب تھا، ابھی ابھی بیزار اور افسردہ سی لگتی تو کبھی اس کی شوخی اور شرارت میں بچپن رنگ نظر آتے۔ جانے کیوں مجھے کبھی کبھی اس پر بڑا ترس آتا۔ میرا دل چاہتا اس معصوم سی بے ضرر، محبت کرنے والی لڑکی کو اپنی بانہوں میں چھپالوں، کہیں اسے زمانے کی عیاریوں اور خودغرضیوں کی ہوا نہ لگ جائے۔ کہیں اس کا شیشے سا نازک دل لوگوں کی فریب کاریوں سے ٹوٹ نہ جائے لیکن جب بھی وہ مجھ سے کسی پریشانی کا اظہار کرتی کسی شخص کی اچھائیوں کے بارے میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتی۔ میں اس کا تجزیہ کرتی جاتی اس کی ایک ایک بات سنتی اور اسے زمانے کے سرد ولرم سمجھانے اور لوگوں سے ہوشیار رہنے کی تلقین کرتی۔ وہ میری ساری باتیں سن تو لیتی مگر دامن جھاڑ کر اٹھتی اور پھر وہی کرتی جو اس کا پاگل دل کہتا۔ جب وہ کسی شخص سے فریب کھاتی تو پھر میرے ہی پاس آکر ان کا رونا روتی اور کہتی، ہاں تم نے صحیح کہا تھا مگر میں کیوں کسی کو بلاوجہ غلط سمجھوں، کیوں شاکی رہوں؟ اور کچھ دن بعد وہ پھر ویسی ہوجاتی۔

نیلم کے گھریلو حالات بھی میری نظر میں تھے۔ وہ لوگ مالی طور پر بھی کمزور تھے۔ اس کے بڑے بھائی اور والد ان کے گھر کا بوجھ اٹھا رہے تھے۔ پھر نیلم سمیت تین بہنیں اور تھیں۔ ان کے گھر میں وہی متوسط طبقے والے معاشی اور شادی کے مسئلے تھے۔ نیلم سے بڑی بہن بھی گریجویشن کے بعد گھر بیٹھ گئی تھی۔ کچھ معمولی شکل اور سانولے رنگ کی وجہ سے اور کچھ ان کی اپنی اونچی پسند کی وجہ سے رشتہ نہ ہو پاتا تھا اور ان کی عمر پینتیس۔۔۔ سے اوپر پہنچ چکی تھی۔

نیلم کا رنگ تو صاف تھا مگر نہ اس میں امور خانہ داری سیکھنے کا شوق تھا اور نہ پڑھنے کی لگن۔ انٹر سائنس کرکے بڑی مشکل سے میرے سمجھانے پر اس نے بی اے کیا تھا۔

اسپتال کی لیب جوائن کرتے ہی میں نے نیلم کو بھی ایکٹو کرنے کی کوششیں کیں کہ کہیں جاب کرے تاکہ ذہن بے کار نہ رہے اور پھر میں نے کچھ عرصے بعد اسے بھی اپنے اسپتال کے ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ لگوادیا۔

کالج کے زمانے میں جب میری نیلم سے دوستی ہوئی تو اس وقت وہ اپنے کزن کی محبت میں مبتلا تھی۔ وہ لڑکا ارشد نیلم سے بڑا تھا مگر تین سال میں انٹر مکمل نہ کرپایا اور کسی ٹیکنیکل کورس میں لگ گیا۔ نیلم اس کے اہمیت دیئے جانے پر دل و جان سے فدا تھی۔ اس کے محبت بھرے خطوط مجھے لاکر دکھاتی۔ اس سے ملاقات میں اس کی طرف سے اشاروں کنایوں میں کیے جانے والے عہدو پیمان بتاتی۔

مجھے وہ لڑکا کبھی بھی نیلم سے مخلص محسوس نہ ہوا، اس لیے میں نیلم کو سمجھاتی کہ شادی اور محبت میں ایسے غیر ذمے دار لوگ کہاں مخلص ہوسکتے ہیں۔ یہ سب خواب شادی کے بعد عقل پر پتھر بن کر برستے ہیں لیکن ان معاملات میں کسی کو بھی سمجھانا بہت مشکل ہوتا ہے اور یہ تو پھر نیلم تھی محض خوابوں کی اہمیت اور محبت کی پیاسی۔

نیلم کو ہوش آیا تو اس وقت جب ارشد اپنے کورس کی بنیاد پر سعودی عرب کی ایک کمپنی میں ٹیکنیشن کی جاب حاصل کرکے اسے نظرانداز کرکے کچھ کہے سنے بغیر سعودی عرب چلا گیا۔ نیلم کا نازک شیشے سا دل تو چیخ کر رہ گیا۔

نیلم میرے سینے سے لگ کر خوب روئی۔ وہ روتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی۔ ''ہاں مونا! تم صحیح کہتی تھیں۔ وہ تو بہت خراب نکلا چلا جاتا وہ، میں کب روکتی اسے مگر مجھے بتاتا تو۔ وہ تو مجھ سے شادی کے لیے بہ ضد تھا۔ میرے بغیر اس کا ایک لمحہ نہ گزرتا تھا، لیکن اب...... اب وہاں کیسے رہے

گا..... جھوٹا دغاباز! میں اس کے لیے یہ اہمیت رکھتی تھی، یہ محبت تھی اسے مجھ سے؟''

میں نیلم کو تسلیاں دیتی رہی۔ جب وہ رو رو کر اپنا غبار نکال چکی تو میں نے کہا۔ ''چھوڑ نیلم تم اس کے لیے کیوں اپنا جی جلاتی ہو۔ تم اس سے زیادہ تعلیم یافتہ ہو، بس اب یہ جذباتیت چھوڑ دو۔ میں نے تمہارے لیے اسپتال میں اسسٹنٹ کی جاب کا بندوبست کر دیا ہے۔ اپنے آپ کو قابل اور اہم بناؤ۔ وہ تمہارے قابل نہ تھا اسے بھول جاؤ اور مستقبل کی طرف دیکھو۔''

یوں نیلم میرے ساتھ ہی جاب کرنے لگی صرف ہمارے ڈیپارٹمنٹ مختلف تھے۔

مجھے جاب کرتے ہوئے دو سال اور نیلم کو ایک سال ہو چکا تھا۔ وہ ارشد کو بھول چکی تھی۔ ایک دن اس نے بتایا کہ اس کے ڈیپارٹمنٹ کا لڑکا فیروز اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔

میں نے خاموشی سے سنا اور ٹال دیا۔ اب موقع بہ موقع ملاقاتوں میں نیلم کے پاس بات کرنے کا موضوع صرف فیروز ہوتا تھا۔ وہ لوگ کبھی کبھار کھانے کے وقفے میں یا کام کر کے میرے پاس لیب میں آجاتے۔ یوں فیروز سے میری بھی اچھی شناسائی ہوگئی۔

لمبی چوڑی جسامت، فرنچ کٹ داڑھی اور اس پر چشمہ لگائے فیروز واقعی پروقار اور سنجیدہ شخصیت محسوس ہوتا۔

فیروز ہمارے اسپتال میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ اس کے علاوہ اچھی کتب کے مطالعے اور حالاتِ حاضرہ سے دلچسپی نے اس کی معلومات اور انداز گفتگو کو بڑا مہذب اور عالمانہ بنا دیا تھا۔ نیلم سے اس کا متاثر ہو جانا، میرے لیے کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی لیکن مجھے اس بات سے کوئی خوشی اس لیے نہ ہوئی کہ میں نے فیروز میں کبھی نیلم کے لیے دلچسپی محسوس نہیں کی۔

فیروز سے جب بھی میری ملاقات ہوتی تو گفتگو آفس کے معاملات یا حالاتِ حاضر پر بھی ہوتی لیکن نیلم کے ذریعے مجھے اس کی کچھ نجی زندگی کے متعلق بھی پتا چل چکا تھا۔ اس کی وجہ کچھ تو نیلم کی ہمدرد طبیعت تھی اور کچھ فیروز میں دلچسپی لینے سے تجسس کا جذبہ۔ ایک دن وہ بڑے زور و شور سے مجھے بتا رہی تھی۔ ''یار مونا! پتا ہے فیروز بے چارے کی والدہ سخت بیمار ہیں۔''

''اچھا تمہیں کس نے بتایا؟''

''وہ جو میرے ساتھ کام کرتے ہیں وہ کسی سے تذکرہ کر رہے تھے۔''

''اچھا اسی لیے وہ تین دن سے نظر نہیں آیا۔''

''اس کی تین بہنیں ہیں اور سنا ہے کہ اس کی کسی بہن کی منگنی ٹوٹ گئی ہے۔''

''اچھا، کیوں؟''

''بھئی اس لڑکے کی عادتیں اچھی نہیں تھیں اور وہ نشے کا عادی بھی تھا۔ فیروز کے والد کو معلوم ہوا تو انہوں نے اپنی بیٹی کی منگنی توڑ دی۔''

''اوہ، بہت افسوس ہوا، بھئی آج کل تو کسی پر اعتماد کرنا بھی کتنا مشکل ہے۔ میرے خیال میں اسی لیے فیروز کی والدہ کی طبیعت خراب ہوئی ہوگی، آخر ماں ہے ناں، بیٹیوں کے دکھ تو پیدائش کے ساتھ ہی محسوس کر لیتی ہے۔'' مجھے اس واقعے پر عورت کی مظلومیت کے سارے دکھ یاد آ گئے۔

''لڑکیوں کی زندگی اتنی مشکل کیوں ہوتی ہے مونا۔'' نیلم نے معصومانہ انداز سے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ہونہہ، پتا نہیں۔'' میں نے اسے ٹالنا چاہا۔

''فیروز کتنا افسردہ ہوگا۔'' نیلم نے خود کلامی کی۔

جس دن فیروز آفس آیا، نیلم اسے لے کر میرے پاس آ گئی۔ میں نے فیروز سے اس کی والدہ کی خیریت پوچھی تو اس نے بتایا کہ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ اب طبیعت بہتر ہے۔

فیروز بہت پریشان اور غمزدہ سا لگ رہا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ لڑکوں کے ساتھ بھی کم مشکلات نہیں ہیں۔ روزگار کی تلاش میں بھٹکتے پھرتے ہیں، بڑی مشکل سے کسی جگہ مل جائے تو آفس میں مزدوری سے زیادہ محنت سیاست اور سازشوں میں وقت گزارنا، اپنا مقام بنانا اور گھر لوٹیں تو گھر کی الجھنیں، بیٹیوں بہنوں کی شادی کے مسائل الگ۔ شاید زندگی انہی آزمائشوں کو سہنے کا نام ہے۔

کچھ دن یونہی گزر گئے۔ فیروز کے حالات سن کر مجھے بھی اس سے ہمدردی ہو گئی تھی اور نیلم تو تھی ہی اس کی گھائل۔

ایک دفعہ میں بیمار ہوگئی۔ مجھے تین دن لیب سے چھٹی کرنی پڑی۔ چھٹی کے تیسرے دن شام کو نیلم میرے گھر آ گئی۔ میں سمجھی میری طبیعت پوچھنے آئی ہے لیکن خیریت پوچھنے کے بعد جو کہانی سنا رہی تھی اسے میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے سن رہی تھی۔

"مونا! میں...... میں اب فیروز کے بغیر نہیں رہ سکتی یار! مجھے وہ بہت اچھا لگتا ہے۔"

"تو تم کب اس کے بغیر رہتی ہو، سارا دن تو ساتھ ہوتی ہو آفس میں اور اچھا لگنا بھی پرانی اطلاع ہے۔" میں سمجھتے ہوئے بھی اس کی بات نہ سمجھ کر شوخی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ "اور تمہیں اتنا پاگل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا اس طرح الجھا پریشان حلیہ بنا کر تم اسے شادی پر راضی کرلو گی۔" میں نے اس کے بے ترتیب بالوں اور سادے کپڑوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"شادی کا تو پتا نہیں، لیکن...... لیکن مونا! اس نے مجھ سے کل محبت کا اقرار کرلیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا میں اسے بہت اچھی لگتی ہوں۔ میں شام کو آفس آف ہونے کے بعد باہر اسٹاپ پر آئی تو پیچھے وہ بھی آ گیا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا چلو اگلے اسٹاپ سے بیٹھیں گے۔ میں اس کی بات مان گئی۔ اس کی رفاقت تو میری بھی خواہش تھی۔ چلتے چلتے اس نے مجھ سے پوچھا کہ مجھے اس کے ساتھ چلنا کیسا لگ رہا ہے۔ میں کیا جواب دیتی اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں محبت کے دیپ جل رہے تھے۔ میں نے شرما کر گردن جھکا لی اور خاموشی سے چلتی رہی۔ پھر اس نے مجھ سے قریبی ہوٹل میں چائے پینے کے لیے کہا۔ میں سحر زدہ تو تھی ہی اس کے اصرار پر منع نہ کرسکی۔ میں پہلی مرتبہ کسی غیر مرد کے ساتھ یوں ریستوران میں گئی تھی۔ ہماری ٹیبل کا رخ دیوار کی طرف تھا۔ میں نشست پر بیٹھی تھی فیروز بھی ادھر میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے کھانے پینے کی خواہش کا پوچھا اور پھر میرے منع کرنے پر صرف چائے کا آرڈر دے دیا۔"

پھر اس نے ہوٹل کی تصویر کشی شروع کردی۔

"کیسا لگ رہا ہے میرا قرب؟" اس نے مجھے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"آپ...... آپ ادھر بیٹھ جائیں۔" مجھے اپنا دل بے قابو ہوتا ہوا محسوس ہوا کہ اس کے جسم کا لمس میرے وجود میں نشہ بن کر اتر رہا تھا۔

پھر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا، مضبوطی سے پکڑ لیا پھر اچانک اپنے ہونٹ میری ہتھیلی پر رکھ دیے۔ وہ میرے اتنے قریب بیٹھا تھا کہ مجھے یقین نہ آیا۔ اس نے اپنا ہاتھ میرے چہرے کی طرف بڑھایا اور سرگوشی میں میرے چہرے کے قریب آتے ہوئے ہونٹ سکوڑے

جین مت

چھٹی صدی قبل مسیح کو تاریخ انسانیت میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ شاید پوری دنیا میں انسانوں پر ویسے ہی نفسیاتی و جسمانی مظالم ڈھائے جارہے تھے جو ہندی آریاؤں نے اقتصادی ترقی وخوشحالی اور تہذیبی جم جماؤ حاصل کرنے کے باوجود ذات پات کی تفریق، فلسفہ تناسخ اور انسانی وحیوانی قربانیوں کی صورت میں روا رکھے۔ شاید انہی مظالم کا ردعمل تھا کہ اس زمانے میں چین اور ہندوستان سے لے کر ایران اور یونان تک مختلف ملکوں میں بڑے بڑے مصلح، فلسفی اور مذاہب کے بانی پیدا ہوئے۔ اس صدی میں ہندوستان میں گوتم بدھ اور مہاویر پیدا ہوئے، چین میں کنفیوشس اور لاؤزے، ایران میں زرتشت اور یونان میں فیثا غورث۔ آج تک مورخین یہ معلوم کرنے سے قاصر ہیں کہ جین مت کی بنیاد کس طرح، کہاں اور کب رکھی گئی مگر جینی لوگوں کا کہنا ہے کہ جین مت ابدی اور غیر فانی ہے۔ یہ اس وقت سے ہے جب کائنات کا ظہور ہوا اور جب تک کائنات قائم ہے، جین مت بھی قائم رہے گا۔ ان کے خیال کے مطابق جینی پیامبر وقتاً فوقتاً بنی نوع انسان کی اصلاح کے لیے ظاہر ہوتے رہے۔ ان کے نزدیک آخری جینی پیامبر مہاویر (560-468ق م) ہیں۔ ان کا اصل نام وردھ مان ہے اور مہاویر لقب ہے یعنی بہادر اعظم۔ وہ صوبہ بہار کے ایک کھتری حکمران خاندان کے راج کمار تھے۔ پٹنہ کے قریب ویسالی میں پیدا ہوئے۔ گوتم بدھ کے ہم عصر تھے۔ تیس برس کے تھے کہ ان کے والدین کا انتقال ہوگیا اور انہوں نے دنیا اور اس کی آسائشوں سے تنگ ہوکر تاج وتخت کو خیر باد کہا اور سچائی کی تلاش میں جنگل کی راہ لی اور تنہا سخت ریاضت کی۔ بارہ برس کی ریاضت کے بعد آخر عرفان حاصل ہوا اور وہ مہاویر کہلانے لگے۔

مرسلہ: نوید عثمانی، ملتان

لیکن میں نے فوراً اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر زور سے پیچھے کر دیا۔

''ایک بار، تھوڑا سا۔'' وہ گڑگڑایا لیکن میں نے اسے سختی سے منع کیا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ جاتے جاتے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ہماری ملاقات کے اس پہلو کا کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے لیکن تم..... تم سونا! میری دوست میری رازدار ہونا، تم سے کیا پردہ۔''

میں حیرانی سے نیلم کے چہرے پر پہلی عشق کی انتہا دیکھ رہی تھی۔ نیلم کو سمجھانا تو میرے لیے ہمیشہ ہی مشکل رہا تھا، اب تو مشکل ترین ہو گیا تھا کہ اب اس محبت میں لمسیاتی حدت بھی شامل ہو گئی تھی۔

نیلم کی محبت اور سادگی سے مجھے ہمیشہ یہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ کوئی غلطی نہ کر بیٹھے۔ فیروز کی سنجیدہ شخصیت سے مجھے کسی بڑی غلط بات کی اُمید تو نہیں تھی مگر جو کہانی نیلم نے مجھے سنائی تھی اس میں غلط بیانی نہیں ہو سکتی تھی۔ نیلم اپنے باطن سے ظاہر تک مجھ پر اپنی ہر خلوت میں عیاں تھی مگر فیروز کے انداز میں یہ تبدیلی مجھے چونکا گئی۔ میرا ذہن مختلف پہلوؤں پر تیزی سے غور کر رہا تھا۔ میں خاموشی سے اسے سنتی رہی۔ میں نے سوچا کہ اگر فیروز واقعی نیلم سے شادی میں انٹرسٹڈ ہے تو بہت اچھی بات ہے لیکن اگر نہیں تو مجھے فیروز کو نیلم کی سادگی اور محبت سے فائدہ نہیں اٹھانے دینا چاہیے تھا۔ نیلم اتنی جذباتی ہو رہی تھی کہ اس نے دو دن کی چھٹی کر لی یوں مجھے فیروز سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔

آفس میں کھانے کے وقفے میں فیروز میرے پاس آ گیا۔ کھانے کے دوران میں نے اس سے باتوں باتوں میں کہا۔ ''بھئی فیروز! آپ یہ بتائیں کہ شادی کب کر رہے ہیں۔''

''جب تم کہو۔'' اس نے شوخی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نئے انداز اور ''تم'' سے مخاطب کرنے پر میں چونکی لیکن میں نے یہ بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''تو کیا جب میں کہوں، جس سے کہوں، آپ اس سے راضی ہو جائیں گے۔''

''بھئی تمہاری آدھی بات صحیح ہے لیکن جس سے کہوں سے کیا مطلب۔''

''بھئی نیلم سے اور کوئی ہو گی اتنی اچھی، اتنی معصوم اور اتنی محبت کرنے والی۔'' میں نے بات چھیڑی۔

''بہت خوب، اچھا لطیفہ ہے بھئی! اچھی، معصوم اور محبت کرنے والی، ہونہہ، میرا خیال ہے مس مونا آپ بہت زیادہ ہی کہہ رہی ہیں، مجھے تو آپ جیسی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔''

فیروز نے اس تیزی کے ساتھ تیر پھینکا تھا کہ میں لرز کر رہ گئی۔ یعنی فیروز نے نیلم کو بے وقوف بنایا اور اب شاید میری طرف، میں خاموش نیچے نگاہ کیے رہی وہ شاید سمجھ رہا ہو کہ میں اس کے اس طرح اظہار پسندیدگی پر شرم سے سر نیچے کیے بیٹھی ہوں لیکن میں سوچ رہی تھی کہ میں نیلم کو کس طرح فیروز کی نیت کا بتاؤں، کیا وہ محبت میں اندھی میری بات پر یقین کرے گی۔

چند دنوں بعد نیلم نے مجھے بڑی پریشانی اور تفکر سے بتایا کہ اس کے لیے رشتہ آیا ہے۔ گھر والے اسے قبول کرنے کے لیے بڑی سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں لیکن میں اب فیروز کے علاوہ کسی سے شادی کے لیے راضی نہیں ہوں۔

میرے لیے ایک نئی مشکل پیدا ہو گئی کیونکہ میں جانتی تھی کہ شادی کیا فیروز تو اس کی عزت بھی نہیں کرتا پھر یہ کیسے ممکن ہے۔ میرے لیے نیلم کو سمجھانا آسان نہ تھا اگر میں فیروز کی برائی کرتی، فیروز سے دور رہنے، محبت چھوڑنے کا کہتی تو اس کے مجھ سے بدگمان ہونے کا خطرہ تھا۔ وہ یہ بھی سمجھ سکتی تھی کہ شاید میں فیروز میں انٹرسٹڈ ہوں اور اسے شادی کے لیے راضی کر کے فیروز سے اپنی لائن کلیئر کرنا چاہتی ہوں۔ یہ وہ نازک معاملہ تھا جو دوستی کو شک کے ذریعے کھا سکتا تھا اور اگر خاموش رہتی کہ نیلم کی ہاں میں ہاں ملاتی تو کہیں نیلم کا یوں گھر آئے ہوئے رشتے سے انکار بہت برا ہوتا۔ میں نیلم کے معاملے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگی کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

''نیلم کا رشتہ آیا ہے۔'' میں نے فیروز کو اطلاع دی۔

''بہت اچھی بات ہے، اس کی تو جلد از جلد شادی ہو جانی چاہیے۔''

''اور آپ؟ آپ کو بھی تو جلد شادی کر لینی چاہیے۔'' میں نے اسے جملہ لوٹایا۔

''ہم تو یہی چاہتے ہیں، بس آپ کے تیار ہونے کی دیر ہے۔'' فیروز کی آنکھوں میں خواہشوں کے دیپ جل اٹھے۔

''فیروز! آپ ایک بات مانیں گے۔'' میرے ذہن

میں ایک خیال تیزی سے آیا۔
"ہاں ہاں کہو، جان ودل سے مانیں گے۔"
"وہ......دراصل نیلم اپنے گھر آئے ہوئے رشتے پر آپ میں انٹرسٹڈ ہونے کی وجہ سے راضی نہیں ہو رہی۔ آپ تو راضی نہیں لیکن میں یہ بتا کر اسے رنجیدہ نہیں کرنا چاہتی میں کسی طرح اسے رشتے پر راضی کرنا چاہتی ہوں۔"
"ہاں تو میں اس سلسلے میں کیا کرسکتا ہوں۔"
"میں آپ کی فرضی منگنی کا اسے بتا دیتی ہوں، آپ اس کی تصدیق کرکے اپنی مجبوریوں کا بہانہ بنا دیجیے گا۔"
میری بات سن کر فیروز کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا لیکن شاید نیلم سے پیچھا چھڑانے اور مجھ میں انٹرسٹ کی وجہ سے راضی ہو گیا۔
"نیلم! تمہارے سلسلے میں میری فیروز سے بات ہوئی ہے۔"
"اچھا! کیا کہا؟"
"تم اسے اچھی تو لگتی ہو مگر وہ تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ دراصل اس کی نسبت اپنی کزن سے طے ہے اور اس کے گھر والے تمہارے لیے راضی نہیں ہو سکتے۔ اس نے تم سے درخواست کی ہے کہ تمہیں شادی کر لینی چاہیے۔"
میرے اندیشے کے مطابق نیلم متوحش اور بے یقینی کے عالم میں تھی جیسے میری بات اسے سمجھ نہ آرہی ہو۔ وہ مزید کچھ نہ بولی۔ میں اسے بدگمانی، دکھ اور بے یقینی میں چھوڑ کر گھر آ گئی۔ میں اس کے علاوہ کیا کرسکتی تھی۔ تھوڑا بہت تو دکھ اٹھانا ہی تھا اسے لیکن اگر اصل بات پتا چل جاتی تو شاید وہ شرم سے مر ہی جاتی۔
دوسرے دن وہ آفس نہ آئی۔ فیروز کی زبانی معلوم ہوا کہ نیلم نے اسے فون کیا تھا۔ فیروز کو منگنی کی مبارک باد دی تھی۔ میری ہدایت کے مطابق فیروز نے اس کا دل دکھانے پر معذرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس کی منگنی ادلے بدلے میں ہوئی ہے لہٰذا وہ منگنی توڑ کر اپنی بہن کے گھر کو تباہ نہیں کرسکتا اس لیے بہت مجبور ہے اور اس نے نیلم سے التماس کیا، اسے سمجھایا کہ اچھے رشتے بار بار نہیں آتے، لہٰذا شادی کے لیے راضی ہو جائے۔
یوں نیلم فیروز کی خواہش پر بادل نخواستہ شادی پر راضی ہو گئی۔ یوں میری ترکیب سے نیلم بڑے غم سے ٹوٹے بغیر نکل آئی لیکن اس حادثے نے اسے بدل کر رکھ دیا، اس نے ناصر کے ساتھ شادی کے لیے راضی ہونے کے ساتھ جاب سے استعفیٰ دے دیا۔
ناصر بینک آفیسر تھا۔ کچھ دنوں بعد نیلم کی بڑی دھوم دھام سے منگنی ہوگئی۔ ایسا لگتا تھا نیلم نے فیروز کی محبت کو اپنے اندر کسی گوشے میں چھپا کر صبر کرلیا ہے۔
مجھے ناصر، نیلم کے ساتھ بہت اچھا لگا۔ ناصر سے میرا تعارف ہوا، میں نے اسے مبارک باد دی۔
منگنی کے بعد ایک دن نیلم ناصر کے ساتھ میرے پاس لیب آئی۔ پرنٹیڈ کاٹن کے سوٹ پر بڑا سا گرین دوپٹا سر پر اوڑھے وہ بڑی پروقار اور نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ ناصر سے گفتگو کرکے مجھے احساس ہوا کہ وہ کافی حد تک لڑکیوں کی پسند اور آزادی کا قائل ہے اور نیلم کو آزادی ہے کہ وہ اپنی پسند سے زندگی گزارے۔ نیلم بڑی سنجیدگی اور خاموشی سے ہماری باتیں سنتی رہی۔ ابھی ہم لوگ گفتگو کر ہی رہے تھے کہ فیروز آ گیا۔ نیلم کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ نیلم نے بھی اسے دیکھ کر ایک دم چہرہ نیچے کرلیا۔ میں نے فیروز اور ناصر کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا۔ فیروز نے نیلم اور ناصر کو مبارک باد دی۔ نیلم اور ناصر کے جانے کے بعد فیروز بڑی حیرانی سے مجھ سے کہہ رہا تھا۔
"واہ بھئی، نیلم کے تو انداز ہی بدل گئے ہیں، اتنی اچھی کیسے ہوگئی۔"
"اچھی تو وہ پہلے بھی تھی فیروز صاحب، بس آپ کو شک کرنے اور ظاہر سا اندازہ لگانے کی عادت ہے۔" میں نے اس کی بات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔
نیلم کی شادی کی تاریخ تین مہینے بعد کی ٹھہری تھی۔ ایک مہینے بعد ناصر میرے پاس آیا۔ وہ کچھ بیمار بیمار تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ اس نے خیر خیریت کے بعد میری طرف ڈاکٹر کی سلیپ بڑھاتے ہوئے کہا۔
"کچھ دنوں سے طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ بخار ہو جاتا ہے اور بہت کمزوری محسوس ہو رہی تھی میں نے ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے چیک اپ کے بعد ٹیسٹ لکھ کر دیے ہیں۔ میں نے سوچا آپ کی لیب سے کرالوں۔"
"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ آپ کوئی غیر تھوڑی ہیں۔"
پھر میں نے خود ناصر کا بلڈ لیا، اسے سرنج سے ٹیوب میں ڈالا اور لیب نمبر ڈال کر ریک میں ٹیسٹ کرنے کے لیے رکھ دیا۔

☆......☆

ناصر کی ٹیسٹ رپورٹس نے مجھے لرزہ کر رکھ دیا تھا۔

اسے محض بخار اور کمزوری نہیں تھی اس کی ٹیسٹ رپورٹس دیکھ کر میرے ذہن میں کئی اندیشے سر ابھار رہے تھے۔ میرا تجربہ جو کچھ کہہ رہا تھا اسے نظر انداز کرنا آسان نہ تھا کہ میں نے سیکڑوں لوگوں کے بلڈ ٹیسٹ کیے تھے اور بیماریوں اور ان کی علامات کے متعلق میرے اندازے کافی حد تک صحیح ہوتے تھے لیکن میں اس وقت سر جھکائے پریشان اندازوں کے غلط ہونے کی دعا کر رہی تھی۔ ہمارے لیب کے پیتھالوجسٹ صاحب کے سامنے رپورٹس رکھتے ہوئے اس کے بارے میں پوچھا۔

''ان کے سفید سیلز کی تعداد TLC اور لیور فنکشن (جگر کا افعال) بہت ڈسٹرب ہے۔''

پھر ڈاکٹر صاحب نے بڑے انہماک سے ناصر کی بلڈ سائیڈ دیکھیں۔ ''ناصر کے بلڈ سیلز ٹیپس کروکنگ کنڈیشن ظاہر کر رہے ہیں میرا خیال ہے ان میں کینسر کی ابتدا ہو گئی ہے۔''

''او نو!'' میرا وجود لرز گیا، جب کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو کنٹرول کیا۔ پیتھالوجسٹ کے جانے کے بعد بھی میں خاموش بیٹھی رہی۔

مجھے نیلم اور ناصر کی منگنی کا دن یاد آرہا تھا۔ کیسے نیلم کو سجا کر ناصر کے پہلو میں بٹھایا گیا تھا۔ لڑکیاں ڈھولک کی تھاپ پر گیت گا رہی تھیں۔ لوگ مبارکباد دے رہے تھے اور چند ماہ بعد ان کی شادی تھی۔ منگنی کے ایک مہینے بعد ناصر کو یہ تکلیف شروع ہو گئی۔ لیور فنکشن کی خرابی کینسر کی ابتدا کا باعث ہو گئی تھی اس کا مطلب تھا کہ ناصر کو نشہ آور چیزیں استعمال کرنے کی بہت زیادہ عادت ہے۔

میں اپنے آپ میں ہمت نہ پاتی تھی کہ نیلم کے گھر والوں کو ناصر کی اس بیماری یا اس کی نشے کی عادت ہونے کی خبر پہنچاؤں ابھی چند دن پہلے تو میں جب نیلم کے گھر گئی تھی تو ان کے گھر میں نیلم کی شادی کی زور و شور سے تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ شاپنگ ہو رہی تھی دوپٹوں پر بیلیں لگائی جا رہی تھیں۔ اب میں انہیں یہ بتاؤں۔

میں کب تک یہ خبر چھپاتی۔ مجبوراً بتانا پڑا۔

میں نے فون کی گھنٹی پر ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف نیلم کی چھوٹی بہن بول رہی تھی۔

''مونا باجی! نیلم باجی کی طبیعت بہت خراب ہے، وہ ہمارے قریبی کلینک میں داخل ہیں۔'' اس کی آواز روہانسی تھی۔

میں نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیوں کیا ہوا نیلم کو، خیریت تو ہے ناں۔''

''صبح ہم نے دیکھا کہ وہ دیر تک سو رہی ہیں۔ پھر پتا چلا کہ بے ہوش ہیں۔ کئی کوششوں کے بعد جب وہ ہوش میں نہ آئیں تو ہم فوراً کلینک لے گئے۔ ڈاکٹر کی تین گھنٹے کی کوششوں سے ان کی زندگی بچی ہے شاید کوئی غلط چیز پیٹ میں چلی گئی تھی۔ امی نے ابھی آپ کو فون کا کہا۔ آپ آرہی ہے ناں۔''

''ہاں ہاں ابھی چھٹی لے کر آتی ہوں۔'' میں اپنے اسپتال سے کلینک چلی گئی۔

میں وہاں پہنچی تو نیلم کے سارے گھر والے موجود تھے۔ انہوں نے بھی وہی تفصیل بتائی۔ نیلم اپنے بیڈ پر سو رہی تھی۔ نیلم کے ڈاکٹر سے ملی تو اس نے بتایا۔ ''نیلم نے آخر شب نیند کے کیپسول کھا کر خودکشی کی کوشش کی تھی اس بے ہوشی میں اسے اسپتال پہنچایا گیا اگر ذرا اور دیر ہو جاتی تو نیلم نہ بچ پاتی۔ ان کے والد نے درخواست کی ہے کہ یہ بات کسی کو نہ بتائی جائے آپ کیونکہ اس فیلڈ کی ہیں۔ دوست ہیں تو نیلم کی امی نے آپ کو بتانے کی اجازت دے دی ہے تاکہ آپ نیلم کو سمجھائیں۔''

میں نیلم کے اس انتہائی اقدام پر حیران رہ گئی۔

''کیوں آنٹی! ایسی کیا بات ہوئی تھی جو نیلم نے یہ کیا۔'' نیلم کی امی کی حالت افسردگی اور نقاہت سے قابل رحم ہو رہی تھی۔

''بس بیٹا کیا بتائیں زندگی کی آزمائشیں ختم ہی ہونے نہیں پاتیں۔ نیلم کی منگنی سے جو تھوڑی خوشی ملی تھی ناصر کی بیماری کا سن کر خاک ہو گئی دوسرے وہ نشے کا بھی عادی ہے بتاؤ بھلا ایسے کیسے ہم اپنی بیٹی کو جانتے بوجھتے جہنم میں جھونک دیں۔ کل شام ہی نیلم کے والد کو یہ پتا چلا وہ تو صاف لڑکے والوں کو انکار کر آئے جب نیلم کو پتا چلا تو وہ خوب روئی اور ہذیانی انداز میں چیختی رہی کہ مجھے اب بس میری قسمت پر چھوڑ دیں۔ امی سے کردیں میری شادی، آپ منگنی کر کے ناصر سے میری شادی کا وعدہ کر چکے ہیں۔ رات گئے تک گھر میں یہی افراتفری رہی۔ نیلم غالباً ساری رات جاگتی رہی اور صبح کے وقت کیپسول کھا کر خودکشی کی کوشش کی۔ بیٹا! تم تو اس کی اچھی دوست ہو ناں میری بچی کو سمجھاؤ اسے بھٹکنے سے بچالو۔ میں تمہاری ہمیشہ احسان مند رہوں گی۔'' نیلم کی امی ▪

میرے ہاتھ تھامے گڑگڑا رہی تھیں۔ ان کے آنسو میرے ہاتھ اور دامن پر گر رہے تھے۔

میں نے انہیں تسلی دی پھر انہیں آرام کے لیے گھر چھوڑ آئی۔ میں نے اپنے لیب سے نیلم کی تیمارداری کے لیے چھٹی کر لی۔ نیلم کا گھر قریب ہی تھا۔ شام کو نیلم کی طبیعت کچھ سنبھلی میں رات گزارنے اپنے گھر چلی گئی اور نیلم کے پاس رات بھر ان کی والدہ رہیں۔

دوسرے دن نیلم کے ہوش وحواس کچھ بحال ہوئے لیکن اتنے بڑے حادثے کے بعد وہ گم صم خلاؤں میں دیکھ رہی تھی کسی سے بات کرنے کے قابل نہ تھی۔ اس کو ہلکی غذائیں دی جا رہی تھیں۔

لیکن وہ گزری بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

تیسرے دن میں آفس گئی تو نیلم کی وجہ سے پریشان اور خاموش تھی اپنا کام نمٹا کر الگ روم میں آ بیٹھی۔ دوپہر کے لنچ بریک میں میرا دل کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ نورین کھانا کھا کر دوبارہ کام میں لگ گئی۔ میں سر جھکائے بیٹھی۔ میرے ہاتھ میں کیا تھا جو نیلم کی مدد کرتی۔ نیلم کے گھر والے اس صورت میں ناصر کے ساتھ بھلا کیسے نیلم کی شادی کے لیے تیار ہو جاتے۔ میں اپنے اندر نقاہت محسوس کر رہی تھی، اپنی ہمت کو مجتمع کر رہی تھی کہ کسی کے قدموں کی چاپ ابھری۔ میں نے سر اٹھایا۔

''فیروز؟'' اسے دیکھتے ہی میرے دل میں نفرت بھر گئی۔

''خیریت تو ہے، کہاں غائب تھیں بھئی۔'' اس نے بے تکلفی سے بیٹھتے ہوئے اپنائیت سے پوچھا۔

''کیوں، آپ کو کیا فکر، میں مروں یا جیوں۔'' میرا لہجہ تلخی اور زہر سے بھر اٹھا۔

''یہ...... یہ کیا کہہ رہی ہو، میں نے تو دو دفعہ تمہارے گھر بھی فون کیا مگر پتا چلا کہ تمہاری کسی دوست کی طبیعت صحیح نہیں ہے تم اسپتال گئی ہو اور اب تم میرے خلوص اور محبت پر شک کر رہی ہو۔''

''ہونہہ! خلوص محبت...... لڑکیوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر انہیں بے وقوف بنا کر ان کا اعتماد حاصل کرنا پھر انہیں خواہشوں کے جنگل میں اکیلا چھوڑ دینا۔ کتنوں سے فلرٹ کریں گے آپ؟ اور وہ...... وہ بے چاری نیلم! اس کے تو نصیب لڑکی ہونے کی وجہ سے خراب تھے ہی، سادہ دلی اور گداز دل فطرت کے ہاتھوں مار کھا گئی اور اب جب کچھ اس کے اچھے مستقبل کی آس ہوئی تو شادی سے پہلے اس کے منگیتر کو مہلک بیماری نے آلیا اور نیلم کو دیکھو اسی لڑکے سے ہمدردی میں گھر والوں سے ناصر کے ساتھ ہی شادی کا اصرار کر رہی ہے اور تمہیں پتا ہے اس احمق لڑکی نے غموں سے ٹوٹ کر خودکشی کی کوشش کی تھی۔'' یہ کہتے کہتے میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی، کچھ دیر بعد پھر بولی۔ ''تم نے فیروز...... تم نے...... اس کا دل دکھایا ہے اس کی تذلیل کی ہے۔ وہ تو مجھ سے کہیں زیادہ اچھی تھی۔ میں تو اسے سمجھاتے سمجھاتے تھک چکی ہوں فیروز! لیکن وہ اپنے اندر کی ہمدردیوں، محبتوں اور اعلیٰ ظرف بننے کے شوق کو کبھی دل سے نہ نکال سکی۔''

فیروز ہکا بکا متوحش سا میری باتیں سن رہا تھا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا کہ نیلم اس حد تک مجھے حرف بہ حرف اپنے اور اس کے متعلق باتیں بتا دے گی۔

فیروز نے شرم سے سر نیچے کر لیا۔ ''مونا! پلیز مجھے معاف کر دو، میں نے تمہاری دوست نیلم کو بہت غلط سمجھا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ تم دونوں اتنی اچھی دوست ہو اور اتنا اعتماد کرتی ہو ایک دوسرے پر، میں نے یہ سب کچھ تمہاری توجہ حاصل کرنے کے لیے کیا تھا۔''

''چھوڑیں فیروز صاحب! جائیں اور اب مجھ سے نہ ملیں تو اچھا ہے، جو میری دوست کی تذلیل کر سکتا ہے، اسے میں بھی محبت اور اعتبار کے قابل نہیں سمجھ سکتی۔'' میں نے فیروز کو نظر انداز کرتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں اس سے تعلق ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ میں نے رومال سے منہ صاف کیا، پرس اٹھایا اور تیزی سے باہر نکل آئی۔ آج میں نے فیروز کو یہ کہہ کر کہ وہ محبت اور اعتبار کے قابل نہیں، نیلم کو دیے جانے والے دکھ کا بدلا لے لیا تھا۔

نیلم کی طبیعت اب کچھ سنبھل گئی تھی لیکن وہ اب تک ذہنی شاک کے اثر سے نہیں نکلی تھی۔ ڈاکٹر نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ نیلم کے پاس دو فرد سے زیادہ لوگ نہ ہوں اور اس سے کسی بات کی پوچھ گچھ نہ کی جائے اس کا ہر لمحہ خیال رکھا جائے۔

میں نیلم کی وجہ سے اتنی پریشان اور افسردہ تھی کہ اپنی لیب کے کام کو بھی توجہ سے نہیں کر پا رہی تھی۔ میں بیک وقت صبح اپنے اسپتال جاتی پھر سہ پہر کو نیلم کی تیمارداری کرنے اس کے کلینک جاتی۔ میں نے بڑی مشکل سے اگلے ہفتے چار دن کی چھٹی لے لی۔ نیلم کی طبیعت تو بہتر ہو گئی تھی لیکن وہ

بڑی مشکل سے کسی بات کا جواب دیتی۔ بس خالی ذہن بیڈ پر لیٹی چھت کو تکتی رہتی۔ اس وقت نیلم کو نفسیاتی تیمارداری کی بھی ضرورت تھی لہٰذا میرا اس کے پاس ہونا بہت ضروری تھا۔

میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد نیلم سے گفتگو کی کوشش کرتی لیکن وہ گم صم مجھے تکتی رہتی۔

''کچھ تو بولو چندا! تم مجھ سے تو کبھی کوئی بات نہ چھپاتی تھیں دیکھو میں نے چھٹی لے لی ہے تاکہ میں خوب تم سے باتیں کروں۔ کتنے دن سے ہم نے باتیں نہیں کیں، ہیں ناں؟'' میں نے نیلم کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پیار سے سہلاتی رہی۔

''موٹا..... ! موٹا!'' اس نے تھوڑے تھوڑے وقفے سے مجھے پکارا۔

''ہاں ہاں میں موٹا ہوں! تمہاری دوست غم خوار لیکن تم نے مجھے اب کے کچھ نہ بتا کے بڑی زیادتی کی ہے۔ میں نے تم سے بہادر بننے اور برداشت کرنے کے لیے اس لیے تھوڑی کہا تھا کہ تم مجھے بھی کچھ نہ بتاؤ۔ کیا میں اس قابل نہیں۔ تم تو مجھ سے مل کر ساری مخبتوں کو بھول جاتی تھیں۔ کیا تمہارا اعتماد مجھ پر سے اٹھ گیا تھا۔ کیا اب تمہیں مجھ سے کوئی محبت نہیں، بتاؤ موٹا میں نے ایسی کون سی غلطی کی ہے؟ کون سا تمہیں دکھ دیا ہے کہ تم نے مجھے بتائے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھایا اتنا غلط فیصلہ، کس نے حق دیا تھا تمہیں کہ تم اپنے گھر والوں سے اور مجھ سے اپنے وجود کو چھین لو، کیا صرف کسی مرد کی محبت ملنا ہی زندگی ہے اور نہ ملے تو بے کار ہے، موت ہے۔'' میں نے اسے غصے اور غم کی ملی جلی کیفیات میں جھنجوڑ ڈالا اور وہ جیسے ہوش کی طرف لوٹنے لگی۔ میری آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو اپنی دوستی، محبت کے احساس اور یوں شکایت کرنے پر وہ میرے کاندھے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''پتا نہیں کیوں میں اتنی بدنصیب ہوں، بتاؤ موٹا! مجھے زندگی صرف ٹھوکر کھانے، فریب کھانے کے لیے ملی ہے، کیا میرے نصیب میں کوئی خوشی نہیں؟ مجھے اپنا وجود بہت ارزاں غیر اہم محسوس ہونے لگا تھا۔ میں کیا کرتی۔ اور..... اور اب تو میں گھر والوں کے لیے بھی بھاری ہوگئی۔ میں کسی کو تکلیف دینا نہیں چاہتی۔ اس لیے موٹا..... میں نے..... میں نے اپنی زندگی ختم کرنے کا سوچا۔'' نیلم بول اٹھی تھی۔ وہ روتی جاتی اور اپنے دکھ کہتی جاتی۔ نیلم جیسے لوگ دل کی بات کہے بغیر چین نہیں پاسکتے۔ میں نے اس کی فطرت بدلنے کی کوشش میں اس کو بہادر بننے اور برداشت کرنے کا کہہ کر اس میں نادانستہ طور سے شاید یہ بات بٹھا دی تھی کہ دنیا میں کسی کو تمہارے دکھ سننے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میرے زیادہ نہ ملنے کو وہ میرا نظرانداز کرنا سمجھی۔ اب اس حادثے کے بعد میں اس کی دل جوئی کر رہی تھی۔ اس میں زندگی کی امنگ پیدا کرنے کے لیے اس کو محبت اور اہمیت کا احساس دلا رہی تھی۔

''نیلم تم تو سراپا محبت ہو، میرے لیے تمہارا یہ خلوص یہ اعتماد بہت بڑی دولت ہے۔ پاگل! زندگی اتنی ارزاں نہیں کہ ایک نارسائی کے پیچھے ختم کردی جائے۔ میں ہوں ناں تمہارے پاس محبت کے لیے۔''

''اور میں بھی تو ہوں محبت کے لیے، اعتماد کے لیے جیسا بھی ہوں۔'' ہم دونوں اپنا رونا دھونا بھول کر سامنے کھڑے فیروز کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

''آپ..... آپ کیسے آئے؟'' بالآخر میں بولی۔

''کیوں! نیلم سے میری بھی تو دوستی تھی، میں بھی تو اس کی عیادت کو آسکتا ہوں۔''

''مگر اب میں کسی کے نیلم کو قریب آنے اسے فریب دینے کی اجازت نہیں دے سکتی۔'' میں تلخ لہجے میں فیروز سے مخاطب تھی۔

وہ بڑے اطمینان سے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے نظرانداز کرکے نیلم سے مخاطب ہوا۔

''کیسی ہو نیلی! تمہیں میرا آنا برا تو نہیں لگا؟''

نیلم حیران کبھی میری اور کبھی فیروز کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''ہاں نیلی کہو ناں!'' فیروز نے پھر کہا۔

''ٹھیک ہوں۔'' نیلم نے بڑی مشکل سے کہا۔

''میں بہت برا ہوں ہے ناں؟''

''نہیں..... نہیں تو۔'' نیلم نے اس کے پوچھنے پر کہا۔

''اس کا مطلب ہے، اچھا لگتا ہوں، چلو پھر ٹھیک ہے۔'' فیروز نے شوخی سے گردن ہلائی۔

فیروز کے اس انداز اور مکالموں پر میں غصہ بھول کر اسے حیرانگی سے دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں نیلم کی امی کسی خاتون کے ساتھ اندر داخل ہوئیں۔ فیروز اٹھ کھڑا ہوا اور ان نئی خاتون کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''امی! یہ نیلم ہیں اور مونا۔ جو میری کولیگ بھی ہیں۔''

نیلم اور میں نے فیروز کی امی کو سلام کیا۔ فیروز کی امی نے آگے بڑھ کر نیلم کو پیار کیا اس کی خیریت پوچھی۔

''بھئی ہمیں آپ کی بیٹی بہت اچھی لگی اور آپ کی ہی نہیں یہ اب ہماری بیٹی بھی تو ہے۔ کیوں نیلم! تمہیں بیٹی کہہ سکتے ہیں نا ہم۔'' فیروز کی امی نے نیلم کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی، کیوں نہیں محبت ہے آپ کی۔'' نیلم بالکل نارمل انداز میں بات کر رہی تھی۔

نیلم کی امی بھی خوش نظر آ رہی تھیں۔ نیلم کی امی مجھے ساتھ لے کر باہر نکل آئیں اور کہا۔

''فیروز کیسا ہے مونا؟ ان کے گھر سے نیلم کے لیے رشتہ آیا ہے۔''

''اچھا، واقعی۔'' خوشی میں میری چیخ نکل گئی۔ فیروز بالآخر نیلم کے پاس واپس آ ہی گیا۔

لمبے چوڑے قد و قامت، صاف رنگت، فرنچ کٹ داڑھی میں فیروز کی شخصیت واقعی متاثر کن تھی۔ آنکھوں پر لگے گلاسز کی وجہ سے وہ سنجیدہ اور پروقار سا بھی لگتا تھا۔ اس کا مطالعہ اس کی گفتگو کا انداز بہت اچھا تھا۔ شریف فیملی سے تعلق تھا۔ اچھی جاب تھی، بس نیلم کو سمجھنے میں اس نے ایک عام مردوں والا جاہلانہ انداز اپنایا تھا۔ پھر نیلم کے اس طرح آسانی سے حاصل ہو جانے پر غلط مطلب نکال بیٹھا تھا اور اب جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تو میں کیوں اس کی راہ میں آتی۔ میں نے نیلم کی امی سے فیروز کی بڑی تعریف کی۔ ان کی امی نے بتایا کہ فیروز کے گھر والے اور فیروز انہیں بھی اچھے لگے ہیں۔

دو دن بعد نیلم کو گھر جانے کی اجازت مل گئی۔ ایک ہفتے بعد میں لیب میں اپنے معمول کے کام میں مصروف تھی کہ فیروز آ گیا۔

''ہیلو دوست! کیسی ہو؟'' اس نے مجھے شوخی سے مخاطب کیا۔

''ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟'' میں نے اس کے لیے اپنا لہجہ نرم کر لیا تھا۔ ''آپ اندر کمرے میں تشریف رکھیے، میں ابھی آتی ہوں۔''

میں نے نہایت مہذب انداز میں اسے کہا تو وہ خاموشی سے مڑ کر کمرے کی طرف چلا گیا۔ میں کام مکمل کر کے اس سے ملنے اندر کمرے میں چلی گئی اور خاموشی سے بیٹھ کر اس سے بات کرنے کا سوچنے لگی۔

''اب بھی ناراض ہو کیا۔'' اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''نہیں ۔۔۔ نہیں تو۔'' پھر کچھ توقف کے بعد نرم انداز میں کہا۔

''بہت شکریہ فیروز، ویری سوری، میں نے تمہیں بہت برا بھلا کہا۔''

''ارے نہیں یار، شکریہ تو مجھے تمہارا ادا کرنا چاہیے کہ تم نے مجھے صحیح راستہ دکھایا۔ پھر مجھ سے ناراضگی کے باوجود میرے بارے میں نیلم یا ان کے گھر والوں سے برائی نہ کی۔ میں بہت خوش ہوں مونا! کہ مجھے تم جیسی بااعتبار اچھی لڑکی کی ہمدردی حاصل ہوئی اور تمہاری دوستی کا تحفہ نیلم ہے جسے میں ہمیشہ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا۔''

''بہت شکریہ فیروز! اگر تم نے نیلم کو اپنی محبت اور اعتماد دیا تو ہمیشہ میں تمہاری عزت کرتی رہوں گی۔'' وہ بہت محبت کرنے والی لڑکی ہے تمہیں کبھی اس کی طرف سے دکھ نہیں پہنچے گا، انشاء اللہ۔'' میں نے طمانیت سے کہا۔

''اچھا تو پھر اس خوشی میں کچھ ہو نہ جائے۔'' فیروز ماحول بدلنے کو ذرا چہکا۔

''یعنی......!'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''یعنی میری طرف سے کل سن شائین ریستوران میں کھانے کی دعوت ہے، نیلم اور میری بات پکی ہونے کی خوشی میں، پلیز مونا! اسے کل میرے ساتھ کھانے کی اس دعوت پر راضی کر لو ناں! دیکھو میرا بڑا دل چاہ رہا ہے اس سے ملنے، باتیں کرنے، اسے دیکھنے کا، پلیز۔'' فیروز بڑے ملتجیانہ لہجے میں مجھ سے التماس کر رہا تھا۔

''اچھا، واہ بھئی کیا کہنے آپ کی بے تابی اور محبت کے اور دعوت کے لیے میں اسے راضی تو کر لوں...... مگر...... ریستوران لے جا کر...... کیا ارادے ہیں جناب کے، کہیں......'' میں نے ذرا ٹھہر ٹھہر کر شرارتی انداز میں کہا۔

فیروز ایک دم چونکا پھر ذرا شرمندہ کھسیانی ہنسی کے بعد بولا۔ ''ارادے کیا خاک ہوں گے، کھانے کی دعوت میں آپ بھی تو ہوں گی اور آپ سے دشمنی لے کر مجھے مرنا ہے کیا۔''

اور پھر ہم دونوں زور سے ہنس پڑے۔

کالی گوری

محترم مدیر
السلام علیکم
آپ تو جانتے ہیں میرے لکھنے کا ایک مخصوص انداز ہے۔ اپنے اسی مخصوص انداز میں اس بار تہمینہ اور متین کی سچ بیانی لکھی ہے۔ عورت کس قدر قربانی دیتی ہے اس کا ادراک آپ کو یہ سچ بیانی پڑھ کر بخوبی ہو جائے گا۔ اُمید ہے یہ سچ بیانی قارئین کو بھی پسند آئے گی۔

سلمیٰ اعوان
(لاہور)
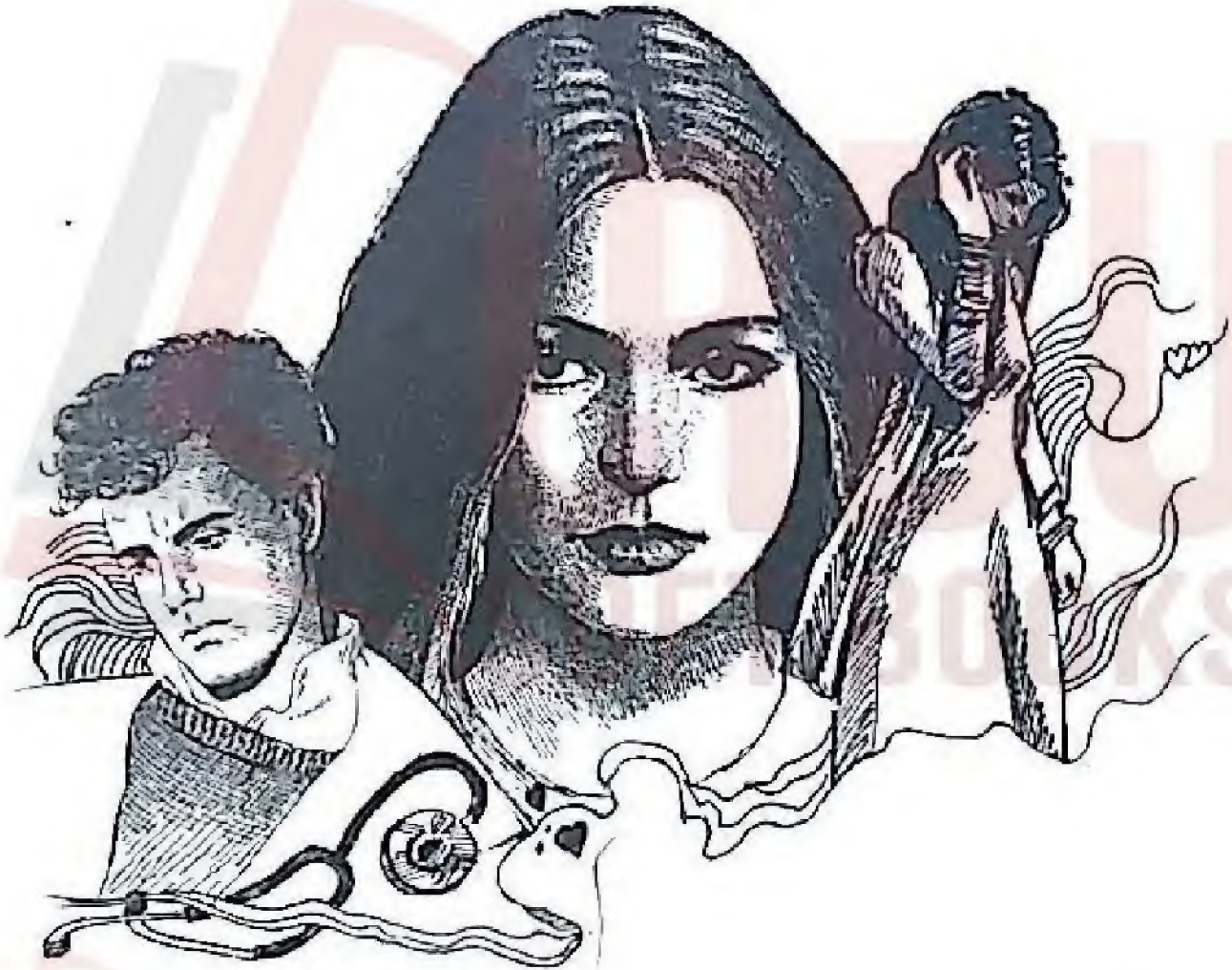
سچی بات ہے Divide and rule کبھی میری پالیسی نہیں رہی۔ ایک بڑے تعلیمی ادارے میں گذشتہ پندرہ سال سے بطور پرنسپل کام کر رہی ہوں۔ کوئی سو کے قریب اساتذہ میری زیرِ نگرانی کام کرتے ہیں۔ میں نے اپنے آپ کو ان کی خوشیوں اور غموں میں ہمیشہ شامل رکھا ہے۔ کسی نے میرے پاس آ کر آنسو بہائے تو میں نے اس کی اشک شوئی کی دلاسہ دیا، حوصلہ بڑھایا اور اگر کوئی خوشی کی خبر سنانے آیا تو میں نے بھی مسکراہٹیں بکھیریں۔ ٹیچرز کے آپس کے جھگڑوں کو

پیار اور محبت بھری ڈانٹ سے نمٹایا۔ یقیناً یہ میرا طرزِ عمل ہے کہ میری ٹیچرز مجھ سے اپنے دُکھ سُکھ کہنے میں کوئی عار نہیں سمجھتیں۔

یہ بڑی گرم دوپہر تھی۔ لو کے تھپیڑوں نے میرا چہرہ جھلسا دیا تھا۔ میں آخری راؤنڈ سے فارغ ہو کر ابھی آفس میں آکر بیٹھی تھی اور سوچ رہی تھی کہ ذرا اس فائل کو کھولوں جس میں انتظامیہ کے ساتھ ہونے والی میٹنگ کی رپورٹ نتھی کی گئی تھی۔ ابھی میں نے رپورٹ پڑھنی شروع کی ہی تھی جب مس تہمینہ دفتر میں داخل ہوئی۔

تہمینہ کے بارے میں مختصراً عرض کیے دیتا چاہتی ہوں۔ مخلص، ہمدرد، عام سے نقش و نگار والی لڑکی ہے۔ ایم اے بی ایڈ تک تعلیم ہے۔ خاندانی پس منظر اچھا ہے۔ چھوٹی سی فیملی جس میں دو بہنیں ایک بھائی ماں اور باپ شامل ہیں۔ باپ نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنا گھر خرید اتھا۔ معاشی حالات بس نارمل سے ہیں۔ زندگی سکون سے گزر رہی ہے۔ بس اگر پریشانی ہے تو تہمینہ کے لیے موزوں رشتے کی۔ تہمینہ کی عمر تیس کے قریب ہے مگر بنک سک سے آراستہ رہنے اور اپنا خیال رکھنے کی وجہ سے اتنی دکھتی نہیں۔

وہ میرے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ آج صبح سے میں نے اُسے نہیں دیکھا تھا اب بغور دیکھا تو کچھ پریشان سی نظر آئی۔

''کوئی بات؟ پریشان لگتی ہو۔'' میں نے نرمی سے پوچھا۔

''میڈم مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔''

''کتنے چاہئیں؟''

''یہی کوئی پچاس ہزار۔ بس دو تین ماہ میں لوٹا دوں گی۔''

پچاس ہزار معقول رقم تھی۔ میں نے ذرا گہرائی میں اترنا مناسب خیال کیا۔

''کہاں ضرورت ہے؟''

اور اس کے تفصیلی جائزے سے مجھے محسوس ہوا کہ وہ کچھ کومگو کی کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔

''کھل کر بات کرو میں تمہاری باس ہی نہیں بہن بھی ہوں۔ ٹھیک مشورہ دوں گی۔'' اور اس نے بتانا شروع کیا۔

''ہمارے دائیں ہاتھ جو لوگ رہتے ہیں وہ شیخ ہیں۔ شیخ اقبال احمد کے دو بچے ہیں توصیف اور نجمہ۔ توصیف میڈیکل کے تیسرے سال میں اور نجمہ فائن آرٹس میں ایم اے کررہی ہے۔ بہت گھلنے ملنے والے اور مخلص لوگ نہیں ہیں۔ بس کبھی کبھار ہی آنا جانا ہوتا ہے یا آتے جاتے ٹکراؤ ہو جائے تو ہیلو ہائے ہو جاتی ہے۔ کوئی تین دن پہلے اماں ہمارے ماموں کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ بھائی ٹیوشن پڑھنے چلا گیا اور میں گھر میں اکیلی تھی۔ کبھی کبھی اکیلا پن بھی کیسی اُداسی پیدا کر دیتا ہے؟ آدمی ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہے۔ میں نے کچھ وقت لان میں پودوں کی کانٹ چھانٹ پر ضائع کیا۔ کچھ وقت گھر میں ہی اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے میں کاٹا اور بالآخر میں نے نجمہ کے گھر کی طرف قدم اٹھا دیے۔ میں اپنی بوریت کو کچھ کم کرنا چاہ رہی تھی۔

''چلو ٹھیک سے بات وات نہ کریں گے تو بھی خیر۔ تھوڑا سا وقت تو کٹے گا۔''

میں اپنے گھر سے نکل کر ان کے گیٹ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ گیٹ بند تھا اور میرا ہاتھ اطلاعی گھنٹی پر جانے ہی والا تھا جب ایک سائیکل سوار لڑکے نے میرے پاس آکر پوچھا۔ ''توصیف احمد شیخ کا گھر یہی ہے۔''

میں نے گھنٹی بجانے کے بجائے رخ پھیر کر اسے دیکھا 22,21 برس کا کمزور سا لڑکا میرے سامنے کھڑا تھا۔ سائیکل کو اس نے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ زرد چہرہ، گال پچکے ہوئے، آنکھیں موٹی موٹی مگر اُداسی میں ڈوبی ہوئیں۔ بے ترتیب سے بال۔ لباس بھی عام سا تھا۔

''یہی گھر ہے۔ تمہیں توصیف سے ملنا ہے کیا؟''

اور میں نے اُس کے جواب کا انتظار کیے بغیر گھنٹی پر انگلی رکھ دی۔ ساز بجا اور گیٹ کھل گیا۔ دروازے پر ملازمہ تھی۔ میں نے نجمہ اور توصیف کے بارے میں پوچھا۔ دونوں گھر پر تھے۔ میں نے اندر جاتے ہوئے ملازمہ سے کہا۔ ''توصیف کو بتا دو کہ اُس سے کوئی ملنے آیا ہے؟''

نجمہ اپنے کمرے میں تھی میں کچھ سوچ کر وہیں چلی گئی۔ وہ غالباً چائے پینے لگی تھی۔ ٹرالی سامنے رکھی تھی۔ کمرا ٹھنڈا تھا اور ماحول بہت خوشگوار سا۔ میں نے ڈھیٹ بن کر کہا۔ ''میرا خیال ہے میں ٹھیک وقت پر آئی ہوں۔''

''آئیے آئیے۔'' نجمہ نے خاصی خوش دلی سے کہا۔

''بھئی گھر میں بور ہو رہی تھی تھوڑے سے وقت کو خوش گوار بنانے کے لیے آئی ہوں اُمید ہے محسوس نہیں کرو گی۔''

اور نجمہ نے جواباً خاصی فراخدلی سے کہا۔ ''ارے نہیں کیسی بات کرتی ہیں آپ۔ اکٹھے چائے پیتے ہیں اور تھوڑی سی گپ شپ بھی لگاتے ہیں۔''

چائے پی اور گپ شپ کی۔ نجمہ نے یونیورسٹی کے لطیفے

سنائے اور میں نے بھی اسے اسکول کی باتیں بتائیں اور تھوڑی سی بات چیت فلم وٹی وی پر ہوئی اور گھنٹا گزر گیا۔ میں نے وقت دیکھا اور کھڑی ہوگئی۔ مجھ نے بیٹھنے کے لیے کہا مگر میں نے معذرت کرتے ہوئے بتایا۔ "گھر میں کوئی نہیں۔ نوکر بھی نہیں ایسے ہی کھلا چھوڑ آئی ہوں، اماں آگئیں تو بولیں گی۔"

جب میں گیٹ سے نکلی اور اپنے گھر کی طرف بڑھی تو وہی لڑکا میرے سامنے آگیا۔ میں نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس وقت سورج ڈوب چکا تھا اور ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ہماری لین میں مرکری ٹیوبیں نہ ہونے کی وجہ سے اندھیرا وقت سے پہلے ہی چھانے لگتا ہے۔

"میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھ سے۔" میں نے حیرانی بھری آواز میں کہا۔

"جی میں توصیف کا کلاس فیلو ہوں۔"

گویا وہ میڈیکل کا اسٹوڈنٹ تھا اور میڈیکل کے اسٹوڈنٹ سے بات کرنے میں قطعی حرج نہ تھا۔ میں نے سوچا۔

"بات لمبی ہے تو گھر آجاؤ۔"

میں نے گھر کی طرف اپنے قدم بڑھا دیے۔ وہ سائیکل کو گیٹ کے پاس کھڑا کرنے لگا تو میں نے کہا۔

"اسے اندر لے آؤ کوئی اٹھا سکتا ہے۔" سیاہ گیٹ کا ایک پٹ میں نے کھول دیا۔ اس نے سائیکل دیوار کے ساتھ ٹکائی۔ جب تک وہ فارغ نہ ہوا میں اس کے پاس کھڑی رہی۔

اس کا حلیہ اُسے کسی بہت غریب گھر سے تعلق کا پتا دیتا تھا۔ ڈرائینگ روم میں صوفے پر بیٹھ کر میں نے بغور اُسے دیکھا اور پوچھا۔ "کہو کیا بات ہے؟"

"مجھے میٹرک یا ایف ایس سی کی کوئی ٹیوشن دلانے میں آپ کچھ مدد کرسکتی ہیں۔"

"توصیف کے پاس تم اسی کام کے لیے آئے تھے۔" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں ان کے پاس میں کسی اور کام کے لیے آیا تھا۔"

"کیا کام تھا وہ۔" میں اس کے بارے میں کچھ جاننا چاہتی تھی۔

لیکن مجھے احساس ہو چکا تھا کہ وہ تذبذب میں ہے کہ کہے یا نہ کہے۔ میں خاموش بیٹھی اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد وہ بولا۔

"غریبی بھی خدا کا بہت بڑا عذاب ہے۔ میں اپنی دو سال۔ بابا کی بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ پڑھنے میں بہت لائق ہوں۔ ہمیشہ وظیفہ لیا۔ میڈیکل کرنا میری بہت بڑی تمنا ہے۔ ٹیوشنوں اور وظیفوں کے بل پر ڈاکٹری کی لائن میں تو آگیا مگر اس کے بے شمار اخراجات کو برداشت کرنا اب میرے لیے بہت مشکل ہو رہا ہے۔ میں ہزار کسی واقف کار سے لیا تھا کتابوں کی ضرورت تھی۔ کچھ دوسرے سال میں میں نے ٹیوشنز نہیں کیں۔ پہلے سال وقت بہت ضائع ہو گیا اور اپنی پوزیشن قائم نہیں رکھ سکا۔ ان پیسوں سے ضروریات پوری کرتا رہا۔ اب اس نے ناک میں دم کر رکھا ہے کہ میرے پیسے واپس کرو۔ میں توصیف کے پاس آیا تھا مگر اس نے معذرت کر دی ہے۔"

تہمینہ نے کہا۔ "یہ روپے مجھے متین کو دینے ہیں۔ ایک ہفتہ کا وعدہ کیا تھا میں نے۔ میرے خیال میں متین جیسے ہونہار نوجوان کی مالی اعانت کرنا نیکی ہی نہیں اس ملک کی بھی خدمت ہے۔"

مجھے تہمینہ کے نظریئے سے بالکل اتفاق تھا مگر میں اسے دیکھنا چاہتی تھی اور اپنی اس خواہش کا اظہار میں نے اس سے بھی کر دیا جس پر وہ بولی۔ "میں کہہ دوں گی وہ آپ سے مل لے۔"

اگلے دن میں نے رقم بینک سے نکلوا کر اُسے دے دی۔

تہمینہ اور متین کے درمیان طے پا گیا تھا کہ وہ اسے پیسے دینے کہاں آئے گی؟ یہ مقام اسپتال کا تھا جو میڈیکل کالج کے ساتھ ملحق تھا۔

گیارہ بجے وہ اسکول سے چھٹی لے کر چلی گئی۔ متین اسی جگہ اس کا منتظر تھا وہ اسے دیکھتے ہی کھل اٹھا۔ دونوں ایک دوسرے کے سامنے خاموش کھڑے تھے۔ تہمینہ نے پرس سے پیسوں کا لفافہ نکالا اس کی طرف بڑھایا اور آہستگی سے کہا۔ "اسے قرض مت سمجھنا۔ یہ مدد ہے ایک انسان کی دوسرے انسان کو آئندہ بھی جہاں تک ممکن ہو سکا میں تمہارے لیے کچھ کرتی رہوں گی۔ ٹیوشنز کے چکروں کو چھوڑو اور اپنی تعلیم کی طرف توجہ دو۔"

معلوم نہیں یہ جذبہ ممنونیت کی انتہا تھی یا وہ صورتِ حال سے اس درجہ متاثر تھا کہ اس سے ایک لفظ بھی نہ بولا گیا۔ تہمینہ کو اس کی آنکھوں میں نمی سی محسوس ہوئی۔ اس کے ہونٹ بھی پھڑپھڑانے لگے تھے۔ وہ ایک ٹک تہمینہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے گھبرا کر اسے دیکھا اور بولی۔ "کیا بات ہے

متین؟"

"مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔" اس نے بے بسی سے کہا۔

"یقین نہ آنے والی کون سی بات ہے؟ آخر انسان ہی ایک دوسرے کا دُکھ بانٹتے ہیں۔ جانور تو آکر احوال پُرسی کرنے سے رہے۔"

وہ اسے کچن میں لے گیا جہاں اس نے تہمینہ کو چائے پلائی اور یہ پوچھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ اسے کہاں مل سکتی ہے۔ تہمینہ نے اسے اسکول کا پتا بتایا اور مجھ سے ملنے کو بھی کہا۔

یہ اکتوبر کے خوشگوار دن تھے۔ آفس کے سامنے چھوٹے سے گلاب کے باغیچے میں پھول مسکرا رہے تھے۔ میری نظریں بہت دیر سے ان پر جمی ہوئی تھیں۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے وہ دائیں بائیں لہراتے خوبصورت لگ رہے تھے۔ میری محویت "میں اندر آسکتا ہوں۔" اس جملے سے ٹوٹ گئی۔ ایک نوجوان میرے سر کو اثبات میں ہلتے دیکھ کر اندر آگیا۔ آتے ہی اس نے سر کو قدرے جھکایا اور بولا۔ "میں متین احمد ہوں مس تہمینہ نے شاید میرا ذکر آپ سے کیا ہو۔" میں نے یکدم خوش ہو کر کہا۔

"اچھا اچھا تو آپ متین ہیں بیٹھیے۔"

وہ کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے گہری تنقیدی نگاہ اس پر ڈالی۔ اس کی آنکھیں موٹی موٹی سی تھیں مگر معلوم نہیں مجھے وہ کچھ عجیب سی لگیں۔ اس کا چہرہ معصومیت بھرا نہیں تھا۔ میں کچھ پریشان سی ہوگئی۔

یہ حقیقت ہے کہ انسان کے بارے میں اتنی جلدی فیصلے نہیں ہوتے۔ اس کی اتنی تہیں ہیں کہ بعض اوقات سالوں ساتھ رہ کر بھی پتا نہیں چلتا مگر پھر بھی میں جو عمر کی درمیانی منزل میں ہوں۔ چہرے مہروں سے تھوڑا بہت جاننے کا دعویٰ ضرور رکھتی ہوں۔

اس کے چہرے نے مجھے متاثر نہیں کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی باتیں بڑی حقیقت پسندانہ تھیں۔ ان میں غم کی جھلک تھی اور حوادث سے نمٹنے کا عزم بھی۔ میں نے چپراسی سے تہمینہ کو بلایا۔ میرا خیال اسے چائے پلانے کا تھا مگر تہمینہ کی موجودگی میں۔

میں نے دیکھا تہمینہ جوں ہی کمرے میں داخل ہوئی۔ متین کو دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں اور رخساروں پر جیسے گلاب سے کھل اٹھے اور جس انداز میں اس نے متین کو دیکھا تھا وہ مجھے یہ سمجھانے اور بتانے کو کافی تھا کہ وہ ہمدردی سے آگے بڑھ چکی ہے۔ میں نے متین کے چہرے پر جو کچھ بکھرا دیکھا تھا اُس سے صرف یہی جان سکی کہ وہاں مسکراہٹ ضرور تھی مگر سنجیدہ سی۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے رخصت چاہی۔ تہمینہ اس کے ساتھ ہی باہر نکل گئی۔ میں نے کھڑکی کے شفاف شیشے میں سے دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ خاموش سا یہ انداز دید ان کی محبت کی چغلی کھاتا تھا۔ مجھے قدرے حیرت بھی تھی کہ تہمینہ اچھی بھلی سمجھدار لڑکی کیسے بیوقوف بن گئی ہے؟ اسے اپنی اور اس کی عمروں کے درمیان فرق کا احساس نہیں۔ زمانہ کون سا جا رہا ہے۔ یہ اسے مالی لحاظ سے سپورٹ کرتی رہے گی اور وہ اسے بیوقوف بناتا رہے گا۔ ڈاکٹر بن کر کسی اچھی خوبصورت لڑکی سے بیاہ رچالے گا اور یہ بیٹھی قسمت کو رو دے گی۔

اسے رخصت کرنے کے بعد جب تہمینہ واپس آئی تو میرے پاس ہی آگئی۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔ "مسز محسن کیسا لگا آپ کو متین؟"

"اچھا ہے۔" میں نے قدرے توقف سے کہا۔

"تہمینہ دیکھو میں ایک بات تم سے کہنا چاہتی ہوں۔ انسانی فطرت مطلب برآری کے لیے گدھے کو باپ بنانے سے نہیں چوکتی۔ ایسا نہ ہو کہ تم ہمدردیوں کی لپیٹ میں اپنا آپ لٹاتی رہو اور وہ ایک دن احسان فراموشی کی داستان بن کر تمہارے سامنے آجائے۔ اس وقت تم دکھ اور کرب کی جس منزل سے گزرو گی اس کا اندازہ مجھے ابھی سے ہو رہا ہے۔"

اس نے میرے ان خدشات کے جواب میں کچھ نہ کہا بس سر جھکائے چپ چاپ میری باتیں سنتی رہی۔ بریک کی گھنٹی بجی اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔

بہت عرصے تک مجھے کچھ پتا نہ چل سکا مگر ایک بات میں نے ضرور محسوس کی تھی کہ تہمینہ کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑا ہوا تھا۔ ایک دو بار میں نے اس سے پوچھا بھی مگر وہ ٹال گئی۔ ایک دن اتفاق سے جب میں ٹیچرز کے پاس بیٹھی ہوئی تھی تہمینہ زیر بحث آگئی۔ مسز رحمان نے تنک کر میرے اس اندیشے کی تردید کی جو مجھے اس کی صحت کے بارے میں تھا۔

"تین ٹیوشنز تو وہ اسکول ختم ہوجانے کے بعد پڑھاتی ہے اور تین چار کے گھروں میں جاتی ہے۔"

اور جیسے میرے دل پر گھونسا پڑا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ وہ اس مشقت کی چکی میں کس لیے پس رہی ہے؟ میں خاموش تھی اور مسز رحمان غالباً منتظر تھی کہ وہ میرے کسی بھی حیرت کے

انتظار کے بعد حقیقت سے پردہ اٹھائے اور میں اپنی ہی سوچ میں گم تھی جب اس نے کہا۔

''کسی ڈاکٹر کے پیچھے گئی ہوئی ہے اُسے پڑھا رہی ہے۔'' اور ساتھ ہی طنزیہ سا قہقہہ فضا میں اچھال دیا۔''احمق!جب وہ ڈاج دے جائے گا تو بیٹھی قسمت کو روئے گی۔''

میں خاموش رہی تبصرے کرنا مجھے قطعی پسند نہیں۔

ایک دن میں نے مسکراتے ہوئے تو ویلنے کی خاطر کہا۔

''میرا خیال ہے تم محبت کر بیٹھی ہو۔'' میں نے موضوع کی تخی کو مسکراہٹ کی آزادی دی۔ اور اس نے شرمانے یا سر جھکانے کے بجائے سکون سے کہا۔

''شاید اسی کا نام محبت ہے مجھے تسین اچھا لگتا ہے۔''

''مگر وہ تم سے شادی کرے گا۔''

''مسز حسن شادی بیاہ تو مقدروں کی بات ہے۔ میں نے اگر اسے مالی اعانت دی ہے یا دے رہی ہوں تو یہ غرض نہیں مجھے اس کی مدد کر کے خوشی ہوتی ہے۔ اس بار اس نے آپ کہا ہے۔''

''کیسی لڑکی ہے۔ کتنا بڑا دل رکھتی ہے خدا کرے خوش رہے۔''

تسین کے ساتھ اس کی دوستی اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ سب لوگ جان گئے تھے۔ بیشتر کا نظریہ میرے جیسا تھا۔

اور جس دن تسین ڈاکٹر بنا اس دن اس نے بہت شاندار پارٹی دی۔ سب لوگوں کا اصرار تھا کہ وہ تسین کو بھی بلا لے۔ تسین بھی آیا۔ اس نے پنجاب کے میڈیکل کالجوں میں نمایاں پوزیشن حاصل کی تھی۔

میں نے کافی مدت بعد اُسے دیکھا تھا۔ وہ خاصا صحت مند اور اچھا لگ رہا تھا۔

مسز رحمان نے پوچھا ''شادی کب کرو گے؟''

''ابھی تو کوئی پروگرام نہیں جی۔ ہاؤس جاب کرنا ہے پھر باہر جانے کے لیے وظیفہ متوقع ہے۔''

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ تہمینہ نہایت سکون سے کپوں میں چائے ڈالنے اور سب لوگوں کو پیش کرنے میں مصروف تھی۔ اس کے اندر کوئی طوفان برپا تھا یا وہ پرسکون تھی یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

تسین کے جانے کے بعد ایک دو نے کہا بھی۔ ''تہمینہ ریت سے گھر بنانے کی کوشش کر رہی ہو۔''

پانی

پانی زندگی کی بنیادی شرط ہے۔ لہٰذا زمین کے علاوہ اگر کسی مقام پر زندگی ہو سکتی ہے تو وہاں پانی کا ہونا لازم سمجھا جاتا ہے۔ 2011ء میں نظام شمسی کے باہر ایک سیارہ دریافت ہوا تھا جس کا نام HATP16B رکھا گیا۔ اس کی فضا میں پائے جانے والے پانی کے ذرات پر سائنسدان تحقیق کر رہے ہیں۔ یہ سیارہ زمین سے 430 نوری سال کے فاصلے پر ہے اور دو بڑی خلائی دوربینوں ہبل اور سپٹزر کی مدد سے اس کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ اس کی فضا ہائیڈروجن اور ہیلیم سے بنی ہے۔ یہ اپنے ایک سورج کے گرد گردش کرتا ہے جو ہمارے سورج سے دوگنا زیادہ بوڑھا ہے۔ یہ نظام شمسی کے سیارے نیپچون کے حجم جتنا ہے لیکن یہ اس سے زیادہ گرم ہے کیونکہ اپنے سورج سے زیادہ قریب ہے۔ خلائی تحقیقاتی ادارے ناسا کے مطابق اس میں پانی کی موجودگی کے بعض شواہد ملے ہیں تاہم یہ پانی زیادہ نہیں HATP 16B جس نظام کا حصہ ہے وہ نظام شمسی سے ملتا جلتا ہے۔

مرسلہ: منشی عزیز ہے۔ لندن ضلع دہاڑی

☆☆

ابن صفی نے اپنے ایک ناول میں سچا لطیفہ لکھا ہے جو کچھ یوں ہے: ''ایک مدیر صاحب کے پاس شہرہ آفاق مصور پکاسو پر اردو میں لکھا ہوا مقالہ آیا۔ مدیر محترم نے فوراً اگلے شمارے میں اشاعت کے لیے برائے کتابت کاتب صاحب کے حوالے کر دیا۔ مضمون کا عنوان تھا ''پکاسو'' اردو ادب کے ماہر کاتب صاحب جو مشہور مصور پکاسو کے متعلق کچھ نہ جانتے تھے انہوں نے مضمون کا بغور جائزہ لیا پھر مسکرائے اور زیر لب بولے۔ ''اچھا رکھنا بھول گئے۔'' اب اللہ دے اور بندہ لے، جہاں جہاں پکاسو کا لفظ آیا کاتب صاحب کا اضافہ کرتے چلے گئے۔ یوں ہو گیا ایک زبردست مقالہ ''پکا سور'' پر تیار۔''

مرسلہ: مجی رحمان۔ یو ایس اے

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”میں نے تو گھر بنانے کا سوچا نہیں تم بلاوجہ سوچیں پیدا کررہی ہو۔ گھر اوپر والا بناتا ہے۔ چاہے گا تو جو بنیاد میں نے رکھی ہے اس پر بن جائے گا اور اگر نہیں تو میں بجری، سیمنٹ، پیسے لے کر بھی نہیں بنا پاؤں گی۔“

متین ان دنوں ہاؤس جاب کررہا تھا۔

پھر بہار کی ایک رنگوں سے بھری صبح کو وہ بہار کی طرح کلائی اور بازوؤں تک مہندی کے پھول پتیوں سے سجی قیمتی زرتار جوڑا پہنے اور پھولوں کے زیورات سے لدی پھندی اسکول میں آئی اور متین سے اپنے نکاح کی دھماکا خیز خبر سنائی۔ ہم سب کے شکوہ پر اُس کا معذرت بھرا اظہار تھا کہ بس سادگی سے نکاح ہوا ہے۔ باہر سے تو کوئی مدعو ہی نہیں تھا۔

چلو خوشی کی بات تھی۔ اس کی بے کیف سی زندگی میں خوشیوں کے رنگ تو کھلے۔

سال بعد بچہ آگیا۔ وہ واقعی بہت خوش تھی۔ مسرور و مطمئن اور سرشاری۔

متین پڑھنے کے لیے انگلینڈ چلا گیا۔ پانچ سال بعد واپس آکر اُس نے گلبرگ میں ایک شاندار اسپتال اور گھر بنایا۔ تہمینہ نے نوکری چھوڑ دی اور اسپتال کی منتظم اعلیٰ کی ڈیوٹی سنبھال لی۔

انسانوں کو پرکھنے، پڑھنے اور ان کو جانچنے کے میرے سارے دعوے غلط نکلے تھے۔

ہم سب کا خیال تھا کہ تہمینہ بختاور ہے۔ قسمت کی دھنی ہے۔ مقدر نے اُس کا بہت ساتھ دیا ہے۔

یہ جاتی سردیوں کے دن تھے۔ میرے بچے چائنیز کھانے کے لیے ضد کررہے تھے میں انہیں لے کر ایک چینی ریستوران میں چلی گئی۔ بڑا خوابناک سا ماحول تھا۔ بہت زیادہ لوگ نہیں تھے۔ میں میزوں کے گرد بیٹھے لوگوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ جب ذرا فاصلے پر کونے میں ایک نوجوان چہرے نے مجھے فی الفور اپنی طرف کھینچ لیا۔ لڑکی کا حسن نیم اندھیرے میں لشکارے مارتا تھا۔ بار بار میری نظریں اس کی طرف اٹھتی تھیں۔ مجھے تجسس سا تھا کہ ساتھ بیٹھا مرد کیسا ہے؟ دونوں جب اٹھے تو میں ششدر رہ گئی۔ وہ متین تھا۔ بہت وجیہہ لگ رہا تھا۔ دُبلا پتلا جسم اب بھر گیا تھا۔ باہر کی تعلیم و تربیت نے زبردست گرومنگ کردی تھی۔ دونوں اپنی ترنگ میں میرے قریب سے گزر کر چلے گئے۔

تو میرے خدشات درست تھے۔ انسانوں کے بارے میں میری ریڈنگ بھی غلط نہ تھی۔ ایسے ہی ہوتا ہے۔

اگلے دن میں نے تہمینہ کو فون کیا۔ ایک دُکھ بھری جھجک آمیز تشویش میرے لب و لہجے سے ہویدا تھی۔ میں حیران رہ گئی۔

”مسز محسن! اُس کی آواز میں طمانیت سے بھرا ہوا محبت بھرا رچاؤ تھا۔ وہ ثمرہ تھی۔ متین کے بچپن کے انتہائی بُرے دنوں کی ساتھی۔ اُس کی محبت، اُس کی بیوی۔“

میں تو سناٹے کی سی کیفیت میں تھی وہ چند لمحوں کے لیے رکی تھی پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی۔

”ثمرہ کے بارے میں تو اُس نے پہلی چند ملاقاتوں کے بعد ہی بتا دیا تھا۔“

مسز محسن جب تیس سال کی ایک سمجھ دار، پختہ عمر کی، اپنے مستقبل سے مایوس لڑکی خود سے نو سال چھوٹی عمر کے لڑکے سے اس کی مجبوریوں اور اپنی تشنہ خواہشوں کے تانے بانوں سے ایک رشتہ بننے لگتی ہے تو سمجھوتے کی لچک کو بھی ساتھ رکھتی ہے۔ متین کی بیوہ ماں ثمرہ کے گھر کی ملازمہ تھی۔ اُن کی جھوٹن سے اپنا اور بچے کا پیٹ بھرتی تھی۔ ثمرہ کا گھر اس کی ماں کی وہ پناہ گاہ تھی کہ جہاں اُس نے اپنا وقت عزت و آبرو سے کاٹا۔

دونوں میں کوئی تین چار سال کی چھوٹائی بڑائی تھی۔ دونوں میں بے پناہ محبت تھی۔ متین میرے خلوص اور قربانیوں سے بھی متاثر تھا۔ میری زندگی میں خوشیاں بکھیرنے کا آرزومند تھا۔ مگر ثمرہ کی محبت کی ڈوریوں میں بندھا ہوا تھا۔ میں سوچتی رہی اور بالآخر ایک نتیجے پر پہنچ گئی۔

”متین دو کشتیوں میں پیر رکھ بیٹھا تھا۔ میری دانش مندی نے اُسے ڈولنے نہیں دیا۔ اُس کے انگلینڈ جانے سے قبل نکاح اُس کی تعلیم اور گرومنگ سب میری نگرانی میں ہوئی۔ پانچ سال وہ میرے ساتھ میرے زیرِ سایہ رہی۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔“

میں ہونقوں کی طرح منہ کھولے آنکھیں پھاڑے یہ سب سنتی تھی جانے کیوں یہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔ ”تمہیں کچھ محسوس نہیں ہوتا۔“

وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ”ارے مسز محسن میں تو اُس کے سارے نظام کی گاڈ مدر ہوں۔ میرے خمار کے لیے تو یہی کافی ہے۔“

تعبیر خواب

محترم مدیر

السلام علیکم

یہ روداد ہے دو سہیلیوں کی۔ ان دونوں میں کتنی محبت کیسی چاہت تھی اس کا اندازہ آپ کو روداد پڑھ کر ہی ہو گا۔ مجھے امید ہے کہ سرگزشت کے قارئین کو بھی یہ روداد پسند آئے گی۔

حبیب الرحمن
(کراچی)

میں اس کو اپنے بچپن سے جانتی تھی کیونکہ وہ میری ہم عمر ہی تھی۔ ایک ہی گلی، ایک ہی محلہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دیوار سے دیوار جڑی ہوئی۔

یہ بستی نہ تو بہت غریبوں کی تھی اور نہ ہی بہت خوشحال لوگوں کی۔ ایک خوبی نمایاں تھی کہ اس میں رہنے والے سارے لوگ ہی پڑھے لکھے اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں کام آنے والے تھے اور سال ہا سال سے ایک ساتھ رہ رہے تھے اس لیے یوں لگتا تھا جیسے سب ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔

سن شعور سے پہلے کا بھی ایک زمانہ ہوتا ہے جس میں کوئی نہ بڑا کہلاتا ہے نہ ننھا منا۔ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب سارے بچے بہت سارے بچوں اور بڑوں کے درمیان رہ کر اچھی بری ہر قسم کی باتیں سن بھی رہے ہوتے ہیں اور سیکھ بھی رہے ہوتے ہیں۔

جوں جوں عمر سن شعور کی جانب بڑھ رہی ہوتی ہے، ہم اچھی اور بری باتوں کا تجزیہ بھی کرنے کے قابل ہوتے جارہے ہوتے ہیں لیکن اس مقام پر ہمارے اردگرد کا ماحول، بڑوں کے رویے اور سلوک، ماں باپ اور بہن بھائیوں کا کردار، حلقۂ احباب کا طرز سلوک اور سب سے بڑھ کر اساتذہ کا معیار تعلیم و تربیت ہماری کردار سازی میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہوتا ہے۔

اس ابتدائی دور سے گزر کر جب میں اور وہ سن شعور کو چھو کر کچھ اور آگے بڑھے تو ہمیں یہ سمجھ کر خوشی ہوئی کہ ہمارے اردگرد کے ماحول کے جتنے بھی مراحل تھے وہ سارے کے سارے بہت ہی اچھے تھے اس لیے ہم پورے یقین سے یہ کہہ سکتے تھے کہ ہم میں کسی بھی قسم کا کوئی بگاڑ جو خود ہمارے لیے یا پھر ہمارے کسی بھی بڑے کے لیے وجہ شرمندگی ہو، نہیں آسکا تھا۔

زندگی میں بعض اوقات ایسے مراحل بھی آتے ہیں جب ایک لمحہ بھی صدیوں کے برابر لگتا ہے اور وقت کاٹے نہیں کٹتا اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ پر لگا کر اڑنے لگتا ہے۔ کچھ ایسا ہی میرے اور اس کے ساتھ بھی ہوا۔

اسکول میں داخلہ لیا ہی تھا کہ ابتدائی اسکول سے فارغ ہونے کا پتا ہی نہ چلا اور اب تو میں اور وہ دسویں جماعت میں تھے۔

مجھ میں اور میری سہیلی میں اگر کوئی بہت بڑا فرق تھا تو وہ یہ تھا کہ ذہین ہونے کے باوجود بھی وہ پڑھائی کے معاملے میں سستی اور کاہلی کا شکار تھی۔ حسن اتفاق یہ بھی رہا کہ میں اور وہ دسویں جماعت تک جس جس اسکول میں بھی رہے نہ صرف اسکول فیلو رہے بلکہ ہم جماعت بھی رہے۔ میں اپنے پورے یقین کے ساتھ یہ بات کہہ سکتی ہوں کہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ لائق فائق تھی، ہر چیز اس کو طوطے کی طرح ازبر ہوجایا کرتی تھی اور ہر سوال کا جواب اس کے پاس موجود ہوتا تھا لیکن نہ معلوم کیا بات تھی کہ ہوم ورک ہو یا کسی بھی قسم کے درمیانی مدت یا سالانہ امتحانات، وہ اس میں مجھ سے پیچھے ہی رہ جایا کرتی تھی اور اس کی بنیادی وجہ وہ یہی بتائی تھی کہ نہ جانے ان مواقعوں پر اس میں سستی اور کاہلی کیوں بڑھ جایا کرتی ہے جس کی وجہ سے وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی امتحانی سوالات کے جوابات کا حق نہیں دے پاتی تھی۔

کسی حد تک میں بھی گھریلو کاموں میں بہت ساری کوتاہیوں کا شکار رہتی تھی، جھاڑو پونچھ کا کام تو مجھے عذاب ہی لگا کرتا تھا لیکن دیگر گھریلو امور خاص طور سے کھانا پکانا اور مہمانداری میں میرے والدین اور بہن بھائیوں کو کبھی کوئی۔۔ شکایت نہیں ہوئی لیکن میری سہیلی شاید بہت سارے معاملات میں بہت اچھی رہی ہو مگر سالن چولہے پر چڑھ جانے کے بعد اکثر بھول جانے کی عادی رہی تھی اسی لیے پڑوس سے اس کی والدہ کی چیخنے کی آوازیں آیا کرتی تھیں کہ ارے نیک بخت دیکھ سالن جلنے کی بو آرہی ہے۔

ڈیٹ شیٹ آچکی تھی اور ٹھیک بیسویں دن ہمارا پہلا پرچہ تھا اور درمیان درمیان مناسب وقفوں کی وجہ سے اس کا اختتام بائیس دن بعد ہونا تھا۔ امتحان کسی بھی قسم کا ہو یہ انسان کو اندر سے ہلا کر رکھ دیتا ہے، یہی حال میرا بھی تھا اور سارے کاموں سے منہ موڑ کے میں نے اپنا رخ کتابوں کی جانب پھیر لیا تھا لیکن جب جب بھی میں اپنی سہیلی کے گھر گئی اس کی کتابیں تو کھلی اور بکھری پائیں لیکن اس کا دھیان کہیں اور ہی پایا، پوچھنے پر یہی جواب ملا کہ میرے ساتھ نا معلوم کیوں ایسا۔۔ ہوتا ہے۔

پرچے ختم ہوئے، لگا ایک پہاڑ سا بوجھ سر پر دھرا تھا وہ اتر گیا۔ ہمارے ملک کا یہ المیہ ہے کہ امتحانات کے نتائج بہت ہی تاخیر سے آیا کرتے ہیں اس طرح زندگی کے کئی قیمتی مہینے امتحان کے نتائج کے انتظار میں ہی گزر جاتے ہیں سو یہ بھی ایک امتحان تھا جو گزر ہی گیا لیکن مجھے اس بات کا گہرا صدمہ تھا کہ میری بہت ہی اچھی اور پیاری سہیلی کو ایک پرچے میں ہزیمت اٹھانا پڑی اور باقی پرچوں میں بھی بہت حوصلہ افزا نمبر نہیں آسکے تھے۔

کہتے ہیں کہ وقت بڑا مرہم ہوتا ہے، اس لیے ماحول کی کدورت بھی قصہ ماضی بننا شروع ہوگئی اور اس نے بھی ضمنی امتحان میں بیٹھنے کا فیصلہ کرلیا۔

کچھ فیصلے وہ ہوتے ہیں جو ہم کررہے ہوتے ہیں اور کچھ فیصلے وہ ہوتے ہیں جو کاتب تقدیر لکھ رہا ہوتا ہے۔ اس نے ضمنی امتحان میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔ تھا اور درخواست داخل بورڈ کی ہی تھی کہ کوئی اس کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آن کھڑا ہوا۔ لوگ اچھے تھے، لڑکا مناسب تھا اور ان ہی کے مطابق حالات اور ماحول والا تھا اس لیے والدین نے رشتہ طے کرنے میں دیر لگانا مناسب نہیں سمجھا اور اس کو اللہ کا حکم اور رب کی رضا سمجھتے ہوئے نہ صرف قبول کرلیا بلکہ چند مہینوں میں اس کو رخصت بھی کردیا۔ جس جس نے بھی لڑکے اور لڑکے والوں کو دیکھا، ملاقات کی، سب نے یہی کہا کہ اچھے لوگ ہیں اور دعائیں دیں کہ اللہ تعالیٰ سکھی رکھے۔ اس طرح میری بہن جیسی سہیلی مجھ سے میلوں دور بیاہ کے اور میری پلکوں پر ستارے سجا کے

پیا دیس چلی گئی۔

میں ابھی اس واقعہ پر حیران و پریشان ہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ میری سہیلی کی ابھی عمر ہی کیا تھی جو ان کے والدین نے اس کے نرم و نازک کاندھوں پر اتنی بھاری ذمہ داری ڈال دی کہ میرے گھر بھی کوئی آندھی طوفان کی طرح آن پڑا اور میں نہیں نہیں ہی کرتی رہ گئی۔

اس طوفان کو سر سے گزرے بھی پانچ برس بیت چکے ہیں۔ اس پانچ برسوں میں کئی اور حقیقی طوفان بھی گزرے، میری والدہ دنیا سے رخصت ہوئیں، میری سہیلی کے تو دونوں سائے ہی سر سے اٹھ گئے، میرے والد کا سایہ ابھی تک میرے سر پر ہے لیکن میں والد سے کوسوں دور دارالحکومت میں ہوں اور والد اپنے آبائی شہر میں، اپنی سہیلی کی بس اتنی ہی خبر ہے کہ وہ شادی ہو کر حیدرآباد چلی گئی تھی اور کیونکہ میری شادی بھی بہت عجلت میں ہوئی تھی اس لیے کسی کو اتنی مہلت ہی نہ مل سکی کہ دور دراز کے لوگوں کو مدعو کیا جا سکے۔

آج کل کے ماحول کے اعتبار سے شاید یہ بات بہت عجیب سی لگے کہ اتنی چھوٹی عمروں میں ہماری شادیاں کیوں کر دی گئیں لیکن میرے زمانے میں یہ عمریں بہت بڑی کہلاتی تھیں اس لیے ایسا ہو جانا اس زمانے کے لحاظ سے درست ہی تھا اور جو کچھ میں نے اپنے محسوسات بیان کیے وہ میرے اپنے اندر کی لڑکی کے تھے کیونکہ مجھے ایسا ہی لگا تھا کہ اتنی کم عمر میں اتنی بھاری بھاری ذمہ داریاں کسی بچی پر ڈال دینا میری اپنی سوچ کے مطابق مناسب نہیں تھا۔

جب تک میری والدہ حیات تھیں اور ان سے بذریعہ خط و کتابت رابطہ رہتا تھا یا وہ کبھی یا میں کبھی آیا......یا......جایا کرتے تھے، اپنی سہیلی کے متعلق یہی خبر ملتی کہ وہ بحیثیت مجموعی خوش ہی ہے البتہ فطری سستی اور کاہلی کی وجہ سے اسے اکثر شدید پریشانی کا سامنا رہتا ہے لیکن والدہ کی وفات کے بعد ہر قسم کا رابطہ منقطع ہو کر رہ گیا تھا۔

کمزوریوں سے پاک اللہ کی ذات ہے، مجھے بھی اس بات کا اندازہ ہے کہ میری اکثر نادانیوں، کمزوریوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے کافی مشکلات کا سامنا رہتا تھا، کچھ پر تو میں قابو پالیا کرتی تھی لیکن جس طرح ایک گھر والی کو گھر کو چندن بنا کر رکھنا چاہیے، اس کمزوری پر میں اب تک قابو نہیں پا سکی تھی۔ یہ بات میری ساس کے لیے کبیدہ دلی کا سبب بن جایا کرتی تھی لیکن ان کی اچھی بات یہ تھی کہ وہ بات کو طول دینے کی بجائے ختم کر دیا کرتی تھیں اور یوں بات آئی گئی ہو جایا کرتی تھی۔

آج مجھے اپنی سہیلی نہ جانے کیوں بہت یاد آرہی تھی۔

پیدائش سے لے کر جوانی تک اور پھر شادی تک جو بہنوں کی طرح ساتھ رہی ہو اس کو بھول جانا کیسے ممکن ہے لیکن پریشانی کی بات یہ تھی کہ میرا اس سے اور اس کا مجھ سے رابطہ نہیں تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دو تین ہی ذرائع ہوا کرتے تھے، خط، تار یا پھر لینڈ لائن ٹیلیفون......ٹیلیفون تو کسی کسی کے پاس ہوا کرتا تھا۔ میرے پاس یہ سہولت ضرور تھی لیکن کروڑوں اس نعمت سے محروم ہی ہوا کرتے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی یہ نہیں سنا تھا کہ میری سہیلی کے گھر یا محلے میں ایسی کوئی سہولت میسر ہے۔ رہی بات خط اور تار کی تو اس کے لیے اولین شرط گھر کے پتے کی ہوتی ہے جو میرے پاس تھا ہی نہیں کیونکہ جو بھی خیر خیریت مجھے معلوم ہوتی رہی وہ میری سہیلی کے والدین سے ہی ہوتی رہی اور اب تو وہ لوگ بھی اس دنیا میں نہیں رہے تھے اور میرا رابطہ بھی بہت عرصہ ہوا اس کے گھر والوں سے منقطع ہی تھا۔ اس کا خیال آتے ہی دل کی گہرائیوں سے کوئی آس و اُمید کی آہ بلند ہوئی تو یہی ہوئی کہ اللہ اس سے ملاقات کی کوئی سبیل ضرور نکالے اور زندگی میں وہ اور میں ایک بار ضرور مل سکیں۔

میری ساس اس زمانے کی روایتی ساس بالکل بھی نہیں تھیں، چھوٹی موٹی گھریلو ناچاقیوں کے علاوہ کبھی کوئی بات نہیں ہوئی اور جو ہوئی بھی اس میں بھی میری ہی کسی نادانی یا کوتاہی کا دخل رہا۔

میرے شوہر کی ملازمت بہت مناسب تھی اور ہم ایک اچھی زندگی گزار رہے تھے۔ میرے سسر بھی اچھے سرکاری عہدے پر فائز تھے۔ شوہر حسبِ معمول صبح دفتر جاتے اور چار پانچ بجے کے دوران لوٹ آتے تھے۔ سسر ہوں یا میرے شوہر، سرکاری ملازمت کے باوجود پابندیٔ اوقات کے بہت ہی پابند تھے اس لیے ہم سب کے سونے اور جاگنے کے اوقات معمول کے مطابق ہی تھے۔

ایک دن جب میرے شوہر گھر لوٹے تو کچھ مضمحل مضمحل نظر آئے، میں نے یہ تبدیلی محسوس...تو فوری طور پر کرلی لیکن جب وہ نہا دھو کر فارغ ہوئے تو میں نے چائے پیش کرتے ہوئے اس تبدیلی کا ذکر کیا۔ میرے سوال پر پہلے تو انہوں نے اس تبدیلی کے محسوس کیے جانے پر حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت کا اظہار کیا اور پھر کہا کہ میرا تبادلہ تین سال کے لیے حیدرآباد کر دیا گیا ہے۔

یا اللہ، میرے دل میں بے اختیار یہ صدا گونجی، آج ہی تو میرے دل میں اپنی بچپن کی سہیلی سے ملنے کی تڑپ پیدا ہوئی تھی

جو بیاہ کے حیدرآباد ہی گئی تھی اور آج ہی میرے شوہر مجھے اپنے تبادلے کا سنا رہے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے یوں لگا جیسے میں شوہر کے سامنے نہیں ہوں بلکہ سہیلی کی تلاش میں حیدرآباد کی گلیوں میں گھومتی پھر رہی ہوں۔

''کہاں گم ہو گئیں؟'' میرے کانوں میں شوہر کی آواز گونجی اور مجھے یوں لگا جیسے بہت دور سے کسی نے آواز دی ہو۔

میں نے گھبرا کے کہا۔ ''کہاں گم ہو سکتی ہوں آپ کے پاس ہی تو ہوں۔'' لیکن یہ جملہ ادا کرتے ہوئے میرا لہجہ، آنکھیں اور اعتماد کچھ اور ہی چغلی کھا رہا تھا۔ میرے شوہر نے سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی چشم پوشی سے کام لیا۔

اکثر میں اپنے گھر آئے کسی مہمان یا گھر میں ساس یا سسر سے کوئی بات کر رہی ہوتی تھی اور میرے شوہر دور بیٹھے کسی کام میں مصروف اس بات کو نوٹ بھی کر رہے ہوتے تھے پھر بھی آج تک انھوں نے خود سے یہ جاننے کی کوشش یا خواہش نہیں کی کہ میں کیا باتیں کر رہی تھی۔ میں نے اکثر اپنے شوہر کو ٹوکا کہ آپ، کی جانے والی باتوں کو دریافت کیوں نہیں کرتے تو وہ بہت متانت سے صرف اتنا کہا کرتے تھے کہ ظاہر ہے تم کون سا میرے خلاف کسی سے کچھ کہہ رہی ہوگی، اگر کوئی بات مجھے بتانے کی ہوگی تو مجھ سے کیوں چھپاؤ گی اور میں ان کی اس سوچ پر ششدر رہ جایا کرتی تھی۔

یہی اس وقت بھی ہوا اور وہ مجھے آج بھی حیران کر گئے۔

والدین کے سامنے اپنے مسئلے کو رکھتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں نے سوچا ہے کہ میں آپ کی بیٹی کو ساتھ لے جانے کی بجائے تنہا چلا جاؤں اور چھٹیوں کے دوران آؤں جاؤں تاکہ آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔

میں نے یہ جملے بہت صبر وضبط کے ساتھ سنے۔ گھر کی فضا میں چند لمحوں کے لیے سکوت سا چھا گیا۔ میری نگاہیں بے ساختہ اپنے ساس سسر کی جانب اٹھ گئیں اور میں منتظر رہی کہ دیکھیں کیا جواب آتا ہے۔

''نہیں بیٹے، یہ بات ہمیں کبھی گوارہ نہیں ہوگی۔ تین سال کا عرصہ کوئی تھوڑا عرصہ تو نہیں ہوتا اور کیا ہمیں معلوم نہیں کہ نوکری پیشہ افراد کو کتنی چھٹیاں ملتی ہیں۔ تم جاؤ تو ہماری بیٹی کو ہمراہ لے کر جانا۔''

ان کی باتیں سنی تو میری پلکیں شبنم آلود ہو گئیں کہ ہم کتنی جلد کسی کی جانب سے کوئی رائے قائم کرلیا کرتے ہیں۔

''ٹھیک ہے۔'' میرے شوہر نے جواب دیا۔ ''میں دو دن بعد روانہ ہو رہا ہوں، جوائنگ دوں گا، کسی اچھی جگہ مکان تلاش کروں گا اور پھر انہوں نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور پھر آپ کی بیٹی کو بھی لے جاؤں گا۔''

ایسا ہی ہوا، ایک ماہ کے اندر اندر میں اپنے شوہر کے ساتھ حیدرآباد شفٹ ہو گئی۔

حیدرآباد کا لطیف آباد اس وقت کے حیدرآباد (اور آج کے بھی) کی ایک اچھی رہائشی اسکیم تھی اور کیونکہ اس کی تعمیر شروع ہوئے بہت عرصہ نہیں ہوا تھا اس لیے ہر جگہ بہت کھلی کھلی اور صاف ستھری نظر آتی تھی، گوکہ مجھے یہاں کی رہائش اسلام آباد سے اچھی کبھی نہیں لگی لیکن جہاں شوہر ہو وہ بیشک جنگل بھی ہو تو سماں منگل سے کم نہیں ہوا کرتا۔

لطیف آباد میں رہتے ہوئے اب دو سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ گلیوں میں گھومتے، بازاروں میں خرید و فروخت کے دوران، تفریح گاہوں میں سیر کرتے میں ایک ایک خاتون، خواہ وہ نقاب میں ہو یا بے نقاب، غور سے دیکھا کرتی کہ شاید مجھے میری سہیلی نظر آجائے لیکن اب تک ایسا ممکن نہ ہو سکا تھا۔ اکثر یہ بھی ہوتا کہ میرے شوہر میری اس بات کو محسوس کر لیتے لیکن سوائے مسکرانے کے کبھی انہوں نے اور کچھ نہیں کیا جس پر اکثر میں جھنجلاہٹ کا شکار ہو کر پوچھ بیٹھتی کہ آخر آپ میری اس کیفیت پر کوئی تبصرہ کیوں نہیں کرتے، یہ بات سن کر ان کی مسکراہٹ میں اور بھی گہرائی آجایا کرتی تھی مگر تبصرہ پھر بھی نہیں کرتے تھے۔

آج بھی کچھ ایسا ہی ہوا، میں ان کے ساتھ بازار میں کچھ خرید و فروخت کر رہی تھی ایک نقاب پوش خاتون کو کچھ زیادہ غور سے دیکھنے لگی لیکن بہت جلد مجھے یہ احساس ہوا کہ جو کچھ میں تلاش کرنا چاہ رہی ہوں وہ اس میں ہے ہی نہیں۔ میں نے بے ساختہ مڑ کر شوہر کی جانب دیکھا تو ان کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔

گھر پہنچ کر میں ان پر الٹ ہی پڑی۔ ''آخر آپ میری اس کیفیت پر صرف مسکراتے کیوں ہیں پوچھتے کیوں نہیں کہ میں ایسا کیوں کرتی ہوں۔''

آج پہلی مرتبہ مجھے ان کی جانب سے لفظوں میں جواب ملا تو میں حیران رہ گئی۔

کہنے لگے۔ ''جس چیز کا معلوم ہو اس کے متعلق پوچھنے کا کیا فائدہ اور جس کا نہ معلوم ہو تو اس کی کھوج کرید کیوں؟''

میں ان کے جواب پر چونک پڑی۔ ''آپ کو کیا معلوم کہ میں ایسا کیوں کرتی ہوں؟''

کہنے لگے۔ ''تمہیں اپنی سہیلی کی تلاش ہے۔''

"کیا مطلب؟" میں جیسے چیخ سی پڑی۔ یہ بات آپ اتنے یقین سے کیوں کہہ رہے ہیں۔

"بات یہ ہے کہ تم جس چھوٹے سے شہر میں رہتی تھیں وہاں تقریباً سارے ہی لوگ ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے۔ جب میرے والدین میرے رشتے کی تلاش میں وہاں گئے تو اس بات کا تذکرہ بھی آیا کہ تمہاری ایک سہیلی کی شادی چند ماہ قبل ہو چکی ہے اور وہ رخصت ہو کر حیدر آباد گئی ہے۔ تم اور تمہاری سہیلی کا جو دوستانہ تھا وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں تھا اس لیے میری والدہ سے اس کے تذکرے بالکل اس طرح کیے گئے تھے جیسے کوئی سگی بہنوں کے کرتا ہے۔"

میں... دل ہی دل میں انھیں کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن صرف "ہوں" کہہ کر رک گئی۔

جب ہی میں کہوں یہ ہر دم مجھے اس طرح دیکھ کر مسکرایا کیوں کرتے ہیں۔ یہ بات بھی میں نے اپنے دل ہی دل میں کہی۔

میں نے اپنے جذبات کو قابو رکھتے ہوئے کہا۔ "پھر آپ کے علم میں بھی ہوگا کہ وہ لطیف آباد میں کہاں ہے۔"

"تمہیں علم ہے؟" الٹا انہوں نے مجھ سے سوال کرلیا۔

"نہیں۔" میرے منہ سے بیساختہ نکلا۔

"پھر مجھے کیسے معلوم ہوسکتا ہے جبکہ مجھے اُس کا یا اس کے شوہر کا نام تک نہیں معلوم۔ جہاں تک اس کے نام کا تعلق ہے وہ ظاہر ہے میں کیسے بھول سکتی تھی لیکن جہاں تک اس کے شوہر کے نام کا تعلق ہے وہ تو میں نے بھی کسی سے پوچھا تک نہیں تھا اور نہ میرے زمانے میں ایسا کوئی رواج تھا البتہ اگر اس کی شادی ہماری بستی ہی میں کسی سے ہوئی ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ اس کے شوہر کا نام کسی نہ کسی سے سننے میں آ ہی جاتا۔

بات آئی گئی ہوگئی اور کچھ ہفتے ایسے ہی گزر گئے۔

شادی ہوئے تقریباً سات برس بیت چکے تھے لیکن ہم ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ اولاد کی نعمت بھی کیا نعمت ہوتی ہے۔ ہماری تو تمنا جتنی بھی ہو کم ہے، بزرگوں کی تمناؤں کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ اولاد کی محرومی ایک خاتون خانہ پر کھنچی ہوئی تلوار کی مانند ہوتی ہے۔ یہ سوچ کے جب جب میں نے اپنے شوہر کی جانب دیکھا ان کو مطمئن ہی پایا اور تذکرہ کرنے پر ایک ہی جواب ملا کہ ہم سب اللہ کے بندے ہیں اور اللہ کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔

میرے شوہر بظاہر کوئی مولوی یا مذہبی قسم کے نہیں تھے لیکن ان میں کچھ صفات تعجب خیز ضرور تھیں، جیسے یہی۔ اتنے یقین اور اعتماد والی بات کہ اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

کچھ دنوں سے میری طبیعت مجھے اپنی ہی چغلی کھاتی محسوس ہو رہی تھی، گھر میں بزرگ خواتین کا ہونا بھی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے اس کا احساس تو مجھے حیدر آباد آتے ہی ہوگیا تھا لیکن اب کچھ دنوں سے تو اس کمی کا احساس اور بھی بڑھ گیا تھا۔ اس زمانے کی تربیت ہی ایسی ہوا کرتی تھی کہ اس قسم کی باتیں شوہر سے بھی براہ راست نہیں کی جاتی تھیں لیکن اب تو کرنا ہی تھی۔ دل و دماغ کو سمجھایا، دل کی دھڑکنوں کو سنبھالا اور آخر کار ان کے سامنے بات رکھ ہی دی۔

یہ وہ وقت تھا جب میرے شوہر دفتر جانے کے لیے گھر سے نکلنے ہی والے تھے۔ میری یہ بات سن کر وہی گہری مسکراہٹ ان کے لبوں پر قصیدہ ہوئی جس کو دیکھ کر میرے دل و دماغ میں عجیب سے کھلبلی مچ جایا کرتی تھی۔ اسی کے ساتھ وہ کوئی جواب دیے بغیر مجھے حیران و پریشان چھوڑ کر دفتر روانہ ہو گئے۔

حسب معمول شام کو گھر لوٹے تو بس اتنا کہا کہ بس تم تیار ہو جاؤ، لیکن پہلے چائے، آج کہیں چلتے ہیں۔ میں نے سوچا شاید میرے سلسلے میں ہی جا رہے ہوں۔

چائے تیار کی، وہ مسکرا مسکرا کر پینے لگے تو میں اٹھی اور تیار ہونے چلی گئی۔ واپسی پر وہ بھی تیار ہی ملے اور ہم نامعلوم منزل کی جانب چل دیے۔ حیدر آباد میرا دیکھا ہوا تو نہیں تھا اس لیے میرے لیے منزل نہ معلوم ہی رہی ہوگی لیکن جہاں میرے شوہر مجھے لے جانا چاہ رہے ہوں گے وہ تو یقیناً ان کے لیے "معلوم" ہی ہوگی۔

ہماری کار کو جہاں بریک لگا اس جگہ کو دیکھ کر ایک جھٹکا میرے دماغ کو بھی لگا، نہ تو یہاں اسپتال تھا اور نہ ہی تفریح گاہ، یہی دونوں جگہیں میرے تصور میں گردش کر رہی تھیں یا اللہ ریلوے اسٹیشن؟ یہ بھی کوئی جگہ ہوئی۔

کسی گاڑی کے آنے کا وقت قریب تھا، تانگے اور سائیکل رکشا جمع ہونا شروع ہوگئے تھے۔ اکا دکا موٹر کاریں بھی نظر آرہی تھیں، یہ وہ زمانہ تھا جب بصد مشکل کسی محلے میں کوئی کار والا ہوتا تھا۔

میں نے اپنے شوہر سے اپنی حیرت کا اظہار کیا تو بس اتنا جواب ملا "چند منٹ ٹھہر جاؤ سب معلوم ہوجائے گا۔"

اور چند منٹ بعد ہی ریل گاڑی اسٹیشن سے آ لگی اور اس کے مزید چند لمحے بعد ایک ڈبے سے میرے ساس سسر

برآمد ہوئے جن کو دیکھ کر میری حیرت اور خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔

ایک حیرت اس حیرت سے بڑھ کر یہ تھی کہ آخر اپنی بات شوہر کے سامنے رکھتے ہی یہ سب کچھ کیسے ہو گیا جبکہ اگر ایسا تھا بھی تو تین چار دن تو لگ جانے چاہییں تھے۔

اسٹیشن سے لے کر گھر تک اس خیال کے علاوہ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کچھ اور سوچا ہو۔

گھر آ کر جونہی میرے ساس سسر نہانے دھونے میں مصروف ہوئے تو میں شوہر سے الجھ گئی جس کا جواب انھوں نے لفظوں میں دینے کی بجائے دیوار سے لٹکے ہوئے کیلنڈر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے دیا اور بے ساختہ میری نگاہیں اور گردن حیا سے جھکی کی جھکی رہ گئیں۔

ابو (سسر) ریٹائرڈ ہونے ہی والے تھے اور امی (ساس) اس خبر کے بعد کسی طور نہیں رک سکتی تھیں اس لیے ابو نے وہ چھٹیاں جو جمع ہو چکی تھیں اور ریٹائرمنٹ کے بعد ان کا حساب بے باق ہو جاتا تھا، ان کو ''حساب'' میں لانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور ان کو تصرف میں لانے کا اس سے اچھا موقع کون سا ہو سکتا تھا۔

میری مشکل دیکھ کر میری امی (ساس) نے میرے شوہر سے کہا کہ کراچی چلو، یہاں جدید سہولتوں کا فقدان ہے اور اللہ نے ہمیں اتنا کچھ دیا ہوا ہے تو کیوں نہ کسی اچھے نجی اسپتال میں چیک اپ کرالیں، میرے شوہر کو اس بات پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا جبکہ میرے سسر کے بہت سارے رشتے دار کراچی ہی میں ہوا کرتے تھے۔ کراچی پہلے دارالحکومت ہوا کرتا تھا، جب اسلام آباد کو دارالحکومت بنایا گیا تو میرے ابو (سسر) کا بھی اسلام آباد ٹرانسفر ہو گیا تھا۔ یہ بات مجھے اپنی شادی کے بعد ہی معلوم ہوئی تھی۔

کراچی میں ہمارا قیام ابو (سسر) کے چھوٹے بھائی کے گھر ہی ہوا۔ ابو اور امی تو اکثر کراچی جاتے آتے رہے تھے لیکن میں پہلی بار ہی کراچی گئی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ پاکستان کے ہر شہری کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ کراچی دیکھے۔ بیشک اس وقت کا کراچی ہو یا اس وقت کا، ایک بہت ہی بڑا اور پُر رونق شہر ہے لیکن لوگوں کے پاس اتنے وسائل ہی نہیں ہوتے تھے کہ وہ کہیں دور دراز کا سفر کر سکیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اب اپنے ملک میں گھومنا تو گھومنا، باہر جانا بھی کوئی بہت انہونی بات نہیں رہی۔

سب لوگ بہت اچھے لگے اور سب سے ہی پیار ملا۔

اگلے دن ہم ایک بہت اچھے اسپتال گئے۔ معائنے کے دوران معلوم ہوا کہ اس اسپتال سے اپنا ہاؤس جاب مکمل کر کے ڈاکٹر قرۃ العین حیدرآباد جا چکی ہیں اور یہاں انھوں نے بہت اچھی شہرت پائی ہے۔ کیونکہ گزشتہ سات آٹھ برس سے حیدر آباد میں ہی مقیم ہیں اس لیے وہاں کے ایک نجی اسپتال نے ان کی لائق مندی اور اچھی شہرت کی وجہ سے ہاؤس جاب کے دوران ہی اچھی آفر دی ہوئی تھی جس کو انھوں نے اپنی خوش بختی سمجھتے ہوئے قبول کر لیا تھا۔ اسپتال کی انتظامیہ کو جب یہ علم ہوا تو انھوں نے مشورہ دیا کہ اگر آپ چاہیں تو ان کے پاس اپنی رجسٹریشن کرا سکتی ہیں۔

الحمد للہ، میری رپورٹس سب ہی اچھی آئی تھیں اور کسی بھی قسم کی کوئی تشویش کی بات نہیں بتائی گئی تھی، علاوہ کھانے پینے کی احتیاط کے، اس لیے سب نے یہی کہا کہ مشورہ مناسب ہے اور فیصلہ ہوا کہ اب باقی علاج اور دیکھ بھال حیدرآباد میں ہی ہو تو بہتر ہے۔

قرۃ العین، میں نے رات بھر اس نام پر بہت غور کیا۔ یہی نام تو تھا میری سہیلی کا۔ لیکن ڈاکٹر؟ میٹرک میں سپلیمنٹ، پڑھنے میں کاہل اور سست۔ سو جانے والی لاابالی...... اونہہ کیا دنیا میں ایک ہی قرۃ العین ہے مگر حیدرآباد۔ سات آٹھ برسوں سے مقیم بس ساری رات کیا۔ جتنے دن کراچی میں گزارے اور کراچی سے آنے کے بعد اپنے گھر میں گزارے یہی کہانی دماغ میں گھومتی رہی۔ اس دوران مجھے یہ تک احساس نہیں ہو سکا کہ میرے شوہر میری اس کیفیت کو بھانپ بھی رہے ہیں یا نہیں، آج ڈاکٹر کے پاس جانا ٹھہرا تھا، شوہر میرے ہمراہ تھے، اسپتال حیدرآباد شہر سے تھوڑا سا ہی باہر تھا۔ اسپتال میں ایسا رش بھی نہیں تھا اور میں آخری مریضہ تھی۔ جب میں ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوئی تو یوں لگا جیسے میرا سارا وجود پتھر کا ہو گیا ہو، پاؤں من من بھر کے ہو کر رہ گئے تھے۔ میں تو اب تک نقاب میں ہی تھی لیکن جو چہرہ میرے سامنے تھا وہ نقاب سے آزاد تھا اور......

''کیا ہوا...... کیا ہوا۔'' ڈاکٹر اور اس کی اٹینڈنٹ گھبرا کے میری جانب بڑھیں۔

''کچھ نہیں ہوا ہے مجھے۔'' میں نے عجیب سی آواز کے ساتھ کہا اور اپنا نقاب کھینچ لیا۔

''ہائیں ں ں...... '' ڈاکٹر کے منہ سے بھی بیساختہ نکلا۔ اس کے بعد جو ہم دونوں نے آنسو بہائے ہیں وہ اللہ ہی جانتا ہے۔ میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ شادیٔ مرگ سے بچ گئی۔ جب

کیفیت معمول پر آئی تو میرآنسوؤں کے سیلاب میں میرا پہلا جملہ ''تم......ڈاکٹر قرۃ العین......تم۔''

آخری جملہ کہنے کے لیے مجھے کوئی تمہید نہیں باندھنا پڑی ظاہر ہے کہ مجھ سے زیادہ اس کو کون جانتا تھا۔

''خواب۔ایک خواب کی تعبیر۔''

''کیا مطلب۔'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہوا یہ کہ میٹرک میں ایک پرچے میں فیل ہونے کے بعد اس رات میں بہت روئی۔ روتے روتے نہ جانے کب مجھے نیند آگئی تو میں نے دیکھا کہ لڑکیوں کی ایک بہت لمبی قطار لگی ہوئی ہے۔ میں خواب میں بھی سوتے سے ہی بیدار ہوئی تھی۔ خمار آلود آنکھوں اور نیند میں ڈوبی آواز میں میں نے ایک لڑکی سے پوچھا کہ یہ کیسی قطار ہے، جواب ملا جنت کے ٹکٹ تقسیم ہو رہے ہیں۔ اندازہ لگایا کہ یہ اتنی لمبی قطار ہے کہ اس میں کئی گھنٹے لگ جائیں گے۔ میں نے سوچا کہ قطار میں کھڑے ہو کر اپنی ٹانگیں تھکانے سے بہتر ہے کہ سو جاؤ۔ آرام سے آخر میں قطار میں لگ کر ٹکٹ لے لوں گی۔

جب میری آنکھ کھلی تو اس قطار میں دو تین لڑکیاں ہی دکھائی دیں لیکن جس کھڑکی سے جنت کے ٹکٹ تقسیم ہو رہے تھے وہ مجھ سے بہت ہی فاصلے پر تھی۔ میں گھبراہٹ میں اٹھ کر تقریباً دوڑتی ہوئی کھڑکی کی جانب بڑھی۔ اسی دوران آخری لڑکی بھی فارغ ہو چکی تھی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ فاصلہ قربت میں بدل جائے لیکن جونہی میں اس کھڑکی کے قریب پہنچی وہ کھڑکی بند ہو چکی تھی۔ میں یہ جان کر اتنی زور سے چیخی کہ میری آنکھ کھل گئی۔ میری آواز پر سب گھر والے پریشان تو ہوئے لیکن اس کو میرے فیل ہو جانے کے صدمے کا سبب سمجھ کر اپنے اپنے بستروں پر چلے گئے۔

میں نے سوچا جو لڑکی جنت کے ٹکٹ کے لیے بھی نہ جاگ سکے وہ دنیا میں کیا کر سکتی ہے۔

خواب کے بعد میں نے عہد کر لیا کہ اب میں کبھی سستی اور کاہلی کا مظاہرہ نہیں کروں گی۔

اسی دوران میری شادی ہو گئی لیکن میں کچھ اور ہی ٹھان چکی تھی۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ میرے سسر یہیں حیدرآباد میں سرکاری ڈاکٹر تھے۔ میں نے بلا تکلف ان سے پڑھنے اور ڈاکٹر بننے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ میں سوچ رہی تھی کہ شاید ہی اجازت ملے لیکن وہ یہ سن کر بہت ہی خوش ہوئے اور میں نے کالج میں داخلہ لے کر پڑھائی کا آغاز کر دیا۔ گھر میں ساری سہولتیں تھیں، نوکر چاکر تھے اس لیے کام کاج کا کوئی بوجھ ہی نہ تھا......اور......

اور......دیکھ لو میں تمہارے سامنے ایک لیڈی گائینا کالوجسٹ ڈاکٹر قرۃ العین موجود ہوں۔''

باہر نکلی تو میرے شوہر نے بہت غور سے مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھا لیکن حسب عادت کوئی لفظ بھی ادا نہیں کیا۔ میں نے بھی اپنی کیفیت کو چھپائے ہی رکھا اور یہی خیال کیا کہ وہ مجھ سے میرے متعلق کوئی سوال کریں گے۔

وہ مجھے گھر پر اتار کر یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے کہ میں ابھی آیا

اس مرتبہ میں نے بھی عہد کیا ہوا تھا کہ جب تک وہ خود سے نہیں پوچھیں گے میں بھی ان کو اپنی سہیلی کے مل جانے کا نہیں بتاؤں گی۔ بڑا دعویٰ کرتے ہیں کہ میں ہر بات کیفیت دیکھ کر ہی سمجھ جاتا ہوں البتہ ان کے آنے سے قبل میں اپنی امی (ساس) کو سب کچھ بتا چکی تھی لیکن اس شرط پر کہ وہ اپنے بیٹے سے کوئی تذکرہ نہیں کریں گی۔

آدھے پونے گھنٹے میں ان کی واپسی ہوئی تو وہ مٹھائی کے ڈبوں کے ساتھ ہوئی۔

میں شرما کے کمرے میں جانے والی ہی تھی کہ انھوں نے ہاتھ پکڑ لیا۔ ''ٹھہرو...... مجھے معلوم ہے تم مجھے ایک سرپرائز دینے والی ہو......لیکن......میں آج تم کو بھی ایک سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔''

میرے ذہن میں ایک نئی زندگی کے علاوہ اور کوئی تصور ابھر ہی نہیں رہا تھا۔

''کیسا سرپرائز؟'' میں نے شرمائے شرمائے لہجے میں کہا۔

یہ سن کر انھوں نے مٹھائی کا ڈبہ کھولا......اس میں مٹھائی تو تھی ہی لیکن کارڈ بھی تھا جس پر درج تھا۔

''تمھیں تمہاری بچپن کی دوست سے ملنا مبارک۔''

''آپ کو کیسے پتا چلا۔'' اس مرتبہ تو میں چیخ ہی پڑی۔

اندر جانے والی کیفیت کچھ اور تھی اور باہر آنے والا سراپا کچھ اور......نام کا علم تو ہو ہی چکا تھا، ڈاکٹر قرۃ العین۔

جو لفظ ایک مرتبہ میرے دل میں گھن ان ان ن......بن کر گونج کر رہ گیا تھا اس مرتبہ بہت بلند آواز کے ساتھ......گھنے ے ے ے......بن کر پھوٹ بہا......اور......اس بے تکلفی پر میری گردن اور آنکھیں شرمندگی کے ساتھ نگوں ہوتی چلی گئیں۔

جو لوگ محنت کرتے ہیں کامیابی انہی کا مقدر ہوتی ہے۔ اگر ہمت کرلے انسان تو زندگی کا بدلنا کوئی مشکل نہیں۔

دل والا

محترم ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
میں پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہوں۔ اسپتال میں ہر روز مریض آیا کرتے ہیں، ہر مریض کی ایک کہانی ہوتی ہے' ہر کہانی خود میں ایک جذبیت رکھتی ہے لیکن جو کہانی میں سنانے جارہی ہوں یہ رفاقت حیات کی کہانی ہے۔ بہت دلچسپ اور بہت انوکھی، امید ہے پسند آئے گی۔
ڈاکٹر عظمیٰ
(فیصل آباد)

کھٹ.....کھٹ.....کھٹ۔
اسپتال کے وارڈ اور کوریڈور میں اس کی بیساکھی کی آواز گونجا کرتی۔ وہ اب تندرست ہو چکا تھا۔ صرف اتنا تھا کہ وہ اب بیساکھی پر چلا کرتا اور وہ بھی زیادہ دیر تک نہیں۔ بس ایک آدھ چکر وارڈز کا اور ایک آدھ چکر کوریڈور کا لگا لیا۔

وہ ایک معصوم آدمی تھا۔ اس کی باتیں بہت معصومانہ ہوا کرتیں وہ ابھی مکروفریب اور جھوٹ وغیرہ سے بہت دور

تھا کم از کم یہی ہمیں محسوس ہوتا۔
ایک ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں اسے اسپتال لایا گیا تھا۔ اس وقت میں ہی ڈیوٹی پر تھی۔ جب مجھے بتایا گیا۔
''میڈم ایک ایمرجنسی ہے۔ کئی جگہ سے فریکچر ہوگیا ہے بے چارے کا، بے ہوش ہے۔''
میں اپنے کمرے سے نکل کر او پی ڈی میں پہنچ گئی۔
اس کی ایک ٹانگ کی ہڈی کئی جگہ سے بری طرح ٹوٹی ہوئی تھی۔ یہ کیس میرا نہیں ڈاکٹر باسط کا تھا لیکن چونکہ میں اسپتال کی انچارج تھی اس لیے سارے واقعات ابتدائی طور پر مجھے ہی دیکھنے پڑتے تھے۔
یہ ایک چھوٹا سا اسپتال تھا۔
شہر سے اندر ایک پُرفضا مقام پر یہ اسپتال ایک این جی او چلا رہی تھی اور مجھے فخر ہے کہ یہ ملک کے بہترین اسپتالوں میں سے ایک تھا۔
ہر طرح کے آلات، ڈاکٹرز سب کچھ تھے۔ یہ بہت بڑے احاطے میں تھا۔ احاطے کے ساتھ ایک طرف ڈاکٹرز کی رہائش کے لیے کوارٹرز بھی بنا دیے گئے تھے۔ کہنے کو تو یہ کوارٹرز تھے لیکن ان میں ہر قسم کی آسائش تھی۔
یہ اسپتال چونکہ شہر سے بہت دور تھا۔ اس لیے اسٹاف کو رہنے کی سہولت بھی فراہم کر دی گئی تھی۔ اسپتال کی اپنی شاندار فارمیسی تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ علاج سے لے کر دوائیں تک مفت ملتی تھیں۔ اس لیے یہ اسپتال مریضوں سے بھرا رہتا تھا۔
ایک بہت بڑی این جی او اسے چلا رہی تھی۔ کروڑوں کا بجٹ تھا اس کا اور سارے اخراجات مخیر حضرات کے تعاون سے پورے ہوا کرتے۔
مجھے یہاں بہت اچھی آفر ہوئی تھی۔ اس لیے میں شہر چھوڑ کر یہاں آگئی تھی۔ یہ بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ یہاں کی سیکیورٹی کے انتظامات بھی بہت اچھے ہیں۔ اس لیے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوا کرتی۔
پندرہ دنوں میں ایک بار میں شہر اپنے گھر آتی تھی جس کا فاصلہ اسپتال سے سو کلو میٹر کے قریب تھا۔ میرے پاس اپنی گاڑی تھی اس لیے آنے جانے میں آسانی رہتی۔
میں تقریباً دوسرے یا تیسرے دن شام کے وقت قصبے کے بازاروں کی طرف چلی جایا کرتی۔ جہاں ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں مل جاتی تھیں۔
اسپتال کے حوالے سے تقریباً ہر شخص مجھے اور اسپتال کے پورے عملے کو جانتا تھا۔
ایک بار میں قصبے کے بازار میں آئی تو ایک لڑکی دکھائی دے گئی۔ ویسے تو وہاں دکانوں پر اور سڑک پر عورتیں اور لڑکیاں دکھائی ہی دیتی تھیں لیکن میں نے اس کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ وہ ذرا مختلف لڑکی تھی۔ قصبے اور گاؤں کی دوسری لڑکیوں سے بالکل مختلف۔
اس کے چلنے کا انداز اور اس کی ڈریسنگ یہ بتا رہی تھی کہ اس کا تعلق شہر سے ہے، وہ خوب صورت اور اسمارٹ بھی تھی۔
میرا اس کے بارے میں اندازہ اس طرح درست نکلا کہ مجھے دیکھ کر وہ خود میرے پاس آگئی تھی۔
''ہیلو۔'' اس نے مجھے مخاطب کیا اور یہ انداز شہری کی لڑکی کا ہو سکتا تھا۔
''ہیلو'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔
''آپ اسپتال میں ڈاکٹر ہیں نا؟'' اس نے پوچھا۔
''تمہیں کس نے بتایا؟''
''سب ہی بتا رہے ہیں۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''ویسے میرا نام شازیہ ہے۔ میں ایم بی اے کر رہی ہوں۔ اس لیے میرا یہاں رہنا نہیں ہوتا۔ شہر میں رہتی ہوں۔ اپنے انکل اور آنٹی کے ساتھ۔ کبھی کبھی یہاں بھی آجاتی ہوں۔''
''اور میں ڈاکٹر عظمیٰ ہوں۔'' میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔
''جی ہاں۔'' اس نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ''لوگوں نے آپ کا نام بھی بتا دیا تھا۔''
''میں یہاں ہر دوسرے تیسرے دن کچھ نہ کچھ خریدنے کے لیے آجاتی ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''اس بہانے میری آؤٹنگ بھی ہو جاتی ہے۔''
''ڈاکٹر! اگر یہ شہر ہوتا تو میں آپ کو آفر کرتی کہ چلیں سامنے والے ریسٹوران میں چل کر بیٹھ جاتے ہیں لیکن یہاں چونکہ ایسی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس لیے آپ کو میرے گھر چلنا ہوگا۔ یہاں سے قریب ہی ہے۔''
''بہت بہت شکریہ شازیہ! لیکن اس وقت نہیں پھر کبھی آؤں گی۔'' میں نے معذرت کر لی۔
''اوکے کوئی بات نہیں لیکن میں آپ کو تنگ کرنے کے لیے آپ کے اسپتال آتی رہوں گی۔ اجازت تو ہے نا؟''

"کیوں نہیں۔ جب چاہو۔ میں چار بجے کے بعد فری ہوجاتی ہوں۔"

وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر ایک طرف چل دی۔ جب کہ میں اپنی گاڑی کی طرف آگئی۔ شازیہ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

☆.....☆

کھٹ کھٹ کی آواز گونجی اور میں اپنے کمرے سے باہر آگئی۔

وہ سامنے سے چلا آرہا تھا۔ اب وہ پوری طرح صحت یاب ہو چکا تھا ورنہ جس وقت اسے اسپتال میں لایا گیا تھا اس کی حالت بہت خراب تھی۔

ایک ٹانگ کی ہڈی کئی جگہ سے ٹوٹی تھی۔ ڈاکٹر باسط نے بہت ہوشیاری اور مہارت کے ساتھ اس کا علاج کیا تھا۔ کئی آپریشن کرنے پڑے تھے۔

اگر یہی سب کچھ شہر کے کسی اسپتال میں ہوتا تو لاکھوں خرچ ہو چکے ہوتے لیکن ہمارے اسپتال میں اس کا علاج بالکل مفت ہوا تھا۔

اس کا نام حیات تھا۔ حیات بخش۔ ایک انتہائی سیدھا سادہ معصوم سا انسان۔ اس کو دیکھنے کے لیے اسپتال میں اس کے گھر والے آتے رہتے تھے۔ اس کے ماں باپ اور اس کی دونوں بہنیں۔ وہ سب ہی اس کی طرح سیدھے سادے تھے۔

اس کا ایکسیڈنٹ قصبے میں ہوا تھا۔ فوری طور پر اسے شہر کے کسی اسپتال میں لے جانے کی بجائے ہمارے ہی اسپتال میں لایا گیا تھا اور خدا کا شکر ہے کہ کامیابی سے علاج بھی ہو گیا تھا۔

وہ کبھی کبھی مجھ سے گپ لڑانے کے لیے میرے کمرے میں آکر بیٹھ جاتا تھا۔

ایک دن اس نے مجھ سے ایک عجیب بات کی۔

"ڈاکٹر صاحبہ! آپ کو معلوم ہے کہ میں بھی بہت پڑھا لکھا آدمی ہوں۔"

"اچھا بھائی وہ کیسے!"

"ڈاکٹر صاحبہ میرا علم ذرا الگ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کون سی مٹی کس فصل کے لیے اچھی ہوتی ہے۔ کون سا پودا پروان چڑھے گا اور کون سا مرجھا جائے گا۔ کون سا بیج اچھا ہے اور کون سا خراب ہے۔ کیا آپ یہ بات جانتی ہیں؟"

"نہیں میں یہ سب نہیں جانتی۔" میں نے اعتراف کیا۔

"تو پھر میں اپنے میدان کا پڑھا لکھا ہوا نا۔" اس نے کہا۔ "آپ اپنے میدان کی پڑھی لکھی ہیں۔"

میں چونک گئی۔ اس نے بہت ہی دانش مندانہ بات کی تھی۔ اس نے ایک بڑا فلسفہ ذرا سی دیر میں سلجھا دیا تھا اور سچائی بھی یہی ہے کہ جو شخص بھی اپنی فیلڈ میں ماہر ہے وہ اپنی فیلڈ کا پڑھا لکھا انسان ہے۔

"واہ حیات بخش۔" میں نے اس کی تعریف کی۔ "یہ بتاؤ تم نے یہ بات کہاں سے سیکھی ہے۔"

"میں نے بھی دنیا دیکھ رکھی ہے ڈاکٹر صاحبہ۔" وہ فخر سے بولا۔

"اچھا۔" میری دلچسپی بڑھ چکی تھی۔ "کون کون سی دنیا دیکھی ہے۔"

"پورا گاؤں دیکھا ہوا ہے۔ ایک ایک گلی، یہی نہیں بلکہ آس پاس کے سارے گاؤں اور سارے قصبے میرے دیکھے ہوئے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ چار پانچ بار شہر بھی ہو آیا ہوں۔"

مجھے اس کی سادگی پر بہت ترس آیا۔ بے چارہ اس کو پوری دنیا سمجھ رہا تھا۔

بہرحال اسپتال میں آنے کے کچھ .... دنوں کے بعد وہ بیساکھی کے سہارے آہستہ آہستہ چلنے کے قابل ہو سکا تھا۔ اب اس نے ایک دوسرا مشغلہ اپنا لیا تھا۔ وہ ایک وارڈ سے دوسرے وارڈ کے چکر لگاتا رہتا اور مریضوں کے چھوٹے موٹے کام کر دیا کرتا۔

اگر کوئی بیمار بچہ ہے تو اس کے پاس پہنچ کر اسے الٹی سیدھی کہانیاں سنانے لگتا اگر کوئی عورت بوڑھی ہے تو اماں اماں کہہ کر اس کی دل جوئی کرتا رہتا۔ یہ سب اس کی عجیب خوبیاں تھیں۔

ایک بار اسپتال کی ایک نرس نے مجھے بتایا۔ "میڈم! آپ نے کبھی حیات بخش کو سنا ہے؟"

"سننے سے کیا مراد ہے تمہاری؟"

"میڈم! اس کی آواز بہت خوب صورت ہے۔ بہت درد بھری آواز ہے اس کی۔ کیا گلا پایا ہے اس نے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں اگر آپ بھی سن لیں نا تو واہ واہ کرنے لگیں۔"

"تم نے کہاں سے سن لیا؟"

"کل رات ہی تو سنا ہے میڈم۔ کل میری ڈیوٹی

رات کی تھی۔ میں یوں ہی کوریڈور میں ٹہل رہی تھی کہ میں نے سنا کوئی ہیر گا رہا تھا۔ آپ تو جانتی ہیں میڈم کہ اگر ہیر کوئی اچھا گانے والا ہو تو کیا اثر ہوتا ہے۔''

''ہاں جانتی ہوں میں۔''

''تو میں آواز کی طرف بڑھ گئی۔ وہ حیات بخش تھا میڈم، کوریڈور سے نیچے اتر کر جو درخت ہے اس کے پاس جو چبوترہ بنا ہوا ہے وہ اس چبوترے پر بیٹھا ہوا اپنی دھن میں گائے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ کسی اور ہی دنیا میں تھا۔ آپ بھی ایک بار اگر اس کو سن لیں تو آپ کو مزہ آجائے۔''

''ٹھیک ہے میں اس سے کہوں گی کہ وہ کسی دن مجھے بھی ہیر سنائے۔''

دو دنوں کے بعد میں نے حیات بخش سے کہا۔ ''حیات بخش! میں نے سنا ہے کہ تمہاری آواز بہت اچھی ہے۔''

''ارے نہیں میڈم! میں کیا اور میری آواز کیا۔ کبھی کبھی اپنے آپ کو بہلانے کے لیے کچھ گا لیتا ہوں۔''

''اور یہ بھی سنا ہے کہ تم ہیر بہت اچھا گاتے ہو۔''

''ہاں میڈم یہ بات تو ہے۔'' اس نے گردن ہلائی۔

''تو پھر سناؤ کسی دن۔''

''جو حکم میڈم۔''

اس نے ایک شام کوریڈور کے نیچے اس چبوترے پر بیٹھ کر ہمیں ہیر سنا دیا۔ اس وقت میرے علاوہ اور بھی نرسیں اور ڈاکٹرز تھے۔ حیات بخش کی آواز نے ایک سماں باندھ دیا تھا۔ اوہ خدا! کیا خوب صورت آواز تھی اس کی، وہ ہیر کی گائیکی اور اس کے بولوں میں ڈوب کر رہ گیا تھا۔

وہ ایسی شخصیت تھا کہ دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسپتال چھوڑ کر جائے لیکن جانا تو تھا۔ ایک دن چلا ہی جاتا۔

اس دن میں اپنے کمرے میں تھی کہ شازیہ مجھ سے ملنے آگئی۔ یہ وہی شازیہ تھی جو قصبے کے بازار میں ملی تھی۔ میں اس وقت تقریباً فارغ ہی بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر خوشی ہوئی تھی۔ ''آؤ آؤ کافی دنوں کے بعد آئیں۔''

''بس میڈم۔'' وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''کل میں شہر واپس جا رہی ہوں تو میں نے سوچا کہ آپ سے ملتی چلوں۔''

''بہت اچھا کیا، پھر کب آنا ہوگا؟''

''میں مہینے دو مہینے میں گاؤں آتی رہتی ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''یہاں میرے والدین ہیں ناں۔''

''اور کون کون ہے؟''

''دو بھائی اور ایک بہن۔'' اس نے بتایا۔ ''ان سبھوں نے تعلیم حاصل کر رکھی ہے لیکن میرے جتنی نہیں کیونکہ مجھے ہمیشہ سے پڑھنے کا شوق رہا ہے۔''

''تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''زمیندار ہیں میڈم۔ سکندر علی نام ہے ان کا۔''

''اوہ۔'' میں چونک اٹھی۔ ''میں تو شاید ان کو جانتی ہوں اس اسپتال کی مدد کرنے والوں میں ان کا بھی نام ہے۔''

''جی ہاں یہ وہی سکندر علی ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''خوشی ہوئی سن کر، اچھا یہ بتاؤ کہیں کوئی رشتہ وغیرہ۔''

وہ ہنس پڑی۔ ''نہیں میڈم باقاعدہ تو کوئی رشتہ نہیں ہوا۔''

''تو چلو بے قاعدہ رشتہ بتا دو۔''

''ہے ایک دوست۔'' اس نے بتایا۔ ''شہر میں ہی رہتا ہے۔ ویسے میرے والدین سے ملنے دو تین بار یہاں بھی آچکا ہے۔ گھر والے بھی اسے پسند کرتے ہیں۔''

''چلو پھر تو اچھی بات ہے۔ تو کب تک اچھی نیوز مل رہی ہے؟''

''یہ میرا ایم بی اے کا آخری سال ہے۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی ہے۔ اس سے فارغ ہو جائیں تو پھر بات آگے جائے گی۔''

اس دوران حیات بخش کمرے میں داخل ہوا، وہ چونکہ دو چار دنوں سے بیساکھی کے بغیر چلنے کی مشق کر رہا تھا۔ اس لیے اس کے آنے کی خبر نہیں ہوئی۔ ویسے بھی وہ فی الحال بہت آہستہ آہستہ ایک ایک قدم اٹھا کر چلتا تھا۔

وہ کھلے ہوئے دروازے سے اندر آگیا۔ شازیہ اسے نہیں دیکھ پائی تھی کیونکہ دروازہ اس کی کرسی کے پیچھے تھا۔ حیات بخش کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے شازیہ کی ایک جھلک دیکھی اور الٹے قدموں واپس چلا گیا۔

میں نے بھی اس وقت اسے آواز دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

شازیہ کچھ دیر میرے پاس بیٹھ کر خدا حافظ کہہ کر چلی

گئی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ اگلے مہینے پھر آرہی ہے۔

اس شام حیات بخش میرے پاس آیا۔ وہ بہت اداس سا دکھائی دے رہا تھا۔ ''میڈم! اب مجھے اجازت دیں مجھے یہاں سے جانا ہے۔ ویسے بھی آپ لوگوں کی مہربانی اور توجہ سے تھوڑا تھوڑا چلنے لگا ہوں۔''

''ارے حیات بخش تم تو کہتے تھے کہ تمہیں یہاں سے بہت دنوں تک نہیں جانا ہے۔''

''بس میڈم اب دل نہیں لگ رہا۔''

''کوئی شادی وادی کا پروگرام تو نہیں ہے؟''

''شادی!'' اس کے ہونٹوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ آگئی۔ ''ارے نہیں میڈم! ابھی ایسی کوئی بات نہیں ہے اور ویسے بھی دل ٹوٹ چکا ہے۔''

''اوہو۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''حیات بخش لگتا ہے کہ تم نے کہیں دکھ اٹھایا ہے۔''

''ہاں میڈم بہت بڑا دکھ۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''لیکن میں پھر بھی خوش اور مطمئن ہوں۔''

''نہیں تم خوش نہیں ہو۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم یہ کہانی نہیں سناؤ گے؟''

''کیوں نہیں میڈم۔ آپ اتنی مہربان ہیں آپ کو تو ضرور بتاؤں گا۔''

☆......☆

''میں ایک سیدھا سادہ آدمی ہوں میڈم۔'' اس نے بولنا شروع کیا۔ ''ایک سیدھے سادے کسان کا بیٹا۔ مٹی سے محبت کرتا رہا۔ باپ کے ساتھ مل کر فصلوں کا مزاج سمجھتا رہا۔ قصبے کا ہر آدمی میرا دوست تھا کیونکہ میں کسی سے لڑتا جھگڑتا نہیں تھا۔ ہر ایک کے کام آنے کی کوشش کرتا۔ زندگی اسی طرح گزر رہی تھی کہ ایک تبدیلی آگئی۔ اس تبدیلی نے میرے اندر ہلچل مچادی تھی میڈم۔''

''اوہ تو اتنی بڑی تبدیلی تھی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں میڈم، بہت بڑی۔ پہلی دفعہ سینے میں کچھ ہوا تھا۔ دھڑکنیں تیز ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں ایک چمک آگئی تھی۔ وہ ایک لڑکی ہے میڈم۔ اس کو دیکھ کر ایسا احساس ہوا تھا جیسے اصل خوشی تو کہیں اور ہوتی ہے۔ کوئی مل جائے تو پھر زندگی خوب صورت معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس کو میں نے جب پہلی بار دیکھا تو میں دیکھتا رہ گیا۔ وہ اتنی اچھی ہے میڈم۔ جس دن میں نے اسے پہلی بار دیکھا۔ اس شام میں بہت دیر لہک لہک کر ہیر گاتا رہا تھا۔''

''تو پہلی بار تم نے اس کو دیکھنے کے بعد گانا شروع کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں میڈم، میں تو شروع سے گاتا آیا تھا۔ قصبے والے اس لیے بھی مجھے پسند کرتے تھے کہ میں کبھی کبھی ان کو ہیر سنا دیا کرتا۔ لیکن آواز میں سرشاری، لپک اور درد اس لڑکی کو دیکھنے کے بعد آیا تھا۔ جب میں گا رہا تھا تو ایسا لگا کہ وہ لڑکی میرے سامنے ہی کھڑی ہوئی ہے اور میرے ہر بول پر جھوم رہی ہے اور میں صرف اسی کی خاطر گائے جا رہا ہوں۔ ایسا لگا تھا مجھے۔''

میں مسکرا دی۔ وہ کتنی سادگی اور سچائی کے ساتھ اپنے دل کی کیفیت بیان کیے جا رہا تھا۔

''میڈم! نہ جانے کس طرح مجھے احساس ہو جاتا کہ آج وہ لڑکی بازار کی طرف آنے والی ہے۔ میں اس کے لیے بازار پہنچ جاتا۔ اس کا انتظار کرنے لگتا اور وہ واقعی کسی طرف سے آجاتی۔''

''اسے کہتے ہیں دل سے دل کو راہ ہوتا۔''

''پتا نہیں میڈم۔ لیکن اس کے لیے میرے اندازے ہمیشہ صحیح ہوتے تھے۔ ایسا کیوں ہوتا تھا میڈم؟'' اس نے سوال کیا۔

''اس لیے کہ تم کو اس سے سچی محبت تھی۔'' میں نے کہا۔ ''اس میں محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے کا پتا چل جاتا ہے۔''

''ہاں میڈم! ایسا ہی ہوتا تھا۔ ایک بار بہت زور کی بارش ہو رہی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسے دیکھوں۔ اتنے اچھے موسم میں اسے دیکھوں اور وہ دکھائی دے گئی۔ حالانکہ ایسی بارش میں کون گھر سے نکلتا ہے۔ لیکن وہ نکل آئی۔''

''وہ بھی بے قرار ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''ہوسکتا ہے میڈم! لیکن میں تو کبھی کھل کر اس کے سامنے بھی نہیں آیا۔ بس اس کو دور سے دیکھا کرتا یا اس کے سامنے سے گزر جاتا۔ ویسے ایک بات تو ضرور ہوئی تھی میڈم۔''

''وہ کیا؟''

''اس کے دیکھ لینے کے بعد میں نے اپنے آپ پر دھیان دینا شروع کردیا تھا۔ پہلے میں یوں ہی سے کپڑے پہنا کرتا تھا پھر بازار سے دو سوٹ لے آیا چمکتے ہوئے۔ کش لش کرتے ہوئے۔ میں جب اس کو دیکھنے کی امید میں بازار

کی طرف جاتا تو وہی کپڑے پہن لیتا۔ میری اماں کہتیں کہ تو بہت اچھا لگ رہا ہے۔ ہے ناں میڈم جب میں اماں کو اچھا لگ سکتا تھا تو اس کو کیوں نہیں لگتا۔“

میں بے ساختہ مسکرا دی۔ کیسی بچی معصومیت تھی۔

”حیات بخش! یہ بتاؤ تم نے کیا اس لڑکی سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا؟“

”نہیں میڈم! اتنی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔“ حیات نے کہا۔ ”جب سوچ کر جاتا اور اسے دیکھ لیتا تو ہمت جواب دے جاتی لیکن ایک دن میں نے سوچ لیا کہ آج ہر حال میں اس سے بات کروں گا۔ کم از کم بات ہی کرلوں۔ دل کی بے چینی ذرا کم ہو جائے گی۔ اس دن میں نے وہی نیا جوڑا پہنا۔ بال سلیقے سے بنائے اور بازار پہنچ گیا اور اس دن وہ تبدیلی آگئی۔ جو پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔“

”تم نے اظہار کردیا؟“

”نہیں میڈم! اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ بازار تو آئی لیکن اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ بہت خوب صورت سا نوجوان بہت اچھے کپڑے پہنے ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتے چل رہے تھے۔ ایک دوسرے سے مذاق کررہے تھے۔ صاف ظاہر ہوگیا تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں ایسے انداز اور ایسا رشتہ چھپتا تو نہیں ہے نا میڈم؟“

”نہیں بالکل بھی نہیں یقیناً اس کا اظہار الگ سے ہو جاتا ہے۔“

”تو وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بہت خوش تھے اور محبت تو اس جذبے کا نام ہے میڈم کہ آدمی جس سے پیار کرتا ہے۔ وہ خوش رہے۔ اسے اس کے علاوہ اور کیا چاہیے۔“

وہ سیدھا سادہ آدمی کتنی بڑی حقیقت بیان کرگیا تھا۔

”اچانک میں نے ایک گاڑی دیکھی جو شاید ڈرائیور کے قابو سے باہر ہوگئی تھی۔ وہ گاڑی ان دونوں کے پیچھے کی طرف سے آرہی تھی اور اس نوجوان کو لگنے والی تھی کہ میں نے اچانک اپنی جگہ سے چھلانگ لگائی اور اس نوجوان کو زور سے دھکا دے کر ایک طرف گرا دیا اور خود گاڑی کی لپیٹ میں آگیا۔ میرے ساتھ جو حادثہ ہوا یہ وہی حادثہ ہے میڈم۔“

”اوہ خدا! یہ آدمی اپنی محبت کے لیے کتنی بڑی قربانی دے گیا تھا۔ ایسی مثال کہاں ملتی ہے۔“ اموڈو اجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی۔ یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں“

”بس میڈم! یہ ہے میری کہانی۔“ اس نے کہا۔ ”ابھی لیے میں بیر گاتا پھرتا ہوں۔“

”کیا اس لڑکی کو معلوم ہے کہ تم نے یہ قربانی کس کے لیے دی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں میڈم! ایسی باتیں بتانے والی نہیں ہوتیں۔ صرف برداشت کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔“

”ویسے وہ لڑکی اب کہاں ہے؟“

”یہیں ہے میڈم! آپ کو یاد ہے پرسوں میں آپ کے کمرے میں آیا تھا تو وہی لڑکی آپ کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اس کو دیکھ کر واپس چلا گیا تھا۔“

”اوہ گاڈ! تم شازیہ کی بات کررہے ہو؟ سکندر علی کی بیٹی۔“

”جی ہاں میڈم! میں اسی کی بات کررہا ہوں لیکن خدا کے لیے اسے کچھ مت بتایئے گا۔ میں نے آپ کو یہ کہانی سنا دی ہے۔ اس کو اپنے ہی تک رکھیے گا۔“

میں عقیدت بھری نگاہوں سے اس آدمی کو دیکھتی رہی۔ گاؤں کے ایک سیدھے سادے نوجوان نے اس دور میں محبت کا مفہوم سمجھا دیا تھا۔

دوسرے دن حیات بخش اسپتال سے فارغ ہوکر چلا گیا۔ اس کے بعد پھر اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ دو ہفتوں کے بعد شازیہ میرے پاس آئی۔ وہ اپنی شادی کا کارڈ لے کر آئی تھی۔ میرا دل چاہا کہ اسے حیات کے بارے میں بتا دوں کہ دیکھو اس دنیا میں ایک ایسا نوجوان بھی ہے جس نے تم سے ٹوٹ کر محبت کی ہے اور اس شخص کو مرنے سے بچا لیا ہے جو تمہارا شوہر بننے جا رہا ہے۔

لیکن میں خاموش رہ گئی۔ جب اپنی محبت کو خود حیات بخش نے چھپا کر رکھا ہوا تھا تو پھر میں کون ہوتی تھی اس کا راز فاش کرنے والی۔

میرا اب اس اسپتال سے ٹرانسفر ہوگیا ہے۔ میں شہر آگئی ہوں۔ خدا جانے بے چارہ حیات بخش کس حال میں ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ قصبے کی فضاؤں میں اب تک اس کی آواز میں بیر گونج رہی ہو۔

خدا کرے

محترم معراج رسول
السلام علیکم
یہ سچ بیانی میری نہیں میرے ایک دوست کی ہے۔ آپ نے سنا ہو گا بلکہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ لڑکے لڑکیوں سے فلرٹ کرتے ہیں لیکن میرے دوست کے ساتھ الٹا ہوا۔ یہ دلچسپ واقعہ آپ کو بھی پسند آئے گا۔

نصیر اشرف
(کراچی)

دو لڑکیاں تھیں۔

دونوں جوان اور خوب صورت۔ دونوں بس اسٹاپ سے ذرا ہٹ کر رکشا یا ٹیکسی کے انتظار میں کھڑی تھیں یا شاید انہیں کسی کا انتظار تھا۔

دونوں نے بہت اچھی ڈریسنگ کر رکھی تھی۔ میرا ارادہ گزر جانے کا تھا لیکن دونوں نے ہاتھ دے کر میری گاڑی کو روک لیا۔

انسان تو انسان ہی ہوتا ہے۔ کچھ اس قسم کی فطرت

ہوتی ہے اس کی کراس کے ضمیر میں شر کی ایک چنگاری جو رکھ دی گئی ہے وہ ہمیشہ بھڑکتی ہی رہتی ہے۔

فرصت کا لمحہ، تقریباً سناٹا اور دو جوان اور خوب صورت لڑکیاں جو شاید لفٹ لینا چاہتی تھیں اور کون کم بخت ہوگا جو لفٹ نہیں دیتا۔

شاید ان کا بھی یہی راستہ ہو۔ جس راستے پر میں جا رہا تھا اس لیے میں نے ان کے پاس گاڑی روک دی۔ میرا اندازہ درست نکلا انہیں لفٹ ہی چاہیے تھی۔

ان میں سے ایک لڑکی تیزی سے میرے پاس آگئی۔ ''سر ہمیں گرومندر تک جانا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ہم بہت دیر سے کھڑے ہیں رکشا یا ٹیکسی نہیں مل رہی۔ کیا آپ ہمیں لفٹ دے سکیں گے؟''

''کیوں نہیں آئیں بیٹھ جائیں۔''

میرا خیال تھا کہ دونوں پیچھے ہی بیٹھ جائیں گی لیکن ان میں سے ایک میرے برابر کی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ دوسری والی سے زیادہ خوب صورت اور اسمارٹ تھی۔

اس نے پرفیوم بھی کوئی مہنگا لگا رکھا تھا۔ میری پوری گاڑی معطر ہوگئی تھی۔ میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

وہ دونوں مجھے کسی اچھے گھرانے کی دکھائی دے رہی تھیں یا پھر کوئی اور بات تھی لیکن ابھی تک تو کوئی اور بات سامنے نہیں آئی تھی۔

لیکن لسبیلہ تک آتے آتے دوسری بات سامنے آہی گئی تھی۔ میرے ساتھ بیٹھ جانے والی لڑکی نے پیچھے مڑ کر دوسری لڑکی سے کہا۔ ''شہلا گرومندر اب بہت قریب ہے۔''

''ہاں ہمارا سفر اب ختم ہونے والا ہے۔'' دوسری نے کہا۔

''تو پھر وقت کیسے گزارا جائے۔''

''چلو ان ہی سے پوچھتے ہیں۔ یہ شریف اور معقول آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ہماری پرابلم سمجھ جائیں گے۔''

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ دونوں لڑکیاں اب آہستہ آہستہ خود کو ظاہر کرنے لگی ہیں لیکن میں انجان بنا گاڑی چلاتا رہا۔ پھر میرے برابر بیٹھی ہوئی لڑکی نے مجھ سے کہا۔ ''دیکھیں ہمارے ساتھ پرابلم یہ ہے کہ ہمیں جن سے ملنے کے لیے جانا ہے ان سے ملنے میں ابھی دیر ہے۔ ہم وقت سے پہلے پہنچ گئے ہیں۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟''

''کچھ باتیں کر لی جائیں۔''

''اب وقت کہاں ہے؟'' ہما نے کہا۔

''ان کو اپنا نمبر دے دو بعد میں یہ کال کر لیں گے۔'' عندلیب نے کہا تو ہما نے اپنا اور عندلیب کا نمبر دے دیا۔ پھر نیپل والی مسجد کے پاس اتر گئیں۔ ان دونوں کی بھی معصومیت نے مجھے گرویدہ کر لیا تھا۔ بعد میں بھی میں انہی کے بارے میں سوچتا رہا۔

تکلف تک تو سارے مشورے، ساری نصیحتیں ایک طرف رہ جاتی ہیں۔

ان کے موبائل نمبرز میرے پاس تھے لیکن میں انہیں خود سے فون نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نہ جانے دوسری طرف سے کوئی فون اٹھا لے۔ وہ کیا سوچے وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے خیالات نے روک لیا تھا۔

کئی دنوں کے بعد اچانک عندلیب کا فون آگیا۔ اس کا فون سن کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ ''کیا حال ہے جناب۔'' اس نے شوخ لہجے میں پوچھا۔

''یہ مت پوچھو میں تو اب اپنے خواب میں بھی گرومندر سے آگے نہیں جاتا۔'' میں نے کہا۔ ''اور جب جاگ رہا ہوتا ہوں تو سارے راستے گرومندر کو چلے جاتے ہیں۔''

''اوہو۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''گرومندر تو آپ کے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے۔''

''گرومندر نہیں گرومندر والیاں۔'' میں نے کہا۔

''اور خاص کر ان میں سے ایک۔''

''اور ان میں سے ایک اتفاق سے اس وقت بھی گرومندر پر کھڑی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اور بالکل اکیلی۔''

یہ ایک واضح اشارہ تھا کہ میں اگر چاہوں تو اس سے جا کر مل سکتا ہوں۔ اس وقت میں فارغ ہی تھا۔ لہٰذا میں نے وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

وہ اس اسٹاپ پر تنہا کھڑی تھی۔ جس اسٹاپ پر میں نے اس دن ڈراپ کیا تھا۔ میں نے اپنی گاڑی اس کے پاس لے جا کر روک دی۔ وہ پہلے کی طرح بڑی بے تکلفی کے ساتھ میرے برابر میں آکر بیٹھ گئی تھی۔

''لگتا ہے کہ اس دن کے بعد سے تم اب تک یہیں کھڑی ہو۔'' میں نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں ایسا ہی سمجھ لیں۔ کسی نہ کسی کا انتظار تو رہتا ہی ہے نا۔''

''اوہو کس کا انتظار؟''

''میرا مطلب ہے کسی رکشے ٹیکسی کا۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''کیا تمہارے پاس فرصت ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''فرصت ہی تو ہے کہ آپ کو بلالیا۔'' اس نے کہا۔

''تو چلو چل کر کہیں لنچ کرتے ہیں۔''

''نیکی اور پوچھ پوچھ۔''

ہم ایک ریسٹورنٹ میں آکر بیٹھ گئے۔ اس دن وہ پہلے سے زیادہ دل کش دکھائی دے رہی تھی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

''عندلیب تم رہتی کہاں ہوں؟ میرا مطلب ہے تمہارا بیک گراؤنڈ وغیرہ۔''

''میرے والد کسی زمانے میں کالج میں پڑھایا کرتے تھے۔'' اس نے بتایا۔

''اوہو یعنی تم ایک استاد کی بیٹی ہو۔''

''ہاں لیکن ان کا استاد ہونا میرے کسی کام نہیں آرہا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''خیر رہنے دیں، کیا کریں گے میرے بارے میں جان کر۔''

''بس یوں ہی ایک ساتھ مل بیٹھنے والوں کو ایک دوسرے کے بارے میں معلوم بھی ہونا چاہیے۔''

''چلیں جناب تو پھر آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔''

''بہت سادہ سی زندگی ہے میری۔'' میں نے کہا۔

''والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ ایک چھوٹا بھائی ہے جو ملک سے باہر رہتا ہے۔ ایک چھوٹی بہن ہے جس کی شادی ہو چکی ہے۔ بس۔''

''اور آپ کی مسز؟''

''ایسی کوئی چیز اب تک میرے حصے میں نہیں آئی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور تم...... تمہارے ساتھ تو ایسا اتفاق نہیں ہوا ہوگا۔''

''نہیں جناب! ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''ویسے تلاش جاری ہے۔''

''کوئی تلاش کر رہا ہے۔ تم خود؟ یا کوئی اور؟''

''ارے صاحب مجھ سے ایسی حماقت نہیں ہوتی۔ والدہ یہ کارنامہ انجام دے رہی ہیں۔ ماؤں کو تو اس کے علاوہ اور کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا۔ بس کسی طرح بیٹی کو ٹھکانے لگا دو۔''

''ظاہر ہے یہ ان کا فرض ہے۔'' میں نے کہا۔

اس وقت دل میں آیا تھا کہ میں اس سے یہ کیوں نہ کہہ دوں کہ اپنی والدہ کے سامنے مجھے لے جا کر کھڑا کر دے۔ ہو سکتا تھا کہ میں ان کو پسند آجاؤں۔

لیکن یہ دوسری ملاقات تھی اور ایسی باتیں اتنی جلدی نہیں کی جاتیں۔ بہرحال ہم بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

پھر ریسٹورنٹ سے باہر آئے تو ایک بھکارن ہمارے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ وہ ہاتھ جوڑ جوڑ کر عندلیب سے بھیک مانگ رہی تھی۔

نہ جانے کیوں عندلیب کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا۔ ''کیا مصیبت ہے یہ لوگ پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں۔ لاکھ منع کرتے رہو لیکن یہ نہیں سننے والے۔''

''یہی بات کا تو رونا ہے۔'' میں نے بھی اس کی تائید کی۔ ''کبھی کبھی میں خود بھی جھلا جاتا ہوں۔''

''چلیں جان چھڑا کر تیزی سے نکل لیتے ہیں۔'' اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''ورنہ یہ اسی طرح پریشان کرتی رہے گی۔''

اس کا اس طرح ہاتھ تھام لینا مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ اس نے یہ حرکت پوری اپنائیت کے ساتھ کی تھی۔

گاڑی میں آکر ہم بیٹھ گئے۔ ''ہاں اب بتاؤ کہاں ڈراپ کیا جائے۔''

''وہی گرومندر۔'' اس نے کہا۔

''خدا کی پناہ کیا ہے گرومندر میں۔'' میں نے پوچھا۔

''جناب عالی! اب تک آپ کی سمجھ میں اتنا بھی نہیں آیا کہ میں گرومندر کے آس پاس ہی رہتی ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''اوہ تو یہ بات ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''اچھا یہ بتاؤ اب کب ملوگی۔''

''جب جی چاہے میرا نمبر ہے نا آپ کے پاس؟'' اس نے کہا۔ ''مہرباں ہوئے بلالو جب جی چاہے''

اس کی اس قسم کی باتوں سے اندازہ ہونے لگا تھا کہ وہ واقعی کسی استاد ہی کی بیٹی ہوگی۔ بہت ستھری اور دلچسپ

باتیں کیا کرتی۔
بہت پہلے کالج کے زمانے میں ایک لڑکی میری زندگی میں آئی تھی۔ وہ بھی عندلیب ہی جیسی تھی۔ اس کی باتیں ایسی ہی ہوا کرتیں۔ بہت شگفتہ اور ذہانت سے بھری ہوئی باتیں۔
خدا جانے اب وہ کہاں ہوگی لیکن میرے لیے یہ اطمینان کی بات تھی کہ مجھے عندلیب مل گئی تھی اور میں اس کو اپنے وجود اور اپنی زندگی کا حصہ بنا سکتا تھا۔
بس تھوڑی سی ہمت دکھانے اور پہلا قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد تو منزل آسان ہی ہو جاتی۔ جب میں اپنے طور پر خود ہی یہ فیصلہ کر چکا کہ عندلیب کی ماں سے مل کر مجھے اپنے آپ کو عندلیب کے لیے پیش کرنا ہے تو ایک عجیب سی خوشی ہونے لگی۔
ایک اطمینان سا ہونے لگا کہ چلو اب میری بھٹکتی ہوئی کشتی کو کنارہ ملنے والا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد ہم پھر ملے۔
اس دن وہ بہت پریشان اور بکھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا۔
''وہ جو میری دوست ہے نا ہما۔''
''ہاں کیا ہوا اس کو؟''
''اس کا فون آیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''اسے آج دس ہزار روپوں کی ضرورت ہے۔ کس لیے یہ اس نے نہیں بتایا۔ مجھ سے مانگ رہی تھی میرے پاس کہاں ہیں جو میں اس کو دے سکوں۔ بس اس لیے پریشان ہو رہی ہوں۔''
''بس اتنی سی بات۔''
''یہ اتنی سی نہیں، میرے لیے تو بہت بڑی بات ہے۔'' اس نے کہا۔
''ارے کوئی بات نہیں۔ دس ہزار مجھ سے لے لو۔''
''کیا بات کرتے ہیں میں آپ سے کیوں لینے لگی۔''
''اس کا مطلب ہے کہ تم نے ابھی تک مجھے اپنا نہیں سمجھا۔''
''اوہو، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوا کہ میں آپ سے پیسے لینے لگوں۔''
''اس کا یہی مطلب ہونا چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''ہمیں اس طرح ایک دوسرے کے کام آنا ہے۔''
''بھلا میں آپ کے کس کام آسکتا ہوں۔''
''تمہاری موجودگی مجھے جینے کا احساس دلاتی رہتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے تمہیں پا کر حوصلہ حاصل کیا ہے۔ مجھے اور کیا چاہیے۔''
بہر حال وہ بڑی مشکلوں سے دس ہزار لینے پر راضی ہوئی تھی۔ میں نے اسے دس ہزار روپے دے دیئے تھے جو اتفاق سے میری سیلری کی صورت میں میرے پاس موجود تھے۔
ہم پھر ملنے کا وعدہ کر کے الگ ہو گئے۔
اب یہ بات تو ہو چکی تھی کہ ہم ذہنی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب آ چکے ہیں اور اب صرف اس بات کی دیر ہے کہ مجھے اس کی ماں سے مل کر اپنی درخواست پیش کر دینی تھی۔
میں نے اپنے دوستوں کو بھی اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔
''اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بری طرح عشق کے جال میں پھنس چکے ہو۔'' ایک نے کہا۔
''ہاں یار! ایسا ہی ہوا ہے میرے ساتھ۔''
''لیکن میری جان یہ محبت وغیرہ سب بے کار کی باتیں ہیں۔''
''تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ تم کو اس کا تجربہ نہیں ہوا اور ہر ایک کو ہو بھی نہیں سکتا۔''
''کیوں نہیں ہو سکتا۔ کیا تم آسمان سے اترے ہو؟''
''میری جان۔ محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں۔ یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا۔''
''لیکن یہ بھی سن لو کہ اگر تم نے اس سے شادی کر لی تو شادی کے بعد یہ محبت وغیرہ سب ہوا ہو جائے گی۔''
''کوئی بات نہیں۔ وہ زندگی بھر کے لیے میرے قریب تو آ جائے گی نا۔''
دوست خاموش ہو گئے۔ ظاہر ہے وہ مجھے کیا سمجھا سکتے تھے۔
دو چار دنوں کے بعد اس کا فون آیا۔ ''مجھے مبارکباد نہیں دیں گے۔ آج میری برتھ ڈے ہے۔''
''ارے بہت بہت مبارک ہو۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔''
''اس میں بتانے والی ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ آج یاد آیا تو آپ کو بتا دیا۔''

"پھر تو آج تمہارا ڈنر میری طرف ڈیو ہو گیا۔" میں نے کہا۔ "تم شام کو مل لینا۔"

اس شام ہم بہت خوش تھے۔ ڈنر سے پہلے میں نے اسے شاپنگ بھی کرائی تھی۔

وہ بار بار میرا شکریہ ادا کرتی رہی تھی اور میں اس سے یہی کہتا رہا تھا کہ یہ سب تمہارا حق ہے۔ کیونکہ میں نے تم سے محبت کی ہے اور محبت کرنے والوں کے ساتھ تکلف نہیں کیا کرتے۔

شاپنگ کے بعد ہم ایک اچھے سے ہوٹل میں چلے گئے۔ اس شام میرے لیے زندگی بہت خوب صورت ہو گئی تھی۔ عندلیب نے اس شام اپنی ڈریسنگ اور میک اپ پر بھی توجہ دی تھی۔ اس لیے وہ عام دنوں سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔

اس شام میں نے اس سے کہہ ہی دیا۔ "بس عندلیب اب مجھ سے انتظار نہیں ہو سکتا۔ تم مجھے اپنی امی سے ملوا دو۔"

"ہوں۔" وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔

"کیا سوچنے لگیں؟" میں نے پوچھا۔

"تم دو چار دن رک جاؤ۔" اس نے کہا۔ "پہلے میں بات چھیڑتی ہوں۔ اس کے بعد تم سے ملاقات کروا دوں گی۔"

"بس یہ کام اسی ہفتے ہو جانا چاہیے۔"

لیکن اس ہفتے کے ختم ہونے سے پہلے ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے مجھے سخت بددل اور مایوس کر دیا تھا۔

مجھے عندلیب کسی کے ساتھ دکھائی دے گئی تھی۔ کسی نوجوان کے ساتھ۔ دونوں شاپنگ کر کے واپس آ رہے تھے۔ دونوں کے پاس شاپرز تھے۔

میں ان دونوں کو دیکھ کر جلدی سے ایک آڑ میں ہو گیا تھا۔ دونوں میرے برابر سے گزرتے چلے گئے۔ اس وقت میرے دل کا عجب حال ہو رہا تھا۔

اس قسم کے تجربوں کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنی محبت میں رقابت وغیرہ کے مرحلوں سے گزرے ہوں کہ اس وقت دل کی کیا حالت ہوتی ہے۔

میں گھر واپس آ کر جیسے کانٹوں کے بستر پر گر گیا تھا۔ ایسی کوفت ہو رہی تھی کہ جس کا اظہار مشکل ہے۔

اب دو راستے تھے۔ یا تو میں خاموش رہ کر اس سے علیحدگی اختیار کر لوں یا اس سے بات کر لوں۔ پھر میں نے

بات کرلینا زیادہ مناسب سمجھا۔
صبح ہوتے ہی اسے فون کیا۔ اس نے بہت حیران ہوکر فون اٹینڈ کیا تھا۔ ''خیریت تو ہے۔ آج صبح صبح کیسے یاد آگئی۔''
''تم سے ایک بہت ضروری کام ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں فوری طور پر ملنا چاہتا ہوں۔''
''لیکن اس وقت تو میں یونیورسٹی جارہی ہوں۔'' اس نے بتایا۔
''بعد میں چلی جانا۔ یا کل چلی جانا۔ آج مجھ سے مل لو۔'' میں نے اصرار کیا۔
''ٹھیک ہے میں ایسا کرتی ہوں۔ ابھی یونیورسٹی جاتی ہوں۔ صرف ایک کلاس اٹینڈ کرکے واپس آجاؤں گی۔ آپ مجھ سے مارکیٹ کے مین گیٹ پر مل لیں۔ ٹھیک بارہ بجے۔''
''ارے میں آجاؤں گا۔''
میں شاید دس منٹ دیر سے مارکیٹ پہنچا تھا۔ عندلیب وہاں موجود تھی لیکن وہ اس بھکارن سے الجھی ہوئی تھی جس کا میں ذکر کرچکا ہوں۔ جو وہیل چیئر پر بیٹھی رہتی تھی۔
میں سمجھ گیا کہ وہ بھکارن اس کے پیچھے پڑگئی ہوگی اور عندلیب اس سے جان چھڑانے کی کوشش کررہی ہوگی۔
میں ان دونوں کے پاس پہنچ گیا۔ ''کیا ہورہا ہے یہ۔'' میں نے بھکارن کو ڈانٹا۔ ''کیا کہہ رہی ہو اس سے۔'' عندلیب نے چونک کر میری طرف دیکھا اور جلدی سے آگے بڑھ گئی۔
''میں اس کو سمجھا رہی تھی کہ اپنے آپ کو برباد نہ کرے۔'' بھکارن نے کہا۔ ''اِدھر اُدھر گھومتی نہ پھرے۔''
''تم کون ہوتی ہو اس کو سمجھانے والی۔''
''اس لیے کہ میں اس کی ماں ہوں۔'' بھکارن نے بتایا۔
''ماں!'' مجھے تو ایسا جھٹکا لگا کہ میں ہل کر رہ گیا۔
''تم عندلیب کی ماں ہو؟''
''ہاں ماں ہوں اس کی۔ اس کے لیے بھیک مانگتی ہوں تاکہ وہ پڑھ لکھ کر کسی قابل ہوجائے۔ اپنے پیروں پر کھڑی ہوجائے۔ اس کی اپنی اچھی زندگی ہو لیکن یہ ہوکیا رہا ہے۔ اس نے تم جیسے بابوؤں سے دوستی شروع کردی ہے۔ اپنی ایک دوست کے بہکاوے میں آکر اس نے الٹی سیدھی حرکتیں شروع کردی ہیں۔ گاڑی والوں سے دوستی کرتی ہے۔ ان سے پیسے لیتی ہے اور سمجھتی ہے کہ اس کا کچھ نہیں ہوگا۔ وہ سب کو بے وقوف بناسکتی ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ اس چکر میں اس کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ میں نے بڑی مشکلوں سے بھیک مانگ مانگ کر اسے یہاں تک پہنچایا ہے، اس کو اچھا برا سمجھاتی رہتی ہوں۔ وہ اگر ابھی بھی نہ مانے تو میں کیا کرسکتی ہوں۔''
وہ بھکارن بول رہی تھی اور روئے جارہی تھی اور میں اس کی طرف عقیدت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس وقت ایک بھکارن نہیں ایک ماں تھی اور ماں بھی ایسی جس کی مثال نہیں ہوسکتی۔
اس کے کرب کا صرف اندازہ ہی ہوسکتا ہے۔ اس نے کس طرح لوگوں کے سامنے ہاتھوں کو پھیلا پھیلا کر پیسے اکٹھے کیے ہوں گے اور اپنی اولاد کے لیے بہتر زندگی کے خواب دیکھے ہوں گے۔
وہ اپنی کرسی دھکیلتی ہوئی اس طرف چلی گئی جس طرف عندلیب گئی تھی۔
اس کے بعد میں نے عندلیب سے ملاقات نہیں کی۔ اس لیے نہیں کی کہ وہ میرے دل سے اتر چکی تھی یا میں اس سے نفرت کرنے لگا ہوں۔
''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''
میں اس سے مل کر اس کی شرمندہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں یہ دیکھوں کہ اس کے چہرے پر شرمندگی کے کتنے رنگ ہیں۔
اس کے بعد میں نے اسے کئی بار دیکھا بھی۔ لیکن تنہا خاموشی سے سر جھکا کر آتے جاتے ہوئے۔ لیکن کبھی اسے آواز نہیں دی۔ کبھی اس کے سامنے منہ نہیں کیا۔ اسے فون نہیں کیا۔
خدا کرے ..... ماں کے خوابوں کے مطابق اسے اچھی زندگی مل سکے اور جہاں تک اس کی ماں کا تعلق ہے تو وہ آج بھی علاقے میں دکھائی دیتی ہے۔
اور میں ہمیشہ اسے کچھ نہ کچھ دے کر آگے بڑھ جاتا ہوں۔ خدا کرے کہ عندلیب کو زندگی کی وہ خوشیاں مل جائیں جن کے لیے اس کی ماں محنت کررہی ہے۔

زن زر زمین

مکرمی مدیر
السلام علیکم
ایک ایسی سچ بیانی ارسال کررہی ہوں جو آپ کو ضرور پسند آئے گی۔ یہ زندگی کے کلیہ کو عیاں کررہی ہے۔ دنیا میں ہر فساد کی جڑ زن، زر، زمین ہے۔ اسی کے گرد پوری سچ بیانی گھوم رہی ہے۔

ثمینہ طاہر بٹ

میر ہاشم ایک محنتی اور ایماندار نوجوان تھا۔ باپ اور بڑے بھائی روشن کے سوا دنیا میں کوئی اس کا نہ تھا۔ ماں کا سایہ تو بچپن میں ہی اٹھ گیا تھا اور بہن کوئی تھی نہیں۔ سو یہ تین مرد اپنی زندگی ویسے ہی گزار رہے تھے، جیسے کہ چھڑے چھانٹوں کی گذرا کرتی ہے۔ روشن نے اباجی کے مشورے سے حلوائیوں کا کام سیکھنا شروع کیا اور جلد ہی اس میں طاق ہوگیا۔ ہاشم بھی بھائی کے ساتھ ساتھ ہی تھا مگر دکان پر ہولڈ روشن بھائی کا ہی تھا۔ ہاشم نے کبھی اس بات کو محسوس ہی نہیں کیا تھا، وہ تو بھائی

کے ابرو کے اشارے پر جان دینے کو تیار رہتے تھے۔ روشن بھی ان کا بہت خیال رکھتا۔ یہ تینوں مرد بڑی پُرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ اپنا کماتے، خود پکاتے اور جی بھر کے کھاتے۔ کل کیا ہوگا، کل کے لیے کچھ بچانا ہے یا نہیں، یہ ان تینوں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ ان دونوں کو لگتا تھا کہ زندگی یونہی سکون سے گزر جائے گی۔ مگر اباجی کا پلان کچھ اور ہی تھا۔ سو، جیسے ہی میر روشن کا کام چل نکلا انہوں نے اس کے پیروں میں زنجیر ڈال دی۔

رقیہ ان کی بھتیجی تھی۔ زبان کی تیز مگر بہت پھرتیلی۔ اباجی کو اپنے آنگن کا سونا پن کھلنے لگا تو رقیہ کو بہو بنا لائے۔ گھر میں ایک عورت کیا آئی، گھر کا تو نقشہ ہی بدل گیا۔ وہ ایک مخصوص قسم کی ویرانی اور اداسی جو در و دیوار سے لپٹی رہتی تھی، اس کی جگہ شوخ ہنسی کی جلترنگ نے لے لی۔ رقیہ بھابی کی چوڑیاں بجتیں تو گھر کے در و دیوار اس جھنکار کے ساتھ مل کر نغمے گاتے ہوئے محسوس ہوتے۔ میر روشن تو خوش تھا ہی، میر ہاشم کی دلی مراد بھی پوری ہوگئی تھی۔ اب نہ تو اسے سب کے کپڑے دھونے پڑتے اور نہ ہی کھانا بنانا پڑتا۔ رقیہ بھابی منٹوں میں سب کر ڈالتی۔ ہاں، البتہ مزاج کی تیز تھی اور کچھ تایا پر مان بھی تھا۔ اس لیے بعض اوقات ضرورت سے زیادہ بول جاتی۔ میر روشن تو اس کا طنز ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دینے کا عادی تھا، مگر میر ہاشم اکثر غصہ کر جاتا۔ ایسے میں اباجی اسے پیار سے رام کر لیا کرتے۔ دن اسی طرح گزرتے گئے اور میر روشن دو بچوں کا باپ بن گیا۔

اب رقیہ بیوی سے ماں بن چکی تھی۔ اسے اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر ہر چیز سے زیادہ تھی، اسی لیے اس نے میر ہاشم کے کاموں سے ہاتھ کھینچنا شروع کر دیا۔ اباجی تو شروع سے ہی اپنے کام خود کرنے کے عادی تھے، یہ میر ہاشم ہی تھا جس نے بھابی کا سہارا پا کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ مگر اب بھابی بیگم نے ان کی بھی طنابیں کھینچ دیں۔ پہلے پہل تو وہ بوکھلایا، پھر سٹپٹا کر بھائی سے گلہ کر بیٹھا تو بھائی نے کہا:

"ہاشم! رقیہ اب تھک جاتی ہے۔ اس اکیلی سے سارے گھر کا کام نہیں سنبھالا جاتا۔ میں اور اباجی سوچ رہے ہیں کہ تمہاری بھی شادی کر دی جائے۔ تمہاری دلہن آجائے گی تو وہ خود ہی تمہارے سب کام کر دیا کرے گی۔ کیوں، ٹھیک ہے ناں؟" میر روشن نے پیار سے بھائی کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا تو وہ منہ کھولے انہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔

"میری شادی؟ لیکن کس سے؟ چاچا جی کی تو ایک ہی بیٹی تھی رقیہ باجی، اور اس سے آپ کی شادی ہوگئی، اب میں کس سے شادی کروں گا؟"

پچیس سالہ بھائی کے منہ سے پانچ سالہ بچے جیسی بات سن کر میر روشن ہکا بکا رہ گیا۔ بھائی کی معصومیت پر پیار بھی آیا اور اس کی سادگی پر ہنسی بھی۔

"ارے بدھو۔ دنیا میں کیا صرف ایک ہی لڑکی تھی، کیا اس دنیا میں لڑکیوں کا کال پڑ گیا ہے جو تم اتنے پریشان ہو رہے ہو؟" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تو ہاشم جھینپ گیا۔

"نہیں بھائی، میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ مگر پھر بھی!" وہ شرماتے ہوئے بولا۔

"پگلے۔ تم پریشان مت ہو۔ ہم تمہارے لیے رقیہ سے بھی اچھی دلہن لائیں گے۔ جسے دیکھتے ہی تم دیوانے ہو جاؤ گے۔ سمجھے۔" میر روشن نے محبت سے کہا۔

☆......☆

کہتے ہیں کہ مرد کی زندگی میں دولت اس کی بیوی کے نصیب سے آتی ہے اور اولاد خود اس مرد کی قسمت سے۔ اگر عورت کا ستارہ مرد کے ستارے سے مل جائے، تو پھر اس مرد کی زندگی میں شامل ہونے والی یہ پہلا "ز" یعنی زن دوسرے دونوں "ز" یعنی زر اور زمین کو خود بخود ہی کھینچ لاتی ہے۔ میر ہاشم کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ ناہید ان کی زندگی میں کیا آئی، زر اور زمین کو اپنے ساتھ کھینچ لائی۔ ہاشم تو پہلے ہی محنتی اور ایماندار جوان تھا۔ اب تو اس کی محنت کا عالم ہی جدا تھا۔ قسمت کی دیوی بھی ان پر مہربان تھی، مٹی کو ہاتھ لگاتے تو وہ سونا بن جاتی۔ بھائی کے مشورے پر اس نے دکان جہاں کھولی تھی وہ خوب چلنے لگی تھی۔ ناہید بھی ہاشم کی طرح بہت محنتی اور جفاکش خاتون تھی۔ اس نے گھر کی ہر ذمہ داری سے ہاشم کو بے فکر کر دیا تھا۔ ہاشم خوب محنت سے کماتا تو ناہید اسے کفایت شعاری اور سلیقہ مندی سے استعمال کرتی۔ وقت گزرتا گیا اور اس گزرے وقت میں کافی کچھ بدل گیا۔ اب وہ دو نہیں رہے تھے۔ ان کی فیملی بڑھ رہی تھی۔ روشن بھائی اور رقیہ بھابی کی فیملی بھی بڑھ چکی تھی۔ اباجی انہیں داغ مفارقت دے کر راہی ملک عدم ہو چکے تھے۔

اس چار مرلے کے گھر میں اب دو فیملیاں مقیم تھیں۔ دو دو زنانیاں، اور دونوں ہی اپنے آپ میں بہت کچھ تھیں۔ ان کی آپس میں ٹھن بھی جاتی، اور پھر خود بخود بن بھی جاتی۔ بچوں کا بھی یہی حال تھا۔ روشن اور رقیہ کے چھ بچے ہو چکے تھے۔ سب ہی پڑھتے تھے اور موقع ملتے ہی چچا کے بچوں سے

لڑ بھی جاتے تھے۔ ہاشم اور ناہید بھی ان سے پیچھے نہیں رہے۔ بلکہ دو ہاتھ آگے ہی۔ رقیہ کے بچوں میں دو دو سال کا وقفہ تھا، مگر ناہید بیچاری ہر سال تخلیق کے عمل سے گزرتی تھی۔ اگر کوئی ٹوک دیتا تو ہاشم اور ناہید کے ساتھ ساتھ روشن اور رقیہ کو بھی آگ لگ جاتی۔

''لو بھلا۔ لوگوں کو کیا تکلیف ہے۔ ہمارے دس بچے ہوں یا دو۔ اللہ کی دین ہے؟ اللہ کا حکم ہے کہ رزق کی وجہ سے اولاد کو قتل مت کرو۔ اور اللہ تو ہمیں کھلا رزق دے رہا ہے۔ شکر ہے مالک کا۔ پھر ہم ناشکری کیوں کریں۔ وہ دے گا تو ہم خوشی خوشی لیں گے۔ کسی کو کوئی اعتراض ہے تو اپنے گھر بیٹھے، مت ملا کرے ہم سے۔''

''بینا کے ابا۔ اب ہمیں یہ جگہ بہت کم پڑنے لگی ہے۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں اور دو کمروں میں ہمارا گزارا نہیں ہو رہا۔ روشن بھائی اور رقیہ بھابی بھی دو کمروں میں بہت تنگی سے گزارا کر رہے ہیں۔ آپ اس بارے میں کچھ سوچتے کیوں نہیں۔''

احد سال بھر کا ہو چکا تھا۔ اس کے بڑے بھائی بہنیں سب اسکول چلے جاتے تھے، بس وہ اور اس سے بڑے دو بھائی زید اور شاہد ہی گھر ہوتے تھے۔ جب تک بڑے بچے گھر سے باہر رہتے گھر میں سکون سا رہتا، مگر جیسے ہی سارے بچے اسکول سے واپس آتے، گھر میں ایک طوفان بدتمیزی برپا ہو جاتا۔ ناہید لاکھ انہیں منع کرتی، ڈانٹتی مگر بچے تو پھر بچے ہی تھے، کہاں سنتے کسی کی۔ پھر رات کو سونے کا بھی بڑا مسئلہ ہوتا، ایک ایک چارپائی پر دو دو بچوں کو ڈالا جاتا، جگہ پھر بھی کم پڑ جاتی۔ ناہید اس صورت حال سے پریشان ہوگئی تو ہاشم سے الجھ پڑی۔

''تم بتاؤ، میں کیا سوچوں۔ میرا تو سارا دھیان کام میں ہی لگا رہتا ہے۔ گھر میں کیا ہوتا ہے، مجھے نہیں پتا۔'' ہاشم نے پریشانی سے کہا تو ناہید بھڑک اٹھی۔

''اچھا۔ اب یہ بھی آپ کو میں ہی بتاؤں؟ آپ کوئی اور جگہ کیوں نہیں لے لیتے۔ دور نہیں جا سکتے تو اسی محلے میں کوئی اور بڑا گھر لے لیں۔ جہاں کم از کم بچے آرام و سکون سے سو تو سکیں۔ یہاں تو ایک ایک چارپائی پر تین تین پڑے ہوتے ہیں۔ نہ ڈھنگ کی نیند نہ چین اور نہ سکون۔''

''اچھا۔ میں بات کرتا ہوں بھائی سے۔ دیکھتا ہوں وہ کیا کہتے ہیں۔'' ہاشم نے کروٹ بدلتے ہوئے جیسے بات ختم کی اور اگلے ہی پل اس کے خراٹے گونج رہے تھے۔

☆......☆

میر ہاشم نے اسی محلے میں دس مرلہ کا پلاٹ خریدا اور کنسٹرکشن شروع کروادی۔ انہوں نے بھائی سے اپنا حصہ مانگا تو بھائی نے سر جھکا لیا لیکن رقیہ سے خاموش نہ رہا گیا۔

''ہم تمہیں حصہ کہاں سے دیں۔ تم دیکھتے نہیں ہو دکان گھاٹے میں جا رہی ہے اور اس پر لڑکیوں کی پوری کھیپ۔ اب اگر یہ گھر بیچ کر تم دونوں بھائی اپنا اپنا حصہ لے بھی لیتے ہو تو کسی کے پلے کیا پڑے گا؟ تم تو پھر بھی کچھ نہ کچھ کر لو گے۔ تمہارا کام بھی اچھا چل رہا ہے اور ناہید نے کافی جوڑ جمع بھی کر رکھا ہے۔ مگر ہم تو سڑک پر آجائیں گے۔''

''بس بھابی! اس سے زیادہ کچھ مت کہیں۔ کوئی بات نہیں۔ آپ اس گھر میں آرام سے رہیں۔ میں اپنا حصہ بھی اپنے بھائی پر وار دوں گا، مگر اپنی بھتیجیوں کو رلتا نہیں دیکھ سکوں گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ مجھے بس دو ماہ کا وقت دے دیں۔ میں اپنے بچے لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔'' ہاشم نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا تو ان کے ساتھ بیٹھا ان کا بڑا بیٹا حیرت سے باپ کو دیکھنے لگا۔

''ابو جی! ہم تایا جی سے کم ہیں کیا؟ ان سے اپنا حصہ نہیں لے سکتے، جو آپ نے انہیں دادا کا گھر پورے کا پورا دے دیا۔ امی تو کبھی نہیں مانیں گی۔'' وہ بولا۔ ہاشم کی رگوں میں بھائی کی محبت جوش بن کر دوڑ رہی تھی۔

''عاصم بیٹا! میری ایک بات یاد رکھنا۔ بھائی بھائیوں کی طاقت ہوتے ہیں۔ بازو ہوتے ہیں۔ ان پر مان کیا جاتا ہے ان سے لڑا نہیں جاتا اور رہی بات تمہاری ماں کی، تو وہ عورت ہے۔ اسے پیار سے سمجھاؤں گا تو سمجھ جائے گی۔ عاصم نے باپ کی باتوں کو غور سے سنا، سمجھا اور پھر دل میں ایسے اتار لیا کہ ایک ایک لفظ نقش ہو کر رہ گیا۔

''امی! ابو نے چوک کے پاس والی گلی میں پلاٹ خرید لیا ہے۔ اس پر کام بھی شروع کروا دیا ہے۔ اب ہم جلد ہی اپنے نئے گھر میں چلے جائیں گے۔ کتنا مزہ آئے گا ناں۔'' زید نے ناہید کے شانے سے لٹکتے ہوئے مزے سے کہا تو وہ بھی خوش دلی سے مسکرادی۔

''ہاں، اب تم لوگ خوب کھلے ڈلے ہو کر کھیلا کرنا۔ کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں ہوگا۔'' ناہید نے بیٹے کو پیار سے گلے لگاتے ہوئے کہا تو پاس بیٹھی بینا جل بھن کر رہ گئی۔ یہ سب بہن بھائیوں سے بڑی تھی۔ ہاشم کی بہت لاڈلی تھی۔ عاصم اور بینا دونوں ہی ہاشم کو بہت پیارے تھے۔ عاصم کا مزاج باپ جیسا تھا، مگر بینا الگ مزاج

رکھتی تھی۔ اسی لیے باپ کا فیصلہ اسے ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

''امی! ہم تو نئے گھر میں چلے جائیں گے، مگر یہاں کون رہے گا؟ ہمارے کمرے کس کے استعمال میں آئیں گے؟''

''کون رہے گا؟ تمہارے تایا تائی جان رہیں گی۔ ہمیں تو اللہ نے اپنا گھر دے دیا ہے۔ اس سے کہیں بڑا اور کشادہ۔ اب بھائی بھابی جانیں اور ان کا کام۔'' ناہید نے سلائی مشین کی سوئی میں دھاگا ڈالتے ہوئے نرمی سے کہا تو بینا کا منہ پھول گیا۔

''امی! یہ گھر دادا کا ہے۔ اس میں ہمارا بھی حصہ ہے اور ہم اپنا حصہ ایسے کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ ہم اپنے کمروں کو تالا لگا کر جائیں گے۔ جب تک تایا جان ہمیں پیسے نہیں دیں گے، ہم انہیں کمرے نہیں دیں گے۔'' وہ ماتھے پر بل ڈالے ماں کو نیا سبق دے رہی تھی۔ ناہید نے حیرت سے اپنی بیٹی کو دیکھا اور پھر اس کی بات پر غور کرنے لگی۔

''ہاں، بینا کہہ تو ٹھیک رہی ہے۔ ہم کیوں اپنا حصہ چھوڑیں۔ آخر میرے سسر کا گھر ہے۔ بھابی رقیہ کون سا جہیز میں لائی تھیں جو انہیں پورے گھر کی مالکن بنا دیا جائے۔ ہوں، آنے دیں آج بینا کے ابا۔ بات کرتی ہوں ان سے۔ لو یہ کوئی بات ہوئی بھلا۔ مجھ سے زیادہ عقل مند تو میری بیٹی ہوگئی ہے۔ کیسے پتے کی بات بتائی اس نے۔'' ناہید کا ذہن اسی ٹریک پر چل نکلا تھا۔ وہ سارا دن اسی ادھیڑبن میں جانے کیا کیا اسکیمیں بناتی رہی۔ ایک بار بھی اس نے یہ نہ سوچا کہ اگر رقیہ چار مرلے کی مالکن بن رہی ہے تو اللہ نے اسے دس مرلے کی مالکن بنا دیا ہے۔ مگر پھر وہی زر، زن، زمین۔

''بینا کی ماں۔ تمہیں یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔ تم ماں ہو، بجائے بچی کو سمجھانے کے، اس کی الٹی بات پلے سے باندھ کر بیٹھ گئیں۔ شکر ادا کرو اللہ کا کہ اس نے تمہیں اتنے بڑے گھر کی مالکن بنا دیا ہے۔ رقیہ بھابی کے پاس کیا ہے، چار مرلے زمین اور چار ہی کمرے، اور تم خود کو دیکھو۔ دس مرلے کا کھلا ڈلا گھر۔ ایک منزل تیار ہوگئی، اب چاہے اوپر دو منزلیں اور ڈلوا لینا۔ تمہارا ہاتھ روکنے والا کون ہے۔'' ناہید نے جیسے ہی بیٹی کی تجویز ہاشم کے سامنے رکھی، وہ الٹا اسے سمجھانے بیٹھ گئے۔ ان کی باتیں ناہید کے دل کو لگ رہی تھیں۔ وہ شرمندہ سی ہوگئی۔ واقعی کل کی بچی کے غلط مشورے کی وجہ سے وہ برسوں پرانے رشتے کھونے جا رہی تھی۔ ہاشم نے چہرے کی شرمندگی پڑھ چکی تھی۔ اس لیے انہیں دلاسا دیا اور بینا کو بھی سمجھایا کہ اپنی توانائیاں فضول باتوں میں ضائع کرنے کی بجائے گھر کے کاموں میں دھیان لگائے۔

وہ لوگ اپنے نئے گھر میں شفٹ ہوگئے۔ میر روشن اور رقیہ بھی سکون سے آبائی گھر میں رہنے لگے۔ وقت کا پہیا اپنی مخصوص رفتار سے چلتا رہا۔ بچے جوان ہوگئے اور ہاشم اور روشن بوڑھے۔ روشن نے اپنی تینوں بیٹیوں کی شادیاں کر دیں۔ ہاشم اور ناہید نے شادیوں میں بھرپور تعاون کیا تھا۔ ابھی دنوں بینا کا رشتہ بھی اچھی جگہ سے آگیا، ہاشم اور عاصم نے اچھی طرح چھان بین کے بعد اس کو بھی رخصت کر دیا۔ بینا کی شادی کو ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ چھوٹی کا بھی رشتہ آگیا۔ لوگ اچھے تھے، لڑکا شریف اور نیک تھا، سو اللہ کا نام لے کر اس کی نیا بھی پار لگا دی گئی۔ اسی طرح انہوں نے ایک ایک کر کے سارے بچے بیاہ دیے۔ عاصم کی شادی ہاشم نے اپنے دوست کی بیٹی سے کر دی۔ زید کو تایا کی چھوٹی بیٹی ہما پسند تھی، ناہید خوشی خوشی اسے بہو بنا لائی۔

یوں تو ہاشم نے سب بیٹوں کو الگ الگ دکان دلوا دی تھی مگر شاہد کو عاصم اپنے ساتھ فیکٹری لگائے ہوئے تھا کیونکہ وہ غصے کا بے حد تیز اور بدتمیزی کی حد تک منہ پھٹ تھا۔ بات بات پر لڑنے مرنے کو تیار اور گالیوں میں تو جیسے اس نے P.H.D کر رکھا تھا۔ ہاشم اور ناہید اسے سمجھا سمجھا کر عاجز آچکے تھے۔ ان کی ساری اولادوں میں یہ واحد بچہ تھا، جو سب سے زیادہ بگڑا ہوا تھا مگر خود کو سب سے زیادہ سمجھدار اور نیک سمجھتا تھا۔

''بینا کی ماں، میں تو اس لڑکے کی وجہ سے کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا۔ محلے میں ہر کسی کو اس سے شکایت ہے۔ بازار میں ہر کسی کی اس سے لڑائی ہے۔ میں جدھر سے گزرتا ہوں، اس کی شکایتیں ملتی ہیں۔ مجھے بتاؤ اس کا کوئی تو حل ہوگا۔ کیا کریں اس لڑکے کا۔'' ہاشم ابھی ابھی گھر آئے تھے، اور راستے میں کوئی دس لوگوں نے انہیں روک کر شاہد نامہ سنایا تھا۔

''ابو جی! اس کی شادی کر دیں۔ دیکھ لیجئے گا۔ دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا۔'' بینا حسب معمول میکے آئی ہوئی تھی، سو اپنا قیمتی مشورہ لیے فوراً گفتگو میں چھلانگ لگا دی۔

''شادی کر دیں؟ مگر کس سے؟ اس بدتمیز آوارہ کو کون لڑکی دے گا اپنی؟ حد کرتی ہو تم بھی۔ ہر مسئلے کا حل شادی تھوڑی ہوتا ہے۔ شادی کر دیں اونہہ۔'' ناہید کو تو بینا کا بیچ میں

کو دنا ہی کھلا تھا کہ اس پر اس کا مشورہ انہیں تو جیسے آگ ہی لگ گئی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہوں امی۔ ہر مسئلے کا حل شادی ہو یا نہ ہو، مگر شاہد کے مسئلے کا حل صرف شادی ہی ہے، اور شادی بھی کسی ایسی لڑکی سے جو اسے قابو کر سکے۔'' بینا اپنی بات پر قائم تھی۔ ہاشم بھی سوچ میں پڑ گئے تھے۔

''ارے لڑکی، ہوش کی دوا کر جا کے۔ ہم سے تو قابو ہو نہیں رہا تو کس طرح بیوی کے قابو آ جائے گا۔''

''آئے گا امی، آئے گا۔ آپ ایک بار سوچیں تو۔ اور لڑکی کا کیا ہے، چچا کریم کی چھوٹی بیٹی نادیہ کیسی رہے گی؟'' آپ چچا سے بات کریں۔ وہ مان جائیں گے۔'' بینا نے پرانے محلے میں رہنے والے ہاشم کے عزیز دوست کا حوالہ دیا تو ناہید بھی سوچ میں پڑ گئی۔ کریم انتہائی شریف النفس انسان تھے۔ خود بھی پڑھے لکھے تھے اور بچوں کو بھی پڑھا رہے تھے۔ گھر کا ماحول سلجھا ہوا تھا۔ نادیہ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ ان کے دل کو بینا کی بات لگی۔ انہوں نے ہاشم کی سمت دیکھا۔ وہ بھی انہیں ہی دیکھ رہے تھے۔ بس، پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال جواب ہوئے اور اگلے چند روز میں یہ معرکہ بھی سر کر لیا گیا۔

شاہد اور نادیہ کی شادی خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ نادیہ بالکل ویسی نہیں تھی، جیسی بینا نے اندازہ لگایا تھا، وہ تو اس سے بھی کئی ہاتھ آگے تھی۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے ایسا جادو چلایا کہ شاہد کو اپنا دیوانہ بنا لیا۔ وہ سارے گھر میں سب کے سامنے نادو، نادو کے نعرے لگاتا، اس کے آگے پیچھے پھرتا رہتا اور نادو بی بی اس اڑیل ٹٹو کو اپنی ابرو کے اشارے پر نچاتی رہتی۔ بات یہاں تک ہی رہتی تو ٹھیک تھا مگر اب اس نے گھر کے معاملات کو قابو کرنا شروع کیا اور اس میں بینا نے اس کا پورا پورا ساتھ دیا۔ دو دو بڑی بہوؤں کے ہوتے ہوئے ساس کی جگہ نادیہ بی بی نے لے لی اور کسی کو پتا بھی نہ چلا۔ اس کا طریقۂ واردات بڑا انوکھا اور نرالا تھا۔ مکمل جوائنٹ فیملی سسٹم تھا۔ بڑی بھابی کے بچے بڑے تھے، اسکول جاتے تھے، اس لیے وہ زیادہ وقت کچن کو نہیں دے سکتی تھی مگر پھر بھی اپنی ذمہ داری پوری ایمانداری سے نبھانے کی کوشش کرتی۔ ہما بھی اپنا کام پورا کرتی تھی مگر نادیہ کا انداز جدا تھا۔ وہ صبح تڑکے اوپر ساس کے کمرے میں آ جاتی۔ ساس امی نماز اور تلاوت کے بعد آرام کر رہی ہوتیں۔ یہ ان کے پیروں میں بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگتی۔ امی کی آنکھ کھلتی تو نادو فوراً ان کے پیر دبانے لگتی۔

ان کے لیے چائے بنالاتی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی اور باتوں ہی باتوں میں سارے راز اگلوالیتی۔ امی اس سے بہت خوش تھیں۔ ہر آئے گئے کے سامنے اس کی خوب تعریفیں کرتیں۔ پہلے یہ تعریفیں بڑی بھابی عائشہ کی ہوتی تھی کہ کئی سال تک تو وہ ہی ان کے ساتھ ہر دکھ سکھ کی ساتھی بنی شانے سے شانہ ملائے کھڑی تھی۔ ہما غریب کا کہیں نام ونشان ہی نہیں تھا، ایک تو زید کی پسند تھی، دوسرے تایازاد یعنی کہ گھر کی مرغی دال برابر اور پھر اس پر وہ عجیب مست مولی طبیعت کی مالک تھی۔ دل کرتا تو سب کے درمیان آکر بیٹھ جاتی، دل نہ چاہتا تو اپنے کمرے سے بھی باہر نہ نکلتی۔ نادیہ اس کا بھی خوب فائدہ اٹھاتی۔ ہما کے خلاف سب کے کان بھرتی رہتی۔ حتیٰ کہ سب نندیں ہما سے متنفر ہوگئیں۔ ناہید بھی ہما کو بہو بنا کر پچھتانے لگیں، مگر پھر بیٹے کو خوش دیکھتیں تو نظر انداز کر دیتیں۔

"تائی جان! ہم باجیوں کو عیدی دینے جارہے ہیں۔ آپ نے کچھ بھجوانا ہے تو ہمیں ہی دے دیں۔ ہم انہیں دے آئیں گے۔" ناہید دونوں بڑی بہوؤں کے ساتھ میٹھی سحری کا مینو سیٹ کروا رہی تھیں کہ نادیہ نک سک سے تیار، شانے پر بیگ لٹکائے شاہد کے ساتھ لہراتی بل کھاتی ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔

اس کی بات سن کر جہاں ناہید کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا، وہیں دونوں بہوؤں کو حیرت کا شدید دورہ پڑا تھا۔ کیونکہ یہاں مشترکہ خاندانی نظام تھا، سو ہر کام مشترکہ کیا جاتا تھا۔ بیٹیوں کو میکے سے عیدی ضرور جاتی تھی، مگر ایک ہی جگہ۔ ناہید اور عائشہ ساری تیاری مل کر کرتی تھیں۔ رمضان سے پہلے ہی خریداری کرلی جاتی اور آخری عشرے میں کوئی نہ کوئی بھائی جاکر ساری بہنوں کو عید کی سوغاتیں دے آتا۔ پھر عید کے دوسرے دن سب بہنوں کی دعوت ہوتی تھی، اور اس دن سب بچوں کو نقد عیدی دے دی جاتی۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ مگر یہ نادیہ تو کوئی نئی اسکیم شروع کر رہی تھی۔

"باجیوں کو عیدی۔ مگر وہ تو امی نے پرسوں ہی بھجوا دی تھی۔ پھر تم کس عیدی کی بات کر رہی ہو۔" عائشہ نے نرمی سے پوچھا تو وہ منہ بنا کر شاہد کو دیکھنے لگی۔

"ارے بھابی! وہ عیدی تو امی ابو کی طرف سے تھی ناں۔ اور یہ عیدی تو ایک بھائی اپنی بہنوں کو دینے جارہا ہے۔ آخر بہنوں کو بھی تو ارمان ہوتا ہوگا ناں کہ ان کے بھائی اور بھابیاں ان کے سسرال آکر انہیں اور ان کے بچوں کو عیدی دیں۔" نادیہ کا اشارہ سمجھتے ہوئے شاہد نے اس کی زبان میں جواب دیا تو عائشہ گہرا سانس بھر کر رہ گئی۔

"لو، یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ جب ہم سب اکٹھے رہ رہے ہیں۔ سب کچھ اکٹھا ہے تو پھر تم دونوں یہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ کیوں بنا رہے ہو؟ اب تم دونوں جاؤ گے۔ پھر باجیوں کو ہماری طرف سے بھی آس لگ جائے گی۔ چچی جان سمجھائیں ناں انہیں۔" ہما کو بھی سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا، گو کہ اس کی شادی کو بھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا مگر چچازاد ہونے کی وجہ سے وہ سب کو پہلے سے جانتی تھی۔

"تو آپ کو کس نے کہا ہے کہ آپ بھی ہماری نقل کریں۔ آپ مت جائیے گا۔ جیسے پہلے ...... دن سب کو پیسے دیتے ہیں۔ دے دیجئے گا، مگر ہمیں کیوں روک رہی ہیں آپ۔ ہماری مرضی، ہم جو چاہے کریں۔ اور ویسے بھی ہم کچھ برا نہیں کر رہے۔ اچھا ہی کر رہے ہیں۔ اس سے ہمارے گھر کی عزت بڑھے گی، گھٹے گی نہیں۔ سمجھیں آپ۔" ہما کی بات کا غصے سے بھرا جواب آیا تھا۔ ہما بھی کچھ کہنے کو تھی، مگر ناہید نے اشارے سے اسے روک دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم لوگ جانا چاہتے ہو تو ضرور جاؤ۔ لیکن اگر پہلے سے ہمیں بتا دیتے تو ہم کچھ اور پروگرام بنا لیتے۔" ناہید نے ہوا کا بدلتا رخ محسوس کرتے ہوئے انہیں اجازت دے دی تھی۔ "ہاں تو ٹھیک ہے ناں۔ یہ دونوں بیٹھی ہیں ناں آپ کی لاڈلی بہوئیں، بنالیں ان کے ساتھ جو بھی پروگرام بنانا ہے۔ ہمارا ٹائم کیوں ویسٹ کر رہی ہیں۔ چلو نادو۔ ہمیں پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔ میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ رہنے دو، خرچ بھی بڑھے گا اور برے بھی ہم بنیں گے، مگر تمہیں بھی باجیوں کی محبت کا بخار چڑھا رہتا ہے۔ چلو اب۔ راستے سے ابھی کیک بھی لینے ہیں سب کے لیے۔" شاہد نے ایک سانس میں ماں کو دس باتیں سنائیں اور بیوی کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں اتر گیا۔

"امی! آپ پریشان مت ہوں۔ اگر آپ کہتی ہیں تو ہم بھی کل اپنی طرف سے عید بھجوا دیں گے۔ کوئی بات نہیں سال بعد تو عید آتی ہے۔ نادیہ ٹھیک کہتی ہے۔ بیٹیوں کو سسرال میں میکے کا ہی تو مان ہوتا ہے۔" عائشہ نے ساس کو پریشان دیکھا تو نرمی سے ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ہما بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"میں اس لیے پریشان نہیں ہوں بیٹا کہ شاہد اور نادیہ بہنوں کی طرف اکیلے چلے گئے۔ بلکہ میں اس لیے پریشان ہو رہی ہوں کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ یہ ہمارے گھر میں دراڑ

ہو گئے۔ ایک جگہ بیٹھ کر نہ فیصلہ کرتے ہیں اور نہ ہی کوئی کام۔ یہ اچھا نہیں ہوا بیٹا۔ اب تم دیکھنا، اس گھر میں نئی نئی باتیں ہوں گی۔ نئے نئے کام سرانجام دیئے جائیں گے اور میرا گھر ٹوٹنا شروع ہو جائے گا۔'' ناہید بے حد پریشان تھیں۔ عائشہ اور ہما بھی ان کی پریشانی سے پریشان ہو گئی تھیں اور پھر وقت نے ثابت کر دیا کہ ناہید کی پریشانی بیجا نہ تھی۔ نادیہ نے شاہد کو مکمل طور پر اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔ اس نے جب سے بہنوں کو علیحدہ عیدی اور مختلف مواقع پر گفٹس دینے کا سلسلہ شروع کیا تو بہنوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہو چکی تھیں۔ اب ناہید اگر ان سے کوئی بات کرنا بھی چاہتیں تو وہ الٹا ماں کو سمجھانے بیٹھ جاتیں کہ نادیہ ہی آپ کی بیسٹ چوائس ہے۔

آہستہ آہستہ گھر میں چھوٹی موٹی لڑائیاں جنم لینے لگیں۔ انہی دنوں شاہد نے عاصم کا ساتھ چھوڑ کے زید اور احد کو جوائن کر لیا۔ عاصم کی دکان کے برابر میں مزید دو دکانیں کھل گئی تھیں اس لیے خریدار کم ہو گئے تھے۔ سو شاہد نے اپنا حصہ وصول کیا اور احد اور زید کے ساتھ آ گیا۔ اب ایک نئی جنگ کا آغاز ہوا۔ یوں لگنے لگا جیسے گھر کی لڑائی کاروبار تک جا پہنچی ہے۔ جب تک زید اور احد اکٹھے تھے، دونوں بڑے سکون سے کام کر رہے تھے، شاہد کے وہاں قدم پڑتے ہی ایک فتنہ سا کھڑا ہو گیا۔ نادیہ نے اس دوران پورے گھر کو قابو کر لیا تھا۔ ناہید اور ہاشم پر تو جیسے کوئی جادو کر ڈالا تھا۔ اور اس جادو میں زیادہ کردار بینا کا ہی تھا۔ وہ ہر بات میں شاہد اور نادیہ کی حمایت کرتی۔ ماں کو جانے کیا کیا پٹیاں پڑھاتی کہ وہ کلی طور پر نادیہ کے گن گانے لگیں۔ ادھر کاروبار کا جھگڑا بڑھا تو یہ لڑائی گھر تک آ گئی۔ تب ناہید نے دل پر پتھر رکھ کر فیصلہ کیا کہ تینوں بیٹوں کو الگ کر دیں۔ احد تو ابھی کنوارہ تھا اور اس نے لامحالہ ماں باپ کے ساتھ ہی رہنا تھا۔ ناہید اور ہاشم نے عاصم کو دکان سے بلوایا۔ اس کے سامنے سارا معاملہ رکھا گیا۔ وہ خود بھی روز روز کی اس دانتا کل کل سے تنگ آیا ہوا تھا۔ اس نے بھی ماں کے فیصلے پر سر جھکا دیا، مگر دل میں کہیں ارمان سا تھا کہ امی اسے ساتھ رکھیں۔ اس کی شادی کو بارہ سال بیت چکے تھے۔ اس کے بچے بھی بڑے تھے اور دادا دادی کے بغیر رہ بھی نہیں سکتے تھے، پھر عائشہ سے آج تک ساس نندوں کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی بہنوں نے بظاہر کوئی بات نہ کی ہو، مگر اب ان کے دل وہ نہیں رہے تھے، ان کے دلوں میں بغض بھرا جا چکا تھا، اور یہ کام نادیہ نے اتنی ہوشیاری سے کیا تھا کہ خود کو بہت چالاک اور ہوشیار سمجھنے والی اس کی بہنیں بھی نہیں جان پائی تھیں۔

''امی! آپ کس کو ساتھ رکھیں گی یہ بھی بتا دیں۔ تینوں بہوؤں کو ایک ساتھ تو الگ نہیں کیا جا سکتا ناں، کسی ایک کو تو ساتھ رکھنا ہی پڑے گا آپ کو۔'' عاصم نے اپنے ڈوبتے دل کی دھڑکنوں کو بمشکل سنبھالتے ہوئے پوچھا تو ناہید بے اختیار شاہد کو دیکھنے لگیں۔

''میں نادیہ کو ساتھ رکھوں گی۔ تم اور زید اپنا چولہا چوکا علیحدہ کر لو۔'' ناہید نے بینا اور نادیہ کا پڑھایا ہوا سبق دہرایا اور ایک ہی سانس میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''بینا کی ماں! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ تمہیں عائشہ کو ساتھ رکھنا چاہیے تھا۔ اس کا حق پہلے بنتا تھا۔ اور پھر اس کا مزاج بھی ایسا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ اچھی طرح رہ سکتی ہے۔ مگر تم نے نادیہ کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ پوچھ سکتا ہوں کیوں؟''

''پتا نہیں بینا کے ابا۔ مجھے خود نہیں پتا کہ میں نے کیا کہہ دیا۔ میں تو خود عاصم کے بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی مگر جانے کیوں میرے منہ سے نادیہ کا نام نکل گیا۔'' وہ خود بھی پریشان تھیں۔ شاید پچھتا بھی رہی تھیں۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

نادیہ کی پلاننگ میں یہ سب شامل نہیں تھا۔ وہ تو انگریزوں کے مشہور معقولے ''ڈیوائڈ اینڈ رول'' پر پوری طرح عمل پیرا تھی، مگر یہاں تو الٹی آنتیں گلے ہی پڑ گئیں۔ وہ تو بھابیوں کو سب کی نگاہوں میں نیچا دکھا کر خود اچھی بننے کے چکر میں تھی، اور یہاں تو سارے گھر کا بوجھ ہی اس کے شانوں پر آ گیا۔ ماشاء اللہ بھرا پرا گھر تھا اور نندوں کو ہر ہفتے میکے کا ہڑک اٹھا رہتا تھا۔ پھر جیسے ہی چھٹیاں شروع ہوتیں۔ ساری نندیں مل کر دھاوا بول دیتیں اور ایسے میں پہلے تو وہ تینوں مل کر سب سنبھال لیتیں تھیں، مگر اب اسے اکیلی کو ہی سب کرنا تھا۔ اس نے پہلے تو چند دن جیسے تیسے ساری ذمہ داری سنبھالی، پھر ناہید کی برین واشنگ شروع کر دی۔ ہاشم کی برین واشنگ کا کام شاہد نے سنبھالا اور چند ہی ہفتوں کے بعد عائشہ ایک بار پھر واپس ان کے ساتھ مل چکی تھی۔

☆......☆

احد کی شادی طے ہو گئی۔ گھر کا سب سے چھوٹا اور لاڈلا بیٹا ہونے کی وجہ سے ہر کوئی پُرجوش ہو رہا تھا۔ نادیہ اور شاہد نے یہاں بھی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر سب کو حیران کر دیا۔ ایسے ایسے شگن ایجاد کیے کہ بینا تک نے دانتوں تلے

انگلیاں دبالیں۔ سنبل دلہن بن کر گھر آ گئی۔ یہاں ایک بار پھر تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا۔ سنبل احد کے لیے ایسا پارس ثابت ہوئی جس کے ساتھ لگتے ہی احد سونا بن گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا بزنس پھیلتا چلا گیا۔ ایک کے بعد ایک اس نے کئی دکانیں کھول لیں۔ زید اور شاہد بھی اس کے ساتھ تھے مگر احد کا شیئر سب سے زیادہ تھا۔ شادی کے بعد اس کے برانٹ میں اضافہ ہی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پھر یہ سنبل کی قسمت تھی کہ احد اسے ہنی مون کے لیے سوئیزرلینڈ بھی لے گیا۔ یہ اعزاز گھر تو کیا خاندان میں کسی کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ بظاہر سب خوش تھے، مگر کچھ دل ایسے بھی تھے جن میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ سوئیزرلینڈ سے واپسی کے بعد روٹین لائف شروع ہوئی اور پھر وہی روز کی چخ چخ۔ تینوں بھائی اپنی اپنی آمدن کے مطابق گذر بسر کر رہے تھے مگر شاہد کو اب زید کا ساتھ کھٹکنے لگا تھا۔ آئے روز کسی نہ کسی بات کا ایشو بنتا اور پھر تینوں میں جھگڑا شروع ہو جاتا۔ ایسے ہی ایک جھگڑے میں بات احد اور زید کی تلخ کلامی بڑھتے بڑھتے ہاتھا پائی تک پہنچی اور شاہد نے گلدان پھینک کر زید کا سر پھاڑ دیا۔ زید کا پھٹا سر دیکھ کر ہاشم کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ عاصم کو خبر ملی وہ بھی سب چھوڑ چھاڑ بھاگا چلا آیا۔ اور بھائی کو خونم خون دیکھ کر رو دیا۔

''شاہد! یہ کیا کیا تم نے۔ بھائی تو بھائیوں کا بازو ہوتے ہیں۔ مان ہوتے ہیں۔ اور تم نے اپنے بھائی کا خون بہا دیا۔ یہ تم نے اچھا نہیں کیا شاہد۔'' عاصم کا صدمے کے مارے برا حال تھا۔

''میں نے جو کیا بالکل ٹھیک کیا۔ یہ خبیث اسی قابل تھا۔ بیوی کی زبان بولتا ہے۔ جب دیکھو الٹی بات ہی کرتا ہے۔ الٹی کھوپڑی کا انسان۔'' شاہد اپنی غلطی ماننے کی بجائے الٹا شیر کی طرح دھاڑتا پھر رہا تھا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر ہما سے بھی نہ رہا گیا اور وہ بھی میدان میں کود پڑی۔ شاہد کو جانے اس سے کیا بیر تھا، اس کی بات پوری سنی بھی نہیں اور اس پر چڑھ دوڑا۔ اگر جو ہاشم اور احد بیچ بچاؤ نہ کراتے تو شاید زید کی طرح ہما بھی پھٹا سر لیے کسی کونے میں پڑی ہوتی۔

''تم لوگ آخر چاہتے کیا ہو؟ اس طرح لڑ بھڑ کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟ آرام سے میرے سامنے بیٹھو، اور کھل کر دل کی بات بتاؤ مجھے تاکہ اس روز روز کے لڑائی جھگڑے کا کوئی مستقل حل نکالا جا سکے۔'' ہاشم نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''ہم سے کیا پوچھتے ہیں آپ! یہ سب کیا دھرا تو آپ کا ہی ہے۔ نہ آپ تایا، تائی پر اتنی مہربانی کرتے، نہ انہیں اپنا آبائی حصہ دان کرتے تو نہ ہی آج ان کی لاڈلی زید کی آنکھ کا تارا بن کر ہم پر حکومت کرنے کی جسارت کرتی۔ یہ سب آپ کی غلطی ہے۔ آپ قصوروار ہیں اس سب کے۔'' شاہد کسی بم کی طرح پھٹا تھا۔

''یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم۔ لڑائی تم تینوں کی ہے۔ اس میں تایا، تائی کہاں سے آ گئے؟ اور یہ خناس تمہارے دماغ میں بھرا کس نے ہے کہ......!''

''بچہ نہیں ہوں میں۔ سب جانتا ہوں، سمجھتا ہوں اچھی طرح سے۔ تایا، تائی کی نظریں آبائی گھر کے بعد اب ہمارے اس گھر پر ہیں۔ اسی لیے انہوں نے اپنی بیٹی کو زید کے پیچھے لگایا۔ اس ہما چڑیل نے جان بوجھ کر زید کو اپنی اداؤں کے جال میں پھانسا اور اس سے شادی کی تاکہ ہمارے گھر، ہماری پراپرٹی میں حصہ دار بن سکے۔ مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ ایک تنکا بھی اب تایا، تائی کو نہیں ملے گا یہاں سے۔ اگر کسی میں ہمت ہے تو ایسا کر کے دکھائے، پھر وہ ہوگا اور اس کا برا انجام۔ سن لیں کان کھول کر سب۔ میں اب کسی کو بخشنے والا نہیں۔'' ناہید سے جیٹھ، جیٹھانی کی انسلٹ برداشت نہیں ہوئی تو وہ شاہد کو ماں کے حق سے ڈانٹنے لگیں، مگر بھول گئیں کہ وہ اب صرف ان کا بیٹا نہیں رہا تھا۔ وہ الٹا ان کی بات پر بری طرح سے ہاتھ نچا نچا کر چلانے لگا تھا۔ اس کی باتوں سے عناد اور بغاوت کی ایسی بو آ رہی تھی کہ سب کے سانس رکنے لگے۔ ہما سے برداشت نہ ہوا تو وہ رونے لگی۔ اس کے آنسو ناہید اور ہاشم کے دل پر گر رہے تھے، زید تو پہلے ہی خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے نڈھال پڑا تھا، ورنہ ایک معرکہ اور ہو جاتا تھا۔

''شاہد! ہوش کے ناخن لو۔ یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کون تمہیں اتنی غلط انفارمیشن دیتا رہتا ہے؟ تمہیں کیا پتا کہ ابو نے تایا تائی کو کیا دیا اور کیا نہیں؟ تم تو اس وقت بہت چھوٹے تھے اور اتنے چھوٹے بچے کو کچھ یاد نہیں رہتا جب تک کہ اسے بار بار یاد دہانی نہ کروائی جائے۔ اور جہاں تک مجھے یاد ہے، ہمارے گھر میں تو ایسی بات کبھی کسی نے کی ہی نہیں۔ نہ امی نے نہ ابو نے۔ تو پھر تمہیں یہ سب کون بتاتا ہے؟'' عاصم ضبط کے کڑے مراحل سے گزرتا ہوا بولا۔

''اور کون بتائے گا بھائی جان۔ یہ سب پینا باجی کے کارنامے ہیں۔ وہ آج تک نہ خود بھولی ہیں، اور نہ ہی ہمیں بھولنے دیتی ہیں۔ جب بھی موقع ملتا ہے باقی باجیوں کے ساتھ مل کر تایا تائی کا خوب مذاق اڑاتی ہیں۔'' احد نے جھکے

کی ہر طرح سے مدد کی ہے، اس کا حساب بھی پورا پورا وصول کروں گا۔"

"تو اور کیا؟ پیسے کیا درختوں پر لگتے ہیں تایا جان جو بغیر سوچے سمجھے ہر کسی پر وار دیں۔ آپ تو ہیں سیدھے بندے، آپ کو کیا پتا دنیا کی چالاکیوں کا۔" شاہد کی بڑھکیں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ نادیہ اس کی مورل اسپورٹ کے لیے بول اٹھی۔

"تم بیچ میں مت بولو۔ یہ ہم بھائیوں کا آپس کا معاملہ ہے۔ بھابیاں اس سے دور ہی رہیں تو......!"

"نادیہ بولے گی۔ ضرور بولے گی۔ میں دیکھتا ہوں کہ اسے کون روکتا ہے۔ یہ اس گھر کا حصہ ہے۔ بیوی ہے میری اور اسے پورا حق حاصل ہے بولنے کا۔" عاصم نے نادیہ کو لڑائی جھگڑے سے دور رکھنے کے لیے روکنا چاہا تھا، مگر شاہد کو جیسے آگ ہی لگ گئی۔ وہ بڑے بھائی کا ادب لحاظ بھول کر اسے کاٹ کھانے کو دوڑا تھا۔ اس کے ماتھے کی رگ غصے سے پھڑک رہی تھی۔

"شاہد! مت بھولو، نادیہ اس گھر کی بہو ہے تو عائشہ، ہما اور سنبل بھی اسی گھر کی بہوئیں ہیں۔ اگر وہ بھائیوں کے کسی معاملے میں نہیں بولتیں تو نادیہ کو بھی خاموش رہنا چاہیے۔ خاموشی ہی ان کے لیے بہتر ہے۔" عاصم نے سرد انداز سے شاہد کو دیکھتے ہوئے کہا تو سب کی نگاہیں ایک ساتھ نادیہ اور شاہد کی طرف اٹھ گئیں۔ نادیہ نے جو سب کو اپنی طرف اس طرح دیکھتے پایا تو منہ پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔ اسے روتا دیکھ کر شاہد کے حواس معطل ہو گئے۔

"بھائی جان! میں برداشت نہیں کروں گا کہ کوئی میری بیوی کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھے۔ میں نادو کی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتا، اور وہ بھی آپ میں سے کسی کی وجہ سے؟ ہرگز نہیں۔ جان سے ماردوں گا سب کو۔" وہ پورے کمرے میں اشتعال کے عالم میں اچھلتا پھر رہا تھا، نادیہ کے رونے کی آواز اس کے اشتعال کو بڑھا رہی تھی اور سب دم سادھے بیٹھے یہ نیا تماشا دیکھ رہے تھے۔

☆......☆

شاہد اور احد باپ کی پراپرٹی میں سے اپنا اپنا حصہ لے کر الگ ہو گئے۔ ان کی اس لڑائی میں بینا نے باقی بہنوں کے ساتھ مل کر خوب فائدہ اٹھایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہاشم کے بچے دو پارٹیوں میں تبدیل ہو گئے۔ بچے تو پارٹی بازی کا شکار ہوئے ہی تھے، والدین کو بھی زبردستی اس میں ملوث کرلیا گیا اور اس میں بھی بینا کا ہاتھ سب سے زیادہ تھا۔ ہاشم اپنے بیٹوں سے عشق کرتے تھے۔ انہوں نے آدھی عمر اکیلے، اور تنہا گزاری تھی۔ شادی کے بعد اللہ نے انہیں اولاد کی نعمت دی تھی اور دل کھول کر دی تھی۔ وہ اللہ کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتے تھے۔ مگر اب یہ نعمت ان کے لیے زحمت بنتی جارہی تھی۔ شاہد اور زید کی لڑائی میں سارا گھر برباد ہو گیا۔ بہنوں نے بھائیوں کو ملانے کی بجائے انہیں لڑانے کا کام کیا۔ اس جلتی آگ پر تیل اس ہوشیاری سے ڈالا کہ کسی کو علم بھی نہ ہوا اور گھر کا شیرازہ بکھر گیا۔ بینا نے سب سے زیادہ ہوشیاری دکھائی۔ اس نے دونوں پارٹیوں کا ساتھ دیا۔ بی جمالو کی طرح گھر گھر پھرتی اور سب کے دل میں بغض کے بیج بو دیتی اور پھر ان بیجوں کو پانی دینے کا کام شاہد اور نادیہ سرانجام دیتے۔

شاہد اور احد کو اس گھر سے گئے چار سال ہو چکے تھے۔ ناہید اسی گھر میں تھی مگر اب ان کی حیثیت کسی عضوِ معطل سے کم نہ تھی۔ ہاشم تو بیٹوں اور بیٹیوں کی پارٹیشن برداشت ہی نہیں کر سکے تھے اور ان لوگوں کے گھر چھوڑنے اور پراپرٹی سے حصہ مانگنے کا فیصلہ سنتے ہی ہمت ہار بیٹھے تھے۔ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا، اور پہلا اٹیک ہی ایسا ظالم ثابت ہوا کہ ان کی جان لے کر ہی ٹلا۔ ان کی وفات کے بعد کچھ عرصہ تو سب غم میں ڈوبے رہے، مگر پھر آہستہ آہستہ اپنے اپنے مفاد کی خاطر سر اٹھانے لگے۔ اب ایک اکیلی ماں کا وجود سب کو بھاری لگنے لگا اور شاید وہ اس بوجھ سے چھٹکارا پانے کو کچھ بھی کر جاتے اگر ہاشم نے اپنی پراپرٹی کا کافی بڑا حصہ ناہید کے نام نہ کردیا ہوتا۔ بازار میں دکانیں تھیں، مکان تھے جو کرائے پر چڑھے تھے۔ ناہید کو ہر ماہ ایک اچھی خاصی رقم کرائے کی مد میں مل جاتی جس سے

وہ اپنا گزارا تو کر ہی لیتی تھی، بیٹیوں کے کئی مسائل بھی اسی رقم سے حل ہوتے تھے۔ مگر پھر، ایک بار پھر لڑائی جھگڑے سر اٹھانے لگے۔ ناہید کی برداشت اب ختم ہو چکی تھی۔ ہما اور عائشہ خاموش تماشائی تھیں، جبکہ نادیہ نے ہمدردی کا جال پھینک کر سنبل اور احد کو اپنے قابو میں کرلیا تھا۔ احد اسے ماں کی جگہ دیتا تو سنبل ساس کی۔ عاصم بیوی بچوں کو لے کر پہلے ہی الگ ہو چکا تھا، اور اسے ہاشم نے اپنی زندگی میں ہی قریبی گھر میں خود شفٹ کروایا تھا۔ اب شاہد اور احد نے بھی اپنے حصے وصول کیے اور ایک دو منزلہ گھر کرائے پر لے کر وہاں سے دور چلے گئے۔

"احد! مجھے کچھ پیسے چاہئیں۔ بچوں کے کپڑے بنانے ہیں۔ موسم بدل رہا ہے اور ان کے سارے کپڑے چھوٹے ہو گئے ہیں۔" سنبل نے احد کے سامنے کھانا رکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"ہاں تو، تم نادیہ بھابی سے مانگ لو۔ وہ دے دیں گی تمہیں۔" احد نے بے پروائی سے ٹرے اپنے سامنے کرتے ہوئے کہا تو سنبل اس کا منہ دیکھنے لگی۔

"نادیہ بھابی سے کیوں مانگوں؟ میرے شوہر آپ ہیں، نادیہ بھابی نہیں۔ مجھے جس چیز کی ضرورت ہوگی میں آپ سے ہی کہوں گی ناں۔"

"تم پاگل عورت۔ تمہیں ایک بات سمجھ نہیں آتی کیا؟ نادیہ بھابی اس گھر کی بڑی ہیں۔ میری ماں کی جگہ ہیں اور میں سارے پیسے انہیں ہی تو دیتا ہوں۔ تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ اس جھوٹی انا کے چکر میں مت پڑو اور چھوٹی ہو تو چھوٹی بن کر رہو۔ وہ بڑی ہیں، ان کی عزت کیا کرو۔ وہ جیسا کہتی ہیں، بس ویسے ہی کیا کرو، سمجھیں۔"

"احد! وہ آپ کی ماں جیسی ہو سکتی ہیں، ماں نہیں۔ اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس طرح اپنی ضرورتوں کے لیے تو کبھی میں نے اپنی ساس کے سامنے بھی ہاتھ نہیں پھیلایا تھا، جس طرح آپ مجھے جیٹھانی کے سامنے لیٹ ڈاؤن کرواتے ہیں۔"

سنبل پہلے تو خاموشی سے اس کی تقریر سنتی رہی پھر نہ رہ سکی تو بول پڑی تھی اور اسے یہ بولنا بہت مہنگا پڑا تھا۔ احد پر جانے کون سا جنون سوار ہوا کہ اس نے سنبل پر ہاتھ اٹھا دیا۔ یہ ان دونوں کے مابین پہلی لڑائی تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ کبھی کبھار آپس میں الجھ جایا کرتے تھے مگر نوبت کبھی مار پیٹ تک نہیں آئی تھی۔ باتوں کے گولے دونوں طرف سے داغے جاتے اور پھر سنبل خود ہی خاموش ہو جاتی۔ احد بولتا بولتا باہر نکل جایا کرتا اور بات آئی گئی ہو جاتی۔

"احد! سنبل کی زبان کچھ زیادہ ہی تیز نہیں ہوتی جا رہی۔ وہ تو تمہاری کوئی عزت نہیں کرتی، تو ہماری کیا کرے گی؟ اسے کچھ سمجھاؤ یار۔ گھر اس طرح نہیں چلا کرتے۔" شاہد دکان میں بیٹھا اس کی برین واشنگ کر رہا تھا۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟ اس نے کچھ کہا ہے آپ سے؟" احد کے کان کھڑے ہو گئے۔ ابھی کل والی لڑائی کا غصہ اس کے دل سے گیا نہیں تھا کہ اب بھائی کوئی نئی داستان سنانے بیٹھ گیا تھا۔

"نہیں، مجھ سے تو کچھ نہیں کہا اس نے۔ مگر نادو کے ساتھ اس کا رویہ ٹھیک نہیں۔ بہت کھنچی کھنچی رہنے لگی ہے۔ بچوں کو بھی اوپر نہیں آنے دیتی اور اگر نادو کوئی بات اس کے بھلے کو ہی کہہ دے تو الٹا لڑنے بیٹھ جاتی ہے۔ طعنے دینے لگتی ہے کہ میرے میاں کی کمائی کھا رہے ہو اور مجھے ہی آنکھیں دکھاتے ہو۔" شاہد تاک تاک کر وار کر رہا تھا، احد کا منہ کھلے کا کھلا ہی رہ گیا۔

"دیکھو یار۔ تم میرے چھوٹے بھائی ہو اور تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ سب "شریکوں" کی نظریں تمہاری دولت پر گڑی ہیں۔ چاہے وہ بہنیں ہوں یا بھائی۔ میں تمہاری حفاظت کے خیال سے تمہارے ساتھ گھر بار بہن بھائی چھوڑ کر چلا آیا، ورنہ میری اپنی تو ذاتی دشمنی کسی کے ساتھ بھی نہیں تھی۔ اب ہم نے تمہارے لیے اتنی بڑی قربانی دی اور بدلے میں تمہاری بیوی کے طعنے سنیں، یہ تو ٹھیک بات نہیں ہے یار۔ تم خود سوچو۔" وہ آنکھوں میں آنسو بھر لایا، اور وہ ساری باتیں جو اسے نادو نے رات کو رٹو طوطے کی طرح یاد کروائی تھیں، سب کی سب بھائی کے سامنے کر دیں۔

احد اس وقت تو کچھ نہیں بولا۔ اس کا تو سر ہی شرم سے جھک گیا تھا کہ اس کی کم گو اور خوش اخلاق بیوی اس کی پیٹھ پیچھے یہ سب بھی کر سکتی ہے؟ اسے یقین تو نہیں آ رہا تھا، مگر بھائی کے آنسو بھی سچے لگ رہے تھے۔ اور پھر احد اور سنبل کی خوشگوار ازدواجی زندگی کا سکون تہ و بالا ہو کر رہ گیا۔ احد کو نادیہ منہ سے کچھ نہیں کہتی تھی، بس اس کے سامنے رونے والی صورت بنا کر شاکی انداز سے سنبل کو دیکھتے ہوئے گزر جاتی اور احد کا پارہ سوا نیزے پر جا پہنچتا۔ ادھر دکان میں شاہد اس کی خوب برین واشنگ کرتا، جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا ایشو بنا کر سنبل سے لڑنے لگتا۔ وہ پہلے تو خاموشی سے سنتی رہتی، جب برداشت ختم ہو جاتی تو جواب دے بیٹھتی اور

اس کے منہ کھولتے ہی احد کا ہاتھ کھل جاتا۔ یہ تماشا اب ہفتے میں دو، چار بار ہونے لگا۔ جب ان کی لڑائی شروع ہوتی، نادو شاہد کو فون کردیتی کہ ابھی گھر مت آنا، وہ لڑ رہے ہیں اور جب احد سنبل کو مارنے لگتا اس کے بچے روتے ہوئے تائی کے پاس مدد کو بھاگتے، تب وہ پھر شاہد کو فون کرتی کہ اب آجاؤ، کام ہوگیا ہے۔ شاہد اس کا فون سنتے ہی بھاگا آتا۔ بھائی کو برا بھلا کہتا، بھاوج سے ہمدردی جتاتا اور پھر بھائی کو ڈانٹ ڈپٹ کر گاڑی نکالتا اور سنبل کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتا۔ اس دوران روتے بلبلاتے بچے تائی کے پاس پناہ گزین ہوجاتے۔ شاہد، احد اور سنبل کے گھر سے نکلتے ہی نادو بچوں کو سنبل کے خلاف بھڑکانے لگتی۔ وہ انہیں باور کروانے میں تقریباً کامیاب ہو ہی جاتی کہ ساری غلطی سنبل کی تھی۔ اسے شوہر کے سامنے بولنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ پھر اپنی مثالیں دینے لگتی۔ اپنی تعریفیں کرتی، بچوں کو ماں سے خوب متنفر کرتی۔

''احد! بس، بہت ہوگئی یار۔ تمہارا ہی حوصلہ ہے جو ایسی پاگل بیوی کے ساتھ گذارا کر رہے ہو۔ میری بیوی اگر ایسی ہوتی تو ایک منٹ نہ لگاتا۔ تین حرف بھیج کے کب کا اپنی زندگی سے نکال چکا ہوتا اسے۔''

''تو اور کیا کروں، بیوی کو چھوڑ دوں، مگر بچوں کی ماں کو کیسے چھوڑوں؟ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، اور وہ ابھی ماں کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بس، اسی لیے برداشت کیے جارہا ہوں۔'' شاہد اب کسی نئے مشن پر تھا۔ احد کا کاروبار بہت پھیل چکا تھا۔ شاہد کے شیئر پچیس فیصد تھے، مگر صرف کھاتے میں۔ ورنہ وہ مراعات ایسے ہی وصولتا تھا جیسے ففٹی ففٹی کا پارٹنر ہو۔ احد اس کے نادیدہ احسانوں کے بوجھ تلے دبا، اسے کچھ نہ کہتا اور بڑا بھائی سمجھ کر اس کی ہر بات مانتا چلا جاتا۔ مگر اب سنبل ان کے راستے کی رکاوٹ بنتی جارہی تھی۔ اس نے آرام سے بیٹھ کر ٹھنڈے دل سے تجزیہ کیا تو سب حقیقت کھل کر اس کے سامنے آگئی۔ وہ احد کو سمجھانے کی کوشش کرتی مگر جواب میں ہمیشہ چار چوٹ کی کھاتی۔ اب اس نے کچھ بھی کہنا چھوڑ دیا تھا۔ سب کچھ برداشت کرتے رہنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ڈپریشن کی مریضہ بن گئی۔ مائیگرین اور ڈپریشن نے اس کی رہی سہی ہمت بھی نچوڑ ڈالی تو اس نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔

شاہد اور نادیہ کی بھرپور کوشش کے باوجود بھی جب احد نے سنبل کو نہیں چھوڑا تو انہوں نے اسے خاندان میں بدنام کرنا شروع کردیا۔ اس کے رابطے سب بہنوں سے بحال تھے۔ وہ ماں سے ملنے بھی جاتا اور نادو ہمیشہ اس کے ہمراہ ہوتی۔ وہ جہاں بھی جاتے، سنبل اور احد کے خلاف ایسی ایسی باتیں کرتے کہ دشمن خوش ہوجاتے اور دوستوں کے دل غم سے بھاری ہوجاتے۔ شاہد نے یہی بات عاصم اور عائشہ کے سامنے کی تو عائشہ سے رہا نہ گیا۔

''یہ تم کیسی باتیں کررہے ہو شاہد؟ احد بھائی ہے تمہارا اور سنبل بھابی۔ تم ان کا گھر توڑنے کی باتیں کر رہے ہو۔ بجائے اس کے کہ انہیں سمجھاؤ، انہیں اور لڑا رہے ہو؟ اور چلو، فرض کیا، اگر احد سنبل کو چھوڑ بھی دیتا ہے تو پھر بچوں کا کیا ہوگا؟ وہ کس کے پاس رہیں گے؟ ماں کے پاس یا باپ کے پاس؟ یہ بھی سوچا ہے تم نے کبھی؟''

''چھوڑیں بھابی۔ آپ کس زمانے کی باتیں کرتی ہیں۔ بچے تو خود ماں سے تنگ آئے ہوئے ہیں۔ وہ پاگل عورت تو اب بچوں کے بھی کسی کام کی نہیں، شوہر کے کیا کام آئے گی۔ اور رہی یہ بات کہ بچے کس کے پاس رہیں گے تو ظاہر ہے، ابھی جس کے پاس رہتے ہیں، بعد میں بھی اسی کے پاس رہیں گے۔ وہ ماں سے زیادہ تائی سے اٹیچ ہیں۔ رہ لیں گے ہمارے ساتھ... کیوں نادو۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟''

شاہد کا اطمینان دیدنی تھا، تو نادو کا سر بھی فخر سے بلند تھا۔ آخر کو دیور کی جایداد کی اکیلی مالکن بننے کا خواب پورا ہونے کا وقت آگیا تھا۔ سنبل نفسیاتی مریضہ کے طور پر خاندان بھر میں بدنام ہوچکی تھی اور نادو کی فہم وفراست کا علم پہلے سے بھی زیادہ بلند ہوچکا تھا۔ عاصم اور عائشہ ان کی باتیں سن کر سخت پریشان ہوچکے تھے۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور پھر ایک دن کھانے پر احد اور بچوں سمیت مدعو کیا۔ سوئے اتفاق نادیہ اپنے میکے گئی ہوئی تھی، ورنہ احد کی کہاں مجال تھی کہ بیوی بچوں کے ساتھ اکیلا ہی بھائی کے گھر چلا جاتا۔ کھانے کے بعد بچے اپنے کھیل میں لگ گئے تو عاصم نے ان دونوں کو سمجھایا۔ احد کو اس کی غلطیوں کا احساس دلایا، اور دبے الفاظ میں شاہد اور نادو کی سوچ سے بھی روشناس کروایا۔ سنبل اس دوران خاموش بیٹھی سب کو دیکھتی رہی۔ عاصم نے جب اس سے اس کی مرضی پوچھی تو اس نے ایسا جواب دیا کہ احد کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ وہ ایک ٹک سنبل کو دیکھتا چلا گیا۔ اتنا معقول اور نپا تلا جواب کوئی پاگل نہیں ہوشمند ہی دے سکتا تھا، تو کیا اس کی بیوی کے بارے میں جو باتیں خاندان میں مشہور ہوچکی تھیں، وہ سب کسی سازش کا نتیجہ تھیں؟

''احد! ابھی بھی وقت ہے میرے بھائی۔ اپنی عقل کا

استعمال کرنا سیکھو۔ کاروبار کے معاملے میں تو تم بڑے ہوشیار ہو۔ اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہو، تو پھر گھر کی طرف سے اتنے غافل کیوں ہو؟ یہ تمہاری بیوی ہے۔ تمہاری ذمہ داری۔ روز حشر اس کے بارے میں تم سے سوال کیا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے؟ سوچو میرے بھائی، تمہاری بیوی کو تو شاہد نے بدنام کر کے رکھ دیا، اور اپنی بیوی کے قصیدے وہ ایسے پڑھتا ہے کہ جیسے اس سے بڑھ کر اس دنیا میں کوئی اور ہے ہی نہیں۔ نادو کا کوئی نام بھی لے لے تو اسے آگ لگ جاتی ہے، تو پھر تم کیوں اس کے منہ سے اپنی بیوی کی برائیاں سنتے ہو، جبکہ وہ برائیاں اس میں ہیں بھی نہیں۔'' عاصم نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی تو ٹھیک نشانے پر ہی لگی۔ سنبل کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور احد کی آنکھوں پر پڑی پٹی کھلنا شروع ہو گئی۔ اب اس نے ہر بات پر غور کرنا شروع کیا تو ساری بات اس کی سمجھ میں آتی چلی گئی۔ اس دوران بر ایہ ہوا کہ ان دونوں نے ایک مشترکہ پلاٹ خرید کر اس پر ڈبل اسٹوری گھر بنا لیا تھا اور اس میں شفٹ بھی ہو چکے تھے۔ اب احد کو پچھتاوے تنگ کرنے لگے کہ کاش وہ اپنا گھر تو علیحدہ بنا لیتا۔ حالانکہ سنبل اور عاصم نے اسے کہا بھی تھا، مگر اس وقت بھائی کی محبت کا بخار سر چڑھ کر بول رہا تھا، اس لیے اس نے کوئی توجہ ہی نہیں دی تھی۔

☆......☆

''شاہد! بس بہت ہو گیا۔ احد اگر سنبل کو چھوڑنے کو تیار نہیں تو اسے کہیں، فیصلہ کر لے۔ ہمارا حصہ ہمیں دے دے اور اپنی لاڈو کو لے جائے یہاں سے۔ میں جب جب اس کی شکل دیکھتی ہوں آگ لگتی ہے میرے سینے میں۔ کم بخت کمبل ہو کر چمٹ گئی ہے جان ہی نہیں چھوڑ رہی۔ ہمارا سارا منصوبہ چوپٹ کر کے رکھ دیا اس ڈائن نے۔''

کہتے ہیں جب گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے اور نادو بی بی کی جو شامت آئی تو شاہد کو الٹی پٹیاں پڑھانے بیٹھ گئی۔

''بس بھائی جان! بہت ہو گیا۔ اب میرا احد کے ساتھ گزارا نہیں ہو سکتا۔ آپ ہمارا فیصلہ کروا دیں۔'' شاہد اگلے دن ہی عاصم کے پاس جا پہنچا اور اس کے سامنے اپنے نادیدہ دکھڑے رونے کے بعد فیصلہ کن انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے۔ میں بات کرتا ہوں احد سے۔ تم بھی اپنی طرف سے حساب لگا کر رکھو کہ تمہارا کیا شیئر بنتا ہے۔ تاکہ عین وقت پر کوئی جھگڑا نہ کھڑا ہو سکے۔'' عاصم اس کی عادت سے اچھی طرح واقف تھا، اسی لیے صبر سے اس کی ساری باتیں سن کر اپنے تئیں اسے حوصلہ افزا جواب دیا تھا۔

''حساب؟ کون سا حساب؟ میرا ہر چیز میں برابر کا حصہ ہے بھائی جان۔ اور میں ایک پائی بھی چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ سمجھے آپ۔'' اسے حسب توقع آگ لگ چکی تھی۔

''دیکھو شاہد! سب جانتے ہیں کہ کاروبار میں احد 75 % کا مالک ہے اور تمہارے شیئرز صرف 25 % ہیں۔ رہی گھر اور پلاٹس کی بات تو وہ احد کی مہربانی ہے کہ اس نے ہر چیز میں تمہارا 25 % شیئر رکھا ہے، ورنہ یہ تو تم بھی اچھی طرح سے جانتے ہو کہ ہر چیز کا اصل مالک تو احد ہی ہے۔ بزنس میں اس کا پیسا زیادہ لگا تھا، سو شیئرز بھی اس کے ہی زیادہ بنتے......!''

''اچھا؟ اور میں نے جو اس کے لیے قربانیاں دیں، ان کا کیا؟ میں نے اپنی زندگی کے بارہ سال اس کے اور اس کے بچوں کے لیے برباد کیے۔ ان کا حساب کون دے گا؟ بدلے میں مجھے کیا ملا؟ صرف 25 % شیئر؟ نہیں بھائی جان۔ اب تو حساب برابری کی سطح پر ہی ہو گا۔ گھر ہو یا پلاٹس یا پھر کاروبار۔ ہر چیز میں سے ففٹی ففٹی کا حصہ وصول کروں گا۔ دیکھتا ہوں مجھے کون روکتا ہے۔'' وہ بدتمیزی سے بھائی کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''شاہد! تم نے احد کے لیے قربانیاں نہیں دیں۔ بلکہ سر کے ساتھ انکشاف کیا تو ہاشم اور ناہید کے منہ کھلے کے کھلے ہی رہ گئے۔

''بینا؟ یہ آگ بینا کی لگائی ہوئی ہے، اور ہم کیسے ماں باپ ہیں کہ ہمیں اپنی ہی اولاد کے کرتوت کی خبر نہیں۔ تف ہے ایسی بیٹی پر جو ماں باپ کی نیکیوں کو برباد کر دے۔ اپنے حسد اور انا کی آگ میں اپنی ماں جائیوں کو جھونک کر ان کی دنیا بھی خراب کر دے اور آخرت بھی۔'' ناہید سے تو کچھ بولا ہی نہیں گیا، مگر ہاشم گہرے صدمے میں بھی بول اٹھے تھے۔

''رہنے دیں ابو آپ۔ باجی نے کچھ ایسا غلط بھی نہیں کیا۔ ہم اب بڑے ہو گئے ہیں اور ہمیں بھی سب باتوں کا علم ہونا چاہیے۔ باجی نے تو ہمیں حقیقت بتا کر ہمارے حق میں اچھا ہی کیا ہے۔ اب تو میں تایا، تائی سے اپنے دادا کے گھر کا حصہ بھی لوں گا اور آپ نے اور بھائی جان نے جو آج تک ان

اپنا مفاد دیکھا۔ زید کی طرح اگر تم بھی اکیلے بزنس کر رہے ہوتے تو آج تک اسی آبائی گھر میں بیٹھے ہوتے۔ نہ تمہارے نام کوئی پلاٹ ہوتا اور نہ ہی تم اپنے گھر کے مالک ہوتے۔ یہ بات اچھی طرح سے جانتے ہو لیکن ماننا نہیں چاہتے۔ کیونکہ تم احسان فراموش ہو۔ تمہارے بھائی نے تم پر احسان کیا اور تم اس کا بدلہ اسے پورے خاندان میں بدنام کر کے دے رہے ہو۔ میں شاہد نہیں۔ تم کوئی اور ہی گیم کھیل رہے ہو اور میں تمہیں بتا دوں۔ میں اب تمہاری کوئی چال کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔" عاصم کا صبر بھی جواب دے گیا۔ ان کا خاندانی جلال عود کر آیا تھا، اور اس جلال کو شاہد بھی جانتا تھا، سو غصے کو ضبط کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھیک ہے بھائی جان۔ لگتا ہے آپ کو میری بات سمجھ ہی نہیں آئی۔ ابھی میں چلتا ہوں۔ پھر کسی دن آؤں گا تو آپ کو تفصیل سے سمجھاؤں گا۔" اس نے میز سے بائیک کی چابیاں اٹھاتے ہوئے کہا۔

"بیٹھ جاؤ شاہد۔ بات ہوگی اور آج ہی ہوگی۔ آج میں یہ روز روز کی کل کل ختم ہی کر دوں گا۔ ابھی بلاتا ہوں احد کو اور ابھی ہو جائے گا سب فیصلہ۔" عاصم نے دبنگ انداز سے کہا تو شاہد پریشان ہو گیا۔

"بیٹھ جاؤ شاہد! کھانا کھا کر جانا۔ ابھی احد بھی آتا ہوگا، پھر میں کھانا لگا دوں گی۔ پہلے کچھ کھا پی لینا، پھر آرام سے ٹھنڈے دل کے ساتھ اپنے مسائل کا حل تلاش کرنا۔ انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" عائشہ نے نرمی سے کہا تو وہ منہ بناتا ہوا بیٹھ گیا۔

"شاہد! تم بڑے ہو، احد چھوٹا ہے۔ میں اس سے بات کروں گا۔ تم بس، اپنے غصے پر قابو رکھنا۔ کوئی ایسی ویسی بات نہ کرنا کہ مزید بدمزگی ہو جائے۔ میں احد سے کہوں گا کہ تمہیں 25 % کی بجائے 35 % شیئرز دے دے۔ بلکہ تم ایسا کرنا کہ سارے شیئرز احد کو ہی بیچ دینا، اس سے نقد رقم لے کر اپنا خود کا بزنس اسٹارٹ کر لینا اور گھر بھی اپنی پسند کا لے لینا۔ اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔" احد کو کسی ضروری کام سے کہیں اور جانا تھا، سو اس نے آنے سے معذرت کر لی۔ عاصم اور عائشہ نے شاہد کو کھانا کھائے بغیر اٹھنے ہی نہیں دیا۔ اس دوران وہ پیار سے، نرمی سے اسے سمجھاتے رہے۔ بات معقول تھی اس کی سمجھ میں بھی آ گئی۔ اس لیے وہ بھی دھیما پڑ گیا۔

"میں تو یہ کہتی ہوں کہ اگر اس طرح لڑ جھگڑ کر ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ہے تو اس سے کہیں بہتر ہے کہ انسان شرافت سے کہیں دور جا کر اپنی دنیا الگ بسا لے تاکہ ایک دوسرے کی محبت دل میں زندہ رہے۔ تم بھی میری بات پر غور کرنا۔ اچھی لگے تو عمل بھی کر ڈالنا۔" عائشہ نے نرمی سے مسکراتے ہوئے کہا تو شاہد بس سر ہلا کر رہ گیا۔

"اور ایک بات اور۔ جو بھی بات کرنی ہے آمنے سامنے بیٹھ کر کرو۔ تم دونوں بھائی ہو۔ سگے بھائی۔ اور بھائی بھائیوں کے بازو ہوتے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے اپنا بازو کاٹ کر دنیا کے سامنے تماشا مت بن جانا۔" عاصم نے بھی نرم لہجے سے کہا تو شاہد بس ان دونوں کو دیکھ کر رہ گیا۔

☆☆......☆☆

تاریخ نے ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرایا۔ مگر اس بار واقعات کا تسلسل بری طرح مجروح ہوا تھا۔ نادیہ کو عاصم اور عائشہ کی کسی بات سے بھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ وہ تو ان کی دی گئی تجاویز سنتے ہی غصے سے ہی اکھڑ گئی تھی۔

"کیا؟ یہ سب بھائی جان نے کہا آپ سے، اور آپ چپ چاپ ان کی باتیں سن کر چلے آئے؟ کمال ہے شاہد۔ میں تو آپ کو بڑا بہادر سمجھتی تھی، مگر آپ تو نرے بزدل ہی نکلے۔"

"تو؟ کیا کرتا؟ بڑے بھائی بھابی ہیں وہ میرے۔ میں ان کے سامنے کیسے......!"

"اچھا؟ وہ بڑے بھائی بھابی ہیں، تو میں اور آپ کون ہیں؟ میں بڑی بھابی نہیں ہوں احد اور سنبل کی؟ آپ بڑے بھائی نہیں ہیں ان کے؟ جب ہماری کوئی عزت نہیں ان کی نگاہ میں تو ہم کسی کی عزت کیوں کریں۔" اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والے انداز میں وہ چلا اٹھی تھی۔

"لیکن احد اور سنبل نے بھی میرے ساتھ تو کوئی بدتمیزی......!"

"ہاں! ان کی بدتمیزیاں آپ کو کیوں دکھائی دینے لگیں۔ آپ کے تو سگے ہیں ناں وہ؟ وہ کیسے جھوٹ بول سکتے ہیں۔ ایک جھوٹی تو میں ہی رہ گئی ہوں سارے زمانے کی۔ بے غیرت کہیں کے۔ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ امی ابو نے بھی جانے کیا دیکھ کر میرا نصیب ان جاہلوں کے خاندان میں پھوڑ دیا۔" وہ اپنی آئی پر آ چکی تھی، اور اب اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ سارے خاندان کو آگے لگا کر رکھنے والا شاہد بھی نہیں۔ وہ بھی سر جھکائے اس کی گالیاں سن رہا تھا۔

"میں آپ کو آخری وارننگ دے رہی ہوں شاہد۔ ایک ہفتے کے اندر اندر مجھے یہ گھر خالی چاہیے اور ساری پراپرٹی میں برابر کا حصہ۔ اب آپ یہ سب کیسے کرتے ہیں۔ مجھے کچھ نہیں

پتا۔ مگر مجھے میرا حق چاہیے۔ سمجھے آپ۔"

"ایک ہفتہ؟ اتنے کم وقت میں تو شاید کچھ بھی نہ ہو سکے۔ میری تو ابھی احد سے اس موضوع پر بات ہی نہیں ہو پائی؟"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ میں نے آپ کو ایک ہفتے کا ٹائم دیا ہے اور ایک ہفتے کا مطلب ایک ہفتہ ہی ہے سمجھے آپ۔ ورنہ۔"

"ورنہ کیا۔" نادو کے انداز نے شاہد کو شاکڈ کر دیا تھا۔

"ورنہ خود بھی مر جاؤں گی اور آپ کے بچوں کو بھی مار دوں گی۔ پھر ساری عمر سیدھی کرتے رہنا بھائی بھابیوں کی جوتیاں۔ کیونکہ پھر تو آپ ہمیشہ کے لیے ویلے ہی ہو جائیں گے ناں۔ نہ کوئی بیوی ہوگی اور نہ ہی بچے۔ سارا سیاپا ہی ختم۔" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے زہر بھرے انداز میں کہہ رہی تھیں۔

شیطان نے ایک بار پھر ایک زن کے دماغ پر قبضہ کیا اور اس کے ذریعے ایک ہنستے بستے گھر کو اجاڑنے کی بھرپور کوشش کر ڈالی۔

☆......☆

"ابو! شاہد چاچو نے احد چاچو کو گولی مار دی۔ جلدی چلیے۔ انہیں اسپتال لے گئے ہیں۔" عاصم کا بیٹا گھبرایا ہوا گھر میں داخل ہوا اور روتے ہوئے باپ کو یہ روح فرسا خبر سنائی۔ عاصم کی ہوائیاں اڑ گئیں۔ عائشہ رونے لگی کہ یہ کیا ہو گیا۔ اسد عاصم کو بائیک پر بٹھائے اڑتا ہوا اسپتال پہنچا تھا۔ گولی احد کی ٹانگ میں لگی تھی۔ اس حادثے کی خبر ملتے ہی پورا خاندان وہاں اکٹھا ہو چکا تھا۔ شاہد بھی ان میں شامل تھا۔ جذبات کی رو میں بہہ کر وہ بھائی کو زخمی تو کر چکا تھا مگر اب پچھتاوں کے ناگ اسے ڈس رہے تھے۔ اس پر یہ خوف کہ اگر احد یا عاصم نے اس کے خلاف پرچہ کٹوا دیا تو اس کا کیا بنے گا؟

"انسپکٹر صاحب! میں اپنی گن صاف کر رہا تھا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا، گولی چیمبر میں پھنسی ہوئی تھی، بس میری انگلی کے دباؤ سے ٹریگر دب گیا اور گولی میری ٹانگ میں گھس گئی۔" عاصم کی التجا بھری نگاہوں کو دیکھتے ہوئے احد نے اپنا بیان حلفی ریکارڈ کروایا اور شاہد کے سر پر ایک اور احسان رکھ دیا۔

"شاہد! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ بھائی سے لڑنا مت۔ زمانے کو اپنا تماشا مت دکھانا، مگر تم نے میری ایک نہیں سنی اور اپنی کر کے رہے۔ اب بتاؤ مجھے۔ مل گیا تمہیں تمہارا حصہ؟ بن گئے ففٹی ففٹی کے پارٹنر؟ کچھ تو بولو۔ اس طرح سر جھکا کے کیوں بیٹھے ہو اب؟" احد کا آپریشن چل رہا تھا۔ اس کی ٹانگ کی ہڈی کی حالت دیکھ کر ڈاکٹرز بھی پریشان تھی کہ کیا کریں۔ اور عاصم کو جیسے ہی موقع ملا، وہ شاہد کو ایک کونے میں لے گیا اور لگا اس کی کلاس لینے۔

"مجھے نہیں پتا کہ مجھے کیا ہوا تھا۔ میرے پاس صرف ایک ہفتے کا وقت تھا بھائی جان، اور احد میری بات سننے کو ہی تیار نہیں تھا۔ میں نے اسے کہا بھی تھا کہ سب کچھ نادو کے نام لگا دے۔ مگر......!"

"نادو کے نام؟ لیکن کیوں؟ یہ تم دونوں بھائیوں کے بیچ نادو کہاں سے آ گئی؟ اور یہ ہفتے کا وقت تمہیں کس نے دیا۔" عاصم حیرت سے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا تو شاہد نے جھکا سر اٹھا کر بھائی کو دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا کہ عاصم کو اپنا سانس رکتا محسوس ہوا۔

"تو یہ سب تم سے تمہاری بیوی نے کروایا۔ وہ احد کا گھر توڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تو اس نے احد کو ہی توڑ ڈالا۔ اور تم نے ایک مرد ہو کر اپنی عقل ایک عورت کے ہاتھ میں دے دی؟ تف ہے تم پر شاہد۔ تف ہے۔ میری نگاہوں سے دور ہو جاؤ۔ میں اب تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔" عاصم کا پارہ چڑھتا ہی جا رہا تھا۔ شاہد چپ چاپ اٹھ کر وہاں سے باہر چلا گیا اور عاصم شدید صدمے اور دکھ کی حالت میں وہیں بیٹھا رہ گیا۔

☆......☆

"کاش شاہد۔ آپ عقل سے کام لے لیتے، اس قدر جذباتی [illegible] تو آج یہ گھر، ہمارا ہوتا۔ میں کسی نہ کسی طرح [illegible] کو احد کی زندگی سے نکال ہی دیتی، مگر آپ کی جلد بازی نے سارا کھیل ہی بگاڑ دیا۔ آپ کی اس گھٹیا حرکت کے بعد اب مجھے بھی آپ کے ساتھ رلنا پڑے گا۔ کہاں تو میں پوری کے خواب دیکھ رہی تھی اور کہاں اب آدھی بھی ہاتھ سے جاتی نظر آ رہی ہے۔ اور وہ بھی صرف آپ کی وجہ سے۔" نادو کا غصے کے مارے برا حال تھا۔ شاہد بھائیوں کی نگاہوں میں تو ذلیل ہوا ہی تھا، بیوی کی نگاہوں میں بھی اپنے لیے غصہ اور نفرت دیکھ کر گم صم بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس "زن" کو کیا جواب دے، جس کی وجہ سے وہ ان حالوں کو پہنچا تھا۔ اور وہ تھی کہ ابھی تک اس کے گلے شکوے ہی نہیں ختم ہو رہے تھے۔ اور تب......تب اس نے ایک نیا فیصلہ کیا۔ اس نے تین حرف کہے اور کمرے سے نکل گیا۔

جو دوسروں کا حق غصب کرنا چاہتی تھی وہ آج اپنی ہی لگائی ہوئی آگ میں جل رہی ہے۔